دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
فروری 2013
معراج رسول
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

مدیر اعلیٰ

عذرا رسول

جلد43 • شمارہ02 • فروری2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی75500

عزیزان من۔۔۔ السلام علیکم!

ایک سال اور بیت گیا۔۔۔ لوگوں نے بغلیں بجائیں۔۔۔ دھواں دھار فائرنگ کی اور یوں سال نو کا استقبال کیا۔۔۔ سال یوں ہی گزرتے جا رہے ہیں مگر ہم آگے بڑھنے یا بلندی کی طرف جانے کے بجائے رجعت قہقری اور پست بینائی کے ہولناک عارضے میں مبتلا ہیں۔ مشرق بعید کے وہ ملک جو ہم سے بہت زیادہ پس ماندہ تھے، بہت آگے نکل چکے ہیں۔ ملیشیا کی تو بات ہی کیا ہے، تھائی لینڈ، فلپائن، کمبوڈیا جیسے ممالک بھی معاشی طور پر ہم سے بہت توانا ہو چکے ہیں، بنگلہ دیش ہم سے کئی ہاتھ آگے ہے ہمارے روپے کے بدلے آج پورا ٹکا نہیں ملتا۔۔۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ نعرہ زنی کے باب میں ہم ان سب کے باپ بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے بونے رہنما ایک بڑی بھیڑ جمع کر کے محض زندہ باد کے نعرے لگوانے کے لیے ہوش ربا وعدے کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ کوئی یاد دلا دے تو یا اپنی خلوتوں میں ہمارے اور آپ کے کمزور حافظے اور اس سے زیادہ کمزور قوت فیصلہ کا مذاق اڑاتے ہوئے پُرامید رہتے ہیں کہ وقت آنے پر ہم انہیں یا ان ہی کے بھائی بندوں کو اپنے سروں پر بٹھائیں گے۔۔۔ کیونکہ متبادل کوئی نہیں ہے۔ متبادل بننے کی کوشش کرنے والوں کے لیے یہ خونخوار بھیڑیے بن جاتے ہیں۔ چند مستثنیات کے سوا، یہ سب مل کر ایسے ایسے وار کرتے ہیں کہ پارساؤں کا تصور تک لہولہان ہو جاتا ہے۔ نہ جانے یہ کھیل کب تک جاری رہے گا۔۔۔ یہ لوگ گائے کے دودھ پر قناعت کرنے کے بجائے اسے حلال کر کے نہیں بلکہ زندہ نوچ کر کھا جانا چاہتے ہیں تاکہ ان کی آنے والی نسلیں عیش کوشی میں زندگی بسر کر سکیں۔ ان کی رسّی ہم نے دراز کی ہوئی ہے۔ ہم رواروی میں ووٹ کی پرچی پر ٹھپے لگا کر خود قومی عذاب مول لیتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ حزب اقتدار اور حزب اختلاف نے حالیہ لانگ مارچ کے دوران میں امیدواروں کی چھانٹی کے لیے آئینی شرائط کے بھرپور اطلاق پر اتفاق کیا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ سارے کھوٹے سکے اس چھلنی سے نہیں گزر پائیں گے۔۔۔ کوئی نکل بھی جائے تو اسے بدترین ناکامی سے دوچار کرنا ہمارا اور آپ کا قومی فریضہ ہونا چاہیے۔ اس بار انہیں جھٹکا نہیں دیا گیا تو۔۔۔ اس سے آگے سوچتے ہوئے خوف آتا ہے۔

آئیے، خوف کی اس دلدل سے نکل کر چلتے ہیں آپ کی رنگارنگ محفل میں۔

حافظ آباد سے ماہا ایمان کے ذکرے "سال نو کی مبارک باد کے ساتھ پیارا جاسوسی چھ تاریخ کو موصول ہوا۔ بات ہو جائے ٹائٹل کی تو جناب ماشاء اللہ ڈاکٹر انکل کو قدرت نے جو حسن نظر دیا ہے، وہ غالباً تقطیر ہو کر دماغ تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد برش اور رنگوں کے راستے نکل کر جاسوسی کے کینوس پر انوکھا حسن بکھیر دیتا ہے۔ ایک خوب صورت حسینہ، دو بدحال مرد 2013ء کی مبارک باد اور آلاتِ تشدد سے سجا جاسوسی کا سرورق شاندار تھا۔ چھٹی نکتہ چینی میں آئے۔ غزالہ آنٹی کس بات کا شکریہ؟ بھئی محبتیں شکریہ نہیں بلکہ اعزاز سمجھ کے وصول کرنی چاہئیں۔ (شاباش بیٹا...) ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی آپ کی آراء کا شکریہ لیکن انکل بزرگی تو عقل سے آتی ہے نہ کہ عمر سے اسی لیے تو تنویر انکل بزرگ کہلوانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ماہ تاب کو شادی مبارک ہو۔ گلاب جامنوں میں میرا حصہ نہ بھولنا۔ ثاقب تبسم صاحب! آپ کی بک کے بارے میں، میں نے سنڈے میگزین میں پڑھا تھا اور جناب میری والدہ محترمہ کے نزدیک یہ لت ہی ہے جس کی مجھے سو سو باتیں سننی پڑتی ہیں۔ آنکھیں خراب ہو جائیں گی، اتنا قرآن پڑھو تو کتنا کچھ سیکھو گی وغیرہ وغیرہ، لیکن کوئی سمجھوتا نہیں کیونکہ شوق کا کوئی مول نہیں۔ سید شکیل حسین کاظمی! آپ کا ذاتی شیکسپیئر کافی سیانا ہے، صرف آپ کے حق کی ہی بات کرتا ہے۔ مبشر حسن کیا خوب بڑ ماری ہے آپ نے۔ ہمایوں سعید کا تبصرہ تو آج کل سلطانی چپکی کھا کر ہضم کرنا پڑ رہا ہے۔ بوجھو کیوں؟ سارہ کے تبصرے کی آخری لائن سے تو میں بھی متفق ہوں۔ زیب حسن اور ثاقب تبسم نگینہ کے شعر قابلِ تحسین تھے۔ تصویر الحسن! ماہ تاب جیسی خوش خبری آپ کب سنا رہی ہو؟ ادریس احمد خان، اتنا سادہ لیکن اچھا کیسے لکھتے ہیں آپ؟ اس بار خلافِ معمول للکار سے آغاز کیا۔ کیونکہ آج کل للکار فل جوبن پر چل رہی ہے۔ جاوا سے ٹاکرا ہو گیا تابش کا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کسی انڈین مووی کا کوئی سین دیکھ رہے ہوں۔ گرداب میں بھی شہریار نے انڈیا کو رختِ سفر باندھ لیا ہے لیکن آج کل اسٹوری بہت بور چل رہی ہے۔ میرے فیورٹ احمد اقبال کی غلل ہے دماغ کا سسپنس سے بھرپور ایک ڈرامائی تحریر ثابت ہوئی۔ حاصل مطالعہ یہ تھا کہ اگر موم کے پر ہوں تو سورج سے دوستی نہیں کرنی چاہیے۔ سچ کہتے ہیں کہ دنیا ایک دوسرے کے رشتے داروں سے بھری پڑی ہے لیکن رشتے مر گئے ہیں۔ سرورق کی تحریروں میں محی الدین نواب قرنطینہ لائے۔ مال و متاع کی ہوس میں جائز و ناجائز اختیار کرنے والوں کا عبرت اثر ماجرا۔ دوسرا رنگ مریم کے خان کا زرگزیدہ تھا۔ مریم کے خان کا انداز تحریر کاشف زبیر سے ملتا جلتا ہے۔ کہیں یہ ایک ہی شخصیت کے دو نام تو نہیں؟ بہرحال، حیات احمد کا کردار مجھے پسند آیا۔ مختصر تحریروں میں نیو ائر فول از کاشف زبیر پڑھی۔ جہاں ہر دفعہ نازو، جلیل کو چونا لگاتی تھی لیکن اس بار جلیل نے محترمہ کو چتر بھر کے بیگ پکڑا دیا۔ نوٹوں کی جگہ۔ شنوکی کمی محسوس ہوئی۔ فرض شناس پولیس افسر کی کارکردگی پر مشتمل تحریر قیمت از محمد عفان آزاد نسل پرستی سے نفرت پر مبنی تھی۔ نجات از بابر نعیم اس مردِ پُرعزم کا ماجرا جو ہار کر بھی جیتنے کی رسم نبھانا چاہتا تھا۔ عبد القدیر کی مار آستین ایک نازک اندام دوشیزہ کے گرد بنے گئے جال کی باریکیاں بھی تھیں اور ایک ایسے وفادار شخص کی کتھا جو اپنی وفاداری و اطاعت گزاری کا اپنی مرضی کے مطابق بدل چاہتا تھا۔ مجموعی طور پر اس ماہ ڈائجسٹ سرورق سے لے کر تمام تحریروں تک شاندار تھا۔"

کوٹ رادھا کشن سے کاشف علی میراں کی ناپسندیدگی "5 جنوری بروز ہفتہ جبکہ لاہور ریجن کا درجۂ حرارت تاریخ میں پہلی بار 2 ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ گھریلو اور سی این جی گیس کو لاہور ریجن میں بند ہوئے تیرھواں دن تھا۔ ہمارا شہر شدید دھند کی لپیٹ میں تھا اور کڑاکے کی اس سردی میں بھی 14 سے 16

بجلی کی لوڈشیڈنگ کا عذاب ہمارے سر پر مسلط تھا۔ رہی سہی کسر لوکل ٹرانسپورٹ بھی سی این جی کی وجہ سے بند پڑی تھی۔ غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے میں جاسوسی ڈائجسٹ کا سالِ نو کا شمارہ دل میں کوئی امنگ کوئی ترنگ نہ جگا سکا۔ ڈاکٹر عقیل کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت سرورق ہمیشہ کی طرح بے مثال تھا۔ بالخصوص 2013ء کے ہندسوں کو گفٹ کی صورت پیش کرنا پسند آیا۔ سب سے پہلے محفلِ یاراں میں گئے جہاں زیب حسن صاحب حاضر ہوئے۔ علی پور چٹھہ سے ثاقب صاحب، بنوں سے ہمایوں بھائی اور اوکاڑہ سے تفسیر عباس بابر صاحب محفل کی رونق کو بڑھا رہے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر انتظار صاحب! آپ کون سے والے ڈاکٹر ہیں؟ راجن پور سے ماہتاب گل کا انکشاف ہمیں ان کی خوشیوں کے لحاظ میں ہی پڑھا۔ مبارکاں جی۔ اور اگلے ماہ میری شادی کی بھی پہلی سالگرہ ہے 25 فروری کو... ساتھوں وی دے دو مبارکاں۔ (لیجیے جناب آپ کو بھی ڈھیروں ڈھیر مبارکاں ہوں) سب سے پہلے حاضری دی مغل صاحب کی للکار کے دربار میں مگر افسوس کے ساتھ کہہ رہا ہوں، مغل صاحب اسٹار پلس کے ڈراموں کی طرح کہانی کو غیر ضروری طول دے رہے ہیں۔ للکار کے بعد گرداب کے بارے میں تو کیا کہوں اب؟ اسما قادری صاحبہ کو پُرخلوص مشورہ ہے کہ ختم کردیں گرداب کو اب۔ للکار اور گرداب سے مایوس ہوکے جیلیل کے کارناموں کا رخ کیا اور خوب مزے لیے۔ ابتدائی صفحات کی طویل کہانی غلل ہے دماغ کا احمد اقبال کی بے حد اچھی کاوش رہی اور اس ماہ کی اسٹوری آف دی منتھ قرار پائی مگر آخر میں جب راوی کو پتا لگا کہ مہرین یعنی اس کی بیوی کو مخدوم صاحب نے بھکش وال لگی کی خاطر ٹھکانے لگا دیا تو اس نے مخدوم کو قرار واقعی سزا نہ دی جس کا مجھے افسوس ہوا۔ ہمارا معاشرہ واقعی انتہائی بے حس ہو چکا ہے۔ مولا جٹ کا کردار بے حد پسند آیا۔ سرورق کے رنگوں کی بات کریں تو دوسرا رنگ پہلے اور پہلا دوسرے نمبر پر رہا۔ نشان دہ غرور کا سر نیچا کا بے مثال نمونہ تھی۔ قیمت بے حد بور رہی۔ نجات بھی بور ہی تھی۔ بعد از مرگ جاسوسی سے بھرپور بہترین کہانی تھی جو پسند آئی مگر شارٹ اسٹوریز میں اسٹوری آف دی منتھ مثالی جوڑا رہا۔ دونوں نے اپنے رقیبوں کو ختم کیا اور سزا کے طور پر ایک دوسرے کو بھگتنے لگے۔ مارِ آستین اور میر بنارس کی خونی ہار بالخصوص زبردست کہانیاں تھیں۔"

پشاور سے بلقیس خان عرف بلو کی بلند پروازی "جاسوسی کے درشن آٹھ تاریخ کو ہوئے۔ ٹائٹل زبردست دِکھ رہا تھا۔ صنفِ کرخت بالکل ڈاکٹر نذیر انتظار مغل کی تصویر تھی۔ لڑکی بہت پیاری تھی، ہماری لیڈر ماہا ایمان سے حسن میں کچھ کم تھی۔ حسن زیب بھائی پلیز! اپنے شعر کی تشریح ضرور ما تحدہ کریں۔ یہ کیا بات ہوئی۔ اندھیروں کا گھر ہو اور تم بھٹکتے رہو۔ ثاقب تبسم نگینہ انکل آپ بجا فرما رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو صرف بڑے بڑے من ہی کر سکتے ہیں ہمی شکر نہیں۔ سید محی الدین صاحب نہ بابا نہ، گرداب میں چھلانگ لگانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ورنہ گرداب سے پھر نکلوں گی کیسے؟ شمس الحق! ویسے آپ نے واقعی بجا فرمایا۔ برے کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔ کراچی کی سارہ آپی! کیا دشمن پڑوسی آپ کو بھی اچھے لگتے ہیں۔ غزالہ بی بی جی، اقرا بانو دل میں باتیں مت رکھیے، ورنہ دل کی باتیں دل میں رہ جاتی ہیں۔ آپ کی بات پر کوئی مہابھارت شروع ہو جاتی تو اچھا ہوتا۔ ماہتاب اپنی زندگی میں قدم رکھتے ہوئے جاسوسی کو مت بھولیے گا۔ اللہ آپ کی نئی زندگی خوش گوار و پُرمسرت بنا دے۔ محسن علی سوم! یہ بتائیے یہ موم آپ نے کس اسٹور سے لی ہے جو آپ کے نام سے چپک گئی ہے۔ ڈاکٹر انتظار نذیر مغل، میرے کہانیاں پڑھنے نہ پڑھنے پر آپ کو کیا اعتراض ہے۔ ویسے آپ نے میرا خط غلط پڑھا تھا۔ میں نے تو بھی 90 فیصد سینئرز نہیں پڑھا۔ جی نہیں بالکل نہیں۔ اب ذرا کہانیوں کی بات ہو جائے، سب سے پہلے للکار ہی پڑھی۔ تابش نے عمران سے فون پر رابطہ کرلیا جبکہ میں نے سنا ہے کہ انڈیا سے پاکستان جانے والی کالز ریکارڈ کی جاتی ہیں اور تابی نے تو پوری رام کہانی ممو کو فون پر سنائی۔ مجھے یقین ہے تابی اور ثروت بالکل حفاظت سے جاوا کے خونی شکنجے میں سے نکل جائیں گے۔ پہلی ابتدائی کہانی غلل ہے دماغ کا، واقعی غلل ثابت ہوئی۔ جمال اور مہرین کی اس کہانی میں سراسر نقصان مہرین کا ہوا۔ زارا اور اس کے پاپا کا داغ دار دامن صاف بچ گیا۔ مہرین کو عزت کے نام پر قتل کر دیا گیا۔ مولا جٹ اور فرح جیسے تیز کردار، کہانی کی بوریت کو کم نہ کر سکے۔ رنگوں میں پہلا رنگ قرطینہ کی ورشا، محی الدین نواب کی خوب صورت کہانی تھی اور تیزی سے چلتی ہوئی کہانی نے ہمیں آخر تک اپنی گرفت میں جکڑے رکھا۔ کاش میں نے آخر تک دعائیں کی کہ ورشا کو دو کروڑ دس لاکھ کی خطیر رقم مل جائے۔ مگر قرطینہ سے کوئی زندہ بچ کر کیسے جا سکتا تھا۔ دوسرا رنگ مریم کے خان کی زر گزیدہ نے بھی بہت متاثر کیا۔ مکون اسٹائل میں جکڑی اس کہانی نے آخر تک ہمیں متاثر کیا۔"

فہد علی جنجوعہ کوٹلی آزاد کشمیر سے رقم طراز ہیں "4 جنوری کو جاسوسی کے درشن ہوئے۔ حسبِ معمول سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی جہاں ایک ماہ جبین اپنی تمام تر رعنائیوں، حشر سامانیوں اور جلووں کے ساتھ جلوہ گر تھی اور ہماری طرف رخ کیے یقیناً ہمیں ہی دیکھ رہی تھی کیونکہ ہم جیسے ہی لاکھوں میں ایک (یہ ہم نہیں کہتے بلکہ ہماری اماں جان کہتی ہیں) وہ یقیناً ہمیں 2013ء کی آمد کی مبارک باد دے رہی تھی۔ ہم نے مبارک باد قبول کی اور اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکے۔ ہم پہنچے اپنی پسندیدہ محفل چپکی نکتہ چینی میں۔ سب سے پہلے چپکی نکتہ چینی میں انکل کا اداریہ پڑھا جہاں پر انہوں نے ہم سب کو بحیثیت ووٹر ہمیں ہماری ذمے داری کا احساس دلایا۔ زیب حسن صاحب کو کرسیِ صدارت حاصل کرنے پر مبارک باد۔ ویسے تبصرہ شاندار تھا اور پہلے نمبر پر آنے کا حق دار تھا اور سب سے خاص بات ان کے خط میں شامل شعر تھا جو مجھے بہت پسند آیا۔ ثاقب تبسم نگینہ، مظہر شہباز بٹ اور ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی کے تبصرے بھی شاندار تھے اور پڑھے جانے کے قابل تھے۔ ماہتاب گل صاحبہ کو پیا گھر سدھارنے پر مبارک باد۔ اب آتے ہیں اس ماہ کی کہانیوں کی طرف تو حسبِ معمول سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کے شاہکار للکار کی طرف متوجہ ہوئے۔ کیونکہ اگر للکار کو جاسوسی کی جان کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ للکار میں تابش حسبِ معمول ایکشن میں نظر آیا اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے ثروت اور اس کے شوہر (یوسف) کو سرداروں کے پنجے سے نکال لایا لیکن یوسف کی تابش کے بارے میں دروغ گوئی اور تابش سے نفرت پسند نہ آئی لیکن اس کے ذہن میں ثروت اور تابش کے بارے میں جو شک برین ٹیومر کی طرح جڑ پکڑ چکا ہے، وہ کسی طور بھی ختم نہ ہو سکے گا۔ جاوا کی آمد کی منظر کشی اور جاوا اور تابش کے مکالمے لاجواب تھے۔ حسبِ معمول اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ میں یہاں پر ایک بات آپ سب کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ جاسوسی ڈائجسٹ میں نے مرحوم اقبال کاظمی صاحب کی آتش فشاں کی وجہ سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ پھر اقبال کاظمی صاحب کے گزر جانے کے بعد حسام بٹ نے اسٹوری کو جاری رکھا لیکن وہ اس کا تمیجو برقرار نہ رکھ سکے۔ بہر حال ہر قاری کا اپنا، اپنا معیار اور پسند ہوتی

ہے۔ مرحوم کاظمی صاحب اور مغل صاحب کے طرزِ تحریر میں کافی شباہت پائی جاتی ہے۔ بلاشک و شبہ مغل صاحب کا اندازِ تحریر ہی اس قدر دلچسپ اور جاندار ہوتا ہے کہ قاری اس تحریر کو پڑھتے وقت اپنے اردگرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اسما قادری کی گرداب لفظی چاشنی اور منظر کشی کی بدولت ابھی تک زندہ ہے۔ اس کے واقعات میں طوالت کی وجہ سے اب تسلسل کی کمی ہے تاہم الفاظ اور جملوں کا انتخاب لاجواب ہوتا ہے۔ اگر سرورق کے رنگوں کی بات کی جائے تو سب سے پہلے بات ہو جائے محی الدین نواب صاحب کے قرطینہ کی۔ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اگر دولت کی خواہش عادت و ہوس میں بدل جائے تو اس سے چھٹکارا پانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی حال سونی اور ورشا کا ہوا۔ ہوسِ زر نے انہیں بالکل اندھا کر دیا تھا کہ وہ دونوں زندگی کی بازی ہار گئے۔ سرورق کا دوسرا رنگ زرگزیدہ بلاشک و شبہ ایک عمدہ تحریر تھی اور مریم کے خان نے ہمیں 2013ء کا تحفہ دیا۔ تین "ز" (یعنی زر، زن، زمین) کے موضوع پر اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن زرگزیدہ بالکل ایک اچھوتی تحریر تھی۔ اب بات ہو جائے ابتدائی صفحات پر موجود احمد اقبال کی تحریر "غلل ہے دماغ کا" کی، ایک بات میں بلاجھجک کہنا چاہوں گا کہ یہ تحریر مجھے کچھ خاص متاثر نہ کرسکی۔ احمد اقبال صاحب نے جو سحر اسٹوری کے ابتدا میں طاری کیا تھا اسے تا دیر برقرار نہ رکھ سکے۔ بلاوجہ کا سسپنس پیدا کیا ہوا تھا۔ وہ جو کہتے ہیں نہ کہ "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" وہ مثال اس اسٹوری کے اختتام پر صادق آتی ہے۔ بہر حال سب قارئین کا میری رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ مختصر تحریروں کی اگر بات کی جائے تو سب سے پہلے بات ہو جائے کاشف زبیر کے شاہکار نیو ائیر فول کی۔ کاشف صاحب اس مرتبہ پھر جانے پہچانے چہروں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے اور ہر دفعہ کی طرح اس مرتبہ پھر بازی لے گئے۔ مختار آزاد کی نشان زدہ بھی ایک اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ جمال دستی کی میری کرسمس ایک مختصر مگر جامع تحریر تھی۔ جیکب اگر میری کی صرف ایک بات (گھر کو صاف ستھرا رکھنا) مان لیتا تو وہ یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا اور اس کی جان بھی بچ جاتی لیکن اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ میر بنارس جب بھی لکھتی ہیں لاجواب ہی لکھتی ہیں۔ اس مرتبہ ان کی خونی ہار کا پلاٹ نہایت جاندار تھا۔ بلاشبہ یہ ایک ایسی تحریر تھی جو قاری کو جکڑ لیتی ہے اور جب تک ختم نہ ہو قاری آزاد نہیں ہو پاتا۔ محمد عثمان آزاد کی قیمت کچھ خاص متاثر نہ کرسکی۔"

فتح پور لیہ سے سید محی الدین اشفاق کی خوشی "اس مرتبہ جاسوسی 6 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل حسینہ بس ٹھیک تھی۔ شاید سردی کی وجہ سے زیادہ تیاری نہ کر سکی اس لیے ہم بھی ایک نظر ڈال کر محفل میں پہنچے۔ زیب حسن بڑے خوش قسمت ہیں بھائی سال میں ایک دو دفعہ حاضری اور آتے ہی کرسیِ صدارت؟ بہر حال بہت مبارک باد۔ محترمہ تصویر الحسن کچھ زیادہ ہی بزی لگتی ہیں۔ دو ماہ بعد واپسی اور وہ بھی اتنی کنجوسی کے ساتھ؟ ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی کا تبصرہ جاندار تھا۔ تفسیر عباس بابر صاحب! مہنگائی، مصروفیات اور مسائل تو چلتے رہتے ہیں تاہم الجھنیں اور تلخیاں جاسوسی کے آنے سے کم ہو جاتی ہیں۔ عمران کی کمی کو میں اور آپ ہی نہیں، سب نے محسوس کیا ہے۔ ثاقب تبسم نگینہ صاحب کا تبصرہ کوالٹی اور کوانٹٹی دونوں لحاظ سے چھا گیا۔ ویلڈن سر۔ کچھ تبصرہ کہانیوں پر۔ للکار میں تابش ایک سنگین صورتِ حال سے بچ نکلا اور اس کا عمران سے رابطہ بھی ہو گیا۔ ثروت کا تابش پر شک کرنا اچھا نہیں لگا۔ کہانی پورے جوبن پر ہے۔ گرداب میں ستارہ م خان کا ذکر اور ایک بار چودھری تو پھر کشور اور اس کے شوہر کا ذکر آ جاتا ہے تو کبھی شہریار کی انٹری یاترا۔ مصنفہ سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کے کسی ایک کردار پر فوکس کریں۔ سرورق کی پہلی کہانی محی الدین نواب کی تھی، جرم و سزا پر مبنی تھی۔ کہانی اختتام تک دلچسپ رہی۔ سرورق کی دوسری کہانی میں مریم کے خان نے زن، زر اور زمین کی تکون کو مدِنظر رکھتے ہوئے لکھا کہ اپنا لہو ہی قاتل نکلا۔ اس کے علاوہ خونی ہار میں میر بنارس نے بڑی اچھی پچویشن دکھائی۔ اولین صفحات پر احمد اقبال نے اپنے مخصوص اسٹائل میں اپنے قلم کے سحر میں جکڑے رکھا۔ نیو ائیر فول میں کاشف زبیر نے ہمارے معاشرے کے مکروہ کرداروں کی اچھے انداز میں عکاسی کی۔ اس بار جاسوسی نے نئے سال کی خوشیاں دوبالا کر دیں۔"

مہمند ایجنسی گندہاب سے طاہر حسین مہمند کا غم و غصہ "محفل میں پہلی دفعہ شرکت کر رہا ہوں اور امید ہے کہ ایڈیٹر صاحب میرا یہ خط ضرور شامل کریں گے۔ کئی سالوں سے میں دیکھ رہا ہوں کہ قبائلی علاقہ جات سے تعلق رکھنے والے کسی بندے کا بھی خط محفل میں شامل نہیں ہوا ہے جس پر ہم ایڈیٹر صاحب سے بہت ناراض ہیں کیونکہ ہم بھی تو اسی ملک کے رہنے والے ہیں۔ اگر اس مہینے میرا یہ خط شامل کیا گیا تو میں پوری کوشش کروں گا کہ ہر مہینے خط ارسال کرتا رہوں۔ (آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ ہم قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والوں کا خط شائع نہیں کرتے... کیا یہ علاقے پاکستان سے الگ ہیں... آپ کا الزام سن کر ہمیں دلی صدمہ پہنچا ہے... آپ خود جاسوسی کئی سالوں سے پڑھ رہے ہیں اور خط پہلی بار لکھ رہے ہیں... جیسے ہی ہمیں کسی بھی علاقے سے خط موصول ہوتا ہے، ہم ضرور لگاتے ہیں) کئی سالوں سے جاسوسی کو پڑھتا ہوں لیکن اس دفعہ جاسوسی کچھ تاخیر سے یعنی 10 جنوری کو مل گیا۔ جاسوسی میں گرداب اور للکار بہت شوق سے پڑھتا ہوں لیکن گرداب میں ماہ بانو پر بعض اوقات غصہ آتا ہے اور وہ اس لیے کہ اس نے شہریار کو اتنے معمولی جرم کی اتنی بڑی سزا کیوں دی کہ اس کو چھوڑ کر بہت دور چلی گئی اور للکار میں ثروت پر بہت غصہ آ رہا ہے کہ انہوں نے تابش جیسے محبت کرنے والے بندے کو چھوڑ دیا۔ ثروت کی جدائی کے غم میں تابش کے ساتھ میں پورا شریک ہوں کیونکہ محبت میں جدائی کے غم کا صرف ان لوگوں کو معلوم ہوتا ہے جن پر یہ دن گزر رہے ہوں۔ ایک شاعر کہتا ہے کہ

فریاد کر رہی ہے یہ ترسی ہوئی نگاہ
دیکھے ہوئے کسی کو بہت دن گزر گئے

پشاور سے انجینئر عمیر شہزاد بنگش کا ضروری نامہ "اس دفعہ جاسوسی 5 تاریخ ہی کو رونق افروز ہوا اور بک اسٹال پر کسی گفٹ بکس کے مانند ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم نے بھی جلدی اس کا اشارہ سمجھ کر فوراً سے پہلے اسے اپنا بنا لیا۔ سرورق پر اس دفعہ حسینہ نما عورت سے زیادہ زنجیر کی طرح لکھا ہوا 2013ء دل کو بھا گیا۔ اس کے نیچے ہمایوں سعید کو یوں بری طرح بے ہوش دیکھ کر یقیناً سب نے انجوائے کیا ہوگا۔ کیونکہ صنفِ نازک کے پیچھے بھاگنے کا آخر کار یہی انجام ہونا ہی تھا۔ (بجا فرمایا) اس کے بعد دل تھام کر گفٹ بکس کھولنے لگا تو سب سے پہلے مدیرِ اعلیٰ صاحب کے درشن نصیب ہوئے۔ کرسیِ صدارت پر حسینوں کی مصوری کرتے ہوئے لاہور سے زیب حسن کو دیکھا۔ ارے کوئی ہماری تصاویر بھی تو بناؤ۔ ثاقب تبسم نگینہ کا جان دار تبصرہ

پڑھ کر غصے سے موسم میں سوغات کا کام دیا۔ شمس الحق صاحب آپ کی طرح ہم سب کا یہی حال ہے۔ آپ کے ہاتھ کے بارے میں جان کر دل کو بہت دکھ ہوا۔ کراچی سے سارہ جی سلام ودعا کے بغیر سیدھی مطلب کی بات پر آ گئیں۔ غزالہ بی بی چلو کسی دوسرے کے الفاظ میں بیان کر کے ہمیں بتائیں۔ منظر شہباز بیٹا آپ ماہا جان کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ کبھی کبھی انہیں اوٹ پٹانگ بولنے کا دورہ آتا ہے۔ ڈاکٹر انتظار مذیر مغل تبصرہ پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ ماشاء اللہ آپ دونوں سے ایک اور رحیم اللہ خان جو ہمایوں سعید کی طرح صنف نازک کا رسیا نکلا۔ بلال لودھی صاحب شاید آپ کہانی پڑھتے سے کہیں کھوئے ہوئے تھے۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی انکل ایک وفادار شوہر کا کتابی کردار نبھا رہے ہیں۔ باقی تبصروں میں سید محی الدین، سید شکیل کاظمی اور حسن سردار رانا کا بہت پسند آیا۔ عدنان یوسف اور طاہرہ گلزار کو بہت مس کیا۔ اوہ شٹ یار! امجد سمیت پورے پشاور سے کسی کا بھی تبصرہ شائع نہیں کیا لیکن جب بلیک لسٹ میں بھی نظر نہ آیا تو مجھے یقین ہوا کہ یہ محکمہ ڈاک کی کارستانی ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ایڈیٹر انکل کی قسمت نے ساتھ دیا اور وہ بچ گئے ورنہ... کہانیوں میں خلل ہے دماغ کا پڑھی۔ جو دماغ کی دہی بنانے کے لیے کافی تھی۔ ہم اتنی مصروفیت کے باوجود خط لکھتے ہیں اور ہمارے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے۔ اس لیے مختصر تبصرہ لکھ رہا ہوں تاکہ محنت ضائع نہ ہو۔“ (لیجیے اپنی محنت کا انعام پڑھ لیجیے)

ٹی لور سے ثاقب تبسم نگینہ کا منفرد پارہ ”نئے سال کا نیا اور پہلا پیارا شمارہ پانچ جنوری کو آنکھوں نے تاڑا۔ دل کا تھا اشارہ کہ اس بار جلدی ہو نظارہ، اسی انتظار میں نئے سال کا پہلا پہلا وقت گزارا... اس بار ہوگا کوئی منفرد نظارہ، جگمگ جگمگ فلک ہوگا سارا، نئے سال کی آمد پر دور ہوگا ہر خسارہ، یہ بھی نہیں تو ہوتا کچھ موسم سرد کا بھی اشارہ، دھند ہوتی کہیں تو کہیں برف کا نظارہ... لیکن سرورق تو حسب روایت تھا روایت کا مارا... وہی حسینہ کی خشمگیں بلکہ جنگی آنکھوں کا مارا، مرد بے چارہ پڑا تھا زمین پر، بے حال و بے سہارا، بیدردی سے کچلا گیا تھا اور اس کی تعاقب میں تھیں نظریں کسی سفاک کی، جس کے چہرے پر تحریر تھی ہیبت ناپاک کی اور اس کی نظر میں 2013ء کی زنجیر تھی۔ وہی مقتول کے لیے موت کی سفیر تھی۔ سفیری میں تو خیال آیا حنا ربانی کھر کا لیکن حسینہ کی آنکھوں میں تھیں ان گنت گہرائیاں... اس کے بنفشی گالوں پہ بکھری زلفیں تو کمال تھیں۔ جس نے نکھاری تصویر حسن و جمال کی، جس کی صراحی دار گردن بھی نشہ تھی، یہی سرورق کا خاصہ تھی۔ یہ تو حسن تھا جو سرورق پہ تھا مگر اک حسن تھا آپ کی تحریر کا، جس میں کیا ہے آپ نے تیا پانچا ایک سیاست کی لکیر کا، پر جو بھی آپ نے شرط ہے سیاست داں کے لیے، یہ تو نہیں ہے قسمت پاکستان کے لیے۔ اللہ کرے کہ سوچ لوگوں کی بدل جائے اب کے اور ہے جتنا بھی گند، وہ نکل جائے اب کے۔ زیب حسن تھا ابھرا، لاہور سے جس کا نام دکھا نیوائیر کی محفل میں غور سے کہ اسے حاصل ہے مسند صدارت اسی لیے اسے ہو مبارک اس بار کی جیت اس کا مقدر تھی ہے ورنہ تو دنیا سے سب کی ٹھنی ہے۔ ہم نے پھر دیکھا محبت نامہ جو کیا ہم نے ارسال تھا، چاہت سے ہم نے تھا بھیجا جو ہمارا خیال تھا، ہم نے لکھا اس میں دل کا حال تھا، اور آپ نے کیا شعر ہمارا پسند تو یہ آپ کے ذوق کا کمال تھا۔ محی الدین اشفاق کی اچھی لگی گراہٹ بھی۔ شکیل کاظمی کی تحریر بھی خوب تھی جو دلچسپی کا روپ تھی، ویلکم ہم کہتے ہیں ہما نظیر کو اور شاباش ہے بھائی تفسیر کو۔ ابن مقبول صدیقی جی ہم آیا کریں گے ہر مہینے ہی، اور اچھی تھی مختصر تصویر العین کی فن کاری... پھر احمد اقبال کی دیکھی قلم کاری، جس کا ہوا ہم پہ اثر بھاری، خلل ہے دماغ کا نام تھا اس چراغ کا، جو نشاں تھا منزل کا۔ مختار آزاد کی جو نشاں زدہ تھی، وہ اپنے انجام پر جان زدہ تھی، اگرچہ طوالت بھی ضرور تھی لیکن دل کے لیے باعث سرور تھی۔ راستے میں اسما قادری کا گرداب بھی تھا، سفر بھی تھا جس میں اور ایکشن کا سیلاب بھی تھا۔ جمال دتی کی میری کرسمس نام تو گرم تھا لیکن کام اور پلاٹ نرم تھا۔ اختصار کا ڈھول بھی تھا اسی لیے شاید اس میں جھول بھی تھا۔ محمد عفان آزاد کی قیمت نے کیا بور کہیں کہیں سے، اسی لیے ہم نے اس پہ کیا غور کہیں کہیں سے، لیکن مزہ آ گیا کاشف زبیر کے قلم کے پھول کا، یہ کمال تھا ان کے نیوائیر فول کا۔ جملوں کی بات تو ایک طرف، جملوں کی تازگی کیا کہیے، جیسے خزاں میں پھول کو ملے زندگی کیا کہیے؟ یا بر نسیم نے جو نجات لکھی تھی، انہوں نے بھی گویا اک سوغات لکھی تھی، ایسا ہی مزہ تھا اس بار للکار کا، قلم کمال چلا اس بار قلم کار کا، پڑھتے ہوئے بھی جیسے ہم بھاگ رہے تھے، مگر بھاگتے بھاگتے ہم کہاں بھاگ رہے تھے؟ بعد از مرگ تنویر ریاض کی کہانی تھی جو کچھ نئی اور زیادہ پرانی تھی، سلیم انور نے مثالی جوڑا جو دکھایا ہمیں، آغاز و انجام اس کا بہت ہی بھایا ہمیں۔ عبداللہ پر کے مار آستین پہ نظر جو ٹھہری، اداسی دل پہ چھا گئی گہری، کہ خوب تھا اس کہانی کا تانا بانا، اسے پسند کرنے کا تھا نہ کوئی بہانہ، پھر جو میر بنارس کی خونی بار دیکھی، ایسی ترتیب بھی کہانیوں میں پہلی بار دیکھی، خونی تو لفظ ہے اصل میں ”خونیں“ شاید ہو خطا اور اس میں کمپوزنگ جنونی... قرنطینہ محی الدین نواب کا شاہکار تھی، سرورق کی پہلی کہانی شاندار تھی، ہندو اور مسلم بھی، رواج بھی ان کے تھے اور پھر باعث فسادات، سماج بھی ان کے تھے۔ ”زرگزیدہ“ کو لکھنے والی مریم کے خان کا پیغام اچھوتا ہے، جیسے میرے وطن کا ہر ذرہ اور نام اچھوتا ہے۔ پاکستان زندہ باد!“

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی درخواست ”نئے سال کا پہلا شمارہ خریدا ایک سرد شام کو۔ ٹائٹل پر حسینہ ہمیں بہت غور سے دیکھ رہی تھی لیکن نیچے دیکھ کر دل کانپ گیا کیونکہ ایک آدمی کی لاش موجود تھی۔ خیر دوستوں کی محفل میں انٹری دی۔ زیب حسن کرسی صدارت مبارک ہو۔ سید محی الدین اشفاق! بھائی کیا حال ہیں۔ ماہ تاب گل! آپ کو شادی کی بہت مبارک ہو۔ دوستوں میں صرف شکیل نے ہمیں یاد رکھا بہت شکریہ۔ ارسلان شاہ کو بہت سلام۔ تفسیر عباس کا تبصرہ اس مرتبہ کچھ ادھورا تھا۔ ہما نظیر! ویلکم ٹو جاسوسی۔ تصویر العین صاحب! خیر نال آگئے۔ عائشہ رانی! کہاں غائب ہو۔ للکار تو اس مرتبہ ٹاپ پر رہی۔ تابی کی بہادری بہت اچھی لگی ہے، ثروت کو تابی سے ملا دیں۔ گرداب بہت سلو جا رہی ہے۔ قرنطینہ نے اس مرتبہ دل جیت لیا۔ دولت کی ہوس انسان کو پاگل کر دیتی ہے۔ مریم کے خان نے بہت اچھا لکھا لیکن کاشف زبیر کی بات ہی کیا ہے۔ چھوٹی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں اور پلیز میرا خط پورا شائع کیجیے گا۔“

شورکوٹ سے نسیم تبسم کا تجزیہ نامہ ”سال نو کے آغاز پر جاسوسی نے چار چاند لگا دیے تھے۔ نئے سال کی نوید دیتا ہوا سرورق حسینہ مہ جبینہ کی بدولت کچھ دلکش تھا، سوائے عارضی یا ابدی نیند سوتے ہوئے شخص کے جو شاید مرحوم ہونے کی سند پا چکا ہے۔ چٹکی نکتہ چینی میں تاخیری حاضری کے روادار زیب حسن صدارت کے تمغے سے سجے ہوئے تھے۔ مبارکاں جی سال نو اور صدارت دونوں کی۔ ثاقب تبسم نگینہ آپ کا تبصرہ زوردار اور بھرپور ہے۔ خلل ہے دماغ کا اعصاب کو چٹخاتی ہوئی کہانی تھی۔ جمال کی زندگی میں مہرین کی آمد و رخصت اور خلاف توقع اس کے انجام نے بری طرح چونکایا۔ شہرت کے زعم میں مبتلا

قاتل کو اس کے آخری انجام تک اس کی وجہ شہرت نے ہی پہنچایا۔ نشان زدہ عبرت اثر تحریر تھی۔ اسما قادری کی گرداب حالات و واقعات میں جکڑی ہوئی قسط سے بھرپور تھی۔ ڈیڈ جوستے کی مختصر تحریر میری کرسمس دماغی خلل اور جرم پر مبنی تھی۔ محمد عفان آزاد قیمت لے کر آئے جس میں فرض شناس پولیس کانسٹیبل کی کارکردگی تھی۔ قتل کی گتھی کو سلجھا کر لیونارڈ اسمتھ نے ایک طرف سیٹر کی نظروں میں سرخروئی حاصل کی تو دوسری جانب نسل پرستی کے تفاخر کو زائل کیا۔ جستی مسکراتی مگر سبق آموز تحریر نیوائیر فول میں ہر دل عزیز رائٹر کاشف زبیر نے کہانی میں جلیل کے کارنامے سے معاشرے کے موضوع طلب پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ نجات مجھے اپنی عقل و سمجھ سے بالاتر لگی۔ باس اینڈریو کا اپنے ہاتھوں عجیب و غریب خاتمہ زندگی۔ جاسوسی کے ساتھ جس کا بے چینی سے انتظار ہوتا ہے، وہ ہے للکار لیکن مغل صاحب نراش کر رہے ہیں۔ جاسوسی کی خاص طرز کی کہانیاں جو جرم و سزا کے انوکھے اور چونکا دینے والے انجام سے سجی ہوتی ہیں انہی طرز میں موجود تحریروں بعد از مرگ، قیمت، مار آستین، خونی بار کو بہتر کہانیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ البتہ مغربی درآمد مثالی جوڑا میں قتل کی دہری واردات ہوئی اور مجرم سزا سے بچے رہے۔ مجھے کہانی کے اختتام پر حیرت ہوئی۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ محی الدین نواب قرنطینہ نئے سال کا تحفہ لے کر آئے۔ ہوس و زر کے لالچ کا بھیانک انجام بے شک ایسا ہی ہوتا ہے۔ دونوں رنگوں میں سے پہلا رنگ واقعی سبقت لے گیا۔“

ٹیکسلا سے دلنشین بلوچ کی خیریت ”شدید سردی اور دھند میں 6 جنوری کو دیدار یار سے مستفید ہوئے۔ پنک ربن سے بندھی 2013ء کی چین بہت ہی پیاری لگی۔ مشرقی حسینہ کی کاجل سے سجی آنکھیں، شفق لبوں کی مسکراہٹ اور بکھرے بالوں کی لٹیں... بہت پیارا ٹائٹل لگا لیکن ذرا سا نیچے نظر ڈالی تو محسن علی سوم صاحب ڈنڈے کی شدید ضرب سے نڈھال پڑے نظر آئے۔ بھئی محسن علی سوم اب یہ تو ہونا ہی تھا۔ آخر اتنی زبان چلانے کا انجام اور کیا ہو۔ آئندہ کسی کو کھنڈرات میں رہنے کا طعنہ دینا ہاہاہا... محفل یاراں میں قدم رکھا، ماشاء اللہ سب دوست موجود تھے لیکن حسنین بلوچ کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ جلد خیریت سے آگاہ کریں آپ۔ غزالہ بی بی! جب آپ محفل میں موجود ہیں تو میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیا؟ ثاقب تبسم نگینہ! اب بتا بھی دیں کہ یہ نگینہ کون ہے؟ محی الدین دلچسپ تبصرہ لائے۔ پیاری ماہ تاب گل! شادی کی ڈھیروں مبارک باد قبول کریں۔ ڈاکٹر انتظار مذیر مغل التعریف پر تحسین۔ اور ہمسایہ شہر کے ابن مقبول جاوید احمد صدیقی بڑے عرصے بعد آئے لیکن ہم سب نے آپ کو یاد رکھا۔ باقی افسردگی تو اب مزاج کا حصہ بن گئی ہے۔ اقرا! یا تو آپ نے میری محبوب مصنفہ صاحبہ کا نام بگاڑ کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس پر جلدی سوری کرو مریم کے خان صاحبہ سے بھی اور میرا دل دکھانے پر مجھ سے بھی، اس کے بعد دوستی پکی۔ سید شکیل حسین کاظمی! ایک راز کی بات تو بتاؤ آخر آپ اتنی بک بک کیسے کر لیتے ہو۔ کھاتے کیا ہو یقیناً بادام، جلد جواب دیں۔ اب کچھ تبصرہ اسٹوریز پر۔ سب سے پہلے دل کی دھڑکن للکار پڑھی جس کی خاطر ڈائجسٹ لیا جاتا ہے۔ سنسنی خیز ناول جو ہر ماہ ایک نشست میں ختم کر کے ہی چھوڑا جاتا ہے۔ ثروت کے یوں بدل جانے پر شدید ترین غصہ ہے۔ وہ اتنی کاکی ہے اچھے برے کی تمیز نہیں۔ غصہ تابش پر بھی ہے جو اسے یوسف کی اصلیت نہیں بتا رہا لیکن یہی تو محبت کے اصول ہیں۔ دوسرے نمبر پر گرداب پڑھی جو کہ اب نہایت بور اسٹوری ہے۔ اسما قادری صاحبہ بہت معذرت کے ساتھ کہوں گی کہ خدارا اسٹوری کو اسٹوری رہنے دیں فزکس، کیمسٹری جیسے بور سبجیکٹ نہ بنائیں۔ دسمبر میں بھی پوری اسٹوری نہ پڑھی اور اب جنوری میں بھی شروع کر کے چھوڑ دی۔ (ایسا بھی کیا؟) سرورق کا دوسرا رنگ پسندیدہ مصنفہ مریم کے خان کی تحریر زرگزیدہ فتنہ و فساد کی مثلث زن، زر، زمین کے گرد گھومتی تحریر جس نے اینڈ تک بھرپور سسپنس میں جکڑے رکھا۔ ڈائجسٹ بہت بہت لیٹ ملا۔ آج تک یہی پڑھ پائی ہوں۔ پھر خط کے شائع نہ ہونے کا خطرہ ہے۔ آخر میں تمام ادارے کو میری طرف سے نیا سال مبارک۔“

بنوں سے محمد ہمایوں سعید کی الجھنیں ”نئے سال کے پہلے سرورق پر ڈاکٹر انکل نے بلاشبہ اپنی تمام توانائیاں صرف کیں۔ دلکش حسینہ کا دلکش پوز بھی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ مگر صد افسوس۔ اب جاسوسی اتنا لیٹ ملتا ہے کہ سرورق کے لیے مخصوص ٹائم کونے میں دل پر اینٹیں رکھ کر کٹوتی کرنی پڑتی ہے۔ اداریے میں انکل ایک بار پھر تلقین کرتے نظر آئے کہ سدا بہار پاکستانی معصومیت سے جان چھڑاؤ اور اس بار عقل شریف کی مدد سے اپنا قیمتی ووٹ استعمال کرو۔ زیب برادر! بلاشبہ مغل صاحب محبت کے سفیر ہیں۔ ان کی ہر کہانی، ہر موڑ اور ہر ہر جملے سے محبتوں کی جو انوکھی شدت محسوس کی جا سکتی ہے، وہ شاید ہی کسی اور رائٹر سے نصیب ہو سکے۔ نگینہ صاحب! ڈاکٹر انتظار سے بھی شکر کے لیے اتنی منتیں مت فرمایئے۔ انہوں نے مریضوں کی یاد میں تڑپتے کلینک کے لگا تار بڑھتے ہوئے بجلی اور ٹیلی فون کے بل ہی بھیج دیے ہیں۔ اشفاق میاں! سلسلے وار کہانیوں کو طول ہی دیا جاتا ہے۔ اگر طول نہ دیا جائے تو وہ طویل سلسلہ وار کہانی کیسے کہلائے گی؟ ماہ تاب صاحب! اور کتنی مارکیٹنگ کروگی اپنے پروگرام کی۔ اور مجھے ان حضرات سے بھی دلی ہمدردی ہے جو آپ کی آواز مبارک سننے اور دل میں اتارنے کے لیے فون کر کے ریڈیو سنتے ہیں (آپ کیوں جل رہے ہیں؟) سوم صاحب! شرتی نخنوں والی حسینہ نے آپ پر اتنے بھرپور حملے کیے پھر بھی آپ سدھرے نہیں؟ کاظمی برادر! آپ کے شیکسپیئر نے آپ سے یہ نہیں کہا کہ میرا نام اور میرا حوالہ استعمال کرنے کے بجائے اپنی خودی کو اتنا بلند کرو کہ آسمان تم پر ناز کرے۔ ایم عزیز! میرے عزیز، خواتین کے کپڑوں کی نوعیت، ڈیزائن، کوالٹی اور برانڈ پر اتنی توجہ مت فرمایئے ورنہ وہ تم پر توجہ فرمانا چھوڑ دیں گی۔ تصویر العین صاحب نے صرف کترنیں پڑھ کر تبصرہ لکھ مارا۔ اعجاز برادر! گمشدہ یادوں سے نکل کر آگے دیکھیے۔ یقیناً بہت ساری خوشیوں کو اپنا منتظر پاؤ گے۔ ابتدائی صفحات پر ہی احمد اقبال کی کہانی خلل ہے دماغ کا توقعات پر پوری نہیں اتری۔ یا شاید احمد اقبال کے نام کی وجہ سے ہم نے کچھ زیادہ ہی امیدیں باندھ لی تھیں۔ مثالی جوڑا یہ سوچتے ہوئے اسٹارٹ کی کہ شاید یہاں کسی نادر و نایاب قسم کے مغربی جوڑے سے تعارف ہو۔ مگر ایسا کچھ بھی نظر سے نہیں گزرا۔ یہاں بھی مغربانہ مفادات سر فہرست رہے۔ بہرحال پرفیکٹ پلل متاثر کن کہانی رہی۔ کاشف زبیر نئے سال کے خاص تحفے نیوائیر فول کے ساتھ حاضر تھے۔ عقلمندوں کی سب سے بڑی بے وقوفی یہ تھی کہ انہوں نے جلیل کو فول بنانے کی کوشش کی۔ محی الدین نواب کی کہانی قرنطینہ خوب رہی۔ ورشا کا کردار بے حد پاورفل رہا۔ موہن بھائی جیسے کھلاڑی کو قرنطینہ میں گھیر کر ورشا نے اپنی ذہانت کا لوہا منوایا مگر شاید قرنطینہ سے نکلنا اس کے نصیب میں ہی نہیں تھا۔ بس یہی ہے زندگی اور یہی ہے دولت کی اہمیت، کاش ہم عبرت حاصل کر سکتے۔ مریم کے خان کی کہانی زرگزیدہ بھی توقعات پر پوری اتری۔ حیات کا بے لوث کردار بہت پسند آیا۔ نجات سمجھ میں نہ آنے والی کہانی تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے اپنی جان کیوں لی۔“

کورنگی کراچی سے شمس الحق کی حاضری "اس بار انتظار کی گھڑیاں 5 تاریخ پر ختم ہوئیں اور نئے سال کی نوید لیے تازہ شمارہ ہاتھوں میں آیا تو تشنگی کا اختتام ہوا۔ اس کو اپنے سینے سے لگائے دوڑتے ہوئے گھر پہنچے تو وہاں لائٹ ہی عرصہ دراز سے غائب تھی۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

سو ہم نے بھی صبح کا انتظار کیا اور آنکھ کھلتے ہی اپنے سامنے حسینہ پُرفتنہ کو دیکھا جو ترچھی نظروں سے اپنے حسن کا جادو چلا رہی تھی۔ پیچھے سے ہمیں گھورنے والے بندے کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ حسینہ سے اس کے یقیناً کچھ سمبندھ تھے۔ نیچے پڑا ہوا آدمی بھی اسی کی رقابت کا نتیجہ معلوم ہو رہا تھا۔ صدارت کی کرسی اس دفعہ زیب حسن کے نام ہوئی مبارک باد قبول کریں اور دوستوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ فوجی صابر علی صاحب غیر حاضر رہے۔ کہانیوں میں یقیناً سبھی پہلے للکار ہی پڑھتے ہیں۔ ہم نے بھی بسم اللہ وہیں سے کی۔ یوسف نے ثروت کو بہت بدظن کیا ہوا ہے۔ جاوا بھی وہاں پہنچ گیا اور اس نے بے چارے گوبند اور اس کی بھابی (جنلی) کو مار دیا، یوسف کو بھی مروا دیتے۔ عمران کے بغیر للکار پھیکی سی لگتی ہے۔ گرداب میں ریاض انور جیسے خبیث کی موت قابل ذکر ہے لیکن اسما صاحبہ سے التماس ہے کہ ملک کے دشمنوں کو اتنی سستی موت نہ مارا کریں۔ دوسری طرف شہریار دشمنوں کو آئینہ دکھانے انڈیا پہنچ گیا ہے۔ اگلی قسط کا بے قراری سے انتظار رہے گا۔ کاشف انکل کی نیو ارتول بھی اچھی کہانی تھی۔ جلیل کے لیے کارناموں نے ہمیں بے اختیار ہنسنے پر مجبور کیا اور ذہانت نے نورو بھائی کا نقصان ہونے سے بچا لیا۔ خلل ہے دماغ کا ایک منفرد سی کہانی تھی دنیا کے حالات اور انسان کا ذہن بہت جلد بدل جاتے ہیں۔ پہلے رنگ میں نواب صاحب کی تحریر دل کو بھا گئی۔ واقعی خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ سرور اکرام صاحب کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ مریم کے خان کا دوسرا رنگ بھی زبردست تھا۔ مختصر کہانیوں میں نشان زدہ، قیمت، نجات اور بعد از مرگ اچھی کہانیاں تھیں۔ میری کرسمس کوئی خاص پسند نہیں آئی۔"

ہیڈ بکائی سے مبشر حسن کا محبت نامہ "جنوری کا شمارہ 5 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل اچھا تھا اور صنف نازک پر مشتمل تھا۔ انکل جی کبھی صنف سخت کی بھی تصویر چھاپ دیا کریں۔ جب موسم سرد ہو اور ساتھ میں چائے ہو اور رات کا وقت ہو تو جاسوسی کا مطالعہ کرنا بہت ہی مزہ دیتا ہے۔ آج کے مشینی دور میں محبت کا ذریعہ جاسوسی ڈائجسٹ ہے۔ (یہ آپ کی محبت ہے) محفل میں زیب حسن صاحب بادشاہت کی نشست پر بیٹھے تھے۔ سرائے عالمگیر سے غزالہ بی بی بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں، اللہ خوش رکھے۔ راجن پور سے ماہتاب گل کے انکشاف پڑھے۔ باجی گل! آپ کی آواز سننے کے لیے بہت سے ایف ایم سنے مگر جاسوسی کے سوا آپ کو میں کہیں نہ پاسکا، چلیں اللہ آپ کو خوش رکھے۔ باقی تصویر الحسن، عباس یاسر، عزیز اسد اور ہما نظیر کے تبصرے جان دار تھے۔ اس مرتبہ کہانیاں بہت ہی اچھی تھیں۔ للکار نے تو چائے کے ساتھ مزہ دوبالا کر دیا۔ تابش بڑی خوب صورتی سے چکما دینے میں کامیاب ہوا اگر بی بی ثروت نے پھر اس کو قابو کر لیا۔ پتا نہیں کیوں لڑکیوں کے چکر میں مرد مارا جاتا ہے۔ چلو کوئی گل نہیں اللہ لکھاری کو ہمت دے پھر وہ نکال لے گا تابش کو... گرداب نے بھی خوب رنگ جما رکھا تھا۔ باقی خلل ہے دماغ کا، مار آستین اور مثالی جوڑا خوب تھیں واقعی جاسوسی کے لکھاری میں بڑی جان ہے اللہ ان کے قلم کو مزید ترقی دے۔ ہماری دعا ہے۔ تراش خراش بھی اچھی تھیں۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ میں جاسوسی کا مستقل لکھاری بننا چاہتا ہوں۔ امید ہے میرے خط کو ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں کریں گے۔"

پشاور سے عثمان غنی کا تبصرہ "جاسوسی ادارے سے وابستہ ہر فرد کو نیا سال مبارک ہو اور اللہ پاک سے یہی دعا ہے کہ نیا سال، ان سب دوستوں کے لیے بے شمار خوشیاں لائے۔ جاسوسی 7 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پر 2013ء کے بڑے بڑے حروف نے توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ ٹائٹل گرل بہت زیادہ پیاری تھی اور میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ یار ذرا انکل! یہ صنف کرخت! اتنے سنجیدہ اور دشمن ٹائپ کیوں بناتے ہیں۔ بھئی اگر کہیں تو اپنی کیوٹ سی پکچر بھجوا دوں۔ چیچی دان کے صوفہ خاص پر زیب حسن کو براجمان دیکھ کر خوش دلی سے انہیں ویلکم کیا۔ سید محی الدین اشفاق آپ نے جو باتیں کیں دل کو اچھی لگیں۔ جبکہ شمس الحق کی اداسی نے ہمیں بھی اداس کر دیا۔ ماہتاب گل! ہم نے آپ کے پروگرام کو سننے کی بہت کوشش کی مگر سوری ابھی تک سن نہیں پائے۔ ویسے آپ نے انکشاف زبردست کیا ہے۔ باقی یہ بھی تو بتا دیتیں آپ کہ وہ کیسے... ہیں۔ اللہ آپ کے نصیب بہت بہت اچھے کرے اور نئے سال اور آپ کی باقی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے۔ بلال لودھی! یہ تو اچھی بات ہے کہ ہم پشاور والے ایک ہی لائن میں نظر آگئے۔ ویسے آپ نظر نہیں آرہے ہیں۔ نجیم اللہ کو موسٹ ویلکم ان جاسوسی... پہلے ہم نے میری کرسمس پڑھی، اس کے بعد للکار کی طرف دوڑے۔ اس بار للکار کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں مگر ایک بات ہمارے ذہن میں کھٹک رہی ہے۔ جو بھی تابش اور ثروت کو پناہ دیتا ہے وہی ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ گرداب کا شہریار بھی دیوار پھلانگ کر پڑوسیوں کے گھر میں کود گیا ہے۔ ویسے اسما جی! شہریار کو چاہیے کہ فوراً عمران کی جگہ لے لے اور وہاں جا کر پہلے تابش اور ثروت کی بھرپور مدد کرے پھر ڈاکٹر کے مسئلے میں ٹانگ اڑائے۔ خلل ہے دماغ کا، احمد اقبال! آپ کی کہانی ہمیں ذرا بھی متاثر نہیں کر پائی۔ ایسے لگی جیسے بنا آواز کی کوئی مووی ہو۔ ویسے آپ کمال کے رائٹر ہو مگر کہانی میں چک کم تھی۔ خونی بار سیر یاراض! واؤ زبردست۔ مثالی جوڑا متاثر کن رہی مگر اینڈ پسند نہیں آیا۔ مغرب جھوٹ کا پلندا ہے اور وہاں ایسے کردہ لوگ ہی رہتے ہیں۔ بعد از مرگ میں شیری کی موت کے بعد شہرت کو دیکھ کر رشک آیا۔ نجات اچھی لگی۔ نیو ارتول، جلیل اور نازو نے اس بار ہمارا پکا دل جیت لیا۔ ویلڈن کاشف انکل یو آر گریٹ۔ مختار آزاد کی نشان زدہ، زبردست رہی۔ رنگوں میں پہلا رنگ قرنطینہ محی الدین نواب صاحب کا زبردست تھا۔ مجھے پورے ڈائجسٹ میں قرنطینہ کی ورشا اور سوہنی اور کشور کی مکاریاں و عیاریاں بے حد پسند آئیں۔ (حیرت ہے۔ کسی کو مکاریاں اور عیاریاں بھی پسند آتی ہیں) اور قرنطینہ دل کو چھوتی ہوئی تحریر تھی۔ دوسرا رنگ ہماری من پسند رائٹر مریم کے خان کا لکھا ہوا تھا۔ مریم کے خان کا فن میرے دل میں ابھی تک تازہ ہے۔ زر گزیدہ میں شہزادی کی موت کا ہمیں بھی دکھ ہوا۔"

مصدق محمود دانش گاؤں کنگ سہالی ضلع گجرات سے خفا خفا کرتے ہیں "جاسوسی احباب کی خدمت میں محبت بھرا اسلام عرض (خفا کر کے) اور

پرانے ساتھیوں نوشی چودھری، بلیک زیرو اور عبدالمغنی جی وغیرہ کو صدائے بحضور نامہ۔ (لوٹ آؤ نا) 6 جنوری کی کپکپاتی اور کہر میں لپٹی سہ پہر کو عرفان نیوز ایجنسی منگووال سے جاسوسی خریدا، تو گویا سردی میں ٹھٹھرتے دل بے قرار کو قرار آگیا (خفا کر کے)۔ سال نو کا پہلا شمارہ حسب معمول تین افراد کی نشست تھا۔ یعنی ایک انار دو بیمار کے مصداق۔ مسٹر جاسوسی زرد چہرہ لیے نہ جانے کس سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ولن نما شخص لکڑی کی ضرب کھائے اگلے جہاں کی تیاری کر گیا تھا۔ خوب صورت رہن سنگھی کا بوجھ سنبھالے ہوئے تھا۔ یہ منظر فل فرضیات کا شاہکار تھا۔ سرورق کے بعد چینی کم مرچ مسالے زیادہ والی محفل یعنی چٹکی نکتہ چینی میں زیب حسن کی فرمائش کو انکل جی نے پورا کر دیا۔ تبصرہ جاندار تھا۔ مبارکاں۔ موصوف کا شاعر ہونا بھرا ہونا، دل خوش کر گیا۔ باقی خطوط میں شمس الحق کی اداسی، غزالہ بی بی کا اظہار تشکر۔ اقرا بانو کی دو باتیں اور بلال لودھی کا انداز پسند آیا، خفا کر کے۔ ہما نظیر صاحبہ اتنی چھوٹی جسارت نہیں کرتے۔ کرنی ہو تو بڑی کرتے ہیں۔ خفا کر کے۔ کہانیوں میں احمد اقبال کی خلل ہے دماغ کا بور کہانی تھی مگر جمال کا کردار غیر معمولی لگا۔ اسما قادری کی گرداب پسندیدہ کہانی ہے مگر اس بار مصنفہ شاید تھک گئی ہیں جو پھسپھسی چال کہانی کو چلایا۔ للکار میں عمران کے ہنگامے جاری ہیں۔ جاوا کو مزید سبق لے گا، خفا کر کے۔ اس بار سرورق کے دونوں رنگ شوخ تھے اور ان میں دوسرا رنگ مریم کے خان کا زر گزیدہ زیادہ پسند آیا اور سوہانہ اور حیات کا ملن باعث خوشی تھا۔ مختصر کہانیوں میں نیو ارتول ہنسی کی سوغات لیے ہوئے تھی، پسند آئی۔ مثالی جوڑا بھی حقیقت کے رنگ میں سموئی ہونے کی وجہ سے اچھی لگی۔ اوور آل جاسوسی مزے کا تھا۔"

عبدالمنان چوچک کی اوکاڑہ سے شمولیت "تقریباً سات سال سے جاسوسی ڈائجسٹ کا مستقل قاری ہوں۔ جنوری کا شمارہ 5 تاریخ کو مل گیا لیکن لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے 6 کی رات کو پڑھا کیونکہ رات کو پڑھنے کا اپنا ہی مزہ ہے اس لیے ایک دن کا انتظار کیا۔ سب سے پہلے سرورق کی حسینہ کی طرف دیکھا جو اس طرح سے دیکھ رہی تھی جس طرح شکیل کاظمی کی پڑوسن ان کو دیکھتی ہے اور وہ اس کی نظروں کا شکار ہو کر اس طرح گر جاتے ہیں جس طرح سرورق پر آدمی گرا پڑا ہے۔ میں بھی کاظمی صاحب کی طرح حسینہ کی نظروں کا شکار نہیں ہونا چاہتا اس لیے لاحول ولا پڑھتے ہوئے آگے کی طرف سفر کیا اور فہرست میں پہنچے تو تمام معروف لکھاریوں کے نام دیکھے تو پہلا خیال ہی یہ تھا کہ اس دفعہ تو کوئی کسر باقی نہیں رہی ہوگی۔ اپنے مطالعے کی گاڑی کو آگے کی طرف بڑھایا اور محفل چینی پر بریک لگائے اور انکل کی ہدایت لیتے ہوئے یعنی کہ ووٹ کا صحیح استعمال کریں۔ کسی ایسے لیڈر کو ووٹ دینا چاہیے جو عوام کا اصل نمائندہ ہو اور عوام کی پریشانیوں کو اپنی پریشانی سمجھے۔ کرسی صدارت پر لاہور سے زیب حسن براجمان تھے۔ مبارک باد قبول کیجیے۔ زیب صاحب نے شاعری کا تڑکا لگایا تو ان کی بغل سیٹ پر بیٹھے ثاقب تبسم نگینہ صاحب نے کہا ہم کسی سے کم ہیں کیا اور انہوں نے بھی شاعری شروع کر دی۔ ویسے دونوں حضرات کے شعر کمال کے تھے، پسند آئے۔ اب آتے ہیں اسٹوریز کی جانب۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ مغل صاحب! کیا بات ہے آپ کے ہاتھ چومنے کو دل کرتا ہے۔ کیا شاہکار تخلیق کیا، لاجواب۔ اس دفعہ کی اسٹوری میں سنگھ فیملی کے افراد کی موت پر اس طرح افسوس ہوا جس طرح حقیقی زندگی میں کسی وفات پر ہوتا ہے۔ ویسے عمران اس جگہ ہوتا تو وہ اس کا حل ضرور نکالتا، پوری قسط نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ اسما صاحبہ نے درمیان والی اقساط میں تو اتنے زیادہ کرداروں میں الجھائے رکھا کہ کہانی بور ہو گئی تھی لیکن اب دوبارہ اچھی ہو گئی ہے۔ احمد اقبال کی خلل ہے دماغ کا بہت پسند آئی۔ ویسے احمد صاحب کی کہانیوں کا اختتام اکثر افسردہ ہوتا ہے لیکن اس دفعہ اس کے برعکس تھا، پسند آئی۔ اس کے بعد نواب صاحب کی قرنطینہ پڑھی، مجھے نواب صاحب کے لکھنے کا اسٹائل پسند نہیں ہے لیکن ان کی ہر اسٹوری کا مرکزی خیال کمال کا ہوتا ہے۔ دوسرا رنگ مریم صاحبہ کا زر گزیدہ پڑھی۔ مجھے جلد پتا چل گیا تھا کہ قتل میں شکیلہ کا ہاتھ ضرور ہے، نائس مریم جی۔ نیو ارتول کاشف صاحب جلیل کے نئے کارنامے کے ساتھ موجود تھے۔ کچھ عرصے سے جلیل کے کارنامے اتنا مزہ نہیں دے رہے تھے، اس دفعہ کمال تھا۔ جلیل نے مکمل کیس حل کر کے دے دیا اور پیسے بھی بچا لیے۔ اس کے ساتھ زندگی کے پہلے خط جو کسی بھی رسالے میں بھیج رہا ہوں، اس امید پر کہ آپ کے قیمتی صفحات پر جگہ مل جائے، مایوس نہیں کریں گے۔" (یقیناً نہیں)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

ایم عزیر اسد، چکوال۔ انجم فاروق ساحلی، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ اصل یاد آفریدی، جگہ نامعلوم۔ علی فیض رسول وڑائچ، سینٹرل جیل بہاولپور۔ رانا فیصل جاوید، مظفر گڑھ تحصیل علی پور۔ رحمن خان، جگہ نامعلوم۔ قمر تقی، راولپنڈی۔ ہادیہ، فیض پور۔

اپنا قیدی

ایچ اقبال

چہروں کے حسن و جمال کا جال دل پھینک پنچھیوں کو آسانی سے جکڑ لیتا ہے... صورت کا فریب کھانے والوں پر جب سیرت کے الجھے الجھے بھید کھلتے ہیں تو ہر زخم روح کی گہرائیوں تک اترتا چلا جاتا ہے— یہ اسی وقت ہوتا ہے جب ایک فریق مخلص اور دوسرا فریب کار ہو مگر جب دونوں ہی ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہوں تو کہاں کا زخم اور کہاں روح کی گہرائی... اپنے اپنے راستوں پر سفر کرنے والوں کو یہ یاد نہیں رہتا کہ وفا پر خنجر زنی کا انجام انہیں کہاں تک لے جا سکتا ہے ... کہیں نہ کہیں جرم ایک بھیانک خواب کی طرح سامنے آجاتا ہے ... من پسند گلابوں میں کھیلنے والوں کو کانٹے چبھنے لگتے ہیں تو ان کی خود ساختہ تصویریں دھندلانے لگتی ہیں، پُرجوش خلوتیں آسیب زدہ تنہائیوں میں بدل جاتی ہیں— جرم اور پھر احساس جرم ہر سانس کا عذاب بن جاتا ہے اور اس کی کوکھ سے وہ کچھ جنم لیتا ہے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتا...

سہ پہر کا وقت تھا۔ پارس بستر پر لیٹی ٹی وی کی اسکرین پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ ایک چینل خبریں نشر کر رہا تھا۔ پارس کو سیاسی معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا اس لیے سیاسی خبروں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اس وقت کوئی سیاسی خبر نہیں، ٹارگٹ کلنگ کے ایک واقعے کی رپورٹ نشر کی جارہی تھی۔ وہ خبر پارس ایک گھنٹے قبل بریکنگ نیوز میں سن چکی تھی۔ اس خبر کے مطابق قومی اسمبلی کے ایک رکن کو اس وقت گولی ماردی گئی تھی جب وہ ایک لنچ میں شرکت کرنے کے بعد میزبان کے گھر سے نکل کر اپنی کار میں بیٹھنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ باڈی گارڈز کے علاوہ بھی کچھ لوگ اس کے ساتھ تھے مگر گولی صرف رکن اسمبلی خواجہ ناصر بیگ کے سر میں لگی تھی۔ اگرچہ اسے فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا تھا لیکن اس کی زندگی کا چراغ اسی وقت گل ہو گیا تھا جب گولی اس کے سر میں پیوست ہوئی تھی۔ فوری طور پر معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی تھی اور کس نے چلائی تھی۔

بریکنگ نیوز کے آدھ گھنٹے بعد خبروں میں ایک بڑے پولیس افسر کو میڈیا کے لوگوں سے گفتگو کرتے دکھایا گیا۔ اس نے بتایا کہ ابتدائی تفتیش کے مطابق خواجہ ناصر بیگ کو دور مار رائفل سے نشانہ بنایا گیا تھا۔ ٹیلی اسکوپ کے ذریعے
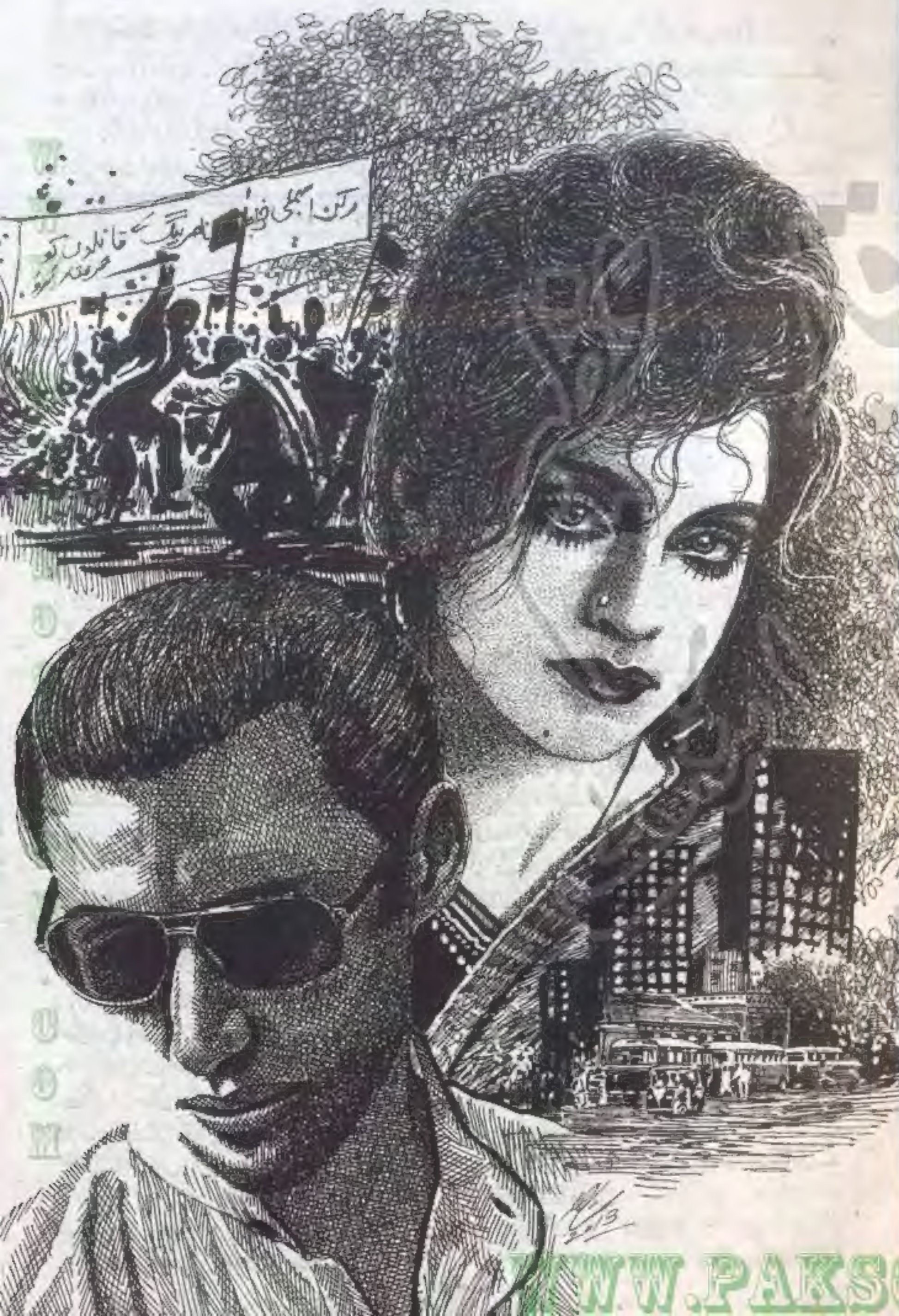
ایسا کیا جاسکتا تھا۔ قاتل اتنا ہی سچا نشانے باز تھا کہ اس نے صرف ایک ہی گولی چلائی تھی جو خواجہ ناصر بیگ کے سر میں لگی اور وہ فوراً جاں بحق ہو گیا۔

وہ گولی کسی دور کی عمارت سے ہی داغی گئی ہوگی لیکن دور کی ساری عمارتوں پر چھاپے مارنے کا پولیس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آتی، تبھی معلوم ہوتا کہ گولی کس زاویے سے سر میں پیوست ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا کہ گولی لگتے وقت خواجہ ناصر بیگ کی پوزیشن کیا تھی۔ اس کے بعد ہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کون سی عمارت یا کون سی دو تین عمارتیں مشکوک ہو سکتی ہیں۔ یہ بات البتہ طے پا چکی تھی کہ گولی خاصی بلندی سے چلائی گئی تھی۔

اب پارس تیسری مرتبہ خبروں میں وہ فوٹیج بھی دیکھ رہی تھی جو وہاں کہیں لگے ہوئے سرکاری کیمرے کی تھیں۔ اس وقت خواجہ ناصر اپنے ساتھ چلتے ہوئے میزبان سے ہنستے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا جب یکایک اس کے جسم نے جھٹکا کھایا۔ اس کی پیشانی سے ابلنے والے خون کی نشاندہی کے لیے چینل والوں نے اس کے گرد دائرہ بھی بنا دیا تھا اور نیوز ریڈر اس کے بارے میں وضاحت کر رہی تھی۔ گولی کھا کے خواجہ ناصر بیگ فوراً ہی زمین پر گرا تھا۔ افراتفری مچ گئی تھی لیکن باڈی گارڈز نے خواجہ ناصر بیگ کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔

تصویر میں گولی چلنے کی آواز شامل نہیں تھی۔ بہت دور سے گولی چلنے کی آواز بھی مدھم طور پر سنائی دینا چاہیے تھی لیکن ایسا نہ ہونے کے باعث یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا تھا کہ رائفل پر غالباً سائلنسر بھی فٹ ہوگا۔

اس کے بعد ٹی وی پر اس قتل کے بارے میں سیاست دانوں اور صحافیوں کے تبصرے شروع ہو گئے۔ پارس ان قیاس آرائیوں کو اہمیت نہیں دیتی تھی اور اس کے خیال کے مطابق چینل والے ایسی کوئی خبر مل جانے کے بعد زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے اور زیادہ سے زیادہ سنسنی پھیلانے کا موقع اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

پارس نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بج چکے تھے۔ وہ بستر سے اٹھی اور سوچتی ہوئی کچن کی طرف بڑھی کہ آج سفیان کو دفتر سے آنے میں کچھ دیر ہو گئی ورنہ فوری طور پر چائے نہ ملنے کے باعث اس پر جھنجلاہٹ طاری ہو جاتی۔ وہ دفتر سے آکر چائے کا ایک گھونٹ لینے کے بعد ہی اپنے کپڑے تبدیل کرنے یا کسی اور کام کی طرف متوجہ ہوتا تھا اور اس کام کے دوران میں چائے کے گھونٹ لیتا رہتا تھا۔

پارس اس کا خیال رکھتی تھی لیکن اس خبر کی وجہ سے اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے کچن میں جا کر چائے بنانے کی تمام تیاری مکمل کر لی۔ عموماً وہ یہی کرتی تھی۔ پھر جب کال بیل کی آواز سنائی دیتی تھی تو وہ پھرتی سے چولہا جلا کر اس پر چائے کا پانی رکھنے کے بعد دروازہ کھولنے جاتی تھی۔

سفیان کی آمد کا وقت مقرر تھا۔ وہ اس وقت سے بس دو تین منٹ پہلے یا دو تین منٹ بعد آجاتا تھا۔ اس کی چھٹی ساڑھے چار بجے ہوتی تھی۔ بیس پچیس منٹ میں وہ گھر پہنچ جاتا تھا۔ دفتر اور گھر کے درمیان ایسے راستے نہیں تھے جہاں کسی بھی وقت ٹریفک جام ہوتا ہو اور جس کی وجہ سے لوگوں کو کہیں آنے جانے میں تاخیر ہوتی ہو۔

پارس نے چائے کی تیاری مکمل کر لی مگر کال بیل کی آواز اب بھی نہیں آئی۔

آج اتنی دیر کیوں ہو گئی؟ پارس سوچتی ہوئی کچن کے کچھ اور کاموں میں مصروف ہو گئی۔ اس کی ذہنی رو سفیان سے ہٹ کر ٹی وی سے نشر ہونے والی خبر کی طرف چلی گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس قسم کے قتل کرائے کے قاتلوں سے ہی کرائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے کئی پیشہ ور قاتلوں کو خود پارس بھی جانتی تھی۔ اس کے تعلقات کا دائرہ اتنا ہی وسیع تھا کہ وہ تقریباً ہر قسم کے بہت سے لوگوں کو جانتی تھی۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جنہیں معاشرے میں ”معزز“ سمجھا جاتا تھا لیکن پارس جانتی تھی کہ وہ درِاصل کیا تھے۔

اتنی واقفیت کا سبب یہ تھا کہ پارس ایک ماڈل گرل تھی۔ وہ خوب صورت بھی تھی لیکن نہ جانے کیوں ماڈل گرل کی حیثیت سے کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اس پیشے کو اپنانے سے اس کو بس اتنا فائدہ ہوا تھا کہ اشتہاروں میں اسے دیکھ کر بہت سے لوگ اس کی خوب صورتی سے متاثر ہوئے تھے اور انہوں نے اسے اپنے قریب کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی لیے پارس کے ”شناساؤں“ کا حلقہ بڑھتا چلا گیا تھا اور اس کے بینک اکاؤنٹ کی ”صحت“ بھی بہتر ہوتی رہی تھی۔

سفیان سے اس کی شادی کو ابھی صرف پندرہ دن گزرے تھے۔ مالی اعتبار سے سفیان آسودہ حال تو یقیناً تھا لیکن وہ آسودہ حالی پارس کے لیے کچھ پُرکشش نہ تھی۔ اس نے ایک خاص سبب سے سفیان کو گھیرا تھا اور اسے شادی کے مرحلے تک لے آئی تھی۔

☆☆☆

سفیان غیر معمولی وجاہت کا مالک تھا۔ وہ کہیں سے بھی

گزرتا تو بعض لڑکیاں اسے چور نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ سفیان اس سے یہ فائدہ بھی اٹھاتا تھا کہ جو لڑکی خود اسے پسند آجاتی تھی، اسے وہ اپنے قریب آنے کے مواقع بھی فراہم کر دیتا تھا۔ حقیقتاً بقول کسے، اس کا مزاج لڑکپن سے ہی عاشقانہ تھا۔ اسے کسی لڑکی کے پیچھے لگنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ لڑکیاں ہمیشہ خود ہی اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر نے سفیان سے شادی بھی کرنا چاہی تھی لیکن سفیان اس کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی زندگی ایک ایسے بھونرے کی سی تھی جو ہمیشہ کے لیے کسی ایک پھول کے رس پر اکتفا نہیں کرتا۔ سنجیدگی سے اسے صرف ایک لڑکی سعدیہ سے محبت ہوئی تھی۔ وہ اس سے شادی بھی کر لیتا مگر اپنی افتادِ طبع کے باعث وہ پارس کے جال میں پھنس گیا۔

پارس سے اس کی پہلی ملاقات ایک فنکشن میں ہوئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ پارس اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ پارس کی خوب صورتی اور خصوصاً اس کے جسمانی خدوخال کے باعث سفیان کے دل میں بھی اس کی خواہش نے انگڑائی لی تھی کہ وہ پارس کا قرب حاصل کرے۔ اس نے اپنی دانست میں پارس کو اپنے قریب آنے کے مواقع بھی فراہم کیے جبکہ پارس خود بھی یہی چاہتی تھی۔ خواہش دونوں طرف تھی اس لیے مراسم تیزی سے بڑھے۔ سفیان نے یہ احتیاط ضرور برتی کہ ان کی ملاقاتیں لوگوں کے علم میں نہ آئیں۔ پارس کیونکہ ماڈل گرل تھی اس لیے اس سے سرِعام ملاقاتیں سفیان کی بدنامی کا سبب بنتیں جس سے اس کی ملازمت پر بھی آنچ آنے کا اندیشہ تھا۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔

ان کی ملاقاتیں خفیہ ضرور ہوتی تھیں لیکن کسی چار دیواری کی تنہائی میں نہیں ہوئی تھیں۔ سفیان کی خواہش تھی کہ پارس کو اپنے اس فلیٹ میں لے جائے جہاں وہ کبھی کبھی جاتا تھا تو شناسا لڑکیوں میں سے بھی کسی کو وہاں بلا لیتا تھا۔

”تنہائی... اور ایسی تنہائی...“ ایک دن پارس نے ہنس کر کہا تھا۔ ”تو یقین کرو کہ میرا اپارٹمنٹ بہت خوب صورت ہے۔ تم داد دو گے کہ میں نے اسے بڑے رومانٹک انداز میں ڈیکوریٹ کیا ہے۔“

سفیان کو کسی رومانٹک ڈیکوریشن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو بس کسی چار دیواری میں پارس سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔ وہ ایک رات چھپ چھپا کر پارس کے اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔

پارس کا بیڈ روم واقعی غیر معمولی انداز کا تھا۔ سفیان کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی آئینہ خانے میں آگیا ہو۔

پارس کو اس کی آمد کے وقت کا علم تھا اس لیے اس نے نہایت اعلیٰ درجے کے مشروب اور اس کے لوازمات کا بندوبست کر رکھا تھا۔

سفیان نے اعتدال سے پینے میں کبھی کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔ وہ اپنے خاص فلیٹ میں کسی کے ساتھ ہوتا تھا تو پیتا ہی تھا مگر اس رات وہ معتدل رویے پر قائم نہیں رہ سکا۔

ایک طرف حسن کا اصرار مگر مجبوبانہ گریز اور اس کے سبب سے دوسری طرف نفسانی شدت جس میں بہ تدریج اضافہ... نتیجہ یہ کہ سفیان بہت زیادہ پی گیا۔ اتنی زیادہ کہ اسے اپنا کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔

صبح وہ دیر سے اٹھا۔ اس دن چھٹی تھی ورنہ وہ خاصا پریشان ہو جاتا۔ اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد بھی ہو رہا تھا کیونکہ پہلے کبھی اس نے اتنی زیادہ نہیں پی تھی۔ اتنی زیادہ پی جانے کے باعث اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ جب وہ جوشِ جذبات میں تھا تو پارس نے اس سے چند سطروں کی ایک تحریر بھی لکھوا لی تھی۔ جاگنے اور ہوش میں آنے کے بعد بھی اسے یاد نہیں آیا کہ اس نے پارس کو کسی قسم کی تحریر دے دی تھی۔

آئندہ دو ڈھائی ماہ میں ان کی دو مزید ملاقاتیں بھی اسی طرح ہوئیں۔ فرق بس یہ رہا کہ سفیان نے زیادہ پینے سے گریز کیا اور پارس نے بھی پہلی مرتبہ کی طرح اصرار نہیں کیا۔

ان ملاقاتوں کے بعد ایک روز سفیان کے سر پر جیسے ایک بم پھٹ پڑا جب پارس نے اسے بتایا کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ سفیان کو اس خیال سے غصہ آگیا کہ پارس کسی اور کا کیا دھرا اس کے سر تھوپنا چاہتی ہے۔ یہ وہ جانتا ہی تھا کہ پارس کے تعلقات اوروں سے بھی تھے۔ جب وہ بپھرا تو پارس نے اس کی چند سطری تحریر کی فوٹو اسٹیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔

سفیان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اپنی تحریر اس نے پہچان لی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔ ”پارس! اگر تم میری وجہ سے ماں بنیں تو میں تم سے شادی کر لوں گا۔“

”یہ تحریر میں نے تم سے پہلی ہی رات کو لے لی تھی۔“ پارس نے آبدیدہ ہو کر مغموم لہجے میں کہا۔ ”میں جیسی بھی ہوں سفیان لیکن تم سے واقعی محبت کرتی ہوں اور اسی محبت کی وجہ سے میں یہ بچہ ضائع تو ہرگز نہیں کرواؤں گی۔“

سفیان اس کی اداکاری سے بھی متاثر نہیں ہوا اور اس

بات پر ڈٹا رہا کہ پارس کسی اور کا کیا دھرا اس کے سر تھوپنا چاہتی ہے۔ اس پر جب پارس نے ڈی این اے ٹیسٹ کی تجویز پیش کی تو سفیان حواس باختہ ہو گیا۔

پارس یہ تجویز پیش کرتے ہوئے بڑی پُراعتماد تھی۔ ادھر سفیان کے دل میں یہ خوف بھی سنستا گیا تھا کہ پارس کے پاس موجود اس کی تحریر بھی اس کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔ ڈی این اے ٹیسٹ کروانے میں بھی بدنامی یقیناً ہوتی لیکن پارس کے مضبوط لہجے کی وجہ سے اسے یقین آ گیا کہ پارس سچ بول رہی ہے۔

پارس نے روتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اگر سفیان اسے اپنی ساری زندگی کا شریک نہیں بنانا چاہتا تو فی الحال اس سے شادی کر لے اور بچے کی پیدائش کے بعد اسے طلاق دے دے۔

سفیان کے لیے یہ بھی پریشان کن بات تھی کیونکہ ایک ماڈل گرل سے شادی کے بعد وہ بدنام ہو جاتا۔ بات اس کے محکمے تک بھی پہنچتی جس کے منفی اثرات اس کی ملازمت پر بھی پڑ سکتے تھے۔

اس کے یہ اندیشے پارس نے یہ کہہ کر دور کیے کہ شادی خفیہ طور پر بھی کی جاسکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دونوں کسی پبلک پلیس پر بھی ایک دوسرے کے قریب نہ ہوں۔ ایک دوسرے سے بات بھی نہ کریں۔

سفیان نے بڑی بے بسی محسوس کی۔ اسے سعدیہ کا خیال بھی تھا جس سے اسے محبت تھی۔ اسے اگر سفیان کی شادی کا علم ہو جاتا تو اسے بہت تکلیف پہنچتی کیونکہ محبت تو وہ بھی سفیان سے کرتی تھی۔

مگر سفیان جس صورتِ حال میں پھنس گیا تھا، اس سے فرار کی اسے کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے پارس سے شادی کرنا ہی پڑی۔ سب کچھ بہت خفیہ طور پر ہوا۔ وہ پارس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں رہتا تو بات جلدی کھل جانے کا اندیشہ تھا اس لیے وہ پارس کو اپنے اپارٹمنٹ میں لے آیا جہاں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کے دور دراز کے کچھ عزیز تھے جو کسی اور شہر میں رہتے تھے۔ ان سے سفیان کا کوئی خاص ربط بھی نہیں تھا۔

کھانا پینا ہوٹل میں ہوتا تھا۔ ناشتا وہ فون کر کے ایک ہوٹل سے اپارٹمنٹ میں منگوا لیا کرتا تھا۔ اپارٹمنٹ کی صفائی ستھرائی کی زیادہ ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ ہفتے میں ایک مرتبہ ایک بوڑھی ملازمہ آ کر جھاڑ پونچھ کر جایا کرتی تھی۔ شادی کے بعد سفیان نے اسے فارغ کر دیا۔

پارس کو بھی اس پر اصرار نہیں تھا کہ گھر میں کوئی ملازم ضرور ہو۔ اس نے خود ہی ساری ذمے داری سنبھال لی۔ وہ کھانا پکانا بھی جانتی تھی۔ اس نے خود ہی بازار جا کر کچن کی ضروریات کا سارا سامان خرید لیا۔ سفیان اس کے ساتھ باہر نکلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

اس اپارٹمنٹ میں سعدیہ کبھی آتی ہی نہیں تھی۔ ان کی ملاقاتیں پارک یا ہوٹل میں ہوا کرتی تھیں، یا وہ سعدیہ کو اپنی کار میں لے کر لانگ ڈرائیو پر نکل جاتا تھا۔ اس نے کبھی سعدیہ کو اپنے اتنا قریب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی جتنا قریب وہ دوسری لڑکیوں سے ہوتا تھا۔

سعدیہ گریجویشن کرنے والی تھی۔ وہ گریجویشن کے بعد ہی سفیان سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ سفیان اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اسے دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ اپنے عاشقانہ مزاج اور آوارگی کی کہانیاں وہ سعدیہ کو سناتا رہتا تھا اور وہ ہنستی رہتی تھی۔ اسے کبھی یقین نہیں آ سکا تھا کہ سفیان ایسا ہوگا۔ وہ ان سب باتوں کو جھوٹ سمجھتی تھی اور سفیان اس سے کہا کرتا تھا کہ شادی کے بعد اسے ان باتوں کا یقین آ جائے گا لیکن پھر وہ یہ نہیں کہہ سکے گی کہ اسے دھوکا دیا گیا۔

☆☆☆

کال بیل کی آواز سنتے ہی پارس نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور تیزی سے دروازے پر پہنچی۔ اس نے اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”آج اتنی دیر...؟“

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ کیا گیا، اس نے خود ہی اپنی بات پوری نہیں کی کیونکہ سفیان اسے بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔

”خیریت؟“ پارس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر تیزی سے پوچھا۔

سفیان کوئی جواب دیے بغیر تیزی سے اندر آیا اور اتنی ہی تیزی سے قدم بڑھا کر لاؤنج کے ایک صوفے پر جا گرا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے گرا ہو۔ وہ اپنی پیشانی مسلنے لگا۔

پارس نے متعجب ہونے کے باوجود کہا۔ ”میں ابھی چائے لاتی ہوں آپ کے لیے۔“

”نہیں۔“ سفیان سر اٹھا کے بولا۔ ”میں چائے نہیں پیوں گا۔ ذرا بوتل نکال لاؤ بیڈ روم سے۔“

پارس کی حیرت میں اضافہ ہوا۔ سفیان صرف رات کے کھانے سے قبل دو پیگ لیا کرتا تھا۔

پارس خلجان میں مبتلا ہو گئی لیکن کوئی اور سوال کرنے کے بجائے اس نے کہا۔ ”ابھی آتی ہوں۔“

وہ تیزی سے کچن میں گئی۔ اوون بند کیا اور واپس لوٹی۔ اس دوران میں سفیان نے سگریٹ سلگا لی تھی اور اس کے گہرے گہرے کش لیتے ہوئے ٹہل رہا تھا۔

پارس بیڈ روم میں گئی۔ ٹی وی اس نے کھلا ہی چھوڑ دیا تھا جو اب بند کیا۔ شراب کی بوتل کے ساتھ پانی، آئس بال اور ایک گلاس ٹرے میں رکھ کر وہ واپس آئی۔

”کیا خبریں سن رہی تھیں؟“ سفیان نے پوچھا۔

”ذرا دیر پہلے سن رہی تھی۔ اب تو کوئی پروگرام چل رہا ہے۔ ٹی وی بند کر کے آئی ہوں۔“ پارس نے ٹرے تپائی پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

لاؤنج میں بھی ٹی وی تھا۔ سفیان نے اس کا ریموٹ اٹھاتے ہوئے پارس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”ڈرنک بنا دو... چاہو تو اپنے لیے بھی...“

”میرا موڈ نہیں ہے۔“ پارس نے کہا۔ وہ گلاس بھی ایک ہی لائی تھی۔

سفیان ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا۔ اس نے بار بار چینل تبدیل کیے۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی پروگرام چل رہا تھا۔ خبریں کسی چینل سے نشر نہیں ہو رہی تھیں لیکن یہ ”ٹکر“ ہر نیوز چینل پر چل رہا تھا کہ ایم این اے خواجہ ناصر بیگ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس سے متعلقہ باتوں کے ”ٹکر“ بھی چل رہے تھے۔

”لیں۔“ پارس نے گلاس سفیان کی طرف بڑھایا پھر بولی۔ ”آخر بات کیا ہے سفیان! آپ کے بال اتنے بکھرے ہوئے کیوں ہیں؟“

”ہوا سے۔“ سفیان نے جواب دیا اور ایک بڑا گھونٹ لے کر گلاس تپائی پر رکھ دیا۔

”ہوا سے کیوں؟... گاڑی کے شیشے بند نہیں کیے تھے کیا؟... اے سی میں کوئی خرابی ہو گئی؟“

”نہیں، میں ٹیکسی سے آیا ہوں۔“ سفیان نے جواب دیا اور ختم ہوتی ہوئی سگریٹ سے دوسری سگریٹ سلگانے لگا۔

”کیوں گاڑی میں کوئی خرابی ہو گئی کیا؟“

”نہیں۔“ سفیان نے جواب دیا اور گلاس اٹھا کر دوسرا گھونٹ لیا۔ اس کے بعد اس نے گلاس اپنے ہاتھ ہی میں رکھا۔ ”خبریں سنی تھیں تم نے؟“

”ابھی کچن میں جانے سے پہلے خبریں ہی سن رہی تھی۔ یہ جو ٹکر چل رہے ہیں، اسی کے بارے میں تھی خبر!“

”تفصیلات کیا بتائی گئی ہیں؟“

”کیا تم اسی کی وجہ سے پریشان ہو؟“ پارس نے جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

”میری بات کا جواب تو دو پارس!“ سفیان کے لہجے میں کسی قدر جھنجلاہٹ تھی۔

پارس نے پل دو پل کے لیے اس کی طرف غور سے دیکھا اور وہ سب کچھ بتانے لگی جو اس نے ٹی وی کی خبروں سے جانا تھا۔ اسی دوران میں سفیان نے تیسرا گھونٹ بھی لے لیا تھا جبکہ شراب پینے کے معاملے میں وہ اتنا تیز رفتار کبھی نہیں ہوتا تھا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ بے حد پریشان ہے۔ پریشانی ہی کی وجہ سے اس نے چائے کے بجائے شراب کا سہارا لیا تھا۔

”ہاں۔“ سفیان نے سب کچھ سن کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ٹیلی اسکوپ کے بغیر تو چار پانچ فرلانگ کے فاصلے سے اتنا صحیح نشانہ لیا ہی نہیں جاسکتا۔“

پارس چونکی۔ ”چار پانچ فرلانگ کی بات تو ٹی وی پر نہیں آئی، تمہیں کیسے معلوم؟“

یہ اس کی عادت تھی کہ سفیان کو مخاطب کرتے ہوئے کبھی ”آپ“ اور کبھی ”تم“ کہا کرتی تھی۔

سفیان نے کوئی جواب دیے بغیر ایک بڑا گھونٹ لیا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پارس اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔

”دراصل۔“ سفیان نے اس کی طرف دیکھے بغیر ٹہلتے ہوئے کہا۔ ”جب فائر کیا گیا اور جہاں سے کیا گیا، اس وقت میں وہاں موجود تھا۔“

”اوہ!“ پارس کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔ وہ سفیان کو تکتی رہ گئی اور چاہتی تھی کہ سفیان تفصیل سے سب کچھ بتائے۔

سفیان نے ایک اور گھونٹ لیا تو گلاس خالی ہو گیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ کر خود ہی دوسرا پیگ بنانے لگا۔ پارس اب بھی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سفیان نے دوسرے پیگ کا پہلا گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ ”یہ بوتل رکھ آؤ۔ سامنے رہے گی تو اور پی جاؤں گا۔ حالت کچھ ایسی ہی ہے اس وقت میری... لیکن مجھے اس قابل رہنا چاہیے کہ میں سوچ سمجھ سکوں۔“

پارس خاموشی سے اٹھی اور بوتل رکھ آئی۔ سفیان ایک اور سگریٹ سلگا رہا تھا۔ پھر وہ پیگ ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوا

اور ٹہلنے لگا۔
"وہ فائر۔" اس نے گم صم انداز میں کہنا شروع کیا۔ "رنگون والا بلڈنگ سے کیا گیا تھا جو میرے اندازے کے مطابق چار پانچ فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ تیسری منزل کی کھڑکی تھی۔ وہاں سے خواجہ ناصر بیگ کو نشانہ بنانا اس لیے ممکن ہوا کہ بیچ میں کوئی زیادہ بلند عمارت نہیں ہے۔ میں وہاں ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور پر رکا تھا۔ کار سے اترا بھی نہیں تھا کہ میری نظر اتفاق سے رنگون والا بلڈنگ کی تیسری منزل کی طرف اٹھ گئی۔ اس کے ایک فلیٹ کی کھڑکی میں مجھے وہ نظر آیا جو ٹیلی اسکوپ رائفل سے کسی کو نشانہ بنانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ خود کو آڑ میں رکھے، کسی کی نظر اس پر نہ پڑ سکے لیکن میں نے جس جگہ کار روکی تھی، وہاں سے کچھ ایسا زاویہ بنا کہ میں نے اسے دیکھ لیا۔ مجھے اس وقت یہ علم نہیں ہوسکا تھا کہ اس نے خواجہ ناصر بیگ کو گولی ماری تھی۔ یہ مجھے بعد میں ٹی وی کی خبروں سے معلوم ہوا۔ ویسے سوچا تو یہ بھی جاسکتا تھا کہ اس نے کسی اور کو گولی ماری ہو لیکن رنگون والا بلڈنگ کے اردگرد کے علاقے سے کسی اور قتل کی اطلاع نہیں آئی ہے۔ اسی وجہ سے میں سمجھا ہوں کہ اس کا ہدف خواجہ ناصر بیگ ہی تھا۔"

سفیان نے خاموش ہو کر ایک گھونٹ لیا۔ پارس بول پڑی۔ "لیکن اس واقعے سے آپ اتنے زیادہ پریشان کیوں ہیں؟"

سفیان نے ایک طویل سانس لی۔ "میں نے اپنے موبائل فون سے اس کی تصویر اس وقت اتار لی تھی جب وہ ٹریگر دبا رہا تھا۔ فائر کرنے کے بعد اس نے فوراً کھڑکی سے غائب ہوجانا چاہا۔ اس وقت اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے ٹیلی اسکوپ سے بھی میری طرف دیکھا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت میرے اوسان خطا ہوگئے تھے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں نے موبائل سے اس کی تصویر اتاری ہے۔ میں اس واردات کا عینی شاہد بن گیا۔ وہ ہرگز مجھے زندہ نہیں چھوڑتا۔ یہ خیال میرے دماغ میں بجلی کی طرح کوندا اور میں تیزی سے دروازہ کھول کر اپنی ہی کار کی آڑ میں ہوگیا۔ تم جانتی ہی ہو کہ میری کار لیفٹ ہینڈ ڈرائیو ہے۔"

"تم نے گاڑی تیزی سے کیوں نہیں دوڑائی؟" پارس بول پڑی۔

"اس طرح میں بچ نہیں پاتا۔ کار ایک فرلانگ آگے نکل جاتی تو بھی وہ مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے بالکل صحیح قدم اٹھایا تھا پارس!... کار کی آڑ لیتے ہوئے بعد میں فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لوگوں کے ساتھ شامل ہوا اور پھر تیزی سے اس گلی میں گھس گیا جو ڈپارٹمنٹل اسٹور کے برابر میں ہے۔ میں تیزی سے دوڑتا چلا گیا۔ اس طرح میں خود کو موت سے بچانے میں کامیاب ہوسکا۔"

"تمہاری کار...."

"وہ اب بھی وہیں کھڑی ہوگی۔" سفیان نے پارس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میری تاک میں ہوگا۔ میں کار لینے واپس جاؤں اور وہ مجھے ختم کردے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ وہاں خود نہ ہو، اس نے اپنے کسی ساتھی کو وہاں مامور کردیا ہو... یہ لوگ اکیلے تو نہیں ہوتے۔"

"تم نے اس کا چہرہ صاف دیکھ لیا تھا؟"

"اس وقت تو نہیں دیکھ سکا۔ وہ تیسری منزل پر تھا۔"

"تو پھر وہ بھی تمہیں نہیں پہچان سکا ہوگا۔"

"اس نے پہچان لیا ہوگا۔ اس نے مجھے ٹیلی اسکوپ سے دیکھا تھا لیکن اب تو میں بھی اسے پہچان چکا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ اب پہچان چکے ہو؟... تم نے ابھی یہ بھی کہا تھا کہ اس وقت تم اس کا چہرہ صاف طور پر نہیں دیکھ سکے تھے۔ تو اب کیسے پہچان چکے ہو؟"

سفیان گلاس خالی کرکے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس نے بہت تیزی سے پی تھی، شاید اسی لیے اس کی آنکھوں میں سرخی آگئی تھی لیکن نشہ اتنا نہیں ہوا تھا کہ وہ سوچنے سمجھنے کے قابل نہ رہتا۔ اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر کہا۔ "میں واقعی اسے پہچان نہیں سکا تھا لیکن دماغ میں یہ خلش رہ گئی تھی کہ اسے میں کہیں دیکھ چکا ہوں۔ اس کی تصویر بڑی کرکے دیکھنے سے میری خلش دور ہوسکتی تھی۔ وہاں سے میں ٹیکسی کرکے گھر آرہا تھا کہ راستے میں ایک سائبر کیفے پڑا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر اپنے موبائل کی تصویر کمپیوٹر میں ڈالی اور جب اسے بڑا کرکے دیکھا تو اسے پہچان گیا۔ اسی وقت سے میں اور زیادہ اعصابی دباؤ میں آگیا ہوں۔"

"کیوں؟ کون تھا وہ؟"

"حکومت اس کی تلاش میں ہے۔ اس کے سر کی قیمت دس لاکھ مقرر کی جاچکی ہے۔ اس کا نام تم نے بھی سنا ہوگا۔ پیشہ ور قاتل ہے۔ لنگڑا اسکندر کے نام سے مشہور ہے۔"

"اوہ!" پارس کے منہ سے نکلا اور پھر اس کا سارا جسم سنسنا گیا۔ بہت سے خیالات بھی اس کے ذہن میں چکرا گئے۔

سفیان اس کے چہرے کے تاثرات سے بے خبر کہتا رہا۔ "میری کار وہاں رات گئے تک کھڑی رہی تو پولیس اسے مشکوک سمجھ کر وہاں سے اٹھالے گی۔ کل وہ رجسٹریشن آفس سے بھی معلوم کرلے گی کہ وہ کار کس کی ہے۔ مجھ تک پہنچ جانا پولیس کے لیے ناممکن نہیں ہوگا لیکن اس کا مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔ رجسٹریشن آفس سے میرے بارے میں معلومات لنگڑا اسکندر بھی کسی ذریعے سے حاصل کرسکتا ہے۔ میرے لیے پریشانی کا سبب سکندر ہے۔"

☆☆☆

لنگڑے سکندر کا نام سنتے ہی پارس ہیجان میں مبتلا ہوگئی لیکن ہیجان کا سبب یہ نہیں تھا کہ سفیان ایک خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہوچکا ہے۔ اس کے برخلاف وہ لنگڑے سکندر کے لیے پریشان ہوگئی تھی جس سے اس کے تعلقات تھے۔

پہلے وہ سکندر ہی کے نام سے مشہور تھا لیکن ایک پولیس مقابلے میں ایک گولی اس کی بائیں ٹانگ کے گھٹنے کو چکنا چور کرگئی تھی۔ وہ گرفتار ہوگیا تھا۔ اسپتال میں اس کی ناکارہ ہوجانے والی ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے کاٹ دی گئی تھی۔ زخم مندمل ہوجانے کے بعد اسے جیل بھیج دیا گیا تھا۔ دو سال قبل کچھ جرائم پیشہ افراد نے جیل توڑ کر وہاں سے اپنے کچھ ساتھیوں کو فرار کرایا تو سکندر کو بھی وہاں سے بھاگنے کا موقع مل گیا جس کے بعد پولیس اسے گرفتار نہیں کرسکی تھی۔

اسی دوران میں سکندر نام کے ایک اور جرائم پیشہ شخص کی شہرت ہوگئی تھی اس لیے ان دونوں میں تمیز کرنے کے لیے پولیس نے اس کے نام کے ساتھ "لنگڑا" کا اضافہ کردیا۔ اخبارات میں اس کی کوئی خبر چھپتی تو "لنگڑا اسکندر" ہی لکھا جاتا۔

وہ نہایت قدآور اور نفسانی اعتبار سے ابنارمل ہونے کی حد تک طاقتور تھا۔ پارس اس کی داشتہ تھی۔ لنگڑا سکندر خیال رکھتا تھا کہ پارس اس کے بچے کی ماں نہ بننے پائے لیکن ایک مرتبہ کچھ گڑبڑ ہوگئی۔ سکندر نے چاہا کہ وہ اسے ضائع کروادے لیکن وہ اس عمل سے بہت ڈرتی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ اس عمل میں بعض اوقات عورتیں مر بھی جاتی ہیں۔ سکندر نے اسے سمجھایا کہ وہ اگر اس سے شادی کرے گی تو کسی نہ کسی دن اسے پچھتانا پڑے گا، وہ ایک بچے کی ماں بننے کے بعد بیوہ ہوجائے گی۔ سکندر کو اپنی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔

"مجھ جیسے لوگوں کی زندگی زیادہ نہیں ہوتی پارس!" اس نے کہا۔ "میں نے بہت سے لوگوں کی زندگی ختم کی ہے۔ کسی دن کوئی گولی میرا سینہ بھی چھید دے گی۔ اگر تو میری بات نہیں مان رہی ہے تو پھر ایسا کر کہ کسی کو پھانس کر اس سے شادی کرلے۔"

"میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی سکندر!"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ مجھے چھوڑ دے۔ بس شادی کرلے کسی سے... میں بھی ملتا رہوں گا تجھ سے... شادی سے کیا فرق پڑتا ہے... کئی شادی شدہ عورتیں ایسی ہیں جن سے میرے تعلقات ہیں۔"

پارس اس بات سے بے خبر نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ سکندر پر جان دیتی تھی جس کا سبب اس کی نفسانی ابنارملٹی تھی۔ وہ پارس کے لیے آسودگی کا سرچشمہ تھا۔ اسے مجبوراً سکندر کی بات ماننا پڑی اور اس نے سفیان کو اپنے جال میں لاکر اس سے شادی کرلی لیکن شادی کے ان پندرہ دنوں میں بھی وہ سکندر سے دو تین مرتبہ مل چکی تھی۔

"تم پولیس اسٹیشن کیوں نہیں گئے؟" اس نے سفیان کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "پولیس کو خبر تو دینا چاہیے تھی کہ ایم این اے کا قاتل کون ہے... یا تم نے کسی اور اہم شخصیت کو اطلاع دی ہے؟"

"کسی کو نہیں دی۔" سفیان نے متفکر لہجے میں جواب دیا۔ "ابھی مجھے مرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اطلاع دوں گا قانون کو تو عدالت بھی جانا پڑے گا۔ گواہی دینا پڑے گی اور ایسے معاملات میں گواہی دینے والے کو زندہ نہیں چھوڑتے، لنگڑے سکندر جیسے لوگ... ہماری پولیس اس قابل کہاں کہ گواہوں کو زندگی کی ضمانت دے سکے۔ سیکیورٹی بھی فراہم کریں تو اس پر بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ آئے دن ایسی خبریں سامنے آرہی ہیں کہ پولیس میں جرائم پیشہ افراد گھس آئے ہیں۔ ان میں سے کوئی لنگڑے سکندر کا آدمی بھی ہوسکتا ہے۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ پولیس سے رابطہ کروں۔"

اس تفصیلی جواب سے پارس نے سکون محسوس کیا۔ یہ اس کے لیے اطمینان بخش بات تھی کہ لنگڑے سکندر کے لیے فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پھر اسے کچھ خیال آیا تو وہ بولی۔ "ابھی تم نے بتایا ہے کہ رات گئے تک تمہاری کار وہاں کھڑی رہی تو پولیس کو شبہ ہوجائے گا اور وہ اسے اٹھالے جائے گی۔ پھر انہیں رجسٹریشن آفس سے معلوم ہوجائے گا کہ وہ تمہاری ہے۔ اس طرح وہ تم تک پہنچ جائیں گے۔"

"میں اسی بارے میں سوچ رہا ہوں۔ مجھے صبح تک کی مہلت تو ہے۔ صبح تک سوچ لوں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

آج رات مجھے نیند تو آنے کی نہیں۔ پولیس کے علاوہ لنگڑا سکندر خطرہ ہے میرے لیے۔ اسے بھی کل تک معلوم ہو جائے گا کہ وہ کار کس کی ہے۔ میرا چہرہ تو اس نے یاد رکھا ہوگا۔"

پارس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور سوچتی رہی۔ یہ تو وہ خود بھی چاہتی تھی کہ پولیس سفیان تک نہ پہنچ سکے۔ پولیس پہنچ جاتی تو پوچھ گچھ میں سفیان کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل سکتی تھی کہ پولیس کو اس کے بیان پر شبہ ہو جاتا اور پھر وہ آڑے ترچھے سوال کر کے اس سے حقیقت اگلوا سکتی تھی۔

"مجھے چابی دو کار کی۔" اس نے کچھ سوچ کر سفیان سے کہا۔

"کیوں؟" سفیان نے چونک کر پوچھا۔

"میں جا کے کار وہاں سے لے آتی ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔ اس طرح تو تم مجھے لنگڑے سکندر کے خطرے سے فوری طور پر دوچار کر دو گی۔"

پارس نہ جانے کیا سمجھی کہ اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

سفیان نے اس کی طرف دیکھے بغیر پیکٹ سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "خود لنگڑا سکندر یا اس کے آدمی اس وقت بھی میری کار کی تاک میں ہوں گے۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ اتنا موقع مل سکے گا کہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ سکو۔ اس کے بعد تمہیں گھیر لیا جائے گا۔ تمہیں ریوالور کی نال پر مجبور کیا جا سکتا ہے کہ تم ان لوگوں کو مجھ تک پہنچاؤ۔"

پارس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے سفیان کے پہلے فقرے سے کچھ اور ہی سمجھا تھا۔

"تو پھر؟" اس نے تشویش ظاہر کی۔ "کیا کرو گے اب؟"

"ابھی کہہ چکا ہوں کہ سوچنا ہے مجھے... ابھی تو رات بھی نہیں ہوئی۔ صبح تک کا وقت ہے میرے پاس... فی الحال تو میرے ذہن میں یہ خیال ہے کہ جب تک کوئی معقول تدبیر میرے ذہن میں نہ آ جائے، میں روپوش ہو جاؤں۔"

"یعنی... چلے جاؤ گے کہیں؟"

"ہاں۔"

پارس کے لیے یہ بھی پریشانی کی بات تھی۔ سفیان کسی وقت بھی لنگڑے سکندر کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔ ویسے تو لنگڑا سکندر پولیس کو مطلوب تھا ہی لیکن جب اسے ایک ایم این اے کا قاتل بھی سمجھ لیا جاتا تو پولیس کے علاوہ دیگر ایجنسیاں بھی اس کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتیں۔ پولیس سے بچنا تو اس کے لیے یوں آسان تھا کہ اس محکمے میں اس کے اپنے آدمی بھی موجود تھے۔ اگر پولیس کو کسی وقت اس کا سراغ مل بھی جاتا اور وہ اس کی قیام گاہ پر چھاپا مارتی تو وہ وہاں سے غائب ہو جاتا۔ پولیس میں موجود اس کے مخبر قبل از وقت اسے چھاپے کی اطلاع دے دیتے لیکن ایجنسیوں کے ملوث ہو جانے کے بعد سکندر کے لیے خطرات بہت بڑھ جاتے۔ پارس ہر قیمت پر سکندر کو اس خطرے سے بچانا چاہتی تھی۔ سفیان اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس سے شادی تو اس نے صرف اپنے بچے کی خاطر کی تھی۔ اگر وہ شادی کے بغیر ماں بنتی تو بدنام ہو جاتی۔ وہ ایک غیر اہم ماڈل گرل تھی لیکن اس قسم کی خبر اخبارات ضرور اچھالتے۔

"اچھا۔" وہ سفیان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ تم کوئی بہتر ہی فیصلہ کرو گے۔ تم سوچو، میں کچن میں جا رہی ہوں۔"

"کیوں؟"

"رات کے کھانے کی تیاری نہیں کروں؟"

"ہاں، یہ تو ہے۔ کھانا تو کھانا ہے۔ بھوکے پیٹ کچھ سوچنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ دونوں مل کر کچھ تیار کرتے ہیں۔ سوچتے سوچتے میرا دماغ دکھنے لگا ہے۔ اس بہانے تھوڑا سا ریلیکس ہو جاؤں گا۔" سفیان کھڑا ہوا۔

پارس کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کچن میں جا کر موبائل پر سکندر کو سفیان کے بارے میں اطلاع دے دے گی۔ سکندر یہ نہیں جانتا تھا کہ پارس نے کس سے شادی کی ہے۔ وہ اس کے شوہر کو دیکھنے کا خواہش مند بھی نہیں تھا۔ سفیان کو دیکھ کر، سے یہ خیال آ ہی نہیں سکتا تھا کہ پارس نے اسی سے شادی کی ہوگی۔ پارس اسے بتاتی تو وہ چونک جاتا اور یہ اطلاع ملنے پر خوش بھی ہوتا لیکن سفیان کی وجہ سے پارس وہ سب کچھ نہ کر سکی جو اس کے دماغ میں آیا تھا۔

کھانے کی تیاری میں رات ہو گئی۔

سفیان بولا۔ "پریشانی کی وجہ سے بھوک تو نہیں ہے لیکن جو کچھ کھایا جا سکے، کھا ہی لیا جائے۔ کھانے کے بعد چائے پی کر بھی تھوڑا سا سکون ملے گا۔"

"ایک دو پیگ اور پی لو فی الحال... کھانا بعد میں کھا لیں گے۔" یہ کہتے ہوئے پارس نے سوچا تھا کہ سفیان کو ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر جب وہ اس کے لیے کچھ لینے کے بہانے کچن میں جائے گی تو اسے سکندر کو فون کرنے کا موقع مل جائے گا لیکن اس کی یہ سوچ بھی بار آور نہیں ہو سکی۔

"نہیں، اب نہیں پیوں گا۔" سفیان نے کہا۔ "جب آیا تھا تو دماغ بہت منتشر تھا۔ اسی لیے پی لی تھی۔ اب سوچ سوچ کر کلی طور پر احساس ہو گیا ہے کہ صبح تک میرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

اپنی یہ کوشش ناکام ہونے کے بعد پارس کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ کھانا میز پر لگا دے۔ اس کام میں بھی سفیان نے اس کی مدد کی۔ پارس کو تنہا ہونے کا موقع نہیں ملا۔

کھانے کے بعد چائے پی کر دونوں خواب گاہ میں آ گئے۔ اس رات کھانا انہوں نے جلد ہی کھا لیا تھا۔ ابھی تو نو ہی بجے تھے۔

پارس بولی۔ "تم جو کچھ بھی سوچ رہے ہو، اس کا کچھ خاکہ تو ہوگا تمہارے ذہن میں... مجھے کچھ بتاؤ۔ ہو سکتا ہے، میں کوئی مشورہ دے سکوں۔"

"یہ بات ظاہر تو ضرور کروں گا کہ ایم این اے کا قاتل لنگڑا سکندر ہے۔" سفیان نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "ایسا نہ کرنے کی صورت میں میرے دماغ پر بوجھ رہ جائے گا لیکن مجھے اپنے تحفظ کے لیے بھی کوئی تدبیر سوچنا پڑے گی۔ اگر ایسی کوئی تدبیر صبح ہونے سے پہلے میرے دماغ میں نہ آ سکی تو گھر سے تو مجھے کہیں فرار ہونا ہی پڑے گا۔ روپوش ہونا ہی پڑے گا۔"

"مجھے اکیلا چھوڑ دو گے؟"

"مجبوری ہے پارس! لیکن میں موبائل پر تم سے رابطے میں رہوں گا۔ اگر آج رات نہیں تو آئندہ دو ایک دن میں مجھے کوئی تدبیر سوجھ ہی جائے گی۔ دو ایک دن تنہا گزار لو۔ پولیس آئے تو تم صرف اتنا ہی کہنا کہ میری کار کسی جگہ کچھ خراب ہو گئی تھی۔ میں ٹیکسی کر کے آیا تھا اور پھر کسی ضروری کام سے فوراً چلا گیا اور کار کی چابی تمہیں دے دی تھی کہ وہ کسی مکینک کو دکھا دینا۔ بیان میں یہ جملہ بھی ضروری ہے کہ میں جس کام سے گیا ہوں، اس کی نوعیت ایسی ہے کہ مجھے واپسی میں دو ایک دن لگ سکتے ہیں۔ ایک اور بیان یہ بھی دیا جا سکتا تھا کہ میں آج دفتر سے واپس ہی نہیں آیا لیکن اس عمارت میں رہنے والے کچھ لوگ مجھے دیکھ چکے ہیں۔ ممکن ہے پولیس کو ان سے یہ بات معلوم ہو جائے۔ اس صورت میں پولیس تمہارے پیچھے پڑ جائے گی کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا۔"

سفیان نے خاصی وضاحت سے سب کچھ سمجھایا۔ پارس وہ سب کچھ ٹھیک سے نہیں سن سکی۔ اس کا دماغ اس خیال میں الجھا ہوا تھا کہ سکندر کو جلد از جلد اطلاع دے۔ سفیان اگر صبح ہونے سے پہلے کہیں چلا جاتا تو اسے جلد از جلد تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔

سکندر یا اس کے کسی آدمی کے ہاتھوں سفیان کے قتل پر اسے کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ شادی سے اس کا جو مقصد تھا، وہ حاصل ہو چکا تھا۔ اب یہ بات کوئی نہیں کہتا کہ جس بچے کو اس نے جنم دیا، وہ ناجائز ہے۔

☆☆☆

آدھی رات گزر گئی۔ سفیان اپنی کلائی پیشانی پر رکھے، آنکھیں بند کیے سوچ میں غلطاں تھا۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ اس کی پریشانی کے باعث آج رات نیند پارس کو بھی نہیں آ سکے گی۔ یہ خیال اس کے دماغ میں نہیں آ سکا کہ پارس کو نیند نہ آنے کا سبب کچھ اور ہوگا۔

سفیان کو یہ خیال بھی تھا کہ اب ایک ماڈل گرل سے اس کی شادی کی بات بھی کھل جائے گی۔ وہ اس انکشاف سے بچنا چاہتا تھا مگر اچانک بدلنے والی صورت حال کے باعث اب اسے یہ سب کچھ گوارا کرنا ہی پڑتا۔

یکایک اس نے بستر میں کچھ حرکت محسوس کی۔ اسے خیال آیا کہ پارس بستر سے اٹھ رہی۔ اس نے آنکھیں ذرا سی کھولتے ہوئے دیکھا کہ پارس اپنی سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا موبائل بڑی آہستگی اور احتیاط سے اٹھا چکی تھی۔ سفیان نے پیشانی سے کلائی ہٹاتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ پارس نے بڑی پھرتی سے موبائل اپنے لباس میں چھپایا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سفیان اس کی یہ حرکت دیکھ لے۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی لیکن سفیان کو یہ بات کیونکہ عجیب سی لگی تھی اس لیے وہ انجان بن گیا۔

"سوری ڈیئر!" پارس نے اسے آنکھیں کھولتے دیکھا تو جلدی سے بولی۔ "میں ذرا واش روم جا رہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم ڈسٹرب ہو، اس لیے ذرا آہستگی سے اٹھ رہی تھی۔"

سفیان کو یہ بات بھی عجیب لگی کہ واش روم جاتے ہوئے پارس نے موبائل بھی اپنے ساتھ لے جانا ضروری سمجھا لیکن سفیان نے اپنے چہرے سے تعجب کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

"اچھا!" سفیان نے سرسری انداز میں کہہ کر کلائی اپنی پیشانی پر اس طرح رکھی کہ آنکھیں بھی تھوڑی سی دب جائیں۔ اس نے پلکوں کے بیچ میں ہلکی سی درز قائم رکھی تھی۔ اس نے پارس کو باتھ روم کی طرف بڑھتے دیکھا۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟" سفیان کا دماغ الجھ گیا۔

موبائل لے کر واش روم میں جانے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ پارس رازدارانہ طور پر کسی کو فون کرنا چاہتی ہے۔

"اس وقت یہ کسے فون کر سکتی ہے؟" سفیان کے دماغ میں سوال ابھرا۔

پھر جیسے ہی پارس نے واش روم میں جا کر اندر سے اس کا دروازہ بند کیا، سفیان پھرتی سے اٹھا اور ننگے پیر ہی دبے قدموں واش روم کے دروازے پر پہنچ گیا۔

اندر سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے واش بیسن کے نل سے پانی گر رہا ہو۔ چند لمحوں کے توقف سے پارس کی آواز سنائی دی لیکن یہ واضح نہیں ہوا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ایک تو اس کا لہجہ دھیما تھا، پھر نل سے گرنے والے پانی کی آواز بھی آ رہی تھی۔ اس کے باوجود جو دو تین الفاظ سفیان سن سکا، ان سے ظاہر ہوا کہ وہ اس کے اپارٹمنٹ کا پتا تھا۔ سفیان کے جسم میں کچھ سنسناہٹ سی ہوئی۔ اس کے اندازے کے مطابق پارس کسی کو اپارٹمنٹ کا پتا سمجھا رہی تھی۔ پھر اس وقت تو سفیان جیسے اچھل پڑا جب اس نے پارس کو سکندر کا نام لیتے ہوئے سنا۔ انداز سے ظاہر ہوا کہ اس نے کسی سے سکندر کا ذکر نہیں کیا تھا بلکہ اسے مخاطب کیا تھا۔ پھر سفیان نے "ایس، ایم، ایس" اور "بھی" کے الفاظ بھی سنے۔ اب سفیان کے دل کی دھڑکنیں ناہموار ہو چکی تھیں۔ اس کے فوری اندازے کے مطابق پارس نے سکندر کو فون کر کے اپارٹمنٹ کا پتا بتایا تھا۔ پھر شاید دوسری طرف سے کہا گیا ہو کہ پتا، ایس ایم ایس بھی کر دیا جائے۔ اس کے جواب میں پارس نے کہا ہوگا کہ "ایس، ایم، ایس" بھی کر دیتی ہوں۔ پھر سفیان نے پارس کو اپنا نام لیتے ہوئے بھی سنا اور "صبح تک" کے الفاظ بھی اسے سنائی دیے۔ غالباً اس نے سکندر کو بتایا تھا کہ سفیان صبح تک ہی اپارٹمنٹ میں رکے گا۔

اس خیال سے سفیان کو صرف حیرت ہی نہیں بلکہ صدمہ بھی ہوا کہ پارس کا تعلق لنگڑے سکندر سے بھی تھا اور اس کے نزدیک لنگڑے سکندر کی حیثیت اپنے شوہر سے بھی زیادہ تھی جس کے بچے کی وہ ماں بننے والی تھی۔

لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ اس کے بچے کا باپ نہ ہو، سفیان کو اچانک خیال آیا۔ وہ کسی کا ناجائز بچہ بھی ہو سکتا تھا جسے پارس اس کے سر تھوپنا چاہتی تھی اور یہ قیاس بھی کیا جا سکتا تھا کہ وہ بچہ لنگڑے سکندر ہی کا ہو۔ شادی سے پہلے تک پارس ماڈل گرل کی حیثیت سے کام کرتی رہی تھی۔ اس کے تعلقات کسی سے بھی ہو سکتے تھے۔

خطرے کے احساس اور غصے کے باعث سفیان کی رگ رگ میں خون کے ساتھ جیسے چنگاریاں بھی دوڑنے لگیں۔

اندر واش بیسن کا نل بند کیا گیا۔ پانی گرنے کی آواز معدوم ہو گئی۔ سفیان ساکت و صامت وہیں کھڑا رہا۔ پھر جیسے ہی پارس باتھ روم سے نکلی، سفیان نے جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے موبائل فون چھین لیا۔ پارس بُری طرح گھبرا گئی۔

"یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"دھوکے باز!" سفیان نے دانت پیسے۔ "لنگڑے سکندر کو بتا دیا میرے بارے میں؟"

"نہ جانے تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" پارس نے ڈھٹائی کا ثبوت دینے کی کوشش تو کی لیکن اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

سفیان نے اس کے موبائل کا وہ فولڈر کھولا جس میں ایس ایم ایس محفوظ رہ جاتے تھے۔ پارس سے غلطی ہوئی تھی کہ اس نے ایس ایم ایس "ڈیلیٹ" نہیں کیا تھا۔ غالباً اسے خیال ہی نہیں آیا ہوگا کہ سفیان اس کا موبائل دیکھے گا۔

جو ایس ایم ایس کیا گیا تھا، اس میں صرف اس کا پتا ہی تھا جو "ایس، کے، ڈی، آر" کو بھیجا گیا تھا۔

یہ حروف سکندر کا مخفف ہو سکتے تھے۔

سفیان نے وہ نمبرز دیکھے جو مختلف ناموں کے ساتھ موبائل میں محفوظ تھے۔

پارس اپنا موبائل لینے کے لیے سفیان پر جھپٹی لیکن سفیان نے اسے زور سے دھکا دے دیا۔ "ایس" کے ناموں میں اسے "ایس، کے، ڈی، آر" کے ساتھ موبائل کا نمبر بھی دکھائی دے گیا۔

سفیان نے پارس کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "لنگڑے سکندر کو پتا بتا دیا ہے تو نے تاکہ وہ صبح سے پہلے یہاں آ کر مجھے قتل کر دے۔ یہ ایس کے ڈی آر، سکندر ہی کے نام کا مخفف ہو سکتا ہے۔"

پارس اب اتنی خوف زدہ ہوئی تھی کہ اس نے بھاگ کر کمرے سے نکل جانا چاہا لیکن سفیان نے بہت پھرتی دکھائی۔ دروازے پر ہی اس نے پارس کی گردن دبوچ لی۔

"ذلیل عورت!" سفیان نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "کیا تو لنگڑے سکندر کی..."

سفیان کی بات پوری نہ ہو سکی۔ پارس نے جھٹکا دے کر اپنی گردن سفیان سے چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ سفیان کی گرفت سخت نہیں تھی اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئی لیکن دوسرے ہی لمحے سفیان نے اس کی کنپٹی پر ایسا

گھونسا مارا کہ وہ ڈگمگا کر دیوار سے جا لگی۔

"میں اب فوراً یہاں سے جا رہا ہوں۔" سفیان نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "میں قاتل نہیں بننا چاہتا ورنہ جی تو چاہ رہا ہے کہ تجھے گلا گھونٹ کر مار دوں۔ تیرا موبائل میں یہیں چھوڑ جاؤں گا کیونکہ شاید کسی وقت مجھے تجھ سے بات کرنا پڑے مگر جانے سے پہلے..."

سفیان اپنی بات ادھوری چھوڑ کر پارس کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے پارس کو ڈرا دیا۔ اس کے ہونٹ دو مرتبہ کھلے مگر غالباً شدید خوف ہی کے باعث وہ کچھ بول نہیں سکی۔ اس کے سر پر لگنے والے گھونسے کی ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس کے خوف کا یہ عالم تھا کہ وہ بت بنی سفیان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ سفیان نے اس کے قریب پہنچ کر اس کی دوسری کنپٹی پر گھونسا مارا اور اس مرتبہ وہ تیورا کر گر پڑی۔ سفیان نے اس پر جھک کر اس کی نبض اور دل کی دھڑکنیں دیکھیں اور اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ پارس صرف بے ہوش ہوئی ہے۔ سفیان چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ صرف بے ہوش ہو۔ اسے بے ہوش کرنے کے لیے سفیان اس کی کنپٹی پر گھونسوں کی بارش کر دیتا لیکن دوسرے گھونسے کے بعد مزید گھونسے مارنے کی ضرورت نہیں رہی۔ بے ہوش پارس کے دانت سختی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔

سفیان نے جلدی جلدی اپنا کچھ ضروری سامان ایک بریف کیس میں بھرا۔ اپارٹمنٹ چھوڑنے سے پہلے اس نے پارس کا موبائل بستر پر پھینک دیا تھا لیکن اس میں موجود لنگڑے سکندر کا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کر لیا تھا۔

☆☆☆

سفیان کے اپارٹمنٹ کی عمارت کے چار بلاک تھے۔ ان چاروں کے بیچ میں احاطہ تھا جہاں کاریں پارک کی جاتی تھیں۔ چاروں بلاک ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی تھے۔ ایک راہداری میں چلتے ہوئے چاروں بلاکس میں گھوما جا سکتا تھا لیکن ہر بلاک کے لیے الگ الگ زینے اور لفٹس تھیں۔

سفیان اپنے اپارٹمنٹ سے نکلنے کے بعد راہداری میں تیزی سے چلتے ہوئے مخالف سمت کے بلاک میں داخل ہوا اور اس کے ایک زینے سے نیچے اترا۔ یہ احتیاط اس نے اس لیے کی تھی کہ اگر لنگڑا سکندر یا اس کا کوئی آدمی بہت جلد وہاں پہنچ جائے تو اس سے سفیان کا سامنا نہ ہو سکے۔ اس کا دشمن اس زینے سے اوپر آتا جس بلاک میں اس کا اپارٹمنٹ تھا۔

رات اتنی گزر چکی تھی کہ اس جانب کی سڑک پر بھی سناٹا تھا۔ سفیان فٹ پاتھ پر عمارتوں کے قریب سے گزرتا ہوا ایک جانب بڑھا اور ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ پھر وہ گلیوں ہی گلیوں میں چلتا ہوا اپنے اپارٹمنٹ کی عمارت سے خاصا دور نکل گیا۔ وہ یہ سوچے بغیر اپنے اپارٹمنٹ سے نکل آیا تھا کہ اس کی منزل کہاں ہوگی لیکن گلیوں میں چکراتے ہوئے اس کے دماغ میں یہ خیال چکرا تا رہا تھا کہ اس موقع پر اسے سعدیہ ہی سے کچھ مدد حاصل ہو سکتی ہے۔

سعدیہ اس سے شدید محبت کرتی تھی۔ اسی لیے سفیان کی شادی اس کے لیے صدمے کا باعث بھی ہوئی تھی۔ سفیان نے اس سے یہ راز نہیں چھپایا تھا کہ اس کی وہ کیا مجبوری تھی جو پارس سے اس کی شادی کا سبب بنی۔

اب جبکہ سفیان ایک خطرناک صورتِ حال سے دوچار تھا، اسے سعدیہ سے رابطہ کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی لیکن گلیوں میں چکراتے اور سوچتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ ان حالات میں سعدیہ کے علاوہ کسی پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ اس نے تذبذب کے ساتھ موبائل فون کے ذریعے اس سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے کئی گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کی گئی جس کا سبب غالباً یہی ہو سکتا تھا کہ سعدیہ کو سوتے سے اٹھنا پڑا ہوگا۔

"خیریت تو ہے سفیان! میں اس وقت تمہیں کیسے یاد آ گئی؟" سعدیہ کی آواز میں خوابیدگی بھی تھی اور تعجب کے ساتھ ہلکا سا طنز بھی۔

"میں اس وقت ایک خطرے سے دوچار ہوں سعدیہ!" سفیان جواب دیتے وقت ایک ایسی جگہ رک گیا تھا جہاں قدرے تاریکی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی پولیس موبائل کے سامنے نہ آ جائے۔ اتنی رات گئے پیدل چلنے والے لوگوں کو پولیس روک کر پوچھ گچھ ضرور کرتی ہے۔

سعدیہ نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیسا خطرہ؟" اس کے لہجے سے طنز ختم ہو گیا تھا۔

"میری زندگی خطرے میں ہے سعدیہ!" سفیان نے کہا۔ "مجھے اپنے اپارٹمنٹ سے فرار ہوئے بیس منٹ سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ اگر میں اس وقت تک اپنے اپارٹمنٹ میں رک جاتا تو یقیناً قتل کیا جا چکا ہوتا۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" سعدیہ روہانسی ہو گئی۔

"میں تمہیں فون پر ساری تفصیل نہیں بتا سکتا۔" سفیان نے کہا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ فوری طور پر تم مجھے کوئی ایسی

جگہ بتا سکتی ہو جہاں میں روپوش ہو سکوں... میں اپنے کسی دوست کے گھر کا رخ بھی نہیں کر سکتا ورنہ کسی ہوٹل میں قیام کر سکتا ہوں۔ رات بھر سڑکوں پر گشت بھی نہیں کر سکتا اور دن نکل آنے کے بعد میرے لیے ایک اور خطرہ بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔"

"تم کیا کر بیٹھے ہو سفیان؟" سعدیہ جیسے رو پڑنے کے قریب ہو گئی۔

"میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں سعدیہ کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے لیکن ایک جرم کا چشم دید گواہ بن گیا ہوں جس میں میرے ارادے کو قطعی دخل نہیں تھا۔ بس وہ گواہ بننا ہی میرے لیے خطرے کا سبب بنا ہے۔ میں نے ابھی کہا نا کہ میں فون پر تمہیں سب کچھ نہیں بتا سکوں گا۔ تم جلدی سے مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ اس وقت تم میری روپوشی کا کچھ بندوبست کر سکتی ہو؟"

"تم اس وقت کہاں ہو؟" سعدیہ نے پوچھا۔

سفیان نے جواب میں ٹھیک ٹھیک بتا دیا کہ وہ کہاں ہے۔

سعدیہ بولی۔ "اچھا میں آ رہی ہوں۔ بیس منٹ میں پہنچ جاؤں گی۔"

"میں بے چینی سے انتظار کروں گا۔"

دوسری طرف سے مزید کچھ کہے بغیر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

سفیان کے دماغ میں یہ خیال تھا کہ سعدیہ اسے صرف اپنے گھر میں ہی پناہ دے سکتی ہے۔ اس کا تعلق ایک آسودہ حال گھرانے سے تھا۔ گھر میں رہنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ گھر میں اس کے علاوہ صرف والدین تھے یا دو تین ملازم... سفیان کے علم کے مطابق ان دنوں اس کے والد بھی کسی کام سے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔

سفیان کو اپنے گھر میں رکھتے ہوئے سعدیہ کو ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ اسے سفیان کی تمام آوارگیوں کا علم تھا۔ وہ ان باتوں کو ہمیشہ ہنس کر ٹالتی رہی تھی۔ خود اس کے معاملے میں سفیان ایک مختلف مزاج کا شخص ثابت ہوا تھا۔ تنہائی کی ملاقاتوں میں بھی اس نے اپنے اور سعدیہ کے درمیان فاصلہ رکھا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ سعدیہ ہی سے شادی کرے گا لیکن شادی سے قبل اسے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ اب تک ان کی شادی نہ ہونے کا سبب یہ تھا کہ سعدیہ بی اے کے آخری سال میں تھی اور اس کے والدین ان کی شادی بی اے گریجویٹ ہو جانے کے بعد کرنا چاہتے تھے۔ سعدیہ بھی سفیان کی تمام آوارگیوں کے باوجود اس سے شادی کرنے کے لیے تیار تھی۔ اسے پورا اعتماد تھا کہ وہ شادی کے بعد سفیان کو "راہ راست" پر لے آئے گی۔

آخر کچھ فاصلے پر سعدیہ کی کار ایک الیکٹرک پول کے قریب آ کر رکی۔ سفیان نے کار بھی پہچان لی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی سعدیہ کو بھی دیکھ لیا جو کار روکنے کے بعد اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہی تھی۔

سفیان محتاط نظروں سے ماحول کا جائزہ لے کر بہت تیزی سے کار کے قریب پہنچ گیا۔ اسے دیکھتے ہی سعدیہ نے خود ہی اپنے برابر کی نشست کا دروازہ کھولا۔ سفیان جلدی سے کار میں بیٹھ گیا۔ سعدیہ فوراً کار حرکت میں لے آئی۔

"اب بتاؤ، کیا ہوا ہے؟" سعدیہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ مجھے کہاں لے جاؤ گی؟"

"اپنے گھر کے علاوہ اور کہاں لے جاؤں گی۔ میرے پاس کوئی خفیہ ٹھکانا تو ہے نہیں۔"

"تمہاری ممی؟"

"وہ بہت گہری نیند سوتی ہیں۔"

"پھاٹک تو چوکیدار ہی کھولے گا۔ میں کسی کی بھی نظر میں نہیں آنا چاہتا سعدیہ!"

"میں خود بھی نہیں چاہوں گی کہ وہ تمہیں میرے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھے لیکن تم اس میں اپنا دماغ مت الجھاؤ۔ میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ تم میری بے چینی ختم کرو۔ آخر وہ کون ہے جو تمہیں قتل کرنا چاہتا ہے اور کیا ہوتے دیکھ لیا ہے تم نے؟"

"ایک شخص کو قتل کرتے دیکھ لیا ہے۔"

سعدیہ چونکی۔

سفیان نے بات جاری رکھی۔ "اگر تم نے خبریں سنی ہیں تو تمہیں معلوم ہوگا۔ آج ایک ایم این اے خواجہ ناصر بیگ کو قتل کیا گیا ہے۔ قتل کرنے والا ایک خطرناک اور پیشہ ور قاتل لنگڑا سکندر ہے۔"

"وہ خبر تو سن چکی ہوں۔" سعدیہ جلدی سے بولی۔ "ابتدائی تفتیش کے مطابق فائر کئی فرلانگ دور سے کیا گیا تھا۔"

"زیر تعمیر بلڈنگ کی تیسری منزل کی کھڑکی سے۔" سفیان نے اسے بتایا۔ "میں اس وقت وہیں تھا۔ ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور سے کچھ خریدنا تھا مجھے، میں نے لنگڑے سکندر کو فائر کرتے دیکھا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے خواجہ ناصر بیگ پر گولی چلائی تھی۔ اتفاق سے لنگڑے سکندر نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ میں اس کے خلاف واحد شہادت ہوں۔ وہ یہی چاہے گا کہ مجھے پولیس تک پہنچنے سے پہلے قتل کر دے۔"

"وہ قتل ہوئے تو بہت دیر ہو چکی ہے سفیان! تمہیں تو بہت پہلے پولیس تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"اس طرح تو میں خود ہی اپنی موت کو دعوت دے بیٹھتا۔"

"وہ کیسے؟ میں سمجھی نہیں سفیان۔"

جواب میں سفیان نے وہی سب کچھ دہرا دیا جو پارس کو بتا چکا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے ساری روداد دہرا دی لیکن یہ بتاتے ہوئے تذبذب کا شکار ہو گیا کہ اس کی بیوی پارس نے لنگڑے سکندر کو اس کے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔

"تمہاری باتوں سے تو..." سعدیہ تشویش سے رک رک کر بولی۔ "یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم خاصی پریشانی اور خطرے میں پڑ گئے ہو۔ غالباً تم اپنے گھر سے تمام ضروری سامان لے کر نکلے ہو۔ خاصا بڑا بریف کیس ہے تمہارے ساتھ۔"

"غیر یقینی صورت حال میں ضروری سامان لینا ضروری تھا۔"

"اس وقت گھر پر تمہاری بیوی بھی تو ہوگی۔" سعدیہ کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی۔ "اس نے نہیں پوچھا کہ تم اس تیاری کے ساتھ کہاں جا رہے ہو؟ ظاہر ہے کہ تمہارے انداز میں عجلت بھی ہوگی۔"

سفیان چپ رہا۔

"کیوں؟" سعدیہ کچھ توقف سے بولی۔ "نہیں تھی وہ؟"

"تھی۔" سفیان نے ایک طویل سانس لی۔ اس کی دانست میں وہ سب کچھ چھپانا سعدیہ کے ساتھ زیادتی ہوتی۔ اس نے وہ سب کچھ بھی بتا دیا۔ جواب میں اسے سعدیہ سے کسی طنزیہ جملے کی توقع تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سعدیہ نے دانت پیستے ہوئے پارس کو کتیا کی اولاد سے نسبت دے ڈالی۔

سفیان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "کاش، میں نے اس سے شادی نہ کی ہوتی۔"

"صرف شادی نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا۔" سعدیہ نے تلخی سے کہا۔ "کوئی اور لڑکی بھی تمہارے لیے ایسی کسی

پریشانی کا سبب بن سکتی تھی۔ اس پریشانی سے نکل جانے کے بعد بھی تم انہی راہوں پر چلتے رہو گے۔"

"مجھے ایسا سبق ملا ہے سعدیہ کہ اب میں خود کو بدلنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

"چور، چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں... اگر تم بدل سکتے ہو تو صرف میں ہی تمہیں بدل سکوں گی اگر تم نے مجھ سے شادی کرنا گوارا کیا۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟" سفیان کی آواز بھرا گئی۔ "تمہارے گریجویشن کا مسئلہ آڑے نہ آتا تو ہم اب تک ایک دوسرے کے ہو چکے ہوتے۔"

"فی الحال یہ غیر متعلق سی باتیں ہیں۔ ہمیں ابھی ان باتوں میں نہیں الجھنا چاہیے۔ یہ بتاؤ کہ اب کرو گے کیا؟"

"اب تک کوئی فیصلہ تو نہیں کر سکا ہوں۔" سفیان نے بے بسی سے کہا۔ "شاید میرا دماغ ہی کام نہیں کر رہا ہے۔ تم ہی کوئی مشورہ دو۔"

"تم نے سارے ہی خدشات ظاہر کر دیے ہیں۔ اب کوئی محفوظ راستہ سوچنا شاید میرے لیے مشکل ہو۔ اچھا، ابھی تو تم پچھلی سیٹ پر جا کر لیٹ جاؤ۔ جب چوکیدار پھاٹک کھولے گا اور کار اندر داخل ہو گی تو اس کی نظر بھی تم پر نہیں پڑنا چاہیے۔ جب میں پھاٹک پر کار روک کر ہارن دوں تو پھاٹک کھلنے سے پہلے ہی تم سیٹ کے نیچے پائے دان میں چھپا لینا خود کو۔ پھر جب تک میں نہ کہوں، کار سے نہیں اترنا۔"

"جب بھی اتروں گا، چوکیدار کی نظر تو پڑ سکتی ہے۔"

"میں کہہ چکی ہوں کہ اپنا دماغ اس میں نہ الجھاؤ۔ میں سب کچھ سوچ چکی ہوں۔ گھر قریب آ رہا ہے۔ پچھلی سیٹ پر تو جاؤ۔"

سفیان نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور پچھلی سیٹ پر جا کر لیٹ گیا۔ کار کی رفتار کم ہونے لگی تو سفیان سمجھ گیا کہ سعدیہ کا گھر قریب آ گیا ہے۔ پھر کار رک گئی۔ سفیان نے کار کا ہارن سنا اور بہ آہستگی پائیدان میں اتر گیا۔ چند لمحے بعد اس نے پھاٹک کھلنے کی آواز سنی۔ کار آہستگی سے پھر حرکت میں آ گئی۔ سفیان ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر رہا تھا کہ وہ کار سے اترتے وقت چوکیدار کی نظر سے کس طرح بچ سکے گا؟

جب کار رکی تو اس نے سعدیہ کی دھیمی آواز سنی۔

"ابھی وہیں رہنا۔"

سفیان دم سادھے پڑا رہا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ پھر اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ سعدیہ کار سے اتری ہے۔ پھر دروازہ بند ہوا۔ سفیان نے سعدیہ کی

ہدایت کے مطابق اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت نہیں کی۔ اس نے ایسی آواز سنی جیسے پھر کوئی پھاٹک کھولا گیا ہو۔ اس کے بعد سعدیہ پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھی، انجن اس نے اسٹارٹ ہی رکھا تھا۔ کار پھر حرکت میں آئی لیکن جلد ہی رک بھی گئی۔ اس مرتبہ سعدیہ نے انجن بند کر دیا۔ وہ پھر کار سے اتر گئی۔

"ابھی لیٹے رہنا۔" اس نے سعدیہ کی آواز سنی۔

چند لمحے بعد پھر ایسی آواز آئی جیسے کوئی پھاٹک کھولا یا بند کیا گیا ہو۔ اس کے بعد کوئی بٹن دبنے کی آواز ہوئی۔ نیم تاریک ماحول کچھ روشن ہو گیا۔ سعدیہ کے قدموں کی آہٹ قریب آتی ہوئی سنائی دی۔

"اب اتر آؤ۔" وہ بولی۔

سفیان نے پائیدان سے اٹھ کر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی گیراج ہے۔ ایک کار وہاں پہلے سے موجود تھی۔ سعدیہ کی کار اس کے پیچھے رکی تھی۔ سفیان سمجھ گیا کہ دوسری کار سعدیہ کے والد کی ہوگی۔ تیز روشنی کے بلب میں سب کچھ نظر آرہا تھا۔ گیراج کا دروازہ بھی بند نظر آیا۔ سفیان نے غالباً اسی کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی تھی۔

سفیان نے کار سے اتر کر اپنے کپڑے جھاڑے۔ اس وقت اس نے دیکھا کہ گیراج کی عقبی دیوار میں ایک دروازہ بھی ہے۔

"اب تو تمہیں اطمینان ہو گیا کہ چوکیدار کی نظر تم پر نہیں پڑی ہوگی؟" سعدیہ بولی پھر اس نے عقبی دیوار میں موجود دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "آؤ۔"

سفیان نے قدم بڑھائے۔ وہ اور سعدیہ پہلے سے موجود کار کے برابر سے گزرے۔

"یہ ڈیڈی کی کار ہے۔" سعدیہ نے بتایا۔ "گھر سے نکل کر سیدھے گیراج میں اور کار میں بیٹھ کر روانہ۔"

سفیان نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

دروازے کے قریب ایک بٹن تھا۔ سعدیہ نے اسے دبایا تو گیراج کا بلب بجھ گیا۔ وہ سفیان کے ساتھ دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اس طرف ایک چھوٹی سی روشن راہداری تھی۔

☆☆☆

پارس کو یوں محسوس ہوا جیسے بہت دور کہیں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ بالکل خالی الذہن تھی۔ اس کی پلکیں بار بار جھپک رہی تھیں۔ یکایک اسے احساس ہوا کہ وہ فرش پر پڑی ہوئی ہے۔ وہ بوکھلا کر اٹھی اور پھر چشم زدن میں اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ وہاں اکیلی تھی۔ اس کا موبائل فون بستر پر پڑا ہوا تھا۔ ہوش میں آتے وقت اس نے کہیں دور سے آتی ہوئی گھنٹیوں کی جو آواز سنی تھی، وہ اس کے موبائل ہی کی تھی۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے چلی۔ اس نے موبائل اٹھایا۔ اس وقت تک دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔ پارس نے دیکھنا چاہا کہ کال کرنے والا کون تھا۔ اسے اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دکھائی دیا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ دو ایس ایم ایس بھی آچکے تھے۔ اس نے جلدی جلدی وہ بھی دیکھے۔ کیا رہا؟ پہلا ایس ایم ایس تھا جو "ایس" کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ دوسرے ایس ایم ایس میں یہ سوال تھا کہ کچھ بتاؤ گی؟... یہ بھی "ایس" کی طرف سے بھیجا گیا تھا اور جس نمبر سے بھیجا گیا تھا، وہ وہی نمبر تھا جس کی کال پارس ریسیو نہیں کر سکی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق "ایس" کا مطلب سکندر ہی ہو سکتا تھا۔ یعنی کال بھی اس نے کی تھی۔

پارس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچتی ہوئی تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی۔ اس نے سارا اپارٹمنٹ دیکھ ڈالا۔ اس کے اندازے کے مطابق سفیان وہاں سے جا چکا تھا۔

پارس نشست کے کمرے میں ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور اپنے موبائل پر سکندر سے رابطہ کیا۔ اس نے وہ نمبر استعمال کیا تھا جو اس کے پاس پہلے سے تھا۔

"کیا بات ہے پارس؟" دوسری طرف سے غراتی ہوئی آواز آئی جو اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ "میں تمہیں دو ایس ایم ایس کر چکا ہوں۔ مجبوراً پھر کال بھی کی تھی۔ یہی سوچا تھا کہ اگر تم سفیان کی وجہ سے بات نہیں کر سکیں تو رانگ نمبر کہہ کر لائن ڈس کنکٹ کر دو گی لیکن تم نے کال ہی ریسیو نہیں کی۔"

"مجھے ابھی ہوش آیا ہے۔" پارس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"کیوں؟" سکندر چونکا۔

پارس نے جلدی جلدی سب کچھ بتا دیا۔ جواب میں دوسری طرف سے ایسی غراہٹ سنائی دی جیسے سکندر کو شدید غصہ آ گیا ہو۔

"میں اوپر آرہا ہوں۔" وہ کچھ توقف سے بولا۔ "دروازے کے قریب موجود رہنا۔"

"اچھا۔" پارس نے جلدی سے کہا۔

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔ پارس اٹھی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اسے ڈر تھا کہ سکندر اسے احمق قرار دے گا اور کیونکہ اسے غصہ آ گیا تھا اس لیے یہ خدشہ بھی تھا کہ وہ اسے دو ایک تھپڑ بھی رسید کر دے۔ پہلے بھی دو ایک بار ایسا ہو چکا تھا لیکن پارس اس کی قربت کی ایسی دیوانی تھی کہ اس نے برداشت کیا تھا اور سکندر سے اپنے تعلقات ختم نہیں کیے تھے۔

وہ دروازے کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ باہر سے آہستگی کے ساتھ دروازہ تھپتھپایا گیا۔ پارس نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھنا ضروری نہیں سمجھا اور دروازہ کھول دیا کیونکہ اس وقت سکندر کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ تیزی سے اندر آیا اور خود ہی دروازہ بند کر دیا۔ اس نے مصنوعی ٹانگ لگوائی تھی۔ وہ لنگڑا نظر نہیں آتا تھا۔ بس اس کی چال میں خفیف سا لنگ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ چہرے کے نقش و نگار بے حد سخت تھے۔ اس نے پارس کی کلائی پکڑتے ہوئے سرگوشی کرنے والے انداز میں کہا۔ "بیڈ روم کی طرف چلو۔"

کلائی پر اس کی سخت گرفت اس کے غصے کی غماز تھی۔ پارس نے تکلیف محسوس کی لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ وہ سکندر کو بیڈ روم میں لے آئی۔

"الو کی پٹھی!" سکندر اب تیز لہجے میں بولا۔ "مجھے تم نے کہاں سے فون کیا تھا۔ اس وقت جب سفیان یہاں تھا؟"

پارس نے باتھ روم کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرے ہی پل سکندر نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا گئی۔

"بے وقوف!" سکندر غرایا۔ "جب سفیان اتنا پریشان تھا اور تجھے معلوم بھی تھا کہ وہ جاگ رہا ہے تو تجھے یہاں سے فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے دیکھ لیا ہوگا کہ تو موبائل فون لے کر باتھ روم میں گئی ہے۔ اسے شبہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ تیری اسی حماقت کے باعث وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ تجھے چاہیے تھا کہ کسی بہانے اس کمرے سے باہر جا کر مجھے فون کرتی۔"

اس کے الٹے ہاتھ کے تھپڑ سے پارس کا نچلا ہونٹ قدرے پھٹ گیا تھا اور اس سے خون رسنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ وہ سسکتی ہوئی سکندر کے سینے سے لپٹ گئی۔

"مجھے معاف کر دو سکندر!"

اس مرتبہ سکندر نے اسے اس طرح دھکا دیا کہ وہ بستر پر جا گری۔

"کتیا!" سکندر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ "تیری حماقت کی وجہ سے میرا فون نمبر بھی اسے پتا چل گیا ہے۔"

پارس بستر پر بیٹھ گئی تھی اور اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس کے دل میں سکندر کے خلاف جذبات نے کچھ سر اٹھایا تھا۔ پہلے بھی سکندر سے دو مرتبہ پٹنے کے باوجود اس نے سکندر کے خلاف کچھ نہیں سوچا تھا لیکن اس وقت وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ سکندر اسے کوئی حقیر ترین جانور سمجھنے لگا ہے۔ اس نے پہلی مرتبہ اس سے تو تڑاخ سے بات کی تھی۔ اسے "الو کی پٹھی" تک کہہ گیا تھا۔ پھر بھی وہ اس کے سینے سے جا لگی تھی مگر پھر اس نے اسے بستر پر دھکا دیتے ہوئے "کتیا" بھی کہہ ڈالا تھا۔ پارس تلملا کر رہ گئی۔

سکندر اب کچھ سوچتا ہوا کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے بشرے سے فکرمندی عیاں تھی۔ یکایک اس نے ٹہلنا موقوف کر کے پارس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ظاہر ہے کہ اپنا موبائل تو وہ اپنے ساتھ لے گیا ہوگا۔ اس کا نمبر بتا۔"

پارس نے دھیمی آواز میں نمبر بتا دیا۔

سکندر نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور پارس سے بولا۔ "نمبر رک رک کر بتاؤ۔"

پارس رک رک کر نمبر بتانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی سکندر اپنے موبائل کے نمبر پریس کرتا رہا۔ پارس سمجھی کہ وہ سفیان کا نمبر "سیو" کر رہا ہے لیکن جب سکندر نے نمبر مکمل ہونے کے بعد موبائل اپنے کان سے لگایا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ سفیان سے بات کرنا چاہتا ہے۔ پارس کا ذہن الجھ گیا۔ وہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھی کہ سکندر، سفیان سے کیا بات کرنا چاہتا ہے۔

☆☆☆

سعدیہ کے ساتھ سفیان ایک کمرے میں داخل ہوا۔

"یہ دادا جان کا بیڈ روم ہے۔" سعدیہ بولی۔ "ان کے انتقال کے بعد سے ڈیڈی نے جانے کیوں یہ کمرا کسی کو استعمال نہیں کرنے دیا۔ ہفتے میں ایک مرتبہ یہاں کی صفائی کرا دی جاتی ہے اور اتفاق سے آج ہی صفائی کی گئی ہے۔ اب ایک ہفتے تک ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ تم یہاں بے خوف آرام کر سکتے ہو۔ میں تمہارے لیے اس سے زیادہ بہتر پناہ

گاڑی کا بندوبست نہیں کر سکتی تھی۔"

"خاصا پُرسکون ہوا ہوں میں یہاں آ کر۔" سفیان نے کہا۔ بستر پر بیٹھتے ہوئے اس نے واقعی اطمینان کی سانس لی۔

سعدیہ کے چہرے سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔ "آئندہ کے لیے تم کیا فیصلہ کرنا چاہتے ہو؟"

"یہی سوچنے کے لیے تو مجھے مکمل سکون کی ضرورت ہے۔" سفیان نے جواب دیا پھر کہا۔ "بیٹھ تو جاؤ۔ یہ خوف تو نہیں ہے کہ کوئی اس طرف نکل آئے اور اس کمرے سے آتی ہوئی آوازیں سن کر چونک جائے۔"

"میں نے تمہیں شاید بتایا تھا کہ ممی تو سو چکی ہیں۔ ملازمین میں سے کوئی ادھر آ ہی نہیں سکتا۔"

"تو بیٹھو... تم سے ذرا دیر باتیں کر کے بھی دماغ کچھ ہلکا ہوگا۔ ابھی تو بہت بوجھل محسوس کر رہا ہوں۔"

سعدیہ نے ایک طرف رکھی ہوئی کرسی اٹھا کر بستر کے قریب کی اور بیٹھ گئی۔ سفیان اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"اس وقت کس کی کال آ سکتی ہے؟" سفیان نے الجھن آمیز انداز میں بڑبڑاتے ہوئے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور پھر یہ دیکھ کر اس کا سارا جسم سنسنا گیا کہ کال کرنے والا لنگڑا اسکندر تھا۔

"کون ہے؟" سعدیہ، سفیان کے چہرے کے غیر معمولی تاثرات دیکھ کر جلدی سے پوچھ بیٹھی۔

"لنگڑا اسکندر۔" سفیان نے سعدیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"اوہ!" سعدیہ کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔

گھنٹی اب تیسری مرتبہ بج رہی تھی۔

"کیا مجھے کال ریسیو کرنا چاہیے؟" سفیان بولا۔

"میں اس معاملے میں تمہیں کوئی مشورہ نہیں دے سکتی۔" سعدیہ کے لہجے میں بھی پریشانی تھی۔

سفیان کھوئے کھوئے انداز میں اپنے موبائل فون کی طرف دیکھنے لگا۔ گھنٹی چوتھی مرتبہ بجی لیکن سفیان نے کال ریسیو نہیں کی۔ اس کی سمجھ میں یہ تو آ گیا تھا کہ اس کا موبائل نمبر سکندر کو پارس سے ہی ملا ہوگا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سکندر اس سے کیا بات کرنا چاہتا ہوگا اور کیوں؟

سعدیہ خاموش بیٹھی اس کا منہ تکے جا رہی تھی۔

سفیان نے کال ریسیو نہیں کی اور دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ سفیان نے ایک طویل سانس لی۔

سعدیہ نے سر ہلایا۔ "ایسے حالات میں کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہی ہوتا ہے۔ عجیب مصیبت کھڑی ہو گئی ہے تمہارے ساتھ۔" وہ کچھ روہانسی نظر آنے لگی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا سعدیہ!" سفیان نے اسے تسلی دی۔ "مجھے اچھی طرح سوچنے کی مہلت مل گئی ہے۔ میں کوئی راہ نکال ہی لوں گا۔"

"اپنا فون وائبریشن پر کر دو۔" سعدیہ نے اپنی آنکھوں میں آ جانے والی نمی صاف کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تو کوئی ادھر نہیں آئے گا لیکن دن میں مناسب نہیں ہوگا کہ گھنٹی کی آواز باہر جائے۔"

"وہ تو میں ابھی کر دیتا ہوں۔ کل صبح تمہیں میرے لیے ایک نیا موبائل لانا ہوگا۔"

"نیا موبائل کیوں؟"

"کل کسی وقت پولیس میرا موبائل نمبر معلوم کر سکتی ہے اور موبائل کمپنی بتا بھی سکتی ہے کہ میرا موبائل اس وقت کہاں ہے، گویا میں خود کہاں ہوں۔"

سعدیہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ سفیان کے موبائل پر ایس ایم ایس آیا۔ وہ ایس ایم ایس سکندر ہی کی طرف سے تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "میرا نمبر دیکھ کر تم سمجھ گئے ہوگے کہ وہ کال میری تھی۔ اگر تم کال ریسیو کر لو تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔"

سفیان نے سعدیہ کو ایس ایم ایس کی عبارت بتاتے ہوئے اپنا موبائل وائبریشن پر کر دیا تھا۔

"کیا بات کرنا چاہتا ہے وہ تم سے؟" سعدیہ بڑبڑائی۔

"سننا تو چاہیے کہ وہ میرے فائدے کی کیا بات کرنا چاہتا ہے۔" سفیان سوچتے ہوئے بولا۔ "یہ تو مجھ پر ہی منحصر ہے نا کہ میں اس کی کیا بات مانوں اور کیا بات نہ مانوں۔"

اسی وقت سفیان کے موبائل میں لرزش پیدا ہوئی۔ کال سکندر ہی کی تھی۔ سفیان کو اسکرین پر اس کا نمبر دکھائی دیا تھا۔

"لنگڑا سکندر۔" سفیان نے سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں کہا پھر کال ریسیو کی۔

"ہوں۔" اس نے اپنے ہونٹ بند رکھے تھے۔

"سفیان؟" دوسری طرف سے بولنے والے کا انداز مستفسرانہ تھا۔

"ہوں۔"

"اگر تم بولو گے نہیں تو بات نہیں ہو سکے گی۔"

[illegible] کیا چاہتے ہو؟"

"پارس نے مجھے بتایا ہے کہ تم پولیس کو میرے بارے میں بتاتے ہوئے گھبرا رہے ہو کیونکہ پھر کیس چلنے پر تمہیں عدالت میں بھی پیش ہونا پڑے گا۔ اس صورت میں تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی اور یہ تم نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔ میرے خلاف شہادت دینے والا زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"ہوں۔" سفیان نے اس مرتبہ ہونٹ بھینچ لیے۔

دوسری طرف سے سکندر نے کہا۔ "آج کل یہ رواج چل پڑا ہے کہ اگر کوئی اپنے موبائل سے کسی واقعے کی تصویر لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ تصویر کسی ٹی وی چینل کو بھیج دیتا ہے۔ تم ایسی کوئی حماقت تو نہیں کر چکے؟"

"میں نے ابھی تمہارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔" سفیان کو جواب دینا پڑا۔

"یہ تم نے اپنے حق میں اچھا کیا ہے۔ اس صورت میں تم مجھے اپنی جان کا دشمن بنا لیتے۔"

"تم نے جو ایس ایم ایس بھیجا تھا، اس کا مطلب؟"

"میرے بارے میں تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے تو میں ساری زندگی تمہیں دو لاکھ روپے ہر ماہ دیتا رہوں گا۔"

"اور اس دوران میں میری تلاش جاری رکھو گے؟" سفیان نے تلخی سے کہا۔

"اگر تم اپنی زبان بند رکھتے ہو تو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اگر پیسے سے کام چل جائے تو میں کسی کو قتل کرنا پسند نہیں کرتا۔"

سفیان کچھ نہیں بولا۔ وہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ اسے کیا جواب دینا چاہیے۔

"بولو!" کچھ توقف سے آواز آئی۔

سفیان نے طویل سانس لی۔ "مجھے سوچنا پڑے گا۔"

"اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں کل تک تمہارے جواب کا انتظار کر لوں گا۔ ایک بار پھر تنبیہ کرتا ہوں کہ میرے خلاف کوئی قدم اٹھانا تمہیں راس نہیں آئے گا۔ تم پاتال میں بھی جا چھپو گے تو میں تمہیں تلاش کر لوں گا۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" اس مرتبہ سفیان کے لہجے میں گھبراہٹ نہیں تھی۔

"کل کب تک جواب دو گے؟"

"شام تک۔"

دوسری طرف سے قدرے خاموشی رہی پھر کہا گیا۔ "تم خاصی دیر تک مجھے الجھن میں رکھنا چاہتے ہو۔ اچھا خیر، میں شام تک تمہاری کال کا انتظار کر لوں گا۔"

سکندر نے جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

اس دوران میں سعدیہ بے تابی سے سفیان کا منہ تکتی رہی۔ جیسے ہی سفیان نے موبائل بند کیا وہ بول پڑی۔

"کیا کہہ رہا تھا؟"

جواب میں سفیان نے اسے سکندر کی پیشکش سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ "ابھی تو میں نے اسے ٹال دیا ہے لیکن یہ طے ہے کہ میں اس کی پیشکش قبول نہیں کروں گا۔ میں اپنے ضمیر پر یہ بوجھ نہیں لے سکتا کہ ایک جرائم پیشہ کو بلیک میل کروں۔"

"ایک اچھے انسان کی طرح تمہارا یہ فیصلہ درست ہے لیکن پھر تم کیا کرو گے؟"

"کتنی بار کہوں سعدیہ کہ مجھے سوچنے کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تم جا کے آرام کرو۔ تنہائی میں زیادہ یکسوئی سے سوچ سکوں گا۔"

سعدیہ سوچتی ہوئی اٹھی۔ "اچھا... جاتی ہوں۔ صبح موقع ملتے ہی تمہیں ناشتا دینے آؤں گی۔ اچھا ہاں، ابھی میں تمہیں ٹھنڈے پانی کا جگ فلاسک اور گلاس تو دے جاؤں۔"

سفیان نے سر ہلا دینے پر اکتفا کیا۔ سعدیہ چلی گئی۔ ذرا دیر بعد وہ پھر آئی اور ٹھنڈے پانی کا فلاسک جگ اور گلاس دے کر چلی گئی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر تفکرات کے آثار تھے۔

سفیان نے بریف کیس سے بوتل نکال لی۔

☆☆☆

سفیان سے بات کرنے کے بعد سکندر کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر اس نے اس طرح سر جھٹکا جیسے ہر قسم کی پریشانی اپنے ذہن سے نکال دی ہو۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بستر کی طرف بڑھا اور پارس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"آج میں تمہارے ساتھ کچھ زیادتی کر بیٹھا۔"

پارس بھی خفیف سا مسکرائی لیکن اس خفیف مسکراہٹ کے لیے بھی اسے اپنے دل پر بہت جبر کرنا پڑا۔ سکندر کے رویے کے باعث اب پارس کے دل میں اس کے لیے نفرت کے سوا کسی قسم کا جذبہ نہیں تھا۔ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو چکی تھی کہ سکندر کو قانون کی گرفت میں جانا ہی چاہیے اور وہ بھی اس طرح کہ پھر اس کی باقی زندگی جیل ہی میں گزر جائے یا پھانسی کا تختہ اس کا مقدر بنے۔

"تمہارا کیا اندازہ ہے جانی!" سکندر نے پارس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "وہ کہاں جا سکتا ہے؟"

"وہ تمہاری بات تو شاید مان ہی لے گا۔" پارس نے سنجیدگی سے کہا۔ "اب تم کیوں فکر کر رہے ہو کہ وہ کہاں گیا ہو گا یا کہاں جا سکتا ہے؟"

"میں نے اسے جو پیشکش کی ہے تو بس اس لیے کہ فوری طور پر تو کچھ بندوبست ہو جائے۔" سکندر نے کہا۔ "میں ہمیشہ تو بلیک میل نہیں ہوں گا۔ اس کی زندگی تو مجھے ختم کرنا ہی ہے۔"

خود پارس کا بھی یہی خیال تھا۔ سکندر کی بات سننے کے بعد وہ خاموش ہی رہی۔ وہ سعدیہ کو جانتی تھی۔ خود سفیان نے ہی اسے بتایا تھا۔ پارس کو خیال تھا کہ ان حالات میں سفیان شاید سعدیہ ہی کا سہارا لے مگر اب اس کا ذہن سکندر کو کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے برخلاف وہ سفیان کی مدد کرنا چاہتی تھی لیکن یہ اس کے دماغ میں نہیں تھا کہ وہ سفیان کی کیا مدد کر سکے گی۔ فی الحال وہ بس اتنا ہی کر سکتی تھی کہ سکندر کو سعدیہ سے بے خبر رکھے۔

"لعنت بھیجو۔" سکندر نے پھر اپنا سر جھٹکا۔ "وہ بچ کر تو نہیں جا سکے گا مجھ سے۔" پھر اس نے پارس کو اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ "اب آج تو میں کچھ وقت تمہارے ساتھ گزاروں گا ہی۔"

پارس بمر جبرا مسکرا دی۔ وہ سکندر کو دھتکارنا چاہتی تھی لیکن ایسا کرنے کی صورت میں وہ دراصل اپنی موت کو دعوت دیتی۔ اسے سکندر کا کھلونا بننا ہی پڑا۔

آدھ گھنٹے بعد سکندر چلا گیا۔

پارس بستر پر لیٹی رہی۔ اس کے چہرے پر گمبھیر تاثرات تھے۔ ایک فیصلے تک پہنچنے کے بعد آخر اس نے اپنے موبائل پر سفیان کے موبائل سے رابطہ کیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ سفیان اس کی کال ریسیو نہیں کرے گا لیکن اس کا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ اس کی کال ریسیو کی گئی۔

"اب وہ تمہارے ذریعے بھی کچھ کھلوانا چاہتا ہے؟" سفیان کے لہجے میں غصہ تھا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو سفیان!" پارس نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہارا یہ اندازہ بے شک ٹھیک ہے کہ اس نے میرے سامنے ہی تمہیں فون کیا تھا۔ وہ یہاں آ گیا تھا لیکن اب میں اکیلی ہوں۔ وہ جا چکا ہے۔ تم شاید میری باتوں پر یقین نہ کرو لیکن جو کچھ میرے دل میں ہے، وہ میں اب تم سے کہہ دینا چاہتی ہوں۔ سکندر نے آج میرے ساتھ جو زیادتی کی ہے، میں اسے بھول نہیں سکتی۔ نفرت ہو گئی ہے اب مجھے اس سے... اب اس معاملے میں تم مجھے اپنا طرف دار سمجھو... بس یہ بتانا پڑے گا تمہیں کہ میں کس طرح تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔"

"خوب!" سفیان کا لہجہ طنزیہ تھا۔ "ایک پیشکش کرنے کے بعد وہ کیا اب مجھ سے تمہارے ذریعے سے کوئی کھیل کھیلنا چاہتا ہے؟"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم مجھ پر یقین نہیں کرو گے لیکن مجھے امید تو ہے کہ دو ایک دن میں ہی شاید ایسی کوئی بات ہو کہ تم مجھ پر بھروسا کرنے لگو۔"

"اگر انسان کو عقل ہو تو وہ ایک بار دھوکا کھا کر دوبارہ ایسا نہیں کر سکتا۔"

"تم جو چاہو کہو، ابھی میری صرف ایک بات سن لو۔ یہ تمہارا ہی خیال ہے کہ تمہاری کار کی وجہ سے پولیس تم تک پہنچنے کی کوشش کرے گی اور یقیناً یہاں تک پہنچ جائے گی۔ میں ان لوگوں سے وہی کچھ کہوں گی جو تم نے مجھے پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میری باتوں پر یقین نہ کریں اور جب انہیں یہ بھی یقین ہو جائے کہ تم کسی وجہ سے مفرور اور روپوش ہو تو وہ میری نگرانی بھی کر سکتے ہیں۔ وہ سوچ سکتے ہیں کہ تم مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ پولیس کے اختیارات کتنے ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی اخبارات میں پڑھا ہے کہ قانون اگر چاہے تو لوگوں کے موبائل فون بھی انڈر آبزرویشن کر سکتا ہے۔ اسی لیے آج کے بعد جب میں تم سے رابطہ کروں گی تو دوسرے نمبر سے کروں گی۔ کچھ دن ہوئے میری ایک دوست مستقل طور پر امریکا چلی گئی ہے۔ اس کا موبائل سیٹ مجھے بہت پسند تھا۔ میں ویسا ہی سیٹ خریدنے والی تھی لیکن میری دوست امریکا جاتے وقت اپنا موبائل مجھے تحفے کے طور پر دے گئی تھی۔ یہ اتفاق ہے کہ میں نے وہ موبائل اب تک استعمال ہی نہیں کیا ہے۔ یہ تم سے شادی سے دو دن پہلے کی بات ہے۔ میرا وہ موبائل میرے اپارٹمنٹ کی ایک الماری میں رکھا ہے۔ وہ میں کل لے آؤں گی اور تم سے رابطہ اسی کے ذریعے کروں گی۔ پولیس کو اس نمبر کا علم نہیں ہو گا۔ وہ نمبر میں تم کو ابھی ایس ایم ایس کر رہی ہوں بلکہ زبانی بتائے دیتی ہوں۔" اس نے نمبر بتایا پھر بولی۔ "لکھ لیا؟"

"میرے پاس فضول وقت نہیں ہے۔" سفیان کا لہجہ خشک تھا۔

"پلیز سفیان! لکھ لو نمبر... وقت آنے پر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں تمہیں دھوکا نہیں دے رہی ہوں۔ ابھی مجھے ایک خیال اور آیا کیونکہ تم بھی پولیس سے بچنا چاہتے ہو اس لیے تمہیں بھی اپنا موبائل نمبر بدلنا ہو گا۔ ایسی صورت میں مجھے معلوم نہیں ہو گا کہ میں تم سے کس طرح رابطہ کروں۔ پھر تم ہی مجھے میرے نئے نمبر پر کال کر لینا... پلیز سفیان... پلیز!"

"اچھا، اب میرا وقت نہ برباد کرو۔ بہت ہو چکی۔" اس جواب کے بعد سفیان نے رابطہ منقطع کر دیا۔

پارس فکرمند ہو گئی۔

☆☆☆

صبح سات بجے چائے پیتے ہوئے پارس نے ٹی وی کھولا تو خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ ان خبروں سے معلوم ہوا کہ شہر کے بعض علاقوں میں صورت حال کشیدہ ہو گئی تھی۔ خواجہ ناصر بیگ کی سیاسی پارٹی اور اس کی مخالف پارٹی کے کارکنوں میں تصادم شروع ہو گیا تھا۔ ایک پارٹی کے دفتر کو آگ بھی لگا دی گئی تھی۔ دو مقامات پر پولیس اور مظاہرین کے درمیان جھڑپیں بھی شروع ہو گئی تھیں۔

پارس پریشان ہو گئی۔ اسے اپنے اپارٹمنٹ جا کر دوسرا موبائل فون لانا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق کشیدگی سارے شہر میں بھی پھیل سکتی تھی کیونکہ دونوں ہی سیاسی جماعتیں طاقتور تھیں۔

پارس نے جلدی جلدی چائے ختم کی۔ اسی دوران میں اسے خبروں سے معلوم ہوا کہ پولیس رنگون والا بلڈنگ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور پولیس کے ذمے داران کو قوی شبہ ہو گیا تھا کہ خواجہ ناصر بیگ پر رنگون والا بلڈنگ سے ہی گولی چلائی گئی تھی۔

پارس زیادہ تفصیلات جاننے کے لیے وقت ضائع کیے بغیر اپارٹمنٹ سے نکل آئی۔ نیچے اتر کر اس نے اطمینان کی سانس لی کیونکہ وہاں ابھی کسی گڑبڑ کے آثار نہیں تھے۔ ٹریفک معمول کے مطابق چل رہا تھا، اسے ٹیکسی بھی فوراً مل گئی۔

ابھی نصف راستہ طے ہوا تھا کہ پارس کے موبائل پر سکندر کی کال آئی۔

"شہر کے حالات خرابی کی طرف جا رہے ہیں۔" سکندر نے اس سے کہا۔ "ہاشو کا معاملہ جلد از جلد نمٹا دو۔"

"میں ابھی ٹیکسی میں ہوں۔" پارس نے جواب دیا۔ "اپنے اپارٹمنٹ کی طرف جا رہی ہوں۔ وہاں سے اپنی کار لے کر جاؤں گی اس کے گھر۔" پارس نے ٹیکسی ڈرائیور کی وجہ سے ہاشو کا نام نہیں لیا تھا۔

"ٹیکسی ہی میں اس کے گھر چلی جاتیں۔" سکندر کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"میں نے سوچا، حالات زیادہ خراب بھی ہو سکتے ہیں۔ شاید ٹیکسی مل ہی نہ سکے بعد میں... ایسے حالات میں اپنی ہی کار کام آ سکتی ہے۔"

"ہوں... اچھا خیر... جلد از جلد اس کے گھر پہنچنے کی کوشش کرو۔ حالات زیادہ بگڑ جانے کی صورت میں کام نہیں ہو سکے گا۔"

پارس کو جواب میں کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ پارس اپنے موبائل کو گھور کر رہ گئی۔

ہاشو، سکندر ہی کے گروپ کا ایک آدمی تھا۔ چند دن پہلے اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی جس کی سزا اسے سکندر سے یہ ملی تھی کہ وہ اپنے گھر تک محدود ہو گیا تھا۔ یہ ایک قسم کی قید تنہائی کہی جا سکتی تھی۔ اسے حکم ملا تھا کہ وہ تا حکم ثانی نہ تو اپنے گھر سے نکلے گا، نہ کسی سے ٹیلی فونک رابطہ کرے گا۔ گروپ کے لوگوں کو بھی یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ ہاشو سے رابطہ نہیں کریں گے۔

اس قسم کی سزائیں گروپ کے آدمیوں کو اکثر ملتی رہتی تھیں لیکن اب لگتا ہے سکندر نے ہاشو کے لیے کچھ اور ہی سوچا تھا۔ اس نے گزشتہ رات پارس کو ایک ننھی سی شیشی دی تھی جس میں کسی بے رنگ محلول کی قلیل سی مقدار تھی۔ پارس کو کرنا یہ تھا کہ ہاشو کے گھر جا کر اسے اپنے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں لے آئے اور چائے یا ایسی ہی کسی چیز میں وہ بے رنگ محلول ملا کر ہاشو کو پلا دے اور دو دو تین تین گھنٹے کے وقفے سے کم از کم چار مرتبہ پلا دے۔ اس محلول کا اثر یہ ہوتا کہ ہاشو کی یادداشت ختم ہو جاتی۔

پارس نے اندازہ لگایا تھا کہ ہاشو کو قید تنہائی کی سزا دینے کے بعد سکندر مطمئن نہیں ہو سکا تھا۔ مطمئن نہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ ہاشو اس کے کسی اہم راز سے واقف ہو چکا تھا۔ اس راز کو راز ہی رکھنے کے لیے یہ تدبیر بہت اچھی تھی کہ ہاشو کی یادداشت ہی ختم ہو جائے۔

پارس کو اب کیونکہ سکندر سے کوئی لگاؤ ہی نہیں رہا تھا بلکہ وہ کسی نہ کسی حد تک اس سے نفرت ہی کرنے لگی تھی، اس لیے اس کے دماغ میں یہ خیال مسلسل سرسرا رہا تھا کہ وہ ہاشو کو اس انجام سے بچا لے۔

مگر یہ وہ کیسے کر سکے گی؟ یہ اس کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا تھا۔

اپنے اپارٹمنٹ کی عمارت کے پھاٹک پر اس نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ کر اس نے وہ موبائل اپنے ساتھ لیا جس کا ذکر وہ سفیان سے کر چکی تھی۔

اس کے علاوہ بھی اس نے اپنی دو تین چیزیں لیں اور اپارٹمنٹ سے نکل آئی۔

پارکنگ لاٹ میں اس کی کار موجود تھی' اس نے کار اسٹارٹ کی اور نکل پڑی۔

ہاشو کے گھر پہنچنے کے لیے اسے لمبا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اگر وہ سیدھے راستے سے جاتی تو اسے ایک ایسے علاقے سے گزرنا پڑتا جہاں حالات کشیدہ تھے۔ بہرحال وہ ہاشو کے گھر پہنچ گئی۔

''میں تو ڈیڑھ گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' ہاشو نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''باس نے مجھے فون کیا تھا کہ تم مجھے لینے آؤ گی۔''

سکندر کے سبھی آدمی پارس سے واقف تھے۔

''گویا تم چلنے کے لیے تیار ہو؟'' پارس نے اس سے کہا۔

''ہاں۔'' ہاشو اپنے فلیٹ سے نکل آیا۔

ذرا دیر بعد پارس اسے کار میں اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔

''باس نے کہا تھا کہ مجھے اپنے ساتھ کسی قسم کا سامان لینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ہاشو بولا۔ ''اسی لیے میں نے کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لیا ہے۔ باس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ تم مجھے اپنے اپارٹمنٹ لے جاؤ گی اور مجھے تمہاری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔ لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ مجھے تم سے کیا ہدایات ملیں گی۔''

''بس تو پھر تمہیں اس سلسلے میں مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' پارس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں وہی کروں گی جس کی مجھے بھی ہدایات مل چکی ہیں۔''

ہاشو چپ رہ گیا۔ وہ معمولی شکل و صورت کا لیکن تومند شخص تھا۔ عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہو سکتی تھی۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے پارس کو اس وقت پہلی مرتبہ سکندر کی خواہش کا خیال آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہاشو اپنی یادداشت سے محروم ہو جائے۔ پارس خود کو یہ سوچنے پر مجبور پا رہی تھی کہ یادداشت ہی ختم کرنے کے بارے میں کیوں سوچا گیا؟ سکندر ایک سفاک قاتل تھا۔ اس کے دماغ میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ وہ ہاشو کو ختم ہی کر دے... نہ رہتا بانس، نہ بجتی بانسری!

''تو پھر صرف یادداشت ہی کیوں؟' پارس کا ذہن الجھا رہا۔

دوسری بات اس کے ذہن میں یہ بھی کسمسا رہی تھی کہ اگر وہ ہاشو کو سکندر کے ارادے سے باخبر کر دے تو کیا وہ ہاشو کو اپنا ساتھی بنا کر سکندر کے لیے کوئی مشکل کھڑی کر سکتی ہے؟

''مشکل'' کی بات تو بعد میں ہی آتی، پہلا سوال یہ تھا کہ ہاشو کیا سکندر کے خلاف اس کے ساتھ کھڑا ہونے پر تیار ہو سکے گا؟

سب سے مشکل سوال یہی تھا اور پارس اندازہ نہیں لگا سکتی تھی کہ اس کا جواب کیا ہوگا۔

راستے میں پارس اور ہاشو میں مزید کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ پارس اسے لے کر اپنے اپارٹمنٹ پہنچ گئی۔ اس نے سکندر کو فون کیا۔

''میں ہاشو کو لے آئی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' جواب آیا۔ ''کام ہوشیاری سے کرنا۔''

دوسری طرف سے پارس کی کوئی اور بات سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

ہاشو اس وقت سوالیہ نظروں سے پارس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کال بیل کی آواز نے پارس کو چونکایا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بجنے والے تھے۔ اگرچہ وہ ساڑھے سات بجے سے بھی کچھ پہلے گھر سے نکل گئی تھی لیکن اپنے اپارٹمنٹ جانے اور پھر وہاں سے ہاشو کے گھر جانے آنے میں خاصا وقت گزر گیا تھا۔ کال بیل کی آواز سن کر پارس کو خیال آیا کہ شاید پولیس ہی آگئی ہو۔ رنگون والا بلڈنگ تک تو وہ لوگ پہنچ ہی گئے تھے اس لیے یہ بھی ممکن تھا کہ سفیان کی کار بھی ان کی نظروں میں آگئی ہو۔ خود سفیان یہ خدشہ ظاہر کر چکا تھا کہ اس کی کار کی وجہ سے پولیس اس کے گھر تک پہنچ سکتی ہے۔

''اٹھو۔'' پارس کہتی ہوئی مضطرب انداز میں کھڑی ہو گئی۔

ہاشو بھی اٹھا۔ اس کے چہرے پر الجھن کا تاثر تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا ہوگا کہ کال بیل کی آواز نے پارس کو اتنا پریشان کیوں کر دیا۔

پارس اسے اپنی خواب گاہ میں لے آئی۔

''جب تک میں واپس نہ آؤں، خاموشی سے یہاں بیٹھے رہنا۔'' پارس نے اس سے کہا۔

کال بیل کی آواز پھر سنائی دی۔ پارس تیزی سے مڑی اور کمرے کا دروازہ بند کر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے دروازے کے آئی گلاس سے باہر جھانکا اور اس کے منہ سے بے اختیار ایک طویل سانس نکل گئی۔ حالانکہ اسے توقع بھی تھی کہ وہ پولیس ہوگی۔ اس نے دروازہ کھول

دیا۔ اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ پولیس کے سامنے خود کو پریشان ظاہر کرے لیکن اس کے لیے اسے اداکاری کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ جن حالات سے گزر رہی تھی، اس میں اس کا پریشان ہونا تو لازمی امر تھا۔

دروازے کے باہر ایک سب انسپکٹر اور دو کانسٹیبل کھڑے تھے۔ سب انسپکٹر، پارس پر نظر پڑتے ہی الجھن میں نظر آیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے پارس کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

''جی؟'' پارس سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''مسٹر سفیان یہیں رہتے ہیں؟'' سب انسپکٹر نے پوچھا۔

''جی ہاں، میں ان کی بیوی ہوں۔ خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت کے بارے میں آپ نے کیوں پوچھا؟'' سب انسپکٹر اسے ٹٹولنے والے انداز میں دیکھنے لگا۔

''دراصل...'' پارس جواب دیتے دیتے رکی اور پھر ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''اندر آجائیے... دروازے پر کھڑے کھڑے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

سب انسپکٹر نے کانسٹیبلوں کو باہر ہی رکنے کا اشارہ کیا اور پارس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ پارس نے اسے بٹھانے کے بعد کہا۔ ''خیریت کی بات میں نے اس لیے کی کہ میں سفیان کی وجہ سے کل سے ہی پریشان ہوں۔''

''کیوں؟''

''کل وہ دفتر سے آئے تھے تو خاصے پریشان تھے۔ انہوں نے مجھے پریشانی کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ پھر رات کو اچانک انہوں نے کچھ فیصلہ کیا اور اپنا کچھ ضروری سامان لے کر گھر سے چلے گئے۔ میں نے ان سے بہت پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں مگر انہوں نے اپنے کہیں جانے کا سبب نہیں بتایا۔ صرف یہ کہا کہ وہ کسی کام سے بیرونِ شہر جا رہے ہیں اور دو چار دن تک واپس نہیں آسکیں گے۔ پلیز، اب آپ مجھے بتائیے وہ خیریت سے ہیں یا نہیں؟''

''میں نہیں جانتا کہ وہ خیریت سے ہوں گے یا نہیں، نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ کس وجہ سے کہاں چلے گئے ہیں۔'' سب انسپکٹر نے کہا۔ ''پولیس ان سے مل کر یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ وہ اپنی کار اپنے گھر سے بہت دور ایک جگہ کیوں چھوڑ آئے ہیں۔''

''کہاں ملی ہے ان کی کار؟''

''آپ نے نام سنا ہی ہوگا۔ شہر کی مشہور عمارت ہے۔ رنگون والا بلڈنگ... ان کی کار وہاں کھڑی ہوئی ملی ہے۔ کچھ دکانداروں سے معلوم ہوا ہے کہ وہ کار سہ پہر سے ہی وہاں کھڑی ہے۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' پارس نے نفی میں سر ہلایا۔

''وہ جب دفتر سے آئے تھے تو اپنی کار میں نہیں آئے تھے؟''

''مجھے اس کا علم نہیں، نہ یہ معلوم ہے کہ وہ جب گئے تھے تو کیسے گئے تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہی ہے کہ ان کی کار رنگون والا بلڈنگ کے پاس کیسے پائی گئی۔''

''ان کے پاس موبائل تو ہوگا؟''

''جی ہاں، میں آج صبح سے دو مرتبہ ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر چکی ہوں مگر ان کا موبائل بند ملا ہے۔''

''ان کا نمبر مجھے دیجیے۔'' اس مرتبہ سب انسپکٹر کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے حکم دے رہا ہو۔

پارس نے بے چون و چرا سفیان کا نمبر سب انسپکٹر کو بتا دیا۔

سب انسپکٹر اپنا موبائل نکال کر اس پر وہ نمبر ملانے لگا جو پارس نے اسے بتائے تھے۔ پارس اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھی کہ سفیان کال ریسیو کرے گا یا نہیں۔

سب انسپکٹر نے تین مرتبہ نمبر ملایا اور اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات بڑھ گئے۔

''مسٹر سفیان نے اپنا موبائل بند کر رکھا ہے۔'' وہ بولا۔

''میں نے یہی بتایا تھا آپ کو۔'' پارس نے کہا۔ ''میں بھی دو مرتبہ کوشش کر چکی ہوں۔''

سب انسپکٹر کچھ سوچنے لگا پھر اچانک بولا۔ ''یہاں اور کون کون رہتا ہے؟''

''بس میں اور سفیان۔'' پارس نے جواب دیا۔ ''ہماری شادی ابھی کچھ ہی عرصے پہلے ہوئی ہے۔''

سب انسپکٹر چند لمحے غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''اب میں شاید آپ کو پہچان گیا ہوں۔ کچھ اشتہارات وغیرہ میں دیکھا ہے آپ کو۔''

''یقیناً دیکھا ہوگا۔'' پارس نے جواب دیا۔ ''میں شادی سے پہلے ماڈل گرل کی حیثیت سے کام کرتی رہی ہوں۔''

سب انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر یکایک کھڑا

ہو گیا۔

"مسز سفیان جب بھی آپ سے رابطہ کریں، آپ انہیں بتا دیجیے گا کہ پولیس کو ان کی تلاش ہے۔ اگر شام تک ان سے رابطہ نہ ہو سکا تو میرا خیال ہے کہ آپ کو پولیس ہیڈ کوارٹر طلب کر کے آپ کا بیان باقاعدہ ریکارڈ کیا جائے گا۔"

"ان کی کار؟"

"جب تک ان سے ملاقات نہیں ہو جاتی، ان کی کار پولیس کی تحویل میں رہے گی۔" سب انسپکٹر نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا پھر بولا۔ "اب مجھے یاد آ گیا۔ آپ کا نام پارس ہے۔"

"جی ہاں، پلیز آپ میری کچھ پریشانی دور کیجیے۔ آخر سفیان کہاں غائب ہو گئے ہیں؟"

"یہ تو وہی بتا سکیں گے مسز سفیان!"

پارس نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔

"آپ بھی ان سے رابطے کی کوشش کرتی رہیے گا۔" سب انسپکٹر نے باہر نکلتے وقت کہا۔

اسی وقت ایک بلی "میاؤں میاؤں" کرتی ہوئی اندر آ گئی۔ وہ کسی کی پالتو تو نہیں تھی لیکن اسی عمارت میں گھومتی رہتی۔ جس اپارٹمنٹ کے مکین اسے کھانے پینے کے لیے کچھ دے دیتے تھے، وہ ان سے مانوس ہو گئی تھی۔ پارس بھی اسے کچھ کھلا پلا دیا کرتی تھی۔

سب انسپکٹر کانسٹیبلوں کے ساتھ لفٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

پارس نے دروازہ بند کیا اور بلی کو گود میں لے کر کچن کی طرف بڑھی۔ ایک پیالا اس نے بلی ہی کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس نے بلی کو گود سے اتار کر پیالے میں تھوڑا سا دودھ انڈیلا اور بلی کے سامنے رکھ کر اس میں اس محلول کے چند قطرے بھی ٹپکا دیے جس کی شیشی اس کے گریبان میں تھی اور جو اسے سکندر، باشو کے لیے دے گیا تھا۔

بلی کو گود میں لیے کچن کی طرف بڑھتے ہوئے پارس کو یونہی خیال آ گیا تھا کہ وہ بلی پر اس محلول کا ردِعمل دیکھے۔ بلی کو دودھ پینا چھوڑ کر وہ شراب پینے کے لیے گلاس نکال رہی تھی کہ اس نے بلی کی چیخ سنی۔ گلاس اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا اور وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں کے ساتھ بلی کی طرف دیکھنے لگی جو فرش پر بری طرح تڑپ رہی تھی اور اس کے منہ سے "خرخر" کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کے تڑپنے کا وہ عمل دس بارہ سیکنڈ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ پھر وہ یک لخت ساکت ہو گئی۔

پارس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا کہ بے ہوشی کی دوا سے کسی کو تڑپنا تو نہیں چاہیے...... وہ اس طرح بلی کے قریب بیٹھی جیسے خواب کی حالت میں ہو۔ اس نے بلی کا دل ٹٹول کر دیکھا۔ یہ یقین آنے میں دیر نہیں لگی کہ بلی مر چکی تھی۔

پارس کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ اگر سکندر اسے بتا دیتا کہ وہ زہر ہے تو اس کام کے لیے وہ ہرگز تیار نہیں ہوتی۔ کسی کی قاتل بننے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ اندازہ سکندر کو بھی یقیناً ہو گا۔ اسی لیے اس نے یہ جھوٹ بولا تھا کہ وہ محلول صرف بے ہوش کرنے کے لیے ہے۔

موبائل کی گھنٹی نے پارس کو چونکا دیا۔ اس نے کال ریسیو کی جو سکندر کی تھی۔ وہ غرایا۔

"ابھی تک رپورٹ نہیں ملی تم سے؟ کیا ابھی تک......!"

"پولیس آ گئی تھی۔" پارس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "باشو کو میں نے اپنے بیڈ روم میں بھیج دیا تھا۔ پولیس آفیسر کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بات کی تھی اس سے۔"

"تفصیل سے بتاؤ، کیا پوچھ گچھ کی پولیس نے تم سے؟"

پارس نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ اس معاملے میں اسے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے۔" سکندر نے سب کچھ سننے کے بعد مطمئن انداز میں کہا۔ "اب تم جلدی سے وہ کام کر ڈالو جو تم سے کہا گیا ہے۔ تم مجھے اطلاع دے دو گی تو پندرہ منٹ میں ہی میرے آدمی وہاں آ کر اسے بے ہوشی ہی کی حالت میں اٹھا لے جائیں گے۔"

دراصل اس کے آدمی باشو کی لاش اٹھانے آتے اگر پارس سکندر کی ہدایت پر عمل کرتی لیکن اس نے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا کہ وہ سکندر کی ہدایت پر عمل کرے گی۔ اس کے برخلاف اب کچھ اور ہی خیالات اس کے دماغ میں کھدبدانے لگے تھے۔ وہ تیزی سے اپنے بیڈ روم میں پہنچی جہاں باشو ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے سے الجھن صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

"وقت بہت کم ہے باشو۔" پارس نے تیزی سے کہا۔ "کیا تم سکندر کے کسی بہت اہم راز سے واقف ہو؟"

"تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟" باشو نے منہ بنایا۔ "مجھے تم بس ہدایات دو۔ باس نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ مجھے ان ہدایات پر عمل کرنا ہے جو مجھے تم سے ملیں گی۔"

"مجھے کوئی ہدایت نہیں دینا ہے تمہیں...... مجھے کرنا صرف یہ تھا کہ تمہیں شراب پلاؤں اور اس میں بے ہوشی کی دوا ملا دوں۔" پارس نے شیشی نکال کر اسے دکھائی۔

باشو چونکا۔

پارس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھ سے یہی کہا گیا تھا کہ جب تم بے ہوش ہو جاؤ تو میں اسے فون پر اطلاع دے دوں۔ اس کے بعد وہ یہاں کسی کو بھیجے گا جو تمہیں بے ہوشی کی حالت میں یہاں سے لے جائیں گے۔"

"یہ اس نے کیوں چاہا ہے؟" باشو حیرت سے بولا۔ "اور تم مجھے یہ کیوں بتا رہی ہو؟"

"اس لیے کہ یہ محلول تمہیں بے ہوش کرنے کے لیے نہیں ہے۔ یہ زہر ہے لیکن میں تمہیں ہلاک نہیں کرنا چاہتی۔ میں اب تمہیں بچانا چاہتی ہوں۔ کچھ ایسی بات ہوئی ہے کہ اب مجھے سکندر سے نفرت ہو گئی ہے اور یہ جاننے کے بعد اب تمہیں بھی اس سے نفرت ہو جانا چاہیے کہ وہ تمہاری زندگی ہی ختم کرنا چاہتا ہے۔"

باشو حیرت اور الجھن سے پارس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"اگر تمہیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے تو میرے ساتھ آؤ۔"

پارس، باشو کو کچن میں لے گئی اور اسے بلی کی لاش دکھائی۔

"یہ اس بلڈنگ کی ایک آوارہ بلی تھی۔" پارس نے کہا اور پھر وہ سب کچھ بتا دیا جو اس نے کیا تھا۔ پھر بولی۔ "اگر اب بھی تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہی ہوں تو لو یہ شیشی، ایک قطرہ ٹپکا لو اپنی زبان پر۔" آخری فقرہ پارس نے جھنجلاہٹ میں کہا تھا کیونکہ وہ اب بھی باشو کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" باشو کی آواز بھرا گئی۔ اب اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے تھے۔ "لیکن تم تو مجھے چھوڑ رہی ہو، وہ مجھے اب بھی نہیں چھوڑے گا۔"

"میں بچاؤں گی تمہیں۔" پارس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "فی الحال تو تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

"میں سکندر سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔" باشو کے خوف زدہ چہرے سے مایوسی بھی ظاہر ہونے لگی تھی۔

"میں عورت ہوتے ہوئے بھی سکندر کی مخالفت میں کھڑی ہو چکی ہوں اور تم مرد ہو کر بھی مایوسی کی باتیں کر رہے ہو؟"

"اور غلط نہیں کر رہا ہوں۔" باشو نے کہا۔ "میں بھی آخر کار مارا ہی جاؤں گا اور تم بھی ماری جاؤ گی اس کے ہاتھوں۔"

"چلو میں فرض کر لیتی ہوں کہ ہم مارے جائیں گے لیکن انسان کو موت سے بچنے کی کوشش تو کرنا چاہیے۔"

"میری سمجھ میں تو نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کوشش کر سکتا ہوں۔"

"فوری طور پر تو روپوش ہو جاؤ۔"

"کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں میں سکندر کی دسترس سے محفوظ رہ سکوں۔"

"میرا وہ فلیٹ تو تم نے دیکھا ہی ہے جہاں میں شادی سے پہلے رہتی تھی۔ تم فوری طور پر تو وہاں چلے جاؤ۔ میں تمہیں اس کی چابی دے دیتی ہوں۔"

"اس کے بعد؟" باشو نے تذبذب سے پوچھا۔

"وہ ہم فون پر طے کر لیں گے بعد میں...... ابھی تو تم جلدی کرو۔ آؤ میرے ساتھ! میں تمہیں چابی دیتی ہوں اپنے فلیٹ کی۔"

باشو پریشانی کے عالم میں پارس کے ساتھ اس کی خواب گاہ میں واپس لوٹا۔ پارس نے ایک طرف رکھا ہوا اپنا پرس اٹھایا اور اس میں سے اپنے فلیٹ کی چابی نکال کر باشو کو دی۔

"جاتے ہوئے ایک کام کر ڈالو۔" پارس نے اس سے کہا۔ "یہ اتفاق ہے کہ یہاں ایک بہت پرانا ٹاٹ کا تھیلا پڑا ہوا ہے۔ تم بلی کی لاش اس تھیلے میں لیتے جاؤ۔ راستے میں کسی جگہ پھینک دینا۔ اور ہاں! اپنا موبائل اب بند کر دو۔ راستے سے کوئی موبائل خرید لینا۔" یہ باتیں کرتی ہوئی پارس باشو کے ساتھ کچن کی طرف لوٹی۔ "موبائل خریدنے کے پیسے ہیں تمہارے پاس یا میں دوں؟"

"میں گھر سے اچھی خاصی رقم لے کر نکلا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" پارس بولی۔ "دوسری بات یہ کہ مجھے اب دوسرے نمبر پر فون کرنا۔ وہ میں ابھی تمہیں لکھ کر دے دیتی ہوں۔ تم مجھے فون کرو گے تو مجھے بھی تمہارا نیا نمبر معلوم ہو جائے گا۔"

پارس نے کہیں سے ٹاٹ کا ایک پرانا تھیلا نکالا۔

اسی وقت موبائل پر سکندر کی کال آ گئی جو اس نے ریسیو نہیں کی۔ وہ جلدی سے بولی۔ "وہ مجھ سے تمہارے بارے میں ہی پوچھے گا لیکن میں ابھی اس سے بات نہیں

کروں گی۔ تم جلدی سے نکل جاؤ۔"

پارس نے عجلت میں اسے اپنا نمبر بھی لکھ کر دیا۔ اب ہاشو کی عجلت میں نظر آنے کا تھا۔ اس نے بلی کی لاش خود ہی تھیلے میں ڈال لی تھی۔ پارس نے اسے رخصت کرنے میں بہت جلدی کی اور اسے یہ ہدایت بھی کر دی کہ وہ عقبی راستہ استعمال کرے اور بہت احتیاط سے... اپارٹمنٹ کے سامنے کے راستے کی طرف تو امکان تھا کہ سکندر کے آدمی پہلے سے موجود ہوں۔

موبائل کی گھنٹی پانچ چھ مرتبہ بجنے کے بعد بند ہو چکی تھی۔

ہاشو کو اپارٹمنٹ سے رخصت کرنے کے بعد پارس نے خود سکندر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کال فوراً ریسیو کی گئی۔

"کہاں مرگئی تھی؟" کاٹ کھا جانے والے انداز میں کہا گیا۔

"میں... میں باتھ روم... باتھ روم میں تھی۔" پارس اس طرح لمبی لمبی سانسیں لینے لگی جیسے ہانپ رہی ہو... یہ اس کی محض اداکاری تھی۔ اس نے کہا۔ "میں سوچ بھی... سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"کیا نہیں سوچ سکتی تھیں؟" تیزی سے پوچھا گیا۔

"وہ... وہ بھاگ گیا؟"

"کیا؟" سکندر جیسے چیخ پڑا۔

اب پارس نے اپنی آواز میں سردنی پیدا کی۔ "میں نے اسے... گلاس بنا کر دے دیا تھا۔ پوری شیشی ہی... الٹ دی تھی... اس میں... پھر مجھے فوری طور پر ٹوائلٹ کی شدید حاجت ہوئی... میں باتھ روم میں چلی... چلی گئی... فون... فون کمرے ہی میں تھا اس لیے... میں آپ کی کال ریسیو نہیں کر سکی... باتھ روم سے نکلی تو... تو وہ غائب تھا... میں بھاگی بھاگی... دروازے تک گئی... وہ بھاگ گیا ہے سکندر... جانے کیا شبہ ہو گیا اسے... شراب کا گلاس... جوں کا توں چھوڑ گیا ہے۔"

"حرام زادی۔" سکندر کی آواز غصے سے کانپ گئی۔

"تم بھی حرام زادے ہو۔" پارس نے بڑی نفرت سے کہا مگر دل ہی دل میں، زبان پر تو یہ الفاظ لا ہی نہیں سکتی تھی۔

پھر دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

پارس نے موبائل بند کرتے ہوئے سر جھٹکا اور تیزی سے ایک بار پھر کچن میں پہنچی۔ بدقسمت بلی نے دودھ تھوڑا سا ہی پیا تھا۔ پارس نے باقی دودھ سنک میں بہا دیا اور اس پر خاصا پانی بھی بہایا۔ اس کے بعد وہ پھر پہلی خواب گاہ میں گئی۔ ایک گلاس میں شراب انڈیلی اور شیشی کا سارا محلول اس میں ڈال دیا۔ اسے بڑی حد تک یقین تھا کہ سکندر غصے میں وہاں آئے گا اس لیے وہ سارا سیٹ اپ ایسا رکھنا چاہتی تھی۔ سکندر کو کسی بات سے بھی کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔

دس منٹ گزرے تھے کہ موبائل کی گھنٹی پھر بجی۔ یہ کال بھی سکندر ہی کی تھی۔

"مجھے اتنا غصہ ہے تم پر کہ وہاں آ کر تمہیں اس کی کچھ سزا ضرور دیتا لیکن کچھ مصروفیت ہو گئی ہے۔ تم شراب کا گلاس اپنے باتھ روم کے فلیش میں بہا دو۔ گلاس اور شیشی بھی کسی طرح ضائع کر دو۔"

"یہ میری دوسری بہت بڑی غلطی ہے۔" اب پارس نے سسکنے کی اداکاری شروع کی۔ "مجھے آخری مرتبہ معاف کر دو سکندر... دراصل اس قسم کے کام میرے بس کے ہیں ہی نہیں۔ میری وجہ سے وہ کم بخت بچ نکلا۔"

"وہ مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا۔ وہ چوہے کی طرح کہیں دبکتا پھر رہا ہوگا لیکن میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔"

پارس کے مزید کچھ بولنے سے پہلے دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

پارس نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے یقین تھا کہ سکندر آتا تو اس کے ساتھ بری طرح پیش آتا۔ اس نے شراب ضائع کی۔ محلول کی شیشی چھوٹی سی تھی، وہ بھی اس نے فلیش میں بہا دی۔ دستانے پہن کر گلاس بہت اچھی طرح دھویا مگر احتیاطاً گلاس اور دستانے، دونوں ہی چیزیں لے جا کر اسٹور میں ڈال دیں۔ مزید احتیاط کے طور پر اس نے ہاتھ بھی تین چار منٹ تک دھوئے، پھر بیڈ روم میں جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ اب اسے ہاشو کے فون کا انتظار تھا۔

آدھا گھنٹا گزر گیا۔ اس دوران میں پارس نے اپنے نئے فون پر سفیان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ سفیان یقیناً اپنا موبائل تبدیل کر چکا تھا۔

آخر پارس کے نئے موبائل پر کال آ گئی۔ نمبر اجنبی تھا اس لیے پارس نے سمجھ لیا کہ وہ ہاشو ہی کا ہوگا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"میں تمہارے اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا ہوں۔" ہاشو کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"بس ٹھیک ہے۔ اب میری کال کا انتظار کرو۔ وہاں تم خود کو محفوظ سمجھو۔ سکندر کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں تمہیں پناہ

دے سکتی ہوں۔"
"آئندہ کے لیے تم نے سوچا کیا ہے؟"
"میں نے ابھی کہا نا... میری کال کا انتظار کرو۔"
ہاشو نے ایک طویل سانس لینے پر اکتفا کیا۔ پارس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

سفیان ٹی وی کی خبریں سننے کے لیے ہیڈ فون لگائے ہوئے تھا تاکہ ٹی وی کی آواز کمرے کے باہر نہ جا سکے۔
خبروں کے مطابق انتظامیہ نے شہر کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر قابو پالیا تھا۔ خواجہ ناصر بیگ کے قتل کے سلسلے میں تحقیقات جاری تھیں مگر ان تحقیقات کے نتائج سے میڈیا ابھی تک بے خبر تھا۔ قیاس آرائی کی جارہی تھی کہ تحقیقات کا سلسلہ رنگون والا بلڈنگ سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ دوسری طرف خواجہ ناصر بیگ کی پارٹی کے سربراہ نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا تھا کہ اگر تین دن کے اندر تحقیقات کا کوئی ٹھوس نتیجہ نہیں نکلا تو بڑے پیمانے پر احتجاج کیا جائے گا۔
اس کے بعد جو خبریں تھیں، ان سے سفیان کو قطعاً دلچسپی نہیں تھی لہٰذا اس نے صرف ہیڈ فون ہی نہیں اتارا بلکہ ٹی وی بھی آف کر کے وہ گلاس اٹھایا جس میں دو گھونٹ شراب باقی رہ گئی تھی۔ وہ اس کا دوسرا پیگ تھا۔ بوتل اس نے بند کر کے رکھ دی تھی۔ اس نے گلاس سے ایک گھونٹ لیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ سعدیہ اس کے لیے چائے لے کر آئی ہوگی۔ وہ دوپہر کو کھانا دے کر گئی تھی تو کہہ گئی تھی کہ اب وہ سہ پہر کو اس کے لیے چائے لے کر ہی آئے گی۔ وہ اس کمرے میں زیادہ وقت اس لیے نہیں گزار سکتی تھی کہ اس کی والدہ کو شبہ نہ ہو جائے۔
وہ ٹرے سنبھالے کمرے میں آئی تو سفیان کے ہاتھ میں شراب کا گلاس دیکھ کر اس کا منہ بن گیا۔
"میرا خیال ہے۔" وہ ناخوشگوار لہجے میں بولی۔ "تمہیں اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ جب میں تمہارے لیے چائے لاؤں گی تو خود بھی تمہارے ساتھ ہی پیوں گی۔"
سفیان نے آخری گھونٹ لے کر گلاس ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "سوری ڈیئر! اس کا اندازہ تمہیں بھی ہونا چاہیے کہ میں ذہنی طور پر کتنے دباؤ میں ہوں۔ اس دباؤ کو کم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں شراب کا سہارا لوں۔"
سعدیہ نے ٹرے تپائی پر رکھ کر اس کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تو یہ چائے اب میں اکیلی ہی زہر مار کروں؟"
"میں سوری کر چکا ہوں سعدیہ!" سفیان نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"تمہارا دوست... کیا نام ہے... ہاں یاد آیا جعفر... مجھے وہ یاد آرہا تھا۔ کیا رہا اس کا؟"
"ابھی پندرہ منٹ پہلے ہی اس کا فون آیا تھا۔ اپنا نیا فون نمبر میں نے اسے صبح ہی بتا دیا تھا۔ بتا کیا دیا تھا، میں نے کال ہی نئے نمبر سے کی تھی۔"
"یہ تو تم مجھے دوپہر کو بتا چکے ہو۔"
"یہ ذہنی حالت ہے میری۔" سفیان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "یاد ہی نہیں رہا تھا کہ تم سے یہ بات ہو چکی ہے۔"
"یہ بھی بتا دیا تھا تم نے کہ وہ جلد از جلد ملنے والی کوئی فلائٹ پکڑنے کی کوشش کرے گا۔"
"ابھی اس نے یہی بتایا ہے کہ وہ آدھے گھنٹے بعد بینکاک سے یہاں کے لیے روانہ ہو جائے گا۔" سفیان نے گھڑی دیکھی۔ "اب تو دس منٹ رہ گئے ہیں۔ وہ جہاز میں بیٹھ چکا ہوگا۔"
"پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے کی فلائٹ ہے شاید۔"
"پانچ گھنٹے بعد فون کر کے کنفرم کر لیں گے۔"
سعدیہ اس دوران میں اپنے لیے چائے بنا چکی تھی۔ سفیان کی وجہ سے اس کا پریشان ہونا بھی فطری امر تھا۔ وہ پریشانی اس کے چہرے پر صاف نظر آرہی تھی۔ سفیان اسے بتا چکا تھا کہ اپنی اس پریشانی سے نکلنے کا اسے ایک ہی حل سوجھ سکا تھا اور وہ یہ کہ اس معاملے میں اپنے دوست جعفر کی مدد حاصل کرے۔
جعفر اس کا بہت گہرا دوست تھا۔ ایک ایسا دوست جس پر سفیان اتنا ہی اعتماد کر سکتا تھا جتنا اس نے سعدیہ پر کیا تھا۔ اس سے مدد کی توقع اس لیے تھی کہ اس کا باپ ملک کی ایک سرکردہ ایجنسی میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھا۔ اسی وجہ سے جعفر کی سکونت اسلام آباد میں تھی لیکن وہ کراچی آتا رہتا تھا۔ فون پر سفیان کی اس سے بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ ان دنوں جعفر تفریحاً بینکاک گیا ہوا تھا۔ اگر وہ بیرون ملک نہ ہوتا تو اس سے رابطہ کرنے میں سفیان کو اتنی دیر نہ لگتی۔ وہ اسی دن صبح اس سے بات کر سکا تھا۔ فون پر اسے پریشانی کی تفصیل تو نہیں بتائی تھی لیکن اتنا کہہ دیا تھا کہ اس وقت ایک دہشت گرد کی وجہ سے اس کی زندگی خطرے میں ہے اور اس

معاملے میں اس کی مدد وہی، یعنی جعفر ہی کر سکتا ہے۔
سعدیہ چائے کا ایک گھونٹ لے کر بولی۔ "میں نے تم سے اب تک ایک سوال نہیں کیا لیکن سوچتی رہی ہوں کہ تم اس کے ذریعے اس کے باپ کا تعاون حاصل کر کے کیا کرنا چاہتے ہو؟"
"میں اس کے والد کو سکندر کی تصویر دے دوں گا اور پھر سکندر کی گرفتاری کے بعد بھی یہ بات سامنے نہیں آسکے گی کہ میں نے اس معاملے میں کچھ کیا تھا۔ یعنی میرا نام سامنے نہیں آئے گا۔"
"سکندر کی گرفتاری میں زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔" سعدیہ کے لہجے میں تشویش تھی۔
"ہاں، یہ تو عین ممکن ہے۔"
"مگر زیادہ دن تک تو میں تمہیں یہاں چھپائے نہیں رکھ سکتی۔ ڈیڈی واپس آجائیں گے تو یہ ممکن نہیں رہے گا۔" سعدیہ کی پریشانی میں اضافہ ہوا۔
"یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔" سفیان نے سر ہلایا۔ "سوچا ہے میں نے اس بارے میں بھی... جعفر ہی کے ذریعے اس کے والد سے اس بارے میں بھی مشورہ کروں گا۔ خود میرے ذہن میں ایک خیال یہ ہے کہ مجھے گرفتار کر کے جیل میں رکھا جائے اور ظاہر یہ کیا جائے کہ میری کار کیونکہ رنگون والا بلڈنگ کے پاس پائی گئی تھی اور پھر میں مفرور بھی ہو گیا تھا اس لیے مجھے شبہے میں گرفتار کر کے جیل میں مجھ سے پوچھ گچھ کی جارہی ہے۔ جیل میں میری زندگی محفوظ رہے گی۔ سکندر مجھے وہاں تو ہلاک نہیں کر سکتا۔ وہ جب تک گرفتار نہ ہو جائے، جیل میں میری زندگی محفوظ رہے گی۔"
"کیا ایسا ہوتا ہے کہ تفتیش کے لیے کسی کو جیل میں رکھا جائے؟"
"مجھے اس کی قانونی حیثیت کا علم نہیں۔ بس ایک خیال تھا ذہن میں جو میں نے تمہیں بتا دیا۔ جعفر کے والد پر منحصر ہے کہ وہ میری حفاظت کی کیا تدبیر کرتے ہیں۔"
سعدیہ کے چہرے سے سوچ بچار کا اظہار ہوتا رہا۔ وہ کچھ توقف سے بولی۔ "پارس سے رابطے اور سکندر کی پیشکش کے بارے میں تم نے کچھ سوچا؟"
"مجھے پارس کی باتوں پر بالکل یقین نہیں آیا ہے۔ اگرچہ اس نے اپنا جو نیا نمبر بتایا تھا، وہ میں نے فوری طور پر لکھ تو لیا تھا لیکن میں اس سے رابطہ نہیں کروں گا، البتہ یہ میں ضرور سوچ رہا ہوں کہ سکندر سے رابطہ کروں۔"
"کیوں؟" سعدیہ چونکی۔ "تم نے تو کہا تھا کہ..."
سفیان نے اس کی بات کاٹی۔ "جو میں نے کہا تھا، اس پر اب بھی قائم ہوں۔ میں اپنے ضمیر کا سودا نہیں کر سکتا۔ اس سے رابطہ میں اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ اسے الجھائے رکھوں۔ اسے اطمینان دلاتا رہوں کہ میں اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا۔ میری طرف سے خاموشی اسے شدید خطرے کا احساس دلائے گی اور وہ بہت زیادہ محتاط رہنے لگے گا۔ ایسی صورت میں اس کی گرفتاری بھی زیادہ مشکل ہو جائے گی۔"
"ہوں۔" سعدیہ نے سر ہلایا۔ "سوچا تو تم نے ٹھیک ہے۔ تم نے اس سے کہا بھی تھا کہ آج شام تک اسے کوئی جواب دو گے۔"
"لیکن شام کے بجائے ابھی فون کر لوں تو بہتر ہے۔ جعفر کے آنے کے بعد تو پھر جعفر کے والد کے مشورے کے مطابق ہی کچھ کرنا ہوگا۔"
"یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہو۔"
سفیان نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا موبائل اٹھایا اور قدرے تذبذب کے بعد لنگڑے سکندر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی مگر کال ریسیو نہیں کی گئی۔
"وہ تو کال ہی ریسیو نہیں کر رہا ہے۔" سفیان نے سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔
"اجنبی نمبر دیکھ کر اس نے محتاط رہنا ضروری سمجھا ہوگا۔"
"پھر تو اب اس سے رابطہ ممکن ہی نہیں ہے۔"
سعدیہ سوچ میں پڑ گئی۔ فکرمندی کا تاثر سفیان کے چہرے پر بھی تھا۔ یکایک وہ دونوں چونکے۔ موبائل پر میسج آنے کی وجہ سے اسکرین روشن ہوئی تھی۔
"اس نمبر پر مجھے کون میسج کر سکتا ہے۔" سفیان کے منہ سے نکلا۔
"دیکھو تو سہی... یہ موبائل کمپنی والے بھی تو میسج کرتے رہتے ہیں۔"
سفیان نے دیکھا اور ایک طویل سانس لی۔
"سکندر کا میسج ہے۔" اس نے کہا۔
"کیا لکھا ہے؟" سعدیہ نے بے چینی سے پوچھا۔
سفیان نے پھر موبائل فون کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ لکھا تھا۔

"PLS SMS I M BUSY"

سفیان نے وہ ایس ایم ایس بلند آواز میں پڑھا، پھر بولا۔ "اس کا مطلب ہے، وہ پہلے جاننا چاہتا ہے کہ اسے کال

کرنے والا کون ہے؟"

"تو پھر تم بھی ایس ایم ایس کر دو۔ وہ جان لے کہ فون کرنے والے تم ہو۔"

سفیان نے اثبات میں سر ہلایا اور ایس ایم ایس ٹائپ کرنے لگا۔ اس نے سکندر کو بتایا کہ وہ اسے ایک نئے نمبر سے فون کر رہا ہے کیونکہ پرانے نمبر سے اسے قانون نافذ کرنے والے "ٹریس" کر سکتے ہیں۔ اس نے مزید لکھا کہ وہ وہی ہے جسے سکندر نے ماہانہ ایک بڑی رقم دینے کی پیشکش کی ہے۔

سفیان نے ایس ایم ایس میں اپنا نام دانستہ نہیں لکھا۔ اس نے ایس ایم ایس میں اشارتاً بتا دیا تھا کہ وہ کون ہے۔ ایس ایم ایس بھیجنے کے بعد سفیان کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بمشکل ایک منٹ بعد سکندر کی کال آ گئی۔

"کیا بات کرو گے؟" سعدیہ نے جلدی سے پوچھا۔

سفیان نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔

"ہاں سکندر!" وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم میری آواز پہچان گئے ہو گے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا کہ اپنا نمبر بدل لیا۔" دوسری طرف سے سکندر کی آواز آئی۔ "پرانے نمبر کی وجہ سے تمہیں واقعی ٹریس کیا جا سکتا تھا۔ خیر، یہ تم نے اچھا کیا کہ مجھے شام تک انتظار کرنے کی کوفت سے بچا لیا۔ کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟"

"تمہاری پیشکش اچھی ہے۔ میں اسے قبول کر سکتا ہوں۔ میں کسی طرح پولیس کو بھی مطمئن کر دوں گا لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جب میں منظرِ عام پر آؤں گا تو تم مجھے ہلاک نہیں کرو گے۔"

"میں نے کل ہی تم سے کہا تھا کہ جہاں پیسے سے کام چل جائے، میں کسی کو قتل کرنا پسند نہیں کرتا۔"

"میں اس پر یقین کیسے کروں؟"

"یقین تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ مجھ پر اعتماد کرو یا میری تصویر قانون کے حوالے کر دو۔ لیکن دوسری صورت میں تم میرے انتقام سے نہیں بچ سکو گے۔ ہمیشہ روپوش تو نہیں رہ سکتے۔"

"ہاں۔" سفیان نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ہمیشہ تو روپوش رہ کر زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔"

"جب ہر پہلو پر تمہاری نظر ہے تو تمہیں اب تک کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔"

"رقم تم مجھے کس طرح دو گے؟"

"تم جس طرح چاہو۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

"مجھے اپنے لیے خطرہ مت سمجھو۔ اپنے گھر لوٹ آؤ۔ رقم تمہیں وہاں پہنچا دی جائے گی۔"

"ابھی تک میرے دل و دماغ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ میں تمہیں اپنے لیے خطرہ نہ سمجھوں۔"

"تو پھر فون نہ کرتے مجھے... وقت کیوں ضائع کیا ہے میرا اور اپنا؟" سکندر نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "اور اگر تم مجھے اس طرح الجھائے رکھ کر اس شہر سے یا اس ملک سے فرار ہونے کا کوئی منصوبہ بنانے کی مہلت حاصل کرنا چاہتے ہو تو میں بتا دوں کہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ تم اس ملک سے تو کیا، اس شہر سے بھی فرار نہیں ہو سکتے۔ ان تمام مقامات پر میرے آدمیوں کی نظر ہے جہاں سے کوئی اس شہر سے جا سکتا ہے۔ تم اسی وقت تک محفوظ ہو جہاں اس وقت روپوش ہو لیکن ہو سکتا ہے کہ وہاں بھی محفوظ نہ رہو۔ شاید میں تمہارے اس ٹھکانے کا سراغ لگا ہی لوں اور پہنچ جاؤں تم تک... لیکن اس صورت میں کوئی سودے بازی نہیں ہو سکے گی۔ جس دن بھی میں تم تک پہنچا، وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہو گا۔"

سفیان خاموشی سے سعدیہ کے چہرے پر نظریں جمائے سکندر کی ساری باتیں سنتا رہا۔ سعدیہ کی توجہ بھی سکندر کی آواز کی طرف تھی۔ سفیان نے ابتدا ہی میں موبائل کا اسپیکر اسی لیے کھول دیا تھا کہ سعدیہ سب کچھ سن لے ورنہ بعد میں سعدیہ اس سے سکندر کی باتوں کے بارے میں استفسار کرتی۔

"مجھے ہر بات کا اندازہ ہے۔" سفیان نے سکندر کے خاموش ہو جانے کے بعد کہا۔ "لیکن تمہارا خیال ضرور غلط ہے۔ میں اس شہر یا اس ملک سے فرار نہیں ہونا چاہتا۔ وہ بھی میرے لیے ایسا ہی ہو گا جیسے کسی مفرور کی زندگی گزرتی ہے۔"

"یہ سب سمجھنے کے باوجود تم نے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہی مجھے فون کر ڈالا۔"

"میں نے تم سے کب جو تھا کہ آج فون کروں گا۔"

"گویا صرف وعدہ وفا کیا ہے؟" سکندر نے طنز کیا۔

"میں نے سوچا تھا کہ شاید تم ہی کوئی ایسا بحر عمل دے سکو جو میرے لیے اطمینان بخش ہو۔"

"وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ اپنے گھر لوٹ آؤ۔ پارس بھی وہاں ہو گی، جو تمہاری ساتھی ہے۔ اگر اب تم اسے اپنے ساتھ نہ رکھنا چاہو تو اسے طلاق دے سکتے ہو۔"

"طلاق کیسے ممکن ہے، وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

سکندر نے فوراً جواب نہیں دیا۔ سفیان کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ سکندر اسے بچے کی حقیقت سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"چپ ہو گئے نا؟" سفیان بولا۔

"ہاں، میں سوچنے لگا تھا۔ ایسی صورت میں تم اس سے علیحدگی تو اختیار کر ہی سکتے ہو۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ میں رہے گی۔ بچے کی پیدائش کے بعد طلاق دے دینا۔ بچہ تو ظاہر ہے کہ اسی کے پاس رہے گا۔ جب وہ بڑا ہو جائے اور تم اسے لینا چاہو تو لے لینا۔ تمہیں اس سلسلے میں عدالت سے رجوع ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں تمہیں یہ ضمانت دے سکتا ہوں کہ بچہ وہ تمہیں دے دے گی۔ میری بات ٹالنے کی ہمت وہ نہیں کر سکے گی۔"

"ہوں۔"

"ہوں کیا... جواب دو۔ اپنے گھر لوٹ رہے ہو یا نہیں؟"

"تمہارا خوف دل سے نکالنے میں مجھے کچھ وقت لگے گا، یا ہو سکتا ہے کہ میں کوئی دوسری تدبیر سوچ لوں۔"

"اب اور کب تک سوچو گے؟" سکندر کا لہجہ پھر کھردرا ہو گیا۔

"مجھے کل تک کا وقت اور دو۔"

فوراً ہی دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ سفیان کے جواب سے سکندر جھنجلا گیا ہو گا۔

سفیان نے بھی اپنا موبائل بند کر کے ایک طرف رکھا۔

"اتنی لمبی چوڑی گفتگو کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" سعدیہ بولی۔

"اسی طرح اسے یقین دلایا جا سکتا تھا کہ میں واقعی الجھن کا شکار ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں اس کی پیشکش قبول کروں تو کس طرح کروں۔"

"کیا اس کا گروہ بہت بڑا ہے؟"

"ابھی اس نے جو باتیں کیں، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ شہر سے نکاسی کے ہر راستے پر اسی صورت میں نظر رکھی جا سکتی ہے جب اس کے پاس آدمیوں کی کمی نہ ہو۔"

"تو پھر خواجہ ناصر بیگ کا قتل اس نے خود کیوں کیا؟ یہ کام اپنے کسی اور آدمی سے کیوں نہیں لیا؟"

"اس بارے میں صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ خود بہت اچھا نشانے باز ہے۔ اس کے گروہ میں کوئی اور ایسا نہیں ہو گا۔ کسی سے اسے بہت معقول رقم اسی لیے ملی ہو گی کہ خواجہ ناصر بیگ بچنے نہ پائے۔"

"کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے خود ہی خواجہ ناصر بیگ سے کوئی پرخاش ہو؟"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔"

"اچھا تو... تمہارا وہ دوست جعفر جب آئے گا تو اس سے کس طرح ملو گے؟"

"وہ نہیں آئے گا۔ میں نے اسے بتا سمجھا دیا ہے۔"

ذرا دیر بعد سعدیہ کچھ دیر کے لیے چلی گئی۔ اسے اپنی والدہ کو رخصت کرنا تھا جو اس رات کسی کی وجہ سے اپنے ایک عزیز کے گھر جا رہی تھیں۔ ان کی واپسی دوسرے دن ہوتی۔

☆☆☆

پارس کے اپارٹمنٹ میں ہاشو بڑی بے چینی سے وقت گزار رہا تھا اور قدرے خوف زدہ بھی تھا۔ اسے مکمل یقین نہیں تھا کہ وہ پارس کے اپارٹمنٹ میں قطعی محفوظ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ الجھن بھی تھی کہ پارس نے آخر یہ سب کچھ کیوں کیا ہے؟

موبائل فون کی گھنٹی کی آواز نے اسے سوچ بچار کی دنیا سے باہر نکالا۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ کال پارس ہی کی تھی۔

"ہیلو!" ہاشو نے کال ریسیو کی۔

"میں عمارت میں داخل ہو چکی ہوں ہاشو۔" پارس کی آواز آئی۔ "تم دروازے کے قریب ہی رہنا۔ دروازے پر بھی میں اسی وقت پہنچوں گی جب آس پاس کوئی نہیں ہو گا۔ ایک مرتبہ کھٹکھٹاؤں گی۔ دروازہ کھولنے میں تم بالکل دیر نہ کرنا۔ فوراً کھولنا دروازہ۔"

"ٹھیک ہے۔" ہاشو نے اطمینان کی سانس لی۔ اب اسے پارس سے تفصیلی گفتگو کا موقع مل جاتا۔ وہ بہت تیزی سے بیرونی دروازے کے قریب پہنچ گیا اور دم سادھے انتظار کرنے لگا۔

باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ ہاشو نے نہایت عجلت سے دروازہ کھولا۔ پارس بڑی تیزی سے اندر آئی اور ہاشو نے دروازہ بند کر دیا۔ پارس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔

"بڑی احتیاط برتی ہے میں نے۔" پارس نے جیسے اطمینان کی سانس لی۔ "میں یہاں آتے ہوئے عمارت کے چوکیداروں کی نظروں سے بھی بچی ہوں۔ چلو اندر چلو۔" اس

نے بیگ ہاشو کی طرف بڑھایا۔ "اس میں تمہارے لیے کچھ کپڑے ہیں۔"

پارس بہت دھیمی آواز میں بولتی رہی، پھر بھی اس کے خیال میں ضروری تھا کہ اندرونی کمرے میں جا کر باتیں کی جائیں۔

ہاشو اس کے پیچھے چلتا ہوا اس کمرے میں پہنچا جسے پارس اپنے بیڈروم کے طور پر استعمال کیا کرتی تھی۔ ہاشو نے بیگ ایک طرف رکھ دیا۔

پارس بیٹھتے ہوئے بولی۔ "رات ہونے کے بعد یہاں آنا بہتر ہوتا لیکن میں چاہتی تھی کہ تم سے جلد از جلد ملاقات کر لوں۔ فون پر زیادہ باتیں نہیں کی جا سکتی تھیں۔"

"میں بھی بہت بے چین تھا تم سے ملنے کے لیے۔ ابھی تک مجھے یہ خواب سا لگ رہا ہے کہ تم باس کے خلاف ہو گئی ہو۔"

"نفرت ہو گئی ہے اب مجھے اس سے... کتیا سمجھنے لگا ہے وہ مجھے۔" پارس نے تیز لہجے میں کہا۔ "میری یہ نفرت اسے مہنگی پڑے گی۔"

"میں تو اب بھی اس سے خوف زدہ ہوں۔ کیا تمہیں ڈر نہیں لگ رہا ہے اس سے؟"

"اگر ڈر لگ رہا ہوتا تو میں یہ سب کچھ نہیں کرتی۔ جب دل میں کچھ ٹھان لی جائے تو سارا خوف کافور ہو جاتا ہے۔ اگر مجھے اس کا ڈر ہوتا تو میں تمہیں اس سے نہ بچاتی۔ زہر دے دیتی تمہیں... اب اس لنگڑے کو قانون کی گرفت تک پہنچانے کے لیے تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟" ہاشو کی آواز بھرا گئی۔

"...."

"بالکل ایسا نہیں ہوگا جو تمہارے دماغ میں ہے۔ اس مرتبہ کوئی بڑے سے بڑا وکیل بھی قانون کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکے گا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس مرتبہ اسے عمر قید نہیں بلکہ پھانسی ہی ہوگی۔"

"ہم سے اس کا انتقام اس کے باقی لوگ لیں گے۔"

"میں ایسا منصوبہ بنانا چاہتی ہوں کہ اس سارے معاملے میں ہمارا نام ہی نہ آ سکے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا منصوبہ ہے تمہارا؟"

"مکمل منصوبہ نہیں ہے ابھی میرے دماغ میں... بس ایک خاکہ ہے۔ اس منصوبے کو مکمل کرنے کے لیے ہمیں ایک اور فرد کی مدد بھی لینا ہوگی۔"

"وہ کون ہے؟"

"میرا شوہر سفیان۔"

بات ہاشو کی سمجھ میں نہیں آ سکی۔ وہ الجھی ہوئی نظروں سے پارس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

پارس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہاشو کو تمام حالات سے آگاہ کرتی۔ اسی صورت میں ہاشو کی ذہنی آمادگی ضروری تھی اور اس کے بعد ہی اسے بتایا جا سکتا تھا کہ پارس اس کے ساتھ مل کر کس منصوبے پر عمل کرنا چاہتی تھی۔

ہاشو نے وہ سب کچھ سن کر اس طرح سر ہلایا جیسے اب سکندر سے پارس کی برگشتگی کا سبب اس کی سمجھ میں اچھی طرح آ گیا ہو۔

"لیکن جب وہ تم پر اعتماد ہی نہیں کر رہا ہے تو تم اس کا تعاون کس طرح حاصل کر سکتی ہو؟" وہ بولا۔ "اس سے تو اب فون پر بھی تمہارا رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔"

"لیکن مجھے اندازہ ہے کہ وہ کہاں چھپا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ میں اس تک پہنچ سکتی ہوں اور اسے مجھ پر اعتماد بھی ہو سکتا ہے اگر میں اپنے منصوبے پر عمل درآمد کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"منصوبہ کیا ہے؟"

پارس نے جواب دینے کے بعد پوچھا۔ "تمہارے پاس ریوالور ہے؟"

"میرے پاس دو ریوالور ہیں۔" ہاشو نے جواب دیا۔ "عام طور پر تو ایک ہی ریوالور لے کر گھر سے نکلا کرتا تھا لیکن آج گھر سے نکلتے وقت جو غیر معمولی صورت حال تھی، اس کے باعث میں نے دونوں ہی ریوالور ساتھ لے لیے تھے۔"

"بغیر لائسنس کے ہوں گے؟"

"ظاہر ہے۔"

"خیر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے پاس جو پسٹل ہے، لائسنس اس کا بھی نہیں ہے۔ بس شوق تھا مجھے کہ پسٹل رکھا کروں۔ ان دنوں میں سکندر کی بہت لاڈلی تھی۔" مزید کچھ کہنے سے پہلے پارس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ "اسی نے وہ پسٹل دیا تھا مجھے۔ اسے چلانا بھی سکھایا تھا لیکن یہ بات میرے سان گمان میں آ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ پسٹل ایسے موقع پر میرے کام آئے گا۔ میں آج ہی رات اس منصوبے پر عمل کرنا چاہتی ہوں۔"

"ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہارا منصوبہ کیا ہے؟"

پارس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری اور پھر اس نے بتانا شروع کیا کہ اس کا منصوبہ کیا ہے۔ ہاشو نے بڑی توجہ سے سنا۔ جو کچھ ہاشو کو کرنا تھا، وہ اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سب کچھ سن کر وہ کچھ سوچنے ضرور لگا لیکن پارس بول پڑی۔

"میرا خیال ہے کہ اس طرح مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کامیابی ہونا تو چاہیے۔"

"بس تو اب میں چلتی ہوں۔" پارس کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں یہی سب کچھ بتانے کے لیے آئی تھی۔ اب میں تمہیں فون پر بتاؤں گی کہ ہمیں کس وقت حرکت میں آنا ہے۔" پھر اس نے پوچھا۔ "میرا خیال ہے، یہاں آتے وقت تم نے اپنے کھانے پینے کا بندوبست تو کر لیا ہوگا؟"

"ہاں۔" ہاشو نے جواب دیا۔ "میں کھانے پینے کا وافر سامان ساتھ لے کر آیا تھا جو کئی دن تک کام آ سکتا ہے۔ ریفریجریٹر بند تھا جو میں نے کھول لیا تھا۔ مائیکرو ویو اوون بھی ہے اس لیے مجھے اس معاملے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

پارس یہ سب کچھ سنتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی اور ہاشو اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

☆☆☆

ایک پُرآسائش کمرے میں سکندر موبائل کان سے لگائے ہوئے تھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔ دوسری طرف سے کوئی اس سے کہہ رہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ اس نے آدھے گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت گزارا تھا اپنے اپارٹمنٹ میں... اب وہ وہاں سے نکلی ہے اور میں اس کے تعاقب میں ہوں۔ راستے سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اب وہ پھر اپنے اسی اپارٹمنٹ کی طرف جا رہی ہے جہاں وہ سفیان کے ساتھ رہا کرتی تھی۔"

سکندر کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اس کے کھوئے کھوئے سے چہرے سے صاف ظاہر ہونے لگا تھا کہ اس وقت اس کے دماغ میں کئی خیالات چکرانے لگے تھے۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میرے لیے اب کیا حکم ہے باس؟"

"پارس کی نگرانی جاری رکھو اور اب پہلے سے زیادہ، بہت زیادہ محتاط ہو جاؤ۔ اسے بالکل شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔"

"میں شروع ہی سے اتنا محتاط رہا ہوں باس۔"

سکندر نے رابطہ منقطع کرنے کے بعد موبائل پر کسی اور سے رابطہ قائم کیا

"یس باس!" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"پارس پہلے جس اپارٹمنٹ میں رہتی تھی، اس کی نگرانی شروع کر دو۔ چھ گھنٹے بعد میں تمہاری جگہ لینے کے لیے کسی اور کو بھیج دوں گا۔ میں چوبیس گھنٹے نگرانی کروانا چاہتا ہوں اس اپارٹمنٹ کی۔"

"او کے باس۔"

سکندر نے رابطہ منقطع کر کے موبائل تپائی پر رکھا اور تپائی پر رکھا ہوا گلاس اٹھایا جو آدھا خالی تھا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے ہی پینا شروع کی تھی۔

جب اس نے پارس کی نگرانی شروع کروائی تھی، اس وقت اسے مکمل یقین نہیں تھا کہ پارس میں تبدیلی آ گئی ہے۔ بس معمولی سا شبہ ہوا تھا کہ ہاشو کے معاملے میں اس نے شاید غلط بیانی کی ہو لیکن اب اسے جو اطلاع ملی تھی تو اسے خاصی حد تک یقین آنے لگا تھا کہ پارس کی حرکات و سکنات مشتبہ تھیں۔ اسے اب یہ شبہ بھی ہو رہا تھا کہ خود پارس نے ہی ہاشو کو فرار کرایا ہو اور پھر اسے چھپنے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ کی چابی بھی دے دی ہو۔

اگر اس اپارٹمنٹ میں کوئی نہیں تھا تو پارس نے وہاں اتنا وقت کیوں گزارا؟ وہ اتنی دیر تک وہاں اکیلی تو نہیں رک سکتی تھی۔ شاید وہاں ہاشو ہی ہو جس سے وہ کوئی بات کرنے گئی ہو۔

سکندر کو وہ وقت بھی یاد آیا جب اس نے پارس کے ساتھ خاصی زیادتی کی تھی اور اسے ایسے الفاظ میں مخاطب کیا تھا جو اس نے پارس کے لیے پہلے کبھی استعمال نہیں کیے تھے۔ اس نے محسوس بھی کر لیا تھا کہ پارس کو اس کے وہ الفاظ شدت سے ناگوار گزرے تھے۔ بعد میں سکندر نے سوچا تھا کہ وہ پارس کا وقتی ردِعمل ہوگا لیکن ہاشو کے غائب ہو جانے کے بعد ہی اس کے دماغ میں اس شبہے نے سر ابھارا تھا کہ پارس اب کہیں بدل تو نہیں گئی؟ اس کے خلاف تو نہیں ہو گئی؟

اگر واقعی ایسا ہے اور اسی نے ہاشو کی جان بچائی ہے اور اسے اپنا اپارٹمنٹ بھی دیا ہے تو آخر کس لیے؟

سکندر اس کا کوئی جواب نہیں سوچ سکا۔

کچھ بھی ہو، اس نے بڑے سکون سے سوچا... اب ہاشو کے ساتھ وہ بھی ماری جائے گی۔

پیگ کے دو تین گھونٹ لینے کے بعد اس نے اپنا موبائل اٹھایا اور گلاس تپائی پر رکھنے کے بعد پارس کا نمبر

طرح۔

''یس!'' پارس کی آواز میں چہکار تھی۔ ''اس وقت کیسے یاد آ گئی میں تمہیں؟''

''میرے کمرے میں تمہاری ایک تصویر رکھی ہے جانِ من... اسی پر نظر پڑی تو جی چاہا کہ تم سے باتیں کروں۔ کہاں ہو اس وقت؟''

''راستے میں ہوں بلکہ گھر کے قریب پہنچ چکی ہوں۔ کچھ شاپنگ کرنے کے لیے نکلی تھی۔''

سکندر کے شبہے کو مزید تقویت حاصل ہو گئی کیونکہ پارس یہ بات گول کر گئی تھی کہ اس نے اپنے پہلے اپارٹمنٹ میں وقت گزارا تھا۔ شاپنگ والی بات بالکل غلط تھی۔ اگر اس نے شاپنگ کی ہوتی تو اس کی نگرانی کرنے والا سکندر کو اس سے بھی آگاہ کرتا۔

''ہاشو کا کچھ پتا چلا؟'' پارس نے پوچھا۔

''چل ہی جائے گا۔'' سکندر نے بے پروائی کا اظہار کیا۔ ''مجھے اس بات کا افسوس ہے جانِ من کہ اس کے غائب ہونے پر میں نے تمہیں بُرا بھلا کہہ ڈالا تھا اور سفیان کے بھاگ جانے پر بھی تم سے زیادتی کی تھی۔''

''میں تو بھول بھی چکی ہوں۔'' پارس نے ہنس کر کہا۔ ''دونوں مرتبہ بات ہی ایسی ہوئی تھی کہ تمہیں غصہ آنا ہی چاہیے تھا۔ بہرحال اس وقت تمہارا فون آیا تو میں بہت خوش ہوئی ہوں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ تم نے میری دوسری غلطی بھی معاف کر دی ہے۔''

''تم سے پیار جو ہے مجھے۔'' سکندر نے کہا۔ ''آج کی رات میں تمہارے ساتھ ہی گزاروں گا۔''

دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔

''ہیلو!'' سکندر بولا۔ ''خاموش کیوں ہو گئیں؟''

''وہ... وہ کچھ نہیں... میں یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تم کس وقت آؤ گے؟''

''کوئی مصروفیت ہے کیا؟''

''کوئی مصروفیت نہیں اور اگر ہوتی بھی تو وہ میں تمہاری وجہ سے ختم کر دیتی۔ وقت اس لیے پوچھ رہی تھی کہ اگر جلدی آؤ تو کھانا بھی تیار کر لوں تمہارے لیے۔''

''نہیں، اتنی جلدی تو نہیں آؤں گا۔ بارہ ایک بجے کے بعد ہی آنا ہو گا۔''

''بس اسی لیے پوچھ رہی تھی۔ لو میرا گھر آ گیا۔ گاڑی روک رہی ہوں۔ فون بند کرنا پڑے گا۔''

''او کے۔'' سکندر نے خود ہی رابطہ منقطع کر دیا اور موبائل رکھ کر گلاس اٹھا لیا جس میں اب دو ایک ہی گھونٹ بچے تھے۔

'رات کو کچھ مصروفیت ضرور ہے اسے۔' سکندر نے گھونٹ لیتے ہوئے سوچا۔ 'لہٰذا یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ مصروفیت کیا ہو گی۔'

موبائل پر کال آئی جس میں سکندر کو بتایا گیا کہ پارس کی کار اپارٹمنٹ کے احاطے میں جا چکی تھی۔

''نگرانی جاری رکھو۔'' سکندر نے اتنا ہی کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا تھا پھر اس نے شراب کا گلاس خالی کر کے اسے دوبارہ بھرا پھر موبائل پر پارس سے رابطہ قائم کیا۔

پارس کی ہنستی ہوئی آواز آئی۔ ''مجھ سے باتیں کرنے کے لیے آج بہت بے قرار ہو۔''

''بات کچھ اور ہے جانِ من... ابھی ایک کال آ گئی تھی۔ رات کا ایک کام نکل آیا ہے۔ میں نے سوچا تمہیں بتا دوں۔ اب میں کل رات آؤں گا۔''

''کام نکل آیا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ضروری ہے۔''

سکندر نے ماؤتھ پیس کو پیار کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔ پیار کی آواز یقینی طور پر پارس نے بھی سنی ہو گی۔ سکندر چاہتا بھی یہی تھا کہ پارس اس کی طرف سے بالکل مطمئن رہے۔ اسی صورت میں وہ آزادانہ نقل و حرکت کر سکتی تھی اور اس کی آزادانہ نقل و حرکت سے ہی سکندر اس معاملے کی تہ تک پہنچ سکتا تھا۔

اس نقل و حرکت کا علم سکندر کو رات کے ساڑھے نو بجے ہوا۔ اطلاع ملی تھی کہ پارس اپنے گھر سے کہیں روانہ ہو چکی ہے لیکن اس کے بعد جو دوسری اطلاع ملی، اس نے سکندر کو چونکا دیا۔ اطلاع یہ تھی کہ پارس کے ذاتی اپارٹمنٹ کی عمارت سے ہاشو کو باہر نکلتے دیکھا گیا تھا۔

اطلاع دینے والے نے کہا تھا۔ اس کو میں نے شلوار قمیص پہنے ہوئے کبھی نہیں دیکھا لیکن وہ اس وقت بہت گہرے رنگ کی شلوار اور لمبی قمیص پہنے ہوئے ہے۔ سر پر سندھی ٹوپی ہے اور وہ کچھ لنگڑا کے چل رہا ہے۔''

سکندر نے اتنی سختی سے دانت پر دانت جمائے کہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ اس کا یہ شبہ یقین میں بدل چکا تھا کہ پارس نے ہاشو کو ہی اپنے اپارٹمنٹ میں چھپایا تھا۔ وہاں سے نکلتے وقت ہاشو نے اپنی ہیئت میں تبدیلی اس لیے کی تھی کہ اسے شناخت نہ کیا جا سکے یا آسانی سے شناخت نہ کیا جا سکے۔

''وہ کچھ ڈرا ڈرا سا لگ رہا ہے باس!'' اطلاع دینے والے نے مزید کہا۔ ''وہ کوشش کر رہا ہے کہ اندھیرے میں چلے۔ میں اسے اڑا دوں باس؟''

''نہیں۔'' سکندر نے سختی سے کہا۔ ''دیکھنا ہو گا کہ وہ کہاں جاتا ہے، وہ کس لیے وہاں سے نکلا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ پارس سے ملے۔ مجھے تھوڑی دیر پہلے اطلاع ملی تھی کہ وہ اپنے گھر سے روانہ ہوئی ہے۔ تم ہاشو پر کڑی نظر رکھو اور بہت محتاط رہے۔''

سکندر نے جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کیا اور ٹہلنے لگا۔ ایک ٹانگ مصنوعی ہونے کی وجہ سے اس کی چال میں خفیف سی لڑکھڑاہٹ تھی جسے غور کرنے پر ہی محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس کے چہرے سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ وہ گہری سوچ بچار میں تھا۔

مشکل آدھے منٹ بعد اس نے پھر ایک کال ریسیو کی۔

''آپ کا خیال ٹھیک نکلا باس! وہ ایک گلی میں رک گیا تھا۔ پارس کی کار وہاں آئی اور وہ اس میں بیٹھ گیا۔''

''ہوں۔'' سکندر نے سر ہلایا۔ قاسم کو لگایا تھا میں نے پارس کی نگرانی پر۔''

''ابھی تو وہ مجھے نظر نہیں آیا۔''

''تمہیں جو ہدایت کی تھی، وہی اسے بھی کی تھی کہ بہت احتیاط برتے۔ بہرحال اب تم بھی پارس کی کار پر نظر رکھو۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ دونوں کہاں جا رہے ہیں۔''

''او کے باس۔''

سکندر نے رابطہ منقطع کر دیا۔ گفتگو کرتے ہوئے بھی وہ ٹہلتا ہی رہا تھا۔

بیس منٹ بعد اس کے موبائل پر قاسم کی کال آئی۔

''باس! پارس نے سوسائٹی کی ایک گلی میں کار کھڑی کی ہے۔ اس کے ساتھ ہاشو بھی ہے۔ وہ دونوں گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئے ہیں اور ایک بنگلے کے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہاں اس وقت تاریکی ہے۔ شاید یہ اس علاقے میں لوڈشیڈنگ کا وقت ہو۔''

☆☆☆

''یہ اندھیرا لوڈشیڈنگ کی وجہ سے ہے۔'' پارس بہت دھیمی آواز میں ہاشو کو بتا رہی تھی۔ ''میں نے اس وقت کا انتخاب خاص طور سے اسی لیے کیا تھا۔ میں نے معلوم کر لیا تھا کہ یہاں لوڈشیڈنگ کس وقت ہوتی ہے۔''

''لیکن اس اندھیرے سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟'' ہاشو بولا۔ ''بنگلے میں کس طرح داخل ہوا جائے؟''

ہاشو کی نظریں سامنے کی رو کے اس بنگلے پر جمی ہوئی تھیں جو اس کے اور پارس کے عین سامنے کے بنگلے کے بائیں جانب پر تھا۔ کھڑے ہونے کے لیے پارس نے یہ جگہ اس لیے منتخب کی تھی کہ وہاں زیادہ اندھیرا تھا۔ کم یا زیادہ اندھیرا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ بعض بنگلوں کے جنریٹر یا یو پی ایس کام کر رہے تھے جس کی وجہ سے بعض مقامات پر کم تاریکی تھی۔

سڑک پر سناٹا بھی تھا۔ اگرچہ حکومت یہ اعلان کر چکی تھی کہ اس نے شہر کی کشیدگی پر قابو پا لیا ہے لیکن کچھ علاقوں میں تھوڑی بہت گڑبڑ اب بھی تھی۔ ٹارگٹ کلنگ کے پندرہ سولہ واقعات ہو چکے تھے جس کی وجہ سے شہر میں خوف و ہراس کی فضا قائم تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں گویا مقید تھے۔ پوش علاقوں کے لوگ تو خصوصاً بہت زیادہ محتاط رہتے ہی ہیں۔ وہاں سے اب تک کوئی گاڑی بھی گزرتی نظر نہیں آئی تھی۔

پارس نے ہاشو کے جواب میں کہا۔ ''کسی وجہ سے میں نے یہ احتیاط برتی تھی کہ دن میں اس طرف نہیں آئی تھی ورنہ اس کی کوئی تدبیر بھی پہلے ہی سے سوچ لیتی۔ اب میں سوچ رہی ہوں کہ ہمیں اس بنگلے کے پیچھے جانا چاہیے۔ ادھر سے شاید کوئی صورت نکل سکے داخلے کی ورنہ پھر جبراً گھسنا پڑے گا۔''

''جبراً؟''

''ہاں۔'' پارس نے کہا۔ ''پھاٹک پر جا کے بیل دیں گے تو چوکیدار یقیناً آئے گا۔ اسے ہم ریوالور کی نال پر لے لیں گے لیکن یہ آخری صورت ہو گی۔ پہلے ہمیں کچھ اور امکانات دیکھنا چاہئیں۔''

اس کے بعد ان دونوں نے سڑک پار کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ خاصے فاصلے پر کسی کار کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں جو قریب آتی جا رہی تھیں۔ اگرچہ وہ دونوں ابھی ہیڈ لائٹس کی زد پر نہیں آتے لیکن پارس نے احتیاط ضروری سمجھی۔

''اسے نکل جانے دو۔'' اس نے ہاشو سے کہا۔

ہاشو کا اٹھتا ہوا قدم رک گیا۔ وہ دونوں اس طرح کھڑے ہو گئے کہ الیکٹرک پول کی آڑ میں رہیں اور کار جب ان کے قریب سے گزرے تو بھی انہیں دیکھا نہ جا سکے۔

ہاشو ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

کار کی رفتار اتنی کم تھی کہ ان کے قریب پہنچنے میں اسے دو منٹ لگ گئے۔ وہ ان کے سامنے سے تقریباً رینگتی ہوئی گزری۔ ڈرائیونگ سیٹ پر باوردی شوفر تھا۔ پچھلی نشست پر سوٹ میں ملبوس ایک جوان العمر شخص تھا۔

کار یکایک رک گئی۔ ہاشو اور پارس چونک گئے۔ کار ان کے سامنے سے تو نکل گئی تھی مگر اتنی قریب رکی تھی کہ وہ

دونوں ہاتھ بڑھا کر اس کی ڈکی چھو سکتے تھے۔

"میں تو مصیبت میں پڑ گیا ہوں سفیان!" کار کی طرف سے آواز آئی جو بہت مدھم ہو کر پارس کے کانوں تک پہنچی تھی۔ وہ سفیان کا نام سن کر چونک گئی۔ اگر اس نے کار کی پچھلی نشست پر صرف ایک شخص کو نہ دیکھا ہوتا تو وہ یہی سمجھتی کہ کار میں سفیان بھی ہوگا۔ یہ اس کے خیال میں ممکن نہیں تھا کہ سفیان باوردی شوفر بنا ہوا ہے۔ اسی لیے پارس کے ذہن میں یہ بات آگئی کہ کار میں موجود شخص نے موبائل فون پر سفیان کو مخاطب کیا تھا۔

اس خیال کی تصدیق کار میں بیٹھے ہوئے شخص کے دوسرے جملے سے ہو گئی۔ "ہاں میں اس وقت اسی سڑک پر ہوں جس کے بارے میں تم نے بتایا تھا... یہاں تو بیشتر گھروں کے باہر کھجور کے درخت ہیں... ہاں ہاں، مجھے یاد ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ اس سڑک پر کھجور کے دو درخت ٹیڑھے ہیں لیکن مجھے اب تک ایک بھی نظر نہیں آیا۔"

پارس کے دماغ نے اس وقت بہت تیزی سے کام کیا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ سفیان نے اس شخص کو کہیں سے بلایا تھا لیکن اس شخص کو سعدیہ کے گھر کا علم نہیں تھا۔

"ہاں۔" کار میں بیٹھے ہوئے شخص کی آواز پھر آئی۔ "میرے پاس اپنی کار کہاں سے آجائے گی۔ ائرپورٹ سے کرائے پر لی ہے... اچھا خیر، میں ابھی اور آگے بڑھتا ہوں۔"

اس وقت پارس بڑی سرعت سے حرکت میں آئی۔ ہاشو کا ہاتھ دبا کر اس نے اسے وہیں رکنے کا اشارہ کیا تھا۔

اس سے پہلے کہ کار حرکت میں آتی، پارس اس کی پچھلی نشست کی کھڑکی کے قریب پہنچ گئی۔

"کیا آپ کو کسی خاص گھر کی تلاش ہے؟" وہ انگریزی میں بولی تھی اور اس کا لہجہ نہایت جینٹلمانہ تھا۔

"جی ہاں۔" کار میں بیٹھے ہوئے شخص نے اس کی طرف دیکھا۔ "اگر آپ اسی علاقے میں رہتی ہیں تو شاید آپ کو افضال صاحب کا گھر معلوم ہو۔ ان کی ایک بیٹی ہے جس کا نام سعدیہ ہے۔"

"ارے!" پارس ہنسی۔ "سعدیہ تو میری دوست ہے۔ اسی سے ملنے آئی ہوں میں بھی۔ میری کار کچھ فاصلے پر پنکچر ہو گئی تھی۔ وہیل بدلنا میرے لیے ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے سوچا کہ سعدیہ کے کسی شوفر کو بھجوا دوں گی۔"

"میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ مجھے وہاں تک پہنچا دیں۔ آپ کو بھی وہیں جانا ہے اس لیے کار میں ہی آجائیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے خود ہی کار کا اس طرف کا دروازہ کھول، جدھر کار کھڑی ہوئی تھی۔

پارس پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اگر کار والے نے یہ "اخلاق" نہ دکھایا ہوتا تو پارس زبردستی کار میں بیٹھ جاتی اور اسے اپنے پستول کا سہارا لینا پڑتا جو وہ کار والے کی کمر سے لگا دیتی۔

ہاشو کو اس نے اپنے ساتھ اس لیے نہیں لیا تھا کہ اس کی وضع قطع کار والے کو شبہے میں ڈال سکتی تھی لیکن اس نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر ہلایا۔ یہ ہاشو کے لیے اشارہ تھا کہ وہ بھی کار کے پیچھے آئے۔

اب اتنی عقل تو ہاشو میں تھی ہی کہ کار اندر جانے کے بعد وہ چوکیدار سے کس طرح پیش آتا۔

کار چل پڑی۔

"زیادہ رفتار نہیں شوفر!" پارس بولی۔ "بس وہاں رکنا ہے۔" اس نے آگے جھک کر سعدیہ کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ!" کار میں بیٹھا ہوا شخص بولا۔ "اتنا قریب تھا میں۔"

پارس ہنسی۔ "کبھی ہوتا ہے ایسا... منزل کے قریب پہنچ کر بھی انسان بھٹکتا رہ جاتا ہے۔"

"میں اپنے دوست کو بتا دوں کہ گھر مل گیا ہے۔" کار والے نے اپنی جیب سے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔

"میرے بارے میں نہ بتایئے گا۔" پارس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں سعدیہ کو سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔ اس وقت اسے توقع نہیں ہوگی کہ میں آؤں گی۔"

وہ مسکرایا۔ موبائل پر اس نے سفیان سے رابطہ کر لیا تھا۔ اس وقت کار بنگلے کے پھاٹک پر رکی تھی اور شوفر نے ہارن بھی دے دیا تھا۔

"میں پہنچ گیا ہوں سفیان۔" وہ موبائل میں بولا۔ "یہ ہارن میرے شوفر ہی نے دیا ہے۔"

اس نے موبائل اس کان سے لگا رکھا تھا جدھر پارس بیٹھی تھی۔ اس نے سفیان کی مدھم آواز سنی۔ "اچھا جعفر! میں کھلواتا ہوں پھاٹک... سعدیہ باہر آئے گی تمہیں لینے... وہ تمہیں اس کمرے میں لے آئے گی جہاں میں ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

سفیان کی آواز سن کر پارس کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ جس شخص کے ساتھ بیٹھی تھی، اس کا نام جعفر ہے۔

پھاٹک کھل گیا۔ پارس نے اپنی لپ اسٹک ٹھیک کرنے کے بہانے پرس میں سے چھوٹا سا آئینہ نکال کر بظاہر لپ اسٹک ہی ٹھیک کی تھی لیکن دراصل اس نے عقب کا جائزہ لیا تھا۔

کار پھاٹک میں داخل ہو رہی تھی۔

پارس نے آئینے میں دیکھا کہ اندھیرے میں ایک سایہ لپکتا ہوا پھاٹک کی طرف آرہا تھا۔ وہ سایہ ہاشو ہی کا تھا۔ پارس مطمئن ہو گئی۔ ہاشو جیسے شخص کے لیے قطعی مشکل نہیں تھا کہ وہ پھاٹک بند ہونے سے پہلے ہی چوکیدار کو اپنے قابو میں کر لیتا۔

کار پھاٹک سے گزری۔ احاطہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ برآمدہ دکھائی دے گیا۔ چوکیدار نے اس طرف اشارہ بھی کر دیا تھا۔ برآمدے میں سعدیہ بھی نظر آگئی۔ پارس اسے پہلے بھی کئی بار دیکھ چکی تھی لیکن وہ جعفر کے ساتھ پارس کو دیکھ کر یقیناً چونک جاتی۔

اب پارس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنے پستول سے کام لے۔ اس نے بہ آہستگی پستول نکال کر جعفر کی کمر سے لگا دیا۔

"اب بس خاموش ہی رہنا ورنہ ایک ہی گولی تمہیں کسی قابل نہیں رہنے دے گی۔" اس نے اپنی آواز اتنی مدھم رکھی تھی کہ شوفر ایک لفظ بھی نہ سن سکے۔

جعفر فوری طور پر چونکا اور پھر اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ وہ بہت زیادہ خائف تو نظر نہیں آیا مگر اس کے تاثرات معمول کے مطابق بھی نہ رہے۔

کار برآمدے کے سامنے رکی تو پارس نے کہا۔ "پہلے تم ہی اترو۔"

شوفر نے کار کی ہیڈ لائٹس اب بھی روشن رکھی تھیں۔ جعفر اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اترنے لگا۔

"ہیڈ لائٹس بجھا دو۔" پارس نے شوفر سے کہا۔

شوفر کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس نے تو ہیڈ لائٹس اس لیے آن رکھی تھیں کہ اس کی سواریوں کو اندھیرے میں دقت نہ ہو لیکن پارس کے لیے اندھیرا ضروری تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ سعدیہ اسے فوراً پہچان لے۔

برآمدے میں کم روشنی کا ایک بلب جل رہا تھا۔ جعفر کے پیچھے اسی دروازے سے پارس بھی اتری۔ اس نے کوشش کی تھی کہ اس کے پستول کی نال جعفر کی کمر سے لگی رہے۔

برآمدے کے بلب کی مدھم روشنی کار تک پہنچ رہی تھی۔ سعدیہ نے جعفر کے ساتھ ایک اور لڑکی کو دیکھ بھی لیا ہوگا لیکن کم روشنی کے باعث پہچان نہیں سکی ہوگی۔ تاہم اس کے چہرے پر الجھن کا تاثر دکھائی دیا۔ اس کے خیال کے مطابق جعفر کو اکیلا ہونا چاہیے تھا۔

پارس کو وہ اس وقت پہچان سکی جب وہ جعفر کے ساتھ برآمدے میں پہنچی۔

"تم!" اس کے منہ سے نکلا۔

"خاموشی سے اندر چلو۔" پارس نے اس سے کہا۔ "تم دیکھ ہی سکتی ہو کہ میرا پستول کہاں ہے۔"

پارس نے اس کا خیال رکھا تھا کہ برآمدے کے سامنے کھڑی کار کا شوفر اس کا ریوالور نہ دیکھ سکے۔ اس کے لیے اس نے اپنے جسم کو آڑ بنایا تھا۔

"جلدی کرو۔" پارس غرائی۔

سعدیہ پر بوکھلاہٹ سی طاری ہو گئی تھی۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف گھوم گئی۔

"چلو دوست!" پارس نے جعفر کو بھی پستول کی نال سے دھکیلا۔

آگے پیچھے وہ تینوں جس کمرے میں داخل ہوئے، وہ ڈرائنگ روم تھا۔ یہاں روشنی قدرے زیادہ تھی۔

"اب۔" پارس نے سعدیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اس کمرے میں لے چلو جہاں سفیان ہے۔"

"سفیان یہاں نہیں ہے۔" سعدیہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"بکواس مت کرو۔" پارس نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "ابھی موبائل پر سفیان سے بات ہو چکی ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ تم ہی ہمیں لینے کے لیے باہر آؤ گی۔" پارس نے جعفر کی طرف دیکھا۔ "کیوں؟ یہی کہا تھا نا سفیان نے؟"

جعفر کچھ نہیں بول سکا۔ اس کے چہرے سے بے بسی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

سعدیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تلخی سے کہا۔ "اچھے دوست ہیں آپ سفیان کے۔"

جعفر اب بھی کچھ نہیں بولا اور بولتا بھی کیا۔ اس نے نظر جھکا کر بس پستول کی طرف دیکھا جو پارس نے اب بھی اس کی کمر سے لگا رکھا تھا۔ اس طرح جعفر نے سعدیہ کو گویا یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ بے بس ہے۔

"چلو سعدیہ!" پارس پھر بولی۔

"چاہتی کیا ہو تم؟" سعدیہ نے اپنی بدحواسی پر قابو پانے کی کوشش کی۔

اسی وقت ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر ہاشو اندر آیا۔ سعدیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ میرے ساتھ ہے۔" پارس بولی پھر اس نے ہاشو سے پوچھا۔ "کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟"

"دشواری کیا ہوتی؟" ہاشو بولا۔ "کنپٹی پر ایک گھونسا بھی وہ برداشت نہیں کر سکا، بے ہوش ہو گیا۔ میں اسے باندھ

کر ڈال دیا ہوں۔ منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا ہے تاکہ ہوش میں آنے پر وہ شور نہ مچا سکے۔''

''باہر کار بھی کھڑی ہے۔ شوفر بھی ہے۔''

''اس سے مجھے کینے ں سرورت ہی بسر کی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا ضرور لیکن یوں نہ کیا... میں اطمینان سے چلتا ہوا اندر آگیا۔''

پارس پھر سعدیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''تم نے سنا نہیں؟''

''میں سفیان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔'' سعدیہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''چاہے تم مجھے بھی گولی مار دو۔ گولی چلنے کی آواز سن کر سفیان ہوشیار ہو جائے گا اور اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کرلے گا۔''

اسی وقت سعدیہ کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں ہی تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کال ریسیو کرتی، پارس نے موبائل اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کال سفیان ہی کی ہوگی۔ وہ حیران ہوگا کہ سعدیہ اور جعفر اب تک اس کے کمرے میں کیوں نہیں پہنچے۔

''ہاشو اس لڑکی کا منہ دبا دو۔ یہ کچھ بول نہیں سکے۔''

ہاشو نے جھپٹ کر سعدیہ کو اپنی گرفت میں لیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ دبا دیا۔ سعدیہ بری طرح مچلی لیکن ہاشو جیسے طاقتور شخص کے آگے کچھ چل نہیں سکی۔

پارس نے اسکرین پر نظر ڈال کر دیکھ بھی لیا تھا کہ وہ کال سفیان ہی کی تھی جس کی گھنٹی اب بھی بج رہی تھی۔

اس دوران میں پارس نے خود کو ایسی پوزیشن میں رکھا تھا کہ جعفر خود کو پستول کی زد سے باہر محسوس نہ کر سکے۔

اب پارس نے موبائل کان سے لگایا مگر خاموش رہی۔

''کیا بات ہے سعدیہ؟'' سفیان کی آواز آئی۔ ''تم بول کیوں نہیں رہی ہو؟ اتنی دیر کیوں لگ گئی؟ کیا جعفر نہیں آیا ابھی اندر؟''

پارس دھیرے سے ہنسی۔ ''جعفر بھی آگیا ہے اور میں بھی۔''

دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ سفیان نے یقیناً پارس کی آواز پہچان لی ہوگی۔

''اب سعدیہ میرے قابو میں ہے۔'' پارس پھر بولی۔ ''اگر تم چاہتے ہو کہ میں اسے چھوڑ دوں تو خود کو میرے حوالے کر دو۔''

''کہاں ہو تم؟'' سفیان نے تیزی سے پوچھا۔

''ابھی تو بنگلے ہی میں ہوں۔'' پارس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''اگر تم سعدیہ کو بچانا چاہتے ہو تو ڈرائنگ روم میں آکر خود کو میرے حوالے کر دو۔''

''میں تیار ہوں۔'' سفیان کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ ''تم سے شادی کرنے میں نے اس کے ساتھ جو ریادتی کی تھی، اس کا ازالہ میں اسی طرح کر سکتا ہوں کہ اسے بچانے کے لیے اپنی پروا نہ کروں۔''

''میں تمہاری منتظر ہوں۔'' پارس نے کہا۔

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔

☆☆☆

یہ جان کر سفیان پر ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی تھی کہ سعدیہ کو پارس نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ یہ بات غلط اس لیے نہیں ہوسکتی تھی کہ پارس نے سعدیہ ہی کے موبائل پر اس سے بات کی تھی۔

سفیان نے اپنا پرانا موبائل کسی جگہ چھپایا اور کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ سعدیہ کے لیے اب وہ اپنی زندگی خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار تھا۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہاں اس نے جعفر، سعدیہ اور پارس کے علاوہ ایک اور شخص کو بھی دیکھا جس کی وضع قطع کسی معمولی آدمی کی سی تھی۔ وہ شخص ہاشو تھا جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ اس ریوالور سے سعدیہ اور جعفر دونوں ہی کو زد پر لیے ہوئے تھا۔

''خوش آمدید سفیان!'' پارس مسکرائی۔

جعفر جلدی جلدی سفیان کو بتانے لگا کہ اس پر کیا گزری تھی۔ اس دوران میں پارس خاموشی سے مسکراتی رہی۔ وہ جعفر کے خاموش ہونے کے بعد بولی۔ ''اب تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا کہ میں یہاں کیسے پہنچ گئی۔ خیر، ہمیں مطلب کی بات کرنا چاہیے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں سعدیہ کو چھوڑ دوں تو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''میں تیار ہوں۔'' سفیان نے کہا۔

''نہیں سفیان!'' سعدیہ چیخ پڑی۔ ''یہ لوگ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''نہ چھوڑیں۔'' سفیان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اپنی وجہ سے تمہیں تو ان لوگوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔''

''میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔'' سعدیہ روہانسی ہو گئی۔ اس نے لپک کر سفیان کے قریب جانا چاہا مگر کامیاب نہیں ہو سکی۔ ہاشو نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔ وہ جھٹکا کھا کے رکی اور گرتے گرتے بچی۔

''اس کے ساتھ زیادتی نہ کرو۔'' سفیان غصے سے بولا۔

''اب اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔'' پارس بولی۔ ''مگر اس سے بھی کہو کہ یہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔''

''سعدیہ!'' سفیان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے افسردہ سے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اب مجھے اس کا ازالہ کرنے دو۔''

''تمہیں ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں؟''

سعدیہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''تم کر بھی کیا سکتی ہو؟'' پارس بڑے سکون سے بولی پھر اس نے سفیان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟''

''تم جانتی ہو کہ میں ہتھیار رکھنا پسند نہیں کرتا۔''

''اس کے باوجود میں تمہاری تلاشی لینا چاہوں گی۔''

سفیان خاموش رہا۔ پارس اس طرح اس کے قریب گئی کہ ہاشو کا ریوالور بدستور سفیان کو اپنی زد پر رکھے رہے۔ پارس نے سفیان کے پیچھے کھڑے ہو کر اس کی تلاشی لی اور مطمئن ہو جانے کے بعد بولی۔ ''ابھی تک مجھے تمہارے دوست کا خیال نہیں آیا۔ تلاشی اس کی بھی لی جانی چاہیے۔''

جعفر کی تلاشی بھی لی گئی۔

''ٹھیک ہے۔'' پارس نے مطمئن ہو جانے کے بعد کہا۔ ''اب یہ بتاؤ سفیان! کیا اب کوئی طاقت تمہیں اغوا ہونے سے بچا سکتی ہے؟''

''مجھے اندازہ ہے کہ تم مکمل تیاری کے ساتھ اندر آئی ہو گی۔'' سفیان نے تلخی سے کہا۔ ''سکندر بھی گولیاں نہیں کھیل سکتا۔ بنگلے کے باہر بھی اس کے لوگ ہوں گے۔ شاید وہ خود بھی ہو۔ میں نے یہ تو خیر اچھا ہی کیا تھا کہ تمہاری چکنی چپڑی باتوں میں نہیں آیا لیکن یہ بات میرے لیے حیران کن ہے کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئیں؟''

''اندازہ۔'' پارس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ مجھے یقین تھا کہ تم ان حالات میں سعدیہ کے علاوہ کسی پر اعتماد ہی نہیں کر سکتے تھے لیکن یہ میں نے سکندر کو نہیں بتایا۔''

''اس وقت... میرا مطلب ہے کہ فوری طور پر نہ بتایا ہو گا۔ اب تو بتا دیا؟''

''تمہیں یقین ہے؟''

''کیا مجھے دکھائی نہیں دے رہا ہے؟''

''بعض اوقات وہ بھی سچ نہیں ہوتا جو دکھائی دیتا ہے۔''

''جو میں دیکھ رہا ہوں، یہ جھوٹ ہے؟'' سفیان نے تلخی سے کہا۔

''ہاں۔'' پارس نے کہا اور اپنا پستول رکھتے ہوئے ہاشو سے کہا۔ ''اب تم بھی اپنا ریوالور رکھ لو۔''

ہاشو نے فوراً اس کی بات مان لی۔ سفیان، جعفر اور سعدیہ کے لیے وہ سب چونکا دینے والی بات تھی۔

''اب ہم دوستانہ فضا میں گفتگو کریں گے سفیان!'' پارس نے کہا اور سفیان کا ہاتھ پکڑ کر ایک صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''مگر سکون سے گفتگو بھی ذرا جلدی کرنی ہو گی۔ اس سے پہلے کہ لوڈشیڈنگ کا وقت ختم ہو مجھے یہاں سے جانا ہو گا۔''

اس صورتِ حال نے سفیان کو ششدر کر دیا تھا۔ سعدیہ اور جعفر بھی ورطۂ حیرت سے باہر نہیں آ سکے تھے۔

پارس نے سفیان کو صوفے پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھتے ہوئے سعدیہ اور جعفر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم دونوں بھی بیٹھ جاؤ۔''

''اب تم کیا کھیل کھیلنا چاہتی ہو پارس!'' سفیان بولا۔

''جو کھیل کھیلا تھا، وہ ختم ہو چکا ہے۔ تم اس وقت جھوٹ دیکھ رہے تھے اور اب سچ دیکھ رہے ہو... باہر نہ تو سکندر ہے، نہ اس کے آدمی۔ میں یہاں صرف ہاشو کے ساتھ آئی تھی اور کیا میں نے ایسی سچویشن پیدا نہیں کی تھی کہ جو چاہوں، تمہارے ساتھ برتاؤ کر سکوں؟ تمہارا جواب یقیناً ہاں میں ہو گا لیکن اب میں تمہارے قریب بیٹھی ہوں۔ تم مجھے جکڑ کر بے بس کر سکتے ہو۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا پارس؟'' سفیان کے لہجے میں حیرت آمیز لکنت تھی۔

''تمہیں یقین دلانا چاہتی تھی کہ میں اب تمہارے معاملے میں مخلص ہوں۔ سکندر سے مجھے نفرت ہو چکی ہے۔ یہ ہاشو... یہ بھی اب سکندر کے خلاف ہے کیونکہ سکندر اسے میرے ہاتھوں ختم کرانا چاہتا تھا حالانکہ یہ اسی کے آدمیوں میں سے ایک ہے۔ مجھے اب تمہارے تعاون کی ضرورت ہے سفیان! فون پر تم نے میری باتوں کو دھوکا سمجھا تھا لیکن اب تمہاری سمجھ میں آ جانا چاہیے کہ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔''

سفیان اب بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''اب تمہیں اپنی آنکھوں پر یقین کر لینا چاہیے۔'' پارس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اب تم سچ دیکھ رہے ہو سفیان... اور اب تمہیں حیرت سے باہر آ جانا چاہیے۔ باتیں کرنے کے لیے ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''کیا چاہتی ہو تم؟'' سفیان کی آواز بھرا گئی۔

''تم سے سکندر نے جو باتیں کی تھیں، مجھے ان کا علم ہے۔ تم نے اس کی پیشکش قبول نہیں کی تھی اور مجھے یقین ہے کہ اس سے تمہارا رابطہ بعد میں بھی ہوا ہو گا۔ میرا اندازہ ہے کہ تم ٹال مٹول کرتے رہے ہو گے۔ میں تمہیں اس حد تک تو جانتی ہوں سفیان! تم اس کی پیشکش ہرگز قبول نہیں کرو گے۔ اس دوران میں تم اپنے بچاؤ کی تدبیریں بھی سوچتے رہے ہو گے۔ میں اندازہ نہیں لگا سکتی کہ تم نے کیا فیصلہ کیا ہو گا لیکن تمہارے اس دوست کی یہاں آمد سے میں بس اتنا سمجھ سکتی ہوں کہ تم نے اسے اپنی مدد کے لیے بلایا ہو گا جبکہ میں خود تمہاری مدد کے لیے تیار ہوں۔ تم نے اپنا موبائل بدل لیا ہے ورنہ میں فون پر ہی کسی طرح تمہیں یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے تمہیں اپنا دوسرا نمبر دیا تھا لیکن تم نے یا تو وہ نمبر نوٹ ہی نہیں کیا تھا یا تم مجھ سے بات ہی نہیں کرنا چاہتے ہو گے۔ مجبوراً مجھے یہ سارا ڈراما کرنا پڑا۔ میرا خیال ہے کہ اب تو تم مجھ پر یقین کر لو گے۔''

''تم چاہتی کیا ہو؟'' سفیان نے اپنا سوال دہرایا۔

''تمہارا تعاون، ابھی میں نے یہی جواب دیا تھا تمہیں۔'' پارس سنجیدگی سے بولی۔ ''سکندر سے تمہارا رابطہ تو ہے نا؟''

''ہوں۔'' سفیان نے سر ہلایا۔

''اور تم ٹال مٹول سے کام لیتے رہے ہو؟''

سفیان اس مرتبہ ''ہوں ہاں'' کیے بغیر پارس کی طرف دیکھتا رہا۔ سعدیہ اور جعفر اب حیرت کے عالم میں نہیں تھے مگر ان کے چہروں سے الجھن صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ خود سفیان بھی ابھی تک اسی الجھن کا شکار تھا۔

''میں چاہتی ہوں کہ اب تم ٹال مٹول سے کام مت لو۔'' پارس نے کہا۔ ''اسے بتا دو کہ تم اس کی پیشکش قبول کرنا چاہتے ہو۔ رقم کی وصولی کے سلسلے میں اس سے جگہ کی بابت طے کرو۔ یہ بھی کہنا کہ رقم لینے تم خود آؤ گے لیکن صرف اسی کے ہاتھ سے لو گے۔''

''اس سے کیا ہو گا؟''

''ہاشو تمہارے آس پاس ہی کہیں ہو گا۔ پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ اس کی اطلاع پولیس کو دے دی جائے گی لیکن بعد میں فیصلہ کچھ اور ہوا۔ خود ہاشو یہ چاہتا ہے کہ یہ تمہارے قریب کہیں رہے اور جب سکندر تمہیں رقم دینے آئے تو یہ سکندر پر گولیاں برسا کر اسے ختم کر دے۔ کیوں ہاشو! تم یہی چاہتے ہو نا؟''

''یقیناً۔'' ہاشو بولا۔ ''اب میری زندگی کا انحصار اسی پر ہے کہ سکندر اس دنیا میں نہ رہے اور سکندر کے آدمیوں کو اس کا علم بھی نہ ہو کہ سکندر کو میں نے ہلاک کیا ہے۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ...''

سفیان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گولیاں چلنے کے دھماکے ہوئے۔ سفیان اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ہاشو، سعدیہ اور جعفر بھی بوکھلا گئے تھے۔ دھماکوں سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ بنگلے کے اندر ہی یا بنگلے کے باہر قریب ہی ہو رہے تھے۔

پھر ایک زوردار آواز کے ساتھ ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ چوپٹ کھلا۔ جو شخص اندر آ کر گرا، وہ لنگڑا سکندر تھا جسے فرش سے اٹھنے کی مہلت نہیں مل سکی کیونکہ تیزی سے اندر آتے ہوئے ایک پولیس آفیسر نے اسے دبوچ لیا تھا۔

''باسٹرڈ!'' سکندر کے منہ سے غراہٹ نکلی۔

پولیس آفیسر نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ ''اب بالکل حرکت نہیں کرنا سکندر!'' پولیس آفیسر بولا۔ ''مارے جاؤ گے ورنہ۔''

سکندر نے بڑی زور سے اس ریوالور پر ہاتھ مارا جو اس کی کنپٹی سے لگا ہوا تھا۔ ریوالور پولیس آفیسر کی گرفت سے بھی نکل گیا اور کچھ دور جا کر گرا لیکن پولیس آفیسر نے اسے اپنے نیچے سے نہیں نکلنے دیا۔ نتیجہ یہ کہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

اب اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ گولیاں بنگلے کے باہر ہی چل رہی تھیں۔ پولیس والوں کی فائرنگ کا جواب دینے والے سکندر کے ساتھی ہی ہو سکتے تھے۔

یکایک پارس اس طرف لپکی جہاں پولیس آفیسر کا ریوالور پڑا ہوا تھا۔ اس نے ریوالور اٹھا لیا۔

''اب آپ اسے چھوڑ دیں آفیسر!'' پارس کی آواز میں لرزش تھی۔ ''اب اگر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو اس ریوالور کی ساری گولیاں اس کے جسم میں اتر جائیں گی۔''

اسی وقت تین کانسٹیبل تیزی سے اندر آئے۔

''سنبھالو اسے۔'' پولیس آفیسر نے ان سے کہا۔

پولیس والوں نے سکندر کو نہ صرف جکڑ لیا بلکہ اسے ہتھکڑیاں بھی لگا دیں اور کھڑا کر دیا۔ پارس ابھی تک اس کی طرف ریوالور تانے کھڑی تھی۔ سکندر اسے بڑی نفرت سے دیکھ رہا تھا۔

''اب اس کی ضرورت نہیں مسز سفیان!'' پولیس آفیسر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''ریوالور مجھے دے دیجیے۔''

پارس نے اسے ریوالور دے دیا۔ باہر اب سناٹا چھا چکا تھا۔ گولیاں چلنے کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔

"تمہارے وہ دونوں آدمی بھی غالباً مارے گئے۔"
پولیس آفیسر نے سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک اور سپاہی اندر آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ باہر سکندر کے دونوں آدمیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ وہ بھاگنے کی کوشش میں پولیس کی گولیوں کا شکار ہو گئے تھے۔

"مجھے کس جرم کے تحت ہتھکڑیاں لگائی گئی ہیں؟"
سکندر غرایا۔

"تم جیل سے بھاگے ہوئے ایک خطرناک مجرم ہو۔"
پولیس آفیسر نے کہا۔ "دوسرے یہ کہ تمہارے ساتھیوں میں سے ایک نے باہر کھڑی ہوئی کار کے شوفر کو چاقو مار کر ہلاک کیا ہے۔ تمہاری یہاں موجودگی البتہ میرے لیے ایک معما ہے۔ میں نے تو مسز سفیان کی نگرانی کروائی تھی۔ پھر مجھے اطلاع ملی کہ کچھ اور لوگ بھی مسز سفیان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

"میری نگرانی؟" پارس چونکی۔

"جی ہاں۔" پولیس آفیسر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "آپ کے اس بیان پر یقین نہیں کیا گیا تھا کہ آپ اس بات سے ناواقف ہیں کہ آپ کے شوہر کہاں غائب ہو گئے ہیں اور کیوں غائب ہو گئے ہیں۔ نگرانی اسی توقع پر کی گئی تھی کہ آپ کسی نہ کسی وقت اس جگہ کا رخ ضرور کریں گی جہاں آپ کے شوہر ہوں گے۔" پھر پولیس آفیسر سفیان کی طرف مڑا۔ "آپ کی دفتری فائل سے آپ کی تصویر مل گئی تھی اس لیے میں آپ کو پہچان سکتا ہوں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ آپ یہاں کیوں روپوش ہوئے تھے؟ اور آپ کی کار رنگون والا بلڈنگ کے پاس کیوں کھڑی تھی؟"

اچانک سکندر بول پڑا۔ "سنا تم لوگوں نے!" اس نے کانسٹیبلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے صرف اس لیے گرفتار کیا گیا ہے کہ میں جیل سے مفرور ہوں۔ کوئی اور جرم نہیں کیا ہے میں نے۔"

پولیس آفیسر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

صرف سفیان کو حیرت نہیں ہوئی۔ سکندر نے یہ بکواس اسی کو سنانے کے لیے کی تھی۔ گویا دھمکایا تھا کہ اگر اس نے اپنے موبائل میں موجود تصویر پولیس والوں کو دی تو یہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔

"سکندر!" پارس کہتی ہوئی آہستہ آہستہ سکندر کی طرف بڑھی۔ "تو نے میرا پیچھا کیا ہے۔ اب تو نے شاید وہ باتیں بھی سن لی ہوں جو یہاں ہو رہی تھیں۔"

"وہ تو اس نے یقیناً سنی ہوں گی۔" پولیس آفیسر بول پڑا۔ "دروازے سے لگا کھڑا تھا یہ... لیکن آپ اس کی وجہ سے کیوں فکرمند ہیں مسز سفیان؟ یہ ساری معاملہ میرے لیے ایک معما بنتا جا رہا ہے۔"

پارس سکندر کے بالکل سامنے جا کھڑی ہوئی تھی، وہ بولی۔

"سب کچھ جان لینے کے بعد تو اب یہ یقیناً میرا اور ہاشو کی جان کا دشمن بن جائے گا۔ کسی نہ کسی طرح قانون کی گرفت سے نکلنے کے بعد تو ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ نہ ہو... نہیں تو تیرے آدمی ہمارے پیچھے لگ جائیں گے۔ گویا موت اب میرا مقدر بن چکی ہے۔ میری بھی اور ہاشو کی بھی۔"

سکندر اسے غرت سے دیکھتا رہا۔

"لہٰذا۔" پارس بولی۔ "کیوں نہ ایسا ہو کہ اپنی آنے والی موت کا انتقام میں تجھ سے ابھی لے لوں۔"

پھر جو کچھ ہوا، اس نے سبھی کو ششدر کر دیا۔ پارس نے اپنا پستول نکال کر اس کی ساری گولیاں سکندر کے سینے میں اتار دیں۔

"یہ کیا...؟" پولیس آفیسر پارس کی طرف جھپٹا۔

اس وقت تک پارس اپنا کام مکمل کر چکی تھی۔ اس نے اپنا پستول فرش پر پھینک دیا اور بڑے سکون سے بولی۔ "اب آپ مجھے ہتھکڑیاں لگا دیں آفیسر!" پھر اس نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ سفیان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں اور جو کچھ کہہ رہی تھیں، وہ سفیان نے سمجھ لیا۔ پارس نے اسے بتایا تھا کہ اب کوئی نہیں جانتا کہ اس کے موبائل فون میں کوئی تصویر ہے۔

سارا ڈراما اس طرح انجام کو پہنچا تھا جو سفیان کے سان گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔

اس ڈرامے کے چند ماہ بعد سفیان اور سعدیہ کی شادی ہو گئی۔ جعفر کے مشورے پر سفیان نے اپنے موبائل میں موجود لنگڑے سکندر کی تصویر پولیس آفیسر کے حوالے کر دی تھی۔ جعفر نے اس سے پہلے موبائل فون پر اپنے باپ سے گفتگو کی تھی اور اس کے باپ نے فون پر ہی پولیس آفیسر کو تاکید کر دی تھی کہ اس سارے معاملے میں سفیان کا نام سامنے نہ آنے پائے۔

اگرچہ سکندر مر چکا تھا لیکن سفیان کو اس کے آدمیوں سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا جو اس طرح ختم ہو گیا۔

پارس کو سکندر کے قتل کے جرم میں قید کی سزا سنا دی گئی تھی۔ اس نے جیل ہی سے سفیان اور سعدیہ کو شادی کی مبارک باد کا پیغام بھیجا تھا۔

قتلِ معبد

مختار آزاد

چالاکی و عیاری سے بڑے بڑے کام نکل جاتے ہیں... مگر کبھی کبھی زیادہ چالاکی گلے کا پھندا بھی بن جاتی ہے... ایک وفا شعار اور مذہب پرست عورت کے قتل کا پُراسرار معما... اس کے اردگرد چابک دست اور زیرک دماغوں کا سخت پہرا تھا...

ایک ماہر سراغ رساں کا کیس جسے اپنی ذہانت کا امتحان درپیش تھا

جب میں وہاں پہنچا تو آفیسر ولے لاش کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ میں نے فرش پر آڑی ترچھی پڑی لاش پر بھرپور نظر ڈالی۔ مجھے یہ بات جاننے میں قطعاً دیر نہیں لگی کہ اسے کہیں اور مارا گیا تھا، بعد میں لاش یہاں لا کر ڈال دی گئی۔ "میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "قاتل نے بچنے کے لیے پولیس کو بھٹکانے کی کوشش کی ہے۔ یہ جائے وقوعہ نہیں، یہاں صرف

لاش پھینکی گئی ہے۔"

"مگر کیوں؟" اس نے چونکتے ہوئے کہا۔ وہ میرا ساتھی سراغ رساں تھا۔ جب لاش کی اطلاع ملی تو اس نے مجھے فوراً مدد کے لیے فون کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں بھی وہاں موجود تھا۔

"ہاں، تمہاری یہ بات درست ہے۔ یہ جاننے میں، میں تمہاری مدد ضرور کر سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے لاش کا دوبارہ گہری نظروں سے جائزہ لینا شروع کر دیا۔

لاش کی شناخت ہو چکی تھی۔ یہ مسز میکنزی راجر بیلٹ تھی۔ لاش ان کے اپنے گھر کے کچن میں پڑی تھی۔ مقتولہ کی پیشانی پر گولی کا گہرا اور واضح نشان نظر آ رہا تھا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں تھی مگر مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ جس انداز میں فرش پر لاش پڑی ہوئی تھی، وہاں بہت زیادہ خون ہونا چاہیے تھا مگر ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ فرش لگ بھگ صاف تھا۔ ماسوائے خون کے چند دھبوں کے۔ صاف ظاہر تھا کہ جتنا خون بہنا تھا، وہ کہیں اور بہہ چکا تھا۔ جب قاتل نے لاش یہاں لا کر پھینکی ہوگی تب تک جسم سے خون بہنا تقریباً بند ہو گیا تھا۔ "حیرت ہے کہ قاتل نے قتل کے بعد لاش کہیں اور ٹھکانے لگانے کے بجائے مقتولہ کے کچن میں لا کر کیوں پھینکی ہے؟" میں نے آفیسر ویلے سے کہا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھا لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔

"ایلن... پلیز بچہ کسی اور کو تھما دو اور مجھے بتاؤ کہ تم اس بارے میں کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ میری ماتحت سراغ رساں ایلن گود میں ایک چھوٹے بچے کو لیے کھڑی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ بچہ مقتولہ کا ہی ہوگا۔ بچے کی عمر دو سال کے لگ بھگ ہوگی۔

"اوکے سر!" یہ کہہ کر اس نے بچہ ویلے لینڈ کی گود میں دیا اور میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ دیکھو..." میں نے ایلن کی توجہ ترچھی پڑی لاش کے سر کے پچھلے حصے کی طرف دلائی۔ "گولی ادھر سے باہر نکلی تھی۔" میکنزی کے بال خون میں لتھڑے ہوئے تھے مگر جس طرف میں نے اشارہ کیا تھا، وہاں خون نہیں کچھ اور تھا۔ "یہ ہے کیا؟" میں گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔

"مجھے تو یہ موم لگ رہا ہے۔" ایلن نے اس شے کو ہاتھ لگائے بغیر صرف دیکھتے ہوئے رائے دی۔

"ارے یہ دیکھو..." ویلے نے یہ سنا تو مجھے متوجہ کیا۔ "یہاں، اس کے انگوٹھے پر بھی لگا ہوا ہے، یہ موم ہی ہے۔" اس نے مجھے دیکھے بغیر کہا۔ اس کی نظریں اب بھی لاش کے داہنے ہاتھ پر جمی ہوئی تھیں۔

"یہ کہاں سے لگا؟" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کچن میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ "تم نے یہاں کوئی موم بتی دیکھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاید نہیں۔" ویلے سر جھکائے بدستور لاش کے معائنے میں منہمک تھا۔

"ابھی دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں کچن سے باہر نکلا۔ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ میں پورے گھر کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میں سب سے پہلے لیونگ روم میں داخل ہوا۔ مینٹل پیس پر شمع دان رکھا ہوا تھا لیکن اس میں کوئی موم بتی نہیں تھی۔ میں نے قریب ہو کر دیکھا۔ ایسے کوئی نشان نہیں تھے کہ جس سے اندازہ ہو کہ اس میں بھی موم بتی رکھ کر روشن کی گئی تھی۔ ساتھ ہی سنہری رنگ کے فریم میں ایک تصویر لگی ہوئی تھی جس میں مقتولہ ایک بچے کو گود میں لیے مسکرا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دراز قد، بڑی بڑی مونچھوں والا مرد بھی کھڑا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مقتولہ کا شوہر، باپ، بھائی یا پھر ممکنہ قاتل ہو۔ فی الحال تو میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

میں دوسرے کمرے میں آیا جہاں گھر کا داخلی دروازہ تھا۔ یہ شیشے کا سلائیڈنگ ڈور تھا۔ سامنے پورچ نظر آ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ قاتل کار کی ڈکی میں لاش رکھ کر یہاں پہنچا ہوگا اور پھر اس نے دروازے کے سامنے گاڑی روک کر سب سے پہلے دروازہ کھولا اور پھر لاش ڈکی سے نکال کر کچن میں لا کر پھینک دی ہوگی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ نہ صرف گھر سے اچھی طرح واقف تھا بلکہ اس کے پاس داخلی دروازے کی چابی بھی ہوگی۔ میں بیڈ روم میں گیا۔ بیڈ کے دونوں طرف کی سائڈ ٹیبل پر بیئر کی دو خالی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک بوتل کے سرے پر لپ اسٹک کا نشان بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ دوسری طرف کی ٹیبل پر بیئر کی خالی بوتل کے ساتھ کافی کپ کی پرچ میں سگریٹ کے تین ٹوٹے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک آفیسر کو بلوا کر ان چیزوں کو بطور ثبوت محفوظ کرنے کو کہا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی میں باتھ روم کا جائزہ لے رہا تھا کہ کسی کے زور زور سے رونے کی آواز کانوں میں پڑی۔ "سراغ رساں مائیکل... ذرا ادھر آیئے۔" میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ رونے والا کون ہو سکتا ہے کہ اسی دوران ایلن نے کچن سے مجھے پکارا۔

میں فوراً پلٹا اور تیزی سے چلتا ہوا کچن میں پہنچا۔ میرے دو آفیسرز بڑی سی مونچھوں والے ایک دراز قد شخص کو

حوصلہ دینے کی کوشش کر رہے تھے، مگر وہ بدستور اونچی آواز میں روئے جا رہا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی فوراً پہچان گیا۔ یہ وہی شخص تھا، جو اس تصویر میں مقتولہ میکنزی اور بچے کے ساتھ کھڑا تھا۔

"یہ مقتولہ کے شوہر ہیں اور ابھی ابھی یہاں پہنچے ہیں۔" ایلن نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ایک بار پھر وہ بچے کو گود میں لیے تھی۔ وہ میری ماتحت اور ساتھی سراغ رساں تھی مگر ان سب کے باوجود وہ ایک عورت بھی تھی۔ اس وقت جس ماحول میں ہم سب وہاں موجود تھے، ایسے میں کسی معصوم بچے کو دیکھ کر اس کی ممتا کے جذبے کا بیدار ہو جانا یقینی تھا۔ اور بچہ بھی وہ... جس کی ماں کی لاش سامنے پڑی ہو۔

وہ شخص شدتِ غم سے نڈھال تھا۔ میرے دو آفیسرز اس کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ایلن بچے کو بیڈ روم میں لے گئی۔ میں چپ چاپ کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ روتے روتے وہ نڈھال ہو گیا اور لاش کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام رکھا تھا۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر بتر تھے۔ "پلیز میک، پلیز... لوٹ آؤ، تم مجھے یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔" وہ اونچی آواز میں رو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سب لوگ افسردہ ہو گئے۔ خود میں نے بڑی مشکل سے اپنی پلکوں کو نم ہونے سے روکا۔ کافی دیر تک وہ یونہی روتا رہا۔ آخر بڑی مشکل سے دو پولیس والے اسے سہارا دے کر لاؤنج میں لے گئے۔ وہ صوفے پر گم صم بیٹھا تھا مگر آنکھ سے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔

"مسٹر..." میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں سراغ رساں مائیکل ایون ہوں۔" اس پر میری بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کی آنکھیں بدستور کچن پر جمی ہوئی تھیں۔ یہاں سے لاش صاف نظر آ رہی تھی۔ میں کئی سیکنڈ تک وہاں کھڑا رہا مگر وہ بدستور لاتعلق بنا بیٹھا تھا۔ دوسری طرف پولیس اہلکار کرائم سین کو محفوظ کر رہے تھے۔ میں لاؤنج سے کچن میں چلا گیا۔ بدقسمتی سے یہاں سے اب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ میں واپس پلٹا اور اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ "کیا خیال ہے مسٹر... ہم کار میں جا کر بیٹھتے ہیں؟ وہ خاصی آرام دہ ہے۔ یہاں پولیس سراغ رسانوں کو کچھ کام کرنا ہے۔" وہ خاموشی سے لرزتے جسم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اٹھنے کے انداز سے نقاہت جھلک رہی تھی۔ "آپ کا پورا نام کیا ہے؟"

"راجر... راجر بیلٹ۔" رونے کے باعث اس کی آنکھیں سوجی اور آواز بھرائی ہوئی تھی۔

میں اسے لے کر گھر سے باہر آ گیا۔ میری کار تین پولیس گاڑیوں کے پیچھے کھڑی تھی۔ کئی گھروں کی کھڑکیوں سے لوگ جھانک رہے تھے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ رات کے اندھیرے میں ایک ساتھ پولیس کی تین گاڑیوں کا کسی کے گھر کے باہر موجود ہونا اور گھر میں پولیس والوں کی چہل پہل سے کوئی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ مجھے یقین تھا کہ شاید ہی کوئی یہ بات جانتا ہو کہ سامنے والے گھر کی مالکن کا قتل ہو چکا ہے اور لاش کچن میں پڑی ہے۔

ہم دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ موسم سرد تھا۔ میں نے انجن اسٹارٹ کر کے ہیٹر آن کر دیا۔ بیٹھتے ہی میں نے اسے پانی کی بوتل پیش کی۔ اس نے صرف دو گھونٹ پیے۔ اس کا چہرہ اب بھی آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ میں نے ٹشو پیپر کا ڈبا اس کی طرف بڑھایا مگر راجر بیلٹ نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس نے اپنی قمیص کی آستین سے آنکھیں صاف کیں۔

"وہ بہت خوبصورت اور جوان عورت تھی۔" میں نے اس سے گفتگو کا آغاز ہمدردانہ لہجے میں کیا۔

"میرے لیے تو وہ فرشتوں جیسی تھی۔" راجر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ایک بار پھر اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"میں جانتا ہوں۔" یہ سن کر میں نے فوراً کہا۔ "میکنزی کی موت تمہارے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میں اسے اعتماد میں لینے اور پُرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ کچھ پوچھ سکوں۔ "بات یہ ہے مسٹر راجر کہ میرے یہاں موجود ہونے کی ایک وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ سب کچھ کیسے ہوا ہے۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے کام کی بات شروع کی۔ یہ سن کر اس نے سر اٹھا کر استفساریہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں یہ بات اس وقت کہہ رہا ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گے۔ مجھے آپ سے چند ضروری سوالات پوچھنے ہیں۔"

"میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ "پوچھیے، کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ؟" یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آج سارا دن کیا کرتے رہے؟" میری بات سن کر لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے پر تناؤ نظر آیا مگر فوراً ہی اس نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

”میں معمول کے مطابق آج صبح آٹھ بجے کام پر گیا تھا۔“ لگ بھگ ایک منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے بتانا شروع کیا۔ ”میں یونائیٹڈ میٹ پیکرز کے ہاں کام کرتا ہوں۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد شام کو میں کینڈل بار گیا اور اس کے بعد ناردرن ریسٹورنٹ میں جا کر کھانا کھایا۔ میں ریستوران میں رات ساڑھے گیارہ بجے تک بیٹھا رہا۔ میکنزی گھر پر مجھے سگریٹ یا ڈرنک نہیں کرنے دیتی تھی۔ اس لیے میں باہر سے ہی فارغ ہو کر گھر پہنچتا ہوں مگر مجھے کیا پتا تھا کہ اس رات...“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز ایک بار پھر رندھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ بدستور رونے سے اس کی آنکھیں اور چہرہ کافی سوج چکا تھا۔

میں اس کا بیان سن کر کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ گھر پر سگریٹ نوشی اور ڈرنک کرنے کی اجازت نہیں تھی مگر وہاں سے بیئر اور سگریٹ کے ٹوٹے ملے تھے۔ راجر کی بات سے صاف ظاہر تھا کہ مقتولہ یہ دونوں چیزیں خود بھی استعمال نہیں کرتی تھی تو پھر بیئر کی خالی بوتلیں، ایک پر لپ اسٹک کا نشان اور سگریٹ کے تین ٹوٹے... یہ سب کیا تھا؟ ”تم کہہ رہے ہو کہ صبح سے باہر تھے اور ابھی لوٹے ہو...“

”جی ہاں، بالکل یہی کہہ رہا ہوں۔“ اس نے یہ سنتے ہی قطع کلامی کی۔

”مگر گھر کو دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ تم وہاں پر تھے؟“ میں نے نرم لہجے میں کہا مگر بیئر اور سگریٹ والی بات گول کر گیا۔

”سر! میں نے جو کچھ کہا ہے، اُس پر یقین کریں۔ میں تو ابھی ابھی لوٹا ہوں۔“ اس نے میری بات سن کر تڑپ کر کہا۔

”تو اگر تم گھر پر نہیں تھے تو پھر تمہارے علاوہ وہاں اور کون ہوسکتا ہے؟“ میں نے کار کی کھڑکی سے باہر کی طرف جھانکتے ہوئے کہا اور پھر گردن موڑ کر چند لمحے کے لیے خاموشی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ ”تمہارے خیال میں ایسا اور کون شخص ہوسکتا ہے جو تمہاری غیر موجودگی میں گھر آیا ہو، وہ بھی شام ڈھلنے کے بہت دیر بعد؟“ میں نے سرد لہجے میں جملہ مکمل کیا۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا اس بارے میں۔“ اس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ ”ہم کنساس سٹی سے چند ماہ پہلے ہی یہاں آئے ہیں۔ یہاں ہمارا کوئی واقف کار بھی نہیں۔ میں سارا دن کام پر رہتا ہوں اور اس کے بعد بار یا پھر ریستوران چلا جاتا ہوں۔ جب گھر لوٹتا ہوں تو رات ہو چکی ہوتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے گہرا سانس لیا۔ ”اب آپ خود سوچیے کہ ایسے میں کس سے ملنے جلنے کا وقت باقی بچتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے پشت سے سر ٹکا لیا۔

”اور میکنزی...“

”ایک ہی جگہ ہے جہاں وہ آتی جاتی تھی... اور وہ بروک سائڈ کا پریس بائٹرن چرچ۔“ یہ کہہ کر اس نے سر میری طرف گھمایا۔ ”اس کے علاوہ وہ بازار جاتی تھی اور بس۔ میری طرح اُس کا بھی کسی سے ملنا جلنا یا دوستی نہیں تھی۔“

”وہ صرف اتوار کو چرچ جاتی تھی یا...“

”نہیں...“ اس نے قطع کلامی کی۔ ”وہ مذہبی رجحان رکھتی تھی۔ اکثر وہ سارا سارا دن چرچ کے فلاحی کاموں میں رضاکارانہ طور پر خود کو مصروف رکھتی تھی۔ وہ ٹیلر کو بھی ساتھ لے جاتی تھی۔“

”ٹیلر؟“ میں نے استفساریہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمارا بیٹا۔“

”اوہ... اچھا... آپ کیا کہہ رہے تھے چرچ میں ان کے کاموں کے بارے میں؟“ میں نے دوبارہ موضوع اسی طرف موڑ دیا۔

”صبح وہ بتارہی تھی کہ آج شام تک وہ چرچ میں رہے گی۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ چرچ کے اسکاؤٹس گروپ کی تنظیم نو میں مصروف تھی۔ ممکن ہے کہ گھر واپسی پر وہیں سے کوئی اس کے ساتھ آیا ہو۔“ اس نے شبہ ظاہر کیا۔

”یہ بھی ہوسکتا ہے۔“ میں نے ونڈ اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بائٹرن چرچ یہاں کا بہت پرانا چرچ تھا۔ کبھی ڈارنیل اُس چرچ میں کام کرتا تھا۔ وہ پانچ سال تک چرچ کی تقریبات کا آرگنائزر رہا مگر اب اس نے ایک میوزک بینڈ بنالیا تھا۔ اب وہ چرچ کی خصوصی تقریبات میں معاوضہ لے کر شرکت کرتا تھا۔ ملازمت چھوڑنے کے باوجود اب بھی وہ چرچ کے ساتھ واقع کرائے کے گھر میں ہی رہتا تھا۔ اس کے بینڈ کی آمدنی تو بہت زیادہ نہیں تھی البتہ اتنے پیسے ضرور کما لیتا تھا کہ کرایہ اور کھانے پینے کی ضروریات پوری کر سکے۔ راجر کا شبہ سن کر میرا خیال ڈارنیل کی طرف اس لیے گیا کہ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ دل پھینک بھی تھا اور بیئر و سگریٹ کا دیوانہ بھی۔ ممکن ہے کہ اس کا اور میکنزی کا کوئی تعلق ہو۔ یہ بات بھی پریشان کر رہی تھی کہ بیئر کی خالی بوتل پر لپ اسٹک کے نشان سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی عورت بھی اس قصے میں شامل ہے۔ ڈارنیل بظاہر بے ضرر شخص تھا مگر

شباب ڈھلنے کے بعد کی مرحلے میں تھی۔ ایسے میں کسی بھی شخص کو شیشے میں اتارنا اس کے لیے مشکل نہ تھا۔ ڈارنیل اور میرا پرانا تعلق تھا مگر پھر بھی یہ بات مجھے کبھی کبھی تشویش میں مبتلا کردیتی ہے کہ اُس کا اور میرا تعلق کس طرح قائم ہوا تھا۔

☆☆☆

بات کو گزرے بہت عرصہ ہو چکا۔ اُس رات جب میں نے چرچ کے اہلکار ڈارنیل سے پوچھا کہ وہ جوزفین کے ساتھ کیا چکر چلا رہا ہے تو یہ بات سن کر اُسے سخت جھٹکا لگا۔ وہ چائے بنانے کے لیے کیتلی اسٹوو پر رکھ رہا تھا مگر یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔

”یہ تو کوئی بات نہیں۔“ اُس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

دل چاہا کہ اسے کہہ دوں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو اور مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ پولیس سراغ رساں کی حیثیت سے میں سچ اُگلوانا جانتا تھا مگر ایسا کچھ نہ کہہ سکا۔ اس وقت میں پولیس والا نہیں صرف عاشق تھا۔ ”دیکھو... سچ بولو گے تو بچ جاؤ گے اور جھوٹ بولا تو پھر مارے جاؤ گے۔ فیصلہ کرلو کہ کیا کہنا پسند کرو گے؟“ میں نے سرد لہجے میں اسے دھمکی دی۔

وہ کپ میں چائے اُنڈیل چکا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں خاموش تھا اور وہ حقیقت بیان کر رہا تھا۔ ”اب تم ہی سوچو، اس سارے کھیل میں میرا کیا کردار ہے۔ مجھے تو وہ مجبور کر رہی ہے۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں اٹھا اور اس کے قریب جا کر پیشانی پر بوسہ دیا۔ ”تم نے میری زندگی بچا لی ہے۔ میں تمہارا شکر گزار رہوں۔“

”سوری... میں بے وقوف بن گیا تھا۔“ وہ کھڑا ہوا اور میرے گلے لگ گیا۔ اس کی آنکھوں سے شرمندگی عیاں تھی۔ آواز بھی کپکپارہی تھی۔

قصہ یہ ہے کہ اُن دنوں میں ایک لڑکی کے عشق میں بری طرح مبتلا ہو چکا تھا۔ اس کا نام جوزفین تھا۔ اس کی اور میری ملاقات ایک پارک میں اتفاقیہ ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات کے بعد وہ خود بخود میرے بہت قریب آتی چلی گئی۔ میں بھی جوان تھا۔ جب وہ خود ہی قریب آرہی تھی تو میں خود کو اُس سے کیسے دور رکھ سکتا تھا۔ بہت جلد ہم دونوں ایک دوسرے کے انتہائی قریب ہو چکے تھے۔ مجھے گمان تھا کہ یہی میری بیوی بنے گی۔ البتہ میں نے اس بات کا ذکر اُس سے کبھی نہیں کیا، نہ ہی اُس نے خود کبھی شادی کی بات چھیڑی تھی۔

انہی دنوں اتفاق سے مجھے پتا چلا کہ ڈارنیل اور جوزفین کا ملنا جلنا ہے۔ میں نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ البتہ میں نے اس پر نظر رکھنی شروع کردی۔ ویسے جوزفین کو گٹار بجانے کا شوق تھا۔ رہ رہ کر مجھے یہ بھی خیال آتا تھا کہ شاید اسی لیے دونوں میں دوستی ہوگئی ہو مگر میں نے جذبۂ رقابت کے باعث کئی بار یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا وہ ڈارنیل کو جانتی ہے؟ مگر اس نے اپنی باتوں سے کبھی یہ عندیہ نہیں دیا کہ ان کے درمیان تعلقات ہیں۔

ایک شام جوزفین نے مجھے بتایا کہ ڈارنیل نے اسے فون کیا ہے اور گھر آنے کی دعوت دی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب وہ اپنے منہ سے اُس کا نام میرے سامنے لے رہی تھی۔

”کیا وہ کوئی تمہارا دوست ہے؟“ میں نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

”دوست نہیں، بس ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔ ”البتہ لگتا ہے کہ وہ میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ شاید میرے حُسن کا دیوانہ بن گیا ہے۔“ اس نے ادائے دلبری سے کہا۔ ”ویسے پہلی بار مجھے اس نے گھر پر ملنے کا کہا ہے، وہ بھی تنہائی میں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے سے ہلکا سا خوف بھی جھلک رہا تھا۔

”ضرور جاؤ ملنے... تم اتنی کمزور لڑکی نہیں ہو جو اُس کے آگے ریت کی دیوار کے مانند ڈھے جاؤ۔“ میں نے اُس سے کہا۔ ”جاؤ اور دیکھو تو سہی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔“

”یا کرنا چاہتا ہے۔“ اس نے ذومعنی انداز میں آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

”ویسے وہ کام کیا کرتا ہے؟“ میں نے سرسری لہجے میں پوچھ لیا۔

”موسیقار ہے۔“

”اوہو... تمہیں بھی تو گٹار بجانے کا شوق ہے۔“

”ہاں، اسی وجہ سے ہمارے درمیان ملاقات ہوئی تھی مگر لگتا ہے وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہے۔“ اس نے میری طرف بڑی ادا سے دیکھتے ہوئے کہا۔

جس رات جوزفین کو ڈارنیل سے ملنا تھا، اُس رات میں نے خفیہ طور پر نگرانی کی۔ جوزفین اُس کے گھر پہنچی اور آدھ گھنٹے بعد باہر نکلی۔ جس انداز سے وہ باہر نکلی اور اپنی کار تک پہنچی، اُسے دیکھ کر قطعاً یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ڈارنیل نے اس کے ساتھ کسی قسم کی کوئی بدتمیزی کرنے کی کوشش کی

ہوگی۔ وہ نہایت اطمینان سے چل رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی قریب ترین دوست کے گھر سے دعوت کھانے کے بعد جا رہا ہو۔

اس کے جانے کے بعد میں ڈارنیل کے پاس پہنچا اور جب میں نے بطور پولیس والے کے اپنا تعارف کروانے کے بعد اس سے جوزفین کے بارے میں دریافت کیا اور پھر اس نے جو کچھ بتایا، وہ سن کر تو میرے ہوش ہی اُڑ گئے۔

ڈارنیل، جوزفین کو بچپن سے جانتا تھا۔ وہ ایڈی کی چھوٹی بہن تھی۔ ایڈی بھی اس کے ساتھ گٹار بجاتا تھا لیکن بعد میں وہ منشیات فروشوں کے ہاتھ چڑھ گیا تھا۔ خود بھی ہیروئن، چرس بیچتا اور دوسروں کو بھی بیچتا تھا۔ اسی لیے کافی عرصے سے پولیس کو مطلوب تھا۔ ایک دن وہ میرے قابو میں آگیا۔ میں اسے مارنا نہیں بلکہ زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے گرفتاری سے بچنے کے لیے مزاحمت کی اور مجھ پر فائرنگ شروع کردی۔ مجبوری میں، میں نے بھی گولیاں چلائیں۔ بدقسمتی سے ایک گولی اس کے سینے پر لگی اور وہ مارا گیا۔

جوزفین ڈارنیل پر زور ڈال رہی تھی کہ وہ مجھ سے ایڈی کی موت کا بدلہ لینے کے لیے اس کی مدد کرے۔ اسی مقصد کے لیے جوزفین نے مجھ سے تعلقات بڑھائے تھے اور میں سراغ رساں ہونے کے باوجود بے وقوف بن گیا مگر ڈارنیل کے انکشاف نے مجھے مرنے سے بچالیا۔

"مجھے معاف کردینا۔" ڈارنیل نے جوزفین کے متعلق تمام انکشافات کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔

"تمہارا کوئی قصور نہیں، وہ تو اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے تمہیں بھی داؤ پر لگا رہی تھی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب..." وہ چونک گیا۔

"بات سیدھی سی ہے۔" میں جوزفین کا پورا منصوبہ سمجھ چکا تھا۔ "جذبۂ رقابت میں آکر میں اگر تمہارا خون کردیتا تو میں پکڑا جاتا اور تم جان سے جاتے۔ اگر تم لوگوں کا منصوبہ کامیاب ہوجاتا تب بھی میں ہی مارا جاتا۔ البتہ اس کھیل میں تمہارے مرنے کے پچاس فیصد اور جوزفین کا انتقام پورا ہونے کا سو فیصد چانس تھا۔"

"شیطان کی بچی۔" ڈارنیل چیخا۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"یہ بات صرف پولیس سراغ رساں ہی سمجھ سکتا ہے اور تم ٹھہرے سیدھے سادے موسیقار۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

اس کے بعد سے اب تک ہم دونوں کے تعلقات بدستور قائم تھے۔ ہم دونوں نے ایک لحاظ سے ایک دوسرے کی زندگی بچائی تھی۔ وہ لگ بھگ پینتالیس برس کے ہونے کے باوجود غیر شادی شدہ تھا۔ اس کی کمزور مالی حالت کے باعث کوئی بھی لڑکی اس کے ساتھ شادی کرنے پر تیار نہیں تھی لیکن وہ بدستور اس کوشش میں تھا کہ کوئی لڑکی راضی ہوجائے۔ مجھے اندازہ تھا کہ میکنزی قتل کیس کی تفتیش میں مجھے شاید اس سے بھی ملنا پڑ جائے۔ میکنزی دن کا بڑا حصہ چرچ میں گزارتی تھی اور ڈارنیل کا گھر چرچ کے احاطے سے متصل تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے میکنزی پر بھی قسمت آزمائی ہو۔ یہ سوچ کر میں مسکرا دیا۔

☆☆☆

راجر نے کہا تھا کہ جس رات اس کا قتل ہوا، وہ دن میکنزی نے چرچ کی سرگرمیوں میں گزارا تھا۔ قتل کی اگلی صبح میں بائٹرن چرچ جا رہا تھا۔ میں آدھ گھنٹے میں چرچ پہنچ گیا۔ میں نے کار میں بیٹھے بیٹھے عمارت پر نظر ڈالی۔ کئی برس بعد یہاں آنا ہوا تھا۔ پتھر سے بنی کئی منزلہ عمارت ویسی کی ویسی ہی تھی لیکن لگتا تھا کہ حالیہ مہینوں میں اس کی تزئین و آرائش پر خاصی توجہ دی گئی ہے۔ میں کار پارک کرکے باہر نکلا اور چرچ کی تین منزلہ عمارت کی جانب بڑھا۔ کچھ دیر بعد میں دوسری منزل پر دائیں جانب واقع چرچ آفس کے سامنے موجود تھا۔ آفس کا داخلی دروازہ شیشے کا بنا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو استقبالیہ پر پینتیس چالیس برس کی خوب رو عورت بیٹھی ہوئی تھی۔

"جی فرمائیے۔" میں اندر داخل ہوا تو اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"پولیس آفیسر مائیکل ایون۔" میں نے اس کے سامنے پہنچ کر اپنا پولیس کارڈ اس کی نظروں کے سامنے کیا۔

"اوہ... پلیز بیٹھیے۔" اس نے مہذبانہ انداز میں کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے سامنے رکھی نیم پلیٹ پر لکھا ہوا تھا:

"لوری میکن، چرچ سیکریٹری۔"

"میں ایک کیس کی تفتیش کے لیے آیا ہوں۔ ایک عورت کے قتل کی تفتیش کے لیے۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ یہ سنتے ہی اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ آنکھوں میں ہلکا سا خوف جھلکا اور لمحہ بھر کے لیے اس کے سرخ لبوں کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

"قتل کیس..." اس نے لپ اسٹک لگے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "کس کا قتل ہوا ہے؟" ایسا لگ رہا تھا کہ قتل کا سن کر اس کا حلق بھی خشک ہوگیا ہے۔

"مسز میکنزی راجر بیلٹ کا..." یہ کہتے ہوئے میں نے تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ وہ پورے دھیان سے سن رہی تھی۔

"اوہ میرے خدا!" میں خاموش ہوا تو اس نے انگلی سے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ "وہ بہت اچھی خاتون تھیں۔ ہم سب انہیں بہت پسند کرتے تھے۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "جب سے وہ کنساس سے یہاں آئی تھیں، تب سے وہ ہر اتوار کو چرچ کی سروس میں نہ صرف باقاعدگی سے شریک ہو رہی تھیں بلکہ ہمارے رضاکار پروگرامز میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ ہم سب انہیں بھول نہیں پائیں گے۔" لوری اگرچہ میکنزی کی بہت تعریف کررہی تھی لیکن اس کے لہجے سے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، وہ اس کے دل کی آواز ہرگز نہیں تھی۔ اس کے الفاظ جذبات اور خلوص سے عاری تھے۔ لہجہ بالکل مصنوعی تھا۔

"یہ لیجیے۔" اس نے ایک کاغذ پر چرچ کمیٹی کے تمام ارکان کے نام اور ٹیلی فون نمبر لکھ کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" میں نے خود اس سے یہ نمبر اور نام مانگے تھے۔

"مجھے امید ہے کہ اگر کمیٹی کا کوئی رکن ایسا کچھ جانتا ہو جس سے پولیس کی مدد ہوتی ہو، تو وہ ایسا ضرور کرے گا۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"کیا میں ذرا چرچ کا جائزہ لے سکتا ہوں؟"

"بخوشی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بائٹرن چرچ آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔" اس نے خوش دلی سے اجازت دے دی۔

میرا ذہن بار بار اس موم کی طرف جا رہا تھا جو مقتولہ کے بالوں اور انگوٹھے پر لگا ہوا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ اسے چرچ کے اندر تو قتل نہیں کیا گیا۔ اس لیے میں چرچ کے اس حصے کا جائزہ لینا چاہتا تھا جہاں عقیدت مند شمع دان میں موم بتیاں روشن کرتے ہیں۔ یہ شک اس لیے بھی زیادہ مضبوط ہو رہا تھا کہ میکنزی کے گھر میں مجھے موم بتی کی موجودگی کا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جہاں اسے قتل کیا گیا، وہاں موم بتیاں ضرور تھیں اور روشن بھی ورنہ جما ہوا موم اس طرح نہیں چپکتا جیسا اس کے بالوں اور انگوٹھے پر لگا ہوا تھا۔ ویسے میں نے ایلن کو اسی وقت ہی خصوصی ہدایت دے دی تھی کہ میکنزی کے جسم سے ملنے والے موم کے نمونے لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے محفوظ کرلے۔ میرا ابتدائی اندازہ تھا کہ قاتل کا سراغ لگانے کے لیے یہ اہم ثبوت ثابت ہوسکتا ہے۔

چرچ میں عبادات کے لیے روشن کی جانے والی موم بتیوں کے لیے اسٹینڈ لگا ہوا تھا۔ میں نے گنا، وہاں ستانوے بڑی موم بتیاں بیک وقت روشن کی جاسکتی تھیں۔ وہاں بڑی تعداد میں موم بھی موجود تھا۔ میں کافی دیر تک پگھلے موم کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے لگا کہ یہ ویسا ہی موم ہے جو لاش کے بالوں اور ہاتھ پر لگا ہوا تھا۔ میں نے چاروں جانب دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے جیب سے چاقو نکال کر تھوڑا سا موم کھرچ کر پلاسٹک کی تھیلی میں رکھ لیا جسے لیبارٹری تجزیے کے لیے بھجوانا تھا تاکہ تصدیق ہوسکے کہ یہ اور لاش پر ملنے والے موم میں کوئی مماثلت ہے بھی یا نہیں۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جس وقت اسٹینڈ پر لگے شمع دان میں موم بتیاں روشن تھیں، اس وقت یہ ذرا سا ڈگمگایا بھی تھا۔ یہ شک اس لیے بھی تھا کہ پگھلا ہوا موم کچھ اس طرح اسٹینڈ کے کناروں سے باہر گرا تھا جس کی لکیریں اسٹینڈ ٹرے پر نظر آرہی تھیں۔ میں نے اسٹینڈ کے ساتھ والی دیوار پر ہاتھ لگایا۔ اگرچہ بظاہر وہ جگہ صاف تھی مگر پھر بھی مجھے دیوار سہلانے پر موم کی ہلکی سی چکناہٹ محسوس ہوئی۔ میرا یہ شک پختہ ہو رہا تھا کہ میکنزی کو اس کے گھر میں قتل نہیں کیا گیا تھا، ممکن ہے اسے یہیں گولی ماری گئی ہو۔ میں اکڑوں بیٹھ کر فرش کا جائزہ لینے لگا۔ وہ جگہ اچھی طرح صاف کی گئی تھی۔ لگ رہا تھا کہ اسے پانی سے دھویا گیا ہے۔ میں نے دیوار کا بغور جائزہ لیا۔ دیوار بھی صاف تھی۔ جس حصے کو میں دیکھ رہا تھا، بظاہر وہاں خون کے نشان نہیں تھے مگر پوری دیوار کو دیکھ کر صاف لگ رہا تھا کہ ایک خاص حصے کو پانی سے رگڑ رگڑ کر دھویا گیا ہے۔ دیوار کا یہ حصہ خاصا چمک رہا تھا۔

"اوہ میرے خدا!" میں دیوار کے بالکل قریب کھڑا ہو کر جائزہ لے رہا تھا کہ منہ سے بے اختیار نکلا۔ پتھر کی دیوار پر ایک چھوٹا سا سوراخ بنا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر کسی بھی پولیس والے کو سمجھنے میں ایک پل کی بھی دیر نہیں لگتی کہ سوراخ گولی کا ہے۔ میں نے جیب سے محدب عدسہ نکال کا بغور جائزہ لیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ جس وقت میکنزی شمع دان میں شمعیں روشن کررہی تھی، اس وقت کوئی یہاں آیا تھا۔ مقتولہ اس سے بات کررہی تھی یا اسے دیکھ رہی تھی کہ اجنبی قاتل نے پیشانی پر گولی داغ دی جو دماغ میں گھس کر، کھوپڑی کو توڑتی ہو دیوار میں جا لگی۔ جب وہ گر رہی تھی تو اس نے شمع دان کا سہارا لینا چاہا... جس سے مقتولہ کے ہاتھ پر موم لگ گیا۔ اسی لیے

اسٹینڈ بھی لڑکھڑا گیا۔ جب وہ نیچے گری تو اس وقت شمع دان سے پگھلتا ہوا موم بھی گر رہا تھا جو اُس کے بالوں اور ہاتھ پر چپک گیا۔ قاتل نے واردات کے بعد لاش اُس کے گھر پہنچنے سے پہلے یا بعد میں اس جگہ کی اچھی طرح صفائی کر دی تھی۔ وہ کرسی بھی غائب تھی جو کھوپڑی کو چیرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ اب بھی جو شواہد موجود ہیں، اُن کی روشنی میں قتل یہیں ہوا تھا... مگر قاتل کون تھا؟ یہ پتا چلانا باقی تھا۔

☆☆☆

دو دن کے دوران میں ہم نے چرچ کے متعدد لوگوں اور دن کے اوقات میں یہاں پر کام کرنے والے کئی مزدوروں سے بات چیت کی مگر کوئی کام کی بات پتا نہیں چل سکی۔ اسی دوران میں ایلن نے سنسنی خیز انکشاف کیا کہ جس رات میکنزی کا قتل ہوا، اُس دن راجر کام پر گیا ہی نہیں تھا۔ اُس نے جس بار اور ریستوران میں اپنی موجودگی کا کہا تھا، اس کی بھی تصدیق نہ ہو سکی۔ اس سے زیادہ تشویش کی بات یہ تھی کہ واردات کی رات سے وہ بچے سمیت لاپتا ہے۔ اس کا موبائل فون بھی بند ہے اور اس نے میکنزی کی تدفین کے حوالے سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا۔ لاش اسپتال کے مردہ خانے میں ہے۔ وہ وہاں بھی نہیں گیا تھا۔

ایلن کی تحقیقات، راجر کے گھر سے ملنے والی بیئر کی خالی بوتلیں اور سگریٹ کے ٹوٹے... اب یہ بات عیاں تھی کہ راجر مشکوک تھا مگر کیس ابھی تک پوری طرح حل نہیں ہوا تھا۔ وہ صرف مشکوک تھا مگر چرچ میں جو کچھ میں نے دیکھا، وہ اس بات کی گواہی تھا کہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ دوسرا یہ کہ چرچ سے لیے گئے موم اور لاش کے جسم پر پایا گیا موم ایک ہی تھا۔ لیبارٹری رپورٹ میں اس بات کی تصدیق کر دی گئی تھی۔

”تم یہ پتا چلاؤ کہ راجر بچے کو لے کر کہاں گیا؟“ میں نے کافی دیر تک کیس کی بکھری کڑیاں جوڑتے رہنے کے بعد ایلن سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ہمیں اسے گرفتار کر لینا چاہیے تھا۔“

”گرفتار کر لیں گے مگر ابھی نہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ایلن! تم کئی سال سے میرے ساتھ کام کر رہی ہو مگر ابھی تک یہ سمجھ نہیں پائی ہو کہ ہم کسی مقتول کے ساتھی کو اس کی گمشدگی یا اُس کا فون بند ہونے کی وجہ سے گرفتار نہیں کر سکتے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

”سوری سر! میں تو بس یونہی...“

”او کے...“ میں مسکرا دیا۔ ”سب سے پہلے تو یہ پتا چلاؤ کہ وہ کہاں پر ہے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ جتنا جلد ہو سکے، ہمیں اس کے ٹھکانے کا پتا لگانا چاہیے۔“

”او کے سر!“

”بھی نہیں، اُس پر پوری نظر بھی رکھی جائے کیونکہ ہماری فہرست میں وہ اب تک مشکوک لوگوں میں شامل ہے۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ ایلن نے کہا اور اجازت لے کر چلی گئی۔

صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے، جب میں نے [illegible] راجر کی تلاش اور اس کی نگرانی کے احکامات دیے تھے۔ [illegible] نے بھی بہت مستعدی دکھائی اور چرچ سے پہلے نہ صرف اس [illegible] راجر کا پتا چلا لیا بلکہ یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ وہ جس ہوٹل میں بچے کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے، وہاں سے وہ آپریٹر سے فون [illegible] پچھلے اڑتالیس گھنٹوں کے دوران ایک ہی نمبر پر چند دو [illegible] بار فون کر چکا ہے۔

”ان نمبروں کی فہرست لی ہے جن پر وہ فون کرتا رہا ہے؟“ یہ سن کر میں نے ایلن سے پوچھا۔

”یہ لیجیے۔“ اس نے فوراً ایک کاغذ میری طرف بڑھایا۔ اُس پر صرف تین نمبر تھے۔ ایک وہاں کا تھا جہاں راجر کام کرتا تھا۔ دوسرا بچوں کی نگہداشت کے ایک ادارے کا تھا اور تیسرا نمبر... میں چونک گیا۔ اس کے آگے کچھ نہیں لکھا تھا۔ میں نے کیس کی تفتیشی فائل اٹھائی اور پھر اس نمبر کا موازنہ کرنے لگا۔ میرا شک درست نکلا۔ یہ نمبر فہرست میں لکھا ہوا ایک نمبر تھا جو چرچ کی سیکریٹری لیلی میکن نے مجھے دو روز پہلے دی تھی۔

”کیا ہوا سر؟“

”ثبوت... یا شاید ثبوت نہیں۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ یہ کہہ کر میں نے رائٹنگ پیڈ اٹھایا اور لکھنے لگا۔ ”یہ لو، اس نمبر پر آبزرویشن لگوا دو۔ اور ہاں، اس نمبر کا پچھلے ایک ہفتے کا ریکارڈ بھی مجھے چاہیے؟“

ایلن نے کاغذ لیا اور کچھ دیر تک اس کا جائزہ لیتی رہی۔ ”او کے سر!“ اس نے کاغذ تہ کر کے جیکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں فون ریکارڈ تھا۔

”یہ لیں۔“ اس نے کاغذ میری طرف بڑھایا اور

[illegible] کی بھاگ دوڑ سے تھک کر [illegible] ان کا لہجہ جسمانی تھکاوٹ کا پتا دے رہا تھا۔ [illegible] میں دن بھر دفتر میں بیٹھے اُسے ہی دوڑا تا رہا تھا۔

”کافی پیو اور چاہو تو میرے ساتھ ڈنر بھی کرو۔ اس کے بعد ہمیں باہر نکلنا ہے۔“ میں نے پیشکش کی۔ یہ سن کر [illegible] اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ [illegible] میکنزی کیس کی فائل کھولی اور ٹیلی فون کمپنی کے ریکارڈ اور [illegible] کی دی گئی فہرست کے نمبروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر دیکھنے لگا۔ کافی آنے تک میں نے ریکارڈ کا اچھی طرح مطالعہ کر لیا تھا۔ اس ریکارڈ سے کئی مفید باتیں سامنے آ گئی تھیں۔

”کچھ کام کا بھی ہے یہ؟“ کافی آنے پر ایلن نے آنکھیں کھولیں اور مگ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کا اشارہ فون ریکارڈ کی طرف تھا۔

”میرے خیال میں تو یہ بہت کام کا ہے۔“ میں نے ایک نمبر پر انگلی رکھتے ہوئے اسے دکھایا۔ ”ایسا کرو، میں تمہیں کچھ نام دیتا ہوں، ان کی فوری طور پر خفیہ نگرانی شروع کر دو۔“

اگلے دو گھنٹے نہایت مصروف گزرے۔ میں اور ایلن کئی چیزوں کی چھان بین اور خفیہ نگرانی کرتے رہے۔ رات ہو رہی تھی۔ ساڑھے سات بجے ہم نے ڈنر کیا اور پھر راجر کے ہوٹل پہنچ گئے۔

”آپ لوگ؟“ راجر نے دروازہ کھولتے ہی حیرت سے کہا۔ اس نے گود میں بچے کو اٹھا رکھا تھا۔

”جی ہاں... ہم لوگ۔ کیا اندر آنے کو نہیں کہو گے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی بالکل... آیئے آیئے۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا اور دروازے سے ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا بات ہے، تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟“ میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔ وہ اب تک کھڑا ہوا تھا۔ ایلن نے آگے بڑھ کر اس کی گود سے بچے کو لے لیا اور پیار کرنے لگی۔ ویسے بھی وہ شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں تھی مگر وہ بچہ سال بھر کا تھا کہ چل بسا۔ تب سے شاید ہر بچے میں اسے اپنا بچہ نظر آتا تھا۔ میں اس کی جذباتی کیفیت سے آگاہ تھا۔

”بیٹھو... اور ہاں، پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا اور میں نے [illegible] اسے مزید وقت دے دینا مناسب سمجھا تھا۔

”کچھ پتا چلا قاتل کے بارے میں؟“ اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی تک تو نہیں مگر پتا چل ہی جائے گا۔“ میں نے سکون سے کہا۔ ”ویسے تمہارا فون بھی بند تھا، اور تم نے خود کوئی رابطہ بھی نہیں کیا۔“ میں نے ذرا سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”ہم دونوں بہت پریشان تھے تمہاری طرف سے۔“ میں نے ایلن کی طرف دیکھتے ہوئے راجر سے کہا۔

”وہ سر... وہ بات یہ ہے کہ میں بچے کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ اسے سنبھالنا آسان نہیں ہے۔“ وہ گڑبڑا گیا۔

”تمہارا تو موبائل فون بھی بند جا رہا تھا۔“

”موبائل نہیں ہے میرے پاس...“

”مگر اُس رات تو تم نے مجھے اپنا نمبر دیا تھا۔“

”ہاں ہاں، مجھے یاد ہے۔“ وہ چونکتے ہوئے بولا۔ ”پتا نہیں، بھاگ دوڑ میں کہاں گر گیا۔“

”اوہ...“

”تدفین کے لیے میکنزی کی لاش...“

”ابھی چند روز لگیں گے۔“ میں نے قطع کلامی کی اور پھر کچھ دیر تک بچے اور اِدھر اُدھر کی بات کر کے کمرے سے نکلنے لگا۔ ”ارے... لو، میں سگریٹ تو گاڑی میں ہی بھول گیا۔“ میں نے جیبیں ٹٹولتے ہوئے ایلن سے کہا۔ ”تم سگریٹ پیتے ہو؟“

”جی ہاں سر!“

”لاؤ، ایک سگریٹ تو دو... بڑی طلب ہو رہی ہے۔“

”یہ لیجیے۔“ اس نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا اور سگریٹ اور لائٹر نکال کر میری طرف بڑھایا۔

”بہت عمدہ سگریٹ ہے یہ۔“ میں نے ایک کش لے کر ڈبیا اور لائٹر واپس کرتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر وہ مسکرا دیا۔

جیسے ہی ہم کمرے سے باہر آئے، اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے لابی میں رکھی ایش ٹرے میں سگریٹ بجھائی اور ادھ پی سگریٹ ایلن کی طرف بڑھائی۔ ”اسے رکھ لو اور دیکھو کہ کیا یہ وہی برانڈ ہے جو ہمیں اُس کے گھر سے ملا تھا۔“ ایلن نے فوراً ہینڈ بیگ سے ایک پلاسٹک کی تھیلی نکال کر سگریٹ اس میں ڈال لی۔

”بڑی ٹھنڈ ہے...“ میں نے ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی اپنی کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

”تو اب کیا کرنا باقی ہے اس ٹھنڈ میں؟“ ایلن نے فوراً

قطع کلامی کی اور مسکراتے ہوئے کہا۔
''ڈنر ہو چکا، راجر سے بھی مل لیے۔ اب کم از کم اسے یقین ہو گیا ہوگا کہ ہم اُس پر نظریں رکھے ہوئے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔
''تو کیا آج کا کام ختم؟''
''ہاں... مگر صرف تمہارا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو رات گئے تک اس کیس پر کام کرنا ہے۔''
''او کے۔''
''میں تمہیں آفس چھوڑتا ہوں، وہاں سے اپنی کار لے کر گھر چلی جانا۔'' میں نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں، کل صبح دس بجے مجھے اُن تمام کالز کا ریکارڈ چاہیے، جن کے نمبرز آج دیے تھے۔''
''ٹھیک ہے۔'' ایلن نے دستانے پہنتے ہوئے کہا۔ ''واقعی آج تو موسم بہت ہی سرد ہے۔''
رات کے نو بج رہے تھے جب میں چرچ کی سیکریٹری لوری میکن کے گھر پہنچا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جلد سو جاتی ہوگی۔ گھر سے کافی دور میں نے گاڑی پارک کی اور ٹہلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میری توقع کے مطابق گھر کی تمام روشنیاں گل تھیں۔ کار پورچ میں کھڑی تھی۔ سفید رنگ کی کار اندھیرے میں خود اپنی موجودگی کا پتا دے رہی تھی۔ مجھے اس کی گاڑی کی اندر سے تلاشی لینا تھی۔ کل صبح چرچ سے باہر آنے کے بعد میں نے دو کام فوری طور پر نمٹائے تھے۔ ایک تو یہ کہ لوری کے گھر کا باہر سے اچھی طرح جائزہ لیا تھا اور دوسرا یہ کہ اُس کی کار کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ سردی کی وجہ سے سڑک سنسان تھی۔ ویسے بھی یہاں گھر ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ مجھے یقین تھا کہ لوری کی طرح اس کے پڑوسی بھی اپنے اپنے بستروں میں دُبکے ہوں گے۔ سخت سردی کے باعث سڑک پر دور دور تک نہ کوئی آدم نہ آدم زاد تھا۔ میں خوش تھا کہ اطمینان سے کار کی تلاشی لے سکوں گا۔
کچھ دیر بعد میں گاڑی کے اندر بیٹھا ہوا پنسل ٹارچ کی روشنی میں تلاشی لے رہا تھا۔ گاڑی زیادہ سے زیادہ تین چار سال پرانی ہوگی لیکن لوری نے اسے اندر سے اچھا خاصا کباڑ خانہ بنا رکھا تھا۔ خالی شاپنگ بیگ، چپس کے خالی ریپر، انرجی ڈرنک کی خالی بوتلیں... نہ جانے کیا کیا کچرا اُس نے کار میں بھر رکھا تھا۔ میں نے ڈیش بورڈ کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک کتاب رکھی ہوئی تھی۔ یہ بچوں کے نام رکھنے کے بارے میں تھی۔ ڈیش بورڈ کھولا تو وہاں بھی کئی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ ڈیش بورڈ سے کام کی صرف دو چیزیں ملیں۔ ایک استعمال شدہ لپ اسٹک اور دوسری اُس کی خریداری کی رسید۔ مجھے ان دونوں چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ ہوتی اگر میں نے رسید نہ پڑھی ہوتی۔ لپ اسٹک ایک فرنچ برانڈ اسٹور سے خریدی گئی تھی۔ کمپیوٹرائزڈ رسید پر اسٹور کا نام اور وقت بھی تحریر تھا۔ میں نے رسید اور لپ اسٹک چیک کی۔ یہ وہی رنگ تھا جو رسید پر لکھا ہوا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ رسید اسی روز دوپہر کا تھا جس رات میکنزی کی لاش دریافت ہوئی تھی۔ لاش دس بجے دریافت ہوئی تھی۔ اُس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ کئی گھنٹے پہلے قتل کی گئی تھی۔ اہم ترین بات یہ تھی کہ بیئر کی خالی بوتل پر لپ اسٹک کا جو نشان تھا، وہ بھی اسی رنگ کا تھا۔
رنگ کی مشابہت اہم نہ ہوتی اگر یہ لپ اسٹک لوری کی کار سے نہ ملتی، لوری چرچ کی سیکریٹری نہ ہوتی... میکنزی نے اپنی زندگی کا آخری دن چرچ میں نہ گزارا ہوتا... مقتولہ گھر میں سگریٹ اور ڈرنک کرنے کی مخالف نہ ہوتی، اُس کے بیڈروم سے بیئر کی لپ اسٹک زدہ بوتل نہ ملتی اور مقتولہ کا شوہر یہ جھوٹ نہ بولتا کہ قتل والے دن صبح سے شام تک کام پر رہا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کیس کی بکھری کڑیاں ملتی جا رہی ہیں مگر ابھی تک یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اسے قتل کیوں کیا گیا؟ جب تک قتل کا جواز سمجھ نہیں آتا، تب تک مشتبہ افراد پر ہاتھ ڈالنے کا مطلب اصل قاتل کو چوکنا کر دینا ہوتا... جب تک قاتل کا پتا نہیں چل جاتا، تب تک مجھے یہی ظاہر کرنا تھا کہ پولیس ملزم کا پتا چلانے میں ناکام ہے تاکہ اصل قاتل مطمئن ہو جائے اور کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے کہ اس کے خلاف کیس اور مضبوط ہو جائے۔ دوسری صورت میں جونہی ہمارے ہاتھ کوئی ٹھوس ثبوت لگتا ہم فوراً اُس کی گردن دبوچ لیتے۔
لوری کی کار کی تفصیلی تلاشی لینے کے بعد میں رات کے ساڑھے بارہ بجے گھر پہنچا۔ تھکن سے بُرا حال تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی نیند کی وادی نے آغوش میں سمیٹ لیا۔
☆☆☆
دن کے دس بج رہے تھے، جب ایلن نے مجھے مشتبہ افراد کی نگرانی کی رپورٹ اور ٹیلی فون ریکارڈ فراہم کر دیا۔ البتہ وائس ریکارڈنگ کی فراہمی سے ٹیلی فون کمپنی نے معذرت کر لی تھی۔ ٹیلی فون ریکارڈ ملزم تک پہنچنے میں نہایت مددگار ہو سکتا تھا۔
ریکارڈ کے مطابق میکنزی کے قتل کے بعد سے راجر نے بیس مرتبہ اپنے موبائل اور ہوٹل کے نمبر سے لوری کو فون کو

تھا... کے درمیان دو بار دو منٹ سے پندرہ منٹ تک کی گفتگو ہوئی تھی۔ جس شام میکنزی کا قتل ہوا، اُس روز بھی راجر نے دو پہر ... لوری نے تین بار اُسے فون کیا تھا۔ ایک کال کا وقت تقریباً وہی تھا جب دوپہر میں لوری اسٹور سے لپ اسٹک خرید رہی تھی۔
فرانزک لیبارٹری نے یہ بھی تصدیق کر دی کہ لپ اسٹک ... جو بیئر کی بوتل پر تھا، وہ بھی لپ اسٹک تھی۔ یہ ... مسکرا دیا۔ نہ جانے کیوں لوری سے اُس دن مل کر مجھے لگا تھا کہ وہ میکنزی سے نفرت کرتی ہوگی۔ اور بات ہے کہ اُس دن وہ مقتولہ کی بہت تعریف کر رہی تھی مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے الفاظ اور ان کے جذبات کے درمیان بہت فرق تھا۔
اب تک کے تمام تر شواہد اس بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ لوری اور راجر کے درمیان تعلقات تھے۔ قتل کے روز وہ کام پر سے غیر حاضر تھا اور میکنزی چرچ میں تھی۔ بچہ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ فون ریکارڈ کے مطابق اُس دوپہر کو لوری بھی چرچ سے باہر خریداری کر رہی تھی۔ الجھن یہ تھی کہ اگر لوری اور راجر، میکنزی کی غیر موجودگی میں گھر پر تھے تو پھر اُسے قتل کس نے اور کہاں پر کیا تھا۔ اگر مقتولہ نے اپنے شوہر کو اس کی محبوبہ کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا تھا تو راجر اور لوری اُسے وہیں قتل کرنے کے بجائے چرچ میں کیوں لے گئے تھے؟ چرچ میں اس بات کے واضح ثبوت تھے کہ قتل وہاں ہوا تھا۔ اگر اُن دونوں نے میکنزی کو وہاں لے جا کر قتل کیا تو پھر لاش کیوں گھر لائے؟ ایک بات اور مشکوک تھی... وہ یہ کہ میکنزی نے انہیں رنگے ہاتھوں اچانک پکڑا ہوگا ورنہ راجر بیوی کے آنے سے پہلے لوری کو چلتا کرتا اور سگریٹ کے ٹوٹے، بیئر کی بوتلیں ضرور ضائع کر دیتا اور پھر چلا جاتا اور رات گئے لوٹتا تو بیوی کو ہرگز شک نہ ہوتا کہ اُس کی غیر موجودگی میں گھر میں کیا کھیل کھیلا گیا تھا۔ ویسے بھی راجر کے پاس گھر کی چابی تو ہوتی ہوگی۔
میں دو، ڈھائی گھنٹے تک اسی ادھیڑ بُن میں لگا رہا مگر اُس کے باوجود کئی سوالوں کے جواب تشنہ تھے۔ آخر میں نے تھک کر کافی منگوائی اور ڈارنیل کا نمبر ملانے لگا۔ ''ہیلو... کیسے ہو؟''
''ہائے مائیکل!'' دوسری طرف سے ڈارنیل نے خوش دلی سے جواب دیا۔
''کیا کر رہے ہو آج کل؟'' میں نے پوچھا۔
''پچھلے ایک ہفتے سے گھر بیٹھا ہوا ہوں، نہ کہیں آتا اور نہ کہیں جاتا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
''تو چلو پھر تیار ہو جاؤ، میں تمہیں شاندار لنچ کرواتا ہوں۔''
''واقعی؟''
''کیوں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم آدھ گھنٹے کے اندر اندر ریک ویو ریستوران پہنچ جاؤ۔''
''میں پہنچتا ہوں... بائے۔''
''بائے!'' میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ امید تھی کہ ڈارنیل سے کچھ کام کی بات پتا چل سکے گی۔ ویسے بھی اس کا چھوٹا سا کاٹیج نما گھر چرچ سے متصل تھا۔ اس کے بیڈروم اور لیونگ روم سے چرچ کی عمارت اور پارکنگ ایریا صاف نظر آتا تھا۔ وہ کئی روز سے گھر پر ہی تھا۔ ممکن ہے کہ واردات والی شام اس نے کچھ غیر معمولی سرگرمی دیکھی ہو۔
تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میں اور ڈارنیل لنچ سے فارغ ہو کر جھیل کے کنارے بچھی بینچ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

ابھی تک میں نے میکنزی قتل کیس کے حوالے سے ایک لفظ بھی اُس سے نہیں کہا تھا۔ اچانک میں نے جیب سے پوسٹ کارڈ سائز تصویر نکالی اور اُس کی آنکھوں کے سامنے ہرائی۔

''اسے جانتے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔ نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تصویر دیکھ کر وہ خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

''نہیں... میں نے تو اسے کہیں نہیں دیکھا۔'' کچھ دیر بعد اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

''اچھا...'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے کہ تم کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو یا بھولنے کی اداکاری۔''

''نہیں نہیں... میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔ ''تم میری بات کا یقین کرو۔''

''کر تو لوں اگر تم سچ بول دو۔'' میں نے پھر طنزیہ انداز میں چوٹ کی۔

''تمہاری مرضی، میں نے تو اسے کبھی کہیں نہیں دیکھا۔'' اس نے زمین کی طرف نظریں جھکائے ہوئے کہا۔

''تمہاری نظریں بتا رہی ہیں کہ تم جھوٹ بول رہے ہو؟''

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟'' وہ تڑپ کر بولا۔ ''مجھے کسی چکر وکر میں نہیں پڑنا۔ مجھے ذرا سا بھی علم ہوتا کہ یہ معاملہ ہے تو میں چرچ کی آفر بھی قبول نہیں کرتا۔'' اس کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

''میں تمہیں کسی چکر میں نہیں پھنسا رہا۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''ایک عورت کا قتل ہوا ہے اور میں اس کیس کی تفتیش کر رہا ہوں۔ بس ایک اچھے شہری کی حیثیت سے تمہاری مدد چاہتا ہوں۔''

میری بات سن کر وہ خاصی دیر تک زمین میں نظریں گڑائے خاموشی سے تکتا رہا۔ ''سچ کہہ رہے ہو؟'' کافی دیر بعد اس نے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

''سو فیصد سچ۔''

''اگر میں تمہاری مدد کروں تو تم بیچ میں میرا نام تو نہیں آنے دو گے؟''

''بالکل نہیں۔'' یہ سن کر میں مسکرا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ ڈارنیل حقیقت میں اس کیس کے بارے میں ضرور کچھ جانتا ہے۔

''میں اس عورت کے بارے میں جانتا ہوں۔'' ڈارنیل نے میکنزی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تو میں جانتا تھا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے قطع کلامی کی۔

''جاننا چاہتے ہو تو پھر خاموش رہ کر سنو۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے خفگی سے کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے میری قطع کلامی پسند نہیں آئی۔

''ٹھیک ہے، اب نہیں بولوں گا۔'' میں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''او کے!'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''بس شام ہی ... رات ہوئی، اُس وقت میں لیونگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور میں وقت گزاری کے لیے بلا ارادہ باہر دیکھ رہا تھا۔ چرچ کے داخلی دروازے سے ذرا ہٹ کر پادری آرتھر اپنی کار سے اتر رہا تھا۔ اسی دوران میں یہ عورت بھاگتی ہوئی چرچ کے اندر جاتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے اسے کوئی آدھ گھنٹا پہلے گود میں بچہ لیے یہاں سے جاتے دیکھا تھا مگر اس بار وہ اکیلی آئی تھی۔ جس ہذیانی انداز میں وہ بھاگتی ہوئی چرچ کے اندر داخل ہوئی، اس سے مجھے شک ہوا۔ ابھی میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا مجھے کیا کرنا چاہیے کہ اسی دوران پادری آرتھر بھی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر چلا گیا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''ذرا سانس تو لینے دو۔'' یہ کہہ کر اس نے پانی کی بوتل اٹھائی اور دو گھونٹ بھر کر اسے واپس رکھ دیا۔ ''اُس وقت چرچ پر سناٹا طاری تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اندر بھی ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا نہیں ہوگا۔ جس انداز میں پادری چرچ کی طرف بڑھا تھا، وہ انداز مجھے ٹھیک نہیں لگا۔ ویسے بھی اکثر خواتین کی رائے اس کے بارے میں اچھی نہیں ہے۔ ایک بات تو میں سمجھ گیا تھا کہ اس عورت کے ساتھ کچھ برا ہوا ہے جو وہ یوں پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی آئی ہے البتہ تنہا عورت اور آرتھر... میں نے فیصلہ کرلیا کہ ذرا پتا چلاؤں کہ معاملہ کیا ہے۔ میں باہر نکلا اور دیوار کی اوٹ لیے ہوئے چرچ میں پہنچ گیا۔ میں داخلی دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک کار تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ میں نے پہچان لیا، یہ لوری کی کار تھی۔ کچھ دیر میں لوری اور ایک مرد کار سے نکلے اور تیزی سے آگے بڑھے۔ انہیں آتا دیکھ کر میں اوٹ میں ہوگیا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے گولی چلنے کی آواز آئی۔ میں نے اندر نظر ڈالی۔ آرتھر، لوری اور وہ مرد بڑے شمع دان کے قریب زمین پر جھکے کچھ دیکھ رہے تھے۔''

''وہ کیا دیکھ رہے تھے؟'' میں نے قطع کلامی کی۔

''یہ جاننے کی کوشش نہیں کی میں نے۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔ ''گولی کی آواز سن کر مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں چھپتے چھپاتے واپس اپنے گھر پہنچ گیا۔'' یہ کہہ کر اس نے گہرا سانس لیا اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ''بس... میں اتنا ہی جانتا ہوں۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے یقین تھا کہ ڈارنیل خود بھی اور شریف انسان ہے۔ اس نے جو کچھ دیکھا، وہ بتا دیا۔ میں اب کیس کی کڑیاں ملا رہا تھا۔ میکنزی قتل کیس کسی حد تک حل ہو چکا تھا۔ راجر اور لوری کے درمیان تعلقات اب صاف ظاہر ہو چکے تھے، البتہ آرتھر کی موجودگی کے باعث اب ایک سوال یہ اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ ان تینوں میں سے جان لیوا گولی کس نے چلائی؟ راجر، لوری یا پھر آرتھر... ڈارنیل کے انکشاف کے بعد اب مجھے صرف قاتل کا سراغ لگانا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' کافی دیر بعد میں نے سر اٹھا کر ڈارنیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بہت مدد کی ہے، تمہارا شکریہ۔''

''مگر میرا نام...''

''بیچ میں نہیں آئے گا۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے پورا سچ بتایا ہے۔''

میری بات سن کر اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ کافی دیر تک وہ کچھ سوچتا رہا اور پھر سر اٹھا کر دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔ ''تمہیں یہ کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے...''

''اس لیے کہ تم تین میں سے کسی ایک یا دو کو بچانا چاہتے ہو یا پھر شاید تینوں کو۔'' میں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔''

''ممکن ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ بھی تو ممکن ہے کہ جو کہہ رہا ہوں وہ درست ہو۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''دیکھو... جو میں کہہ رہا ہوں، وہی جانتا ہوں۔'' وہ گڑبڑا گیا اور جلدی سے کہنے لگا۔ ''ویسے میرا اُن سے کیا رشتہ ہے جو کسی کو بچانے کی کوشش کروں گا۔''

میں نے ہوا میں تیر چلایا تھا لیکن اس کا جو ردِعمل سامنے آیا، اُسے دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہوگیا کہ ڈارنیل نے جو کچھ بتایا، وہ اس سے زیادہ جانتا ہے۔ ''تمہارا کسی سے کوئی رشتہ ہے یا نہیں، یہ تو میں نہیں جانتا البتہ مجھے یقین ہے کہ تم جان بوجھ کر کچھ چھپا رہے ہو یا پھر سب کچھ بتا کر پولیس کی مدد نہیں کرنا چاہتے۔'' یہ کہہ کر میں نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''سچ تو پتا چل ہی جائے گا مگر مجھے افسوس رہے گا کہ تم جیسا آدمی بھی جھوٹ بول سکتا ہے۔''

...وہ میں ہوں

شرابی آدھی رات کو جھومتا جھامتا سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ کانسٹیبل نے اسے روک لیا اور پوچھا۔ ''تمہارا نام؟''

''پتا نہیں...'' شرابی نے جواب دیا۔

''تمہیں اپنا نام ہی نہیں معلوم؟'' کانسٹیبل نے غصے سے پوچھا۔

شرابی کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ''آپ ایسا کریں، شاہراہ نمبر 108 پر جائیں۔ گھر نمبر 84 کی گھنٹی بجائیں اور پوچھیں کہ ایڈورڈ گھر پر ہے۔ اگر نہ ہو تو سمجھ لیں کہ وہ میں ہوں۔''

(اخلاق احمد، پشاور)

☆☆☆

''میں جھوٹ نہیں بول رہا۔'' اس نے تڑپ کر کہا۔

''اچھا...'' میں نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''اگر تم جھوٹ نہیں بول رہے تو پھر پورا سچ بھی کب بتایا ہے۔'' مجھے پتا چل گیا کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔ ڈارنیل جیسے حساس انسان سے اسی ردِعمل کی توقع تھا۔ اس جیسا کوئی بھی شخص یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی اسے منہ پر جھوٹا کہے۔

''سچ سن سکو گے؟'' اس نے سخت لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ اس کے چہرے پر تناؤ نظر آ رہا تھا۔

''میرے اندر بڑی ہمت ہے۔''

''تو ٹھیک ہے... پھر سنو۔'' اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''آرتھر اچھا آدمی نہیں ہے۔ اسی کی وجہ سے میں نے چرچ کی ملازمت چھوڑی تھی، بڑا کمینہ ہے وہ۔''

''یہ بات پہلے تو کبھی تم نے نہیں بتائی۔'' میں نے استفساریہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب بتا رہا ہوں۔'' اس نے فوراً کہا۔ ''کیا ہوا جو میں نے پانچ سال تک کسی سے یہ بات نہیں کہی مگر کبھی کسی نے مجھ سے یہ بات جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا۔ ''تم نے بھی یہ بات جاننے کی کوشش کی کہ میں نے ملازمت کیوں چھوڑی تھی؟ کبھی تم نے یہ سوال مجھ سے نہیں کیا۔ حالانکہ اچھی طرح جانتے ہو کہ چرچ کی ملازمت چھوڑنے کے بعد سے اب تک میں تنگ دستی کا شکار ہوں۔''

"تم سچ کہہ رہے ہو۔" میں نے ندامت سے سر جھکا کر کہا۔ وہ واقعی سچ بول رہا تھا۔ "آج بتا دو... آرتھر اور تمہارے چرچ چھوڑنے کے درمیان کیا تعلق ہے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"آرتھر بیمار ہے... ذہنی بیمار۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "اتفاق سے اس کی سرگرمیاں میرے علم میں آگئی تھیں۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ ملانا چاہا مگر میرے انکار پر اس نے مجھے دھمکی دی۔ میرے سامنے زندگی، موت، ملازمت اور زباں بندی کے آپشن تھے۔ میں نے زندگی اور زباں بندی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"سچ بتاؤ۔" میں نے اسے واپس موضوع کی طرف لانا چاہا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ بات میکنزی کے قتل کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ وہ سخت جذباتی ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ سب کچھ صاف صاف کہنے والا ہے۔

"ہوا یہ کہ ایک دن اتفاق سے میں اس کے کمرے میں چلا گیا تھا۔" ڈارنیل نے کہنا شروع کیا۔ "اس وقت وہ اندر موجود نہیں تھا۔ میں نے دروازہ کھلا ہونے سے یہی اندازہ لگایا کہ شاید وہ غسل خانے میں ہوگا۔ یہ سوچ کر میں بیٹھ گیا۔ میری نظر سامنے پڑی۔ کمپیوٹر آن تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک دوست کو ای میل بھیجنا تھی۔ میں نے کرسی گھسیٹی اور کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ مووی پلیئر کھلا ہوا ہے۔ پھر جو کچھ میں نے دیکھا، وہ نہایت ہی تکلیف دہ تھا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور کچھ سوچنے لگا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"میں نے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک سرچ کرنا شروع کر دی اور پھر جو کچھ سامنے آیا، اسے دیکھ کر میرا سر شرم سے جھک گیا۔ میں نے کمپیوٹر پر سرچ کی گئی تمام فائلیں بند کیں اور کمرے سے باہر نکل گیا۔" اس نے تفصیل سے بتایا۔

"کیا تھا وہ سب کچھ؟"

"آرتھر گھناؤنے جرائم میں ملوث ہے۔" یہ کہہ کر اس نے میری طرف دیکھا۔ میں خاموشی سے اسے تک رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد جب اس نے آرتھر کے بارے میں انکشافات کرنا شروع کیے تو میرا ابھی سر گھوم گیا۔ وہ سب کچھ تفصیل سے بتا رہا تھا۔

"ڈارنیل... تم نے صرف ایک نہیں، دو کیس میں میری مدد کی ہے۔" کافی دیر بعد جب وہ دل میں چھپے سارے راز بیان کر چکا تو میں نے سچے دل سے اس کی مدد کا اعتراف کیا۔ "اب وہ بچ نہیں سکتا۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہاں اٹھو... آج شام اپنے گھر کی کھڑکی پر پردہ نہیں ڈالنا۔ تمہیں بہت کچھ دیکھنے کو ملے گا۔"

"میں دعا گو ہوں کہ ایسا ہی ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اگلے ہی لمحے ہم دونوں پارکنگ کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

"یہ لیجیے۔" ایلن نے مسکراتے ہوئے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا۔ شام کے پانچ بجنے والے تھے جب مجسٹریٹ سے چرچ کی تلاشی کا وارنٹ لے کر پہنچی۔ میں کافی دیر سے اس کی آمد کا منتظر تھا۔ میں نے فوراً وارنٹ لے کر اسے دیکھا اور تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ "فرانزک اور پولیس ٹیم تیار ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ایک، ایک کپ کافی پی لیں... تب تک ہر چیز تیار ہو جائے گی۔" اس نے فون پر کافی اور اسنیک کا آرڈر دیا۔ "پتا نہیں، ڈنر کب نصیب ہو۔ بہتر ہے کہ بھرے پیٹ کام شروع کیا جائے۔" فون رکھ کر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

"امکان ہے کہ اس کیس میں آج کی رات مشقت کی آخری رات ہے۔ کل صبح دیر تک سوئیں گے۔"

"ایسا ہو تو مزہ آ جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی۔ "میں تیاریوں کا جائزہ لے کر آتی ہوں۔"

جب ہم پولیس ہیڈ کوارٹر سے نکلے تو رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ پولیس کی چار گاڑیاں تیار تھیں۔ میں اور ایلن پرائیویٹ کار میں تھے۔ باقی گاڑیاں ہمارے پیچھے تھیں۔ ہم چرچ کی طرف جا رہے تھے۔

دو گھنٹے کے اندر اندر کارروائی ختم ہو گئی۔ آرتھر کو تمام ثبوتوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ فرانزک اور میڈیکل ٹیم نے چرچ کی دیوار میں گولی سے بننے والے سوراخ اور اس میں لگے دماغ کے ٹشوز اور خون کے ذرات کے نمونے حاصل کیے۔ قتل میں استعمال ہونے والا پستول آرتھر کی کار سے مل گیا۔ لوری کو اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا جبکہ راجر کو ہوٹل کے کمرے سے تحویل میں لیا گیا تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ تفتیش مکمل کرنے کے لیے ڈی این اے رپورٹ کا انتظار کرنا پڑے گا لیکن حیرت انگیز طور پر آرتھر بہت ہی کمزور ثابت ہوا۔ وہ بہت جلد پولیس کے سامنے ہمت ہار بیٹھا۔ اس کی دیکھا دیکھی لوری اور راجر نے بھی سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ ان اعترافات کے نتیجے میں جو حقیقت سامنے آئی، وہ نہایت شرمناک تھی۔

آرتھر نے اپنے تمام تر گناہوں کا اعتراف کر لیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کئی سالوں سے مافیا کے لیے کام کر رہا تھا جس کے عوض اس کے بے نام بینک اکاؤنٹ میں بھاری رقم جمع کروائی جاتی تھی۔ وہ نہ صرف شہر کے نوجوانوں سے منشیات کو بیچ کر چرچ تک لاتا بلکہ اسے چرچ کے اندر چھپا کر بھی رکھتا جہاں سے رات گئے مافیا کے کارندے انہیں ضرورت کے مطابق حاصل کر لیتے تھے۔ وہ برسوں سے اس دھندے میں ملوث تھا۔ اس کام کے لیے وہ چرچ کے بوائز اسکاؤٹس اور رضا کار عورتوں کو استعمال کرتا تھا۔ عورتوں کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال پر رضامند کرنے کے لیے پہلے وہ ان سے جسمانی تعلقات قائم کرتا اور پھر اپنے کمرے میں لا کر خفیہ کیمروں سے ان کی مخرب اخلاق ویڈیوز تیار کر کے بلیک میل کرتا تھا۔ یوں وہ مظلوم عورتیں اس کی آلۂ کار بن جاتی تھیں۔ لوری بھی اس دھندے میں برابر کی شریک تھی۔ وہ اپنی اداؤں سے ایسے لوگوں کو پھانستی تھی جو اس دھندے میں ان کے کام آ سکیں۔

لوری مہینا بھر پہلے راجر سے ملی تھی۔ اس دن وہ اپنی بیوی کے ساتھ پہلی بار چرچ آیا تھا۔ انہی دنوں انہیں ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو ان کا آلۂ کار بن سکے۔ لازم تھا کہ وہ پولیس کی نظروں میں نہ آیا ہو۔ راجر سے مل کر لوری کو محسوس ہوا کہ وہ ان کے لیے مناسب آدمی ہے۔ اس نے قدم آگے بڑھائے۔ راجر آزاد خیال آدمی تھا۔ بیوی کے کٹر مذہبی رجحانات کے باعث پہلے ہی پریشان تھا۔ دوسرا یہ کہ شہر بھی اس کے لیے نیا تھا۔ ابھی تک اس کی کوئی گرل فرینڈ بھی نہیں بنی تھی۔ لوری نے قدم آگے بڑھائے تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور بہت جلد وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔

میکنزی کے قتل سے پہلے، راجر کام سے فارغ ہو جانے کے بعد سیدھا لوری کے گھر چلا جاتا اور رات دیر گئے تک اس کے ساتھ رہتا تھا۔ جس دن میکنزی کا قتل ہوا، اس روز وہ بوائز اسکاؤٹس کے گروپ کی تنظیم نو میں مصروف تھی کہ لنچ کے وقفے میں پادری آرتھر نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا اور اس کے قریب ہونے کی کوشش کی مگر اس نے مزاحمت کی اور واپس آ گئی۔ پروگرام کے مطابق اسے شام چھ بجے گھر لوٹنا تھا مگر آرتھر کی بے باکانہ حرکت کے باعث وہ ذہنی طور پر سخت پریشان تھی۔ اس نے بچوں کو ان کے گھروں پر واپس بھجوانے کے بعد خود بھی جلدی گھر جانے کا فیصلہ کیا۔

دوسری طرف لوری اور راجر کے درمیان اس دن ملاقات طے تھی۔ راجر نے بیوی کو بتائے بغیر کام پر سے چھٹی

اقوالِ مس زریں

☆ اگر لڑکیاں اپنے چہروں کو دیکھنا چھوڑ دیں تو لڑکے بھی ان کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں گے۔

☆ ضروریاتِ زندگی کی بہترین چیزیں ہی مفت نہیں ملتیں، بدترین چیزیں بھی مفت ملتی ہیں۔

☆ سراب کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ کوئی شخص یقین کر لے کہ وہ ہو بہو اپنے شناختی کارڈ کی طرح دوسروں کو نظر آتا ہے۔

☆ اوسط درجے کی لڑکی میں ذہانت سے زیادہ حُسن ہونا چاہیے کیونکہ اوسط درجے کے لڑکے کا دماغ کمزور اور نظر تیز ہوتی ہے۔

☆ بیویوں کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ اکثر بیویاں اس راکھ تک کی آواز سن لیتی ہیں جو ان کے شوہروں کے سگریٹ سے ڈرائنگ روم میں قالین پر گرتی ہے۔

☆ مصوروں کی ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی نے جس گھوڑے کو ڈیزائن کیا تھا، اسے اونٹ کہتے ہیں۔

☆ وہ وقت قریب ہے جب کسی ماہنامے کا ایڈیٹر غیر فانی شہرت حاصل کرے گا، کم و بیش اتنی ہی دلچسپ کہانیاں چھاپ کر جتنے دلچسپ ٹی وی کے اشتہارات ہوتے ہیں۔

☆ تجربے سے اچھا کوئی استاد نہیں البتہ اس استاد کی فیس بہت زیادہ ہے۔

☆ ماؤ، بہنو اور بیٹیو! کیا تمہیں علم ہے کہ تم اپنے شوہروں سے جو کچھ کہتی ہو، اسے تمہارے ہی خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ دولت مند شخص جھاڑو دینے والی، برتن مانجھنے والی، کپڑے دھونے والی، کھانا پکانے والی، بچوں کی دیکھ بھال کرنے والی اور گھر کو صاف ستھرا رکھنے والی ملازمائیں الگ الگ رکھتا ہے۔ غریب آدمی صرف شادی پر اکتفا کر لیتا ہے۔

مرسلہ: محمد طاہر مجاہد، منڈی بہاؤالدین

کی اور دونوں لنچ سے کچھ پہلے مارکیٹ میں ملے جہاں سے لوری نے لپ اسٹک خریدی اور لگائی بھی۔ ویسے بھی جس دن میں اس سے پہلی بار ملا تھا، تب بھی اس نے نہایت گہری اور بھڑکیلے سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی۔ راجر نے بیئر کی بوتلیں خریدیں اور اسے ساتھ لے کر گھر آگیا۔ راجر کو علم تھا کہ میکنزی شام کو ساڑھے چھ بجے تک گھر لوٹے گی۔ اس لیے وہ دونوں نہایت سکون سے بیڈ پر لیٹے تھے کہ اچانک وہ لوٹ آئی۔ لوری اور اپنے شوہر کو جس حالت میں اُس نے دیکھا، وہ اس کے لیے بہت بڑا ذہنی صدمہ ثابت ہوا۔ وہ دونوں خود بھی اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گئے۔ لوری چاہتی تھی کہ کسی طرح راجر کو ملازمت سے جواب مل جائے اور جب وہ بے روزگاری سے تنگ ہو کر مدد مانگے تو وہ اسے دھندے پر لگا دے مگر میکنزی بیچ میں آگئی۔ اسے لگا کہ اس طرح سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا مگر اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچھ کرتے، میکنزی نے بچے کو لاؤنج میں لا کر صوفے پر بٹھایا اور روتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آیا اور وہ روتے روتے چرچ واپس پہنچ گئی۔ شمع دان کے قریب وہ موم بتی روشن کر رہی تھی کہ آرتھر آگیا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ آرتھر نے ایک بار پھر اسے اپنے بس میں کرنا چاہا مگر اس نے سخت مزاحمت کی اور دھمکی دی کہ وہ سب کچھ اخبار والوں کو بتا دے گی۔ یہ سن کر وہ ڈر گیا اور جیب سے پستول نکال کر گولی چلا دی۔ گولی اس کی پیشانی میں لگی اور وہ شمع دان کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے نیچے جا گری۔ اسی دوران میں راجر اور لوری بھی پہنچ گئے۔ ویسے بھی انہیں یقین تھا کہ لوری یہیں آئی ہوگی مگر جب تک وہ اندر داخل ہوتے، تب تک گولی چل چکی تھی۔

لوری نے بتایا کہ یہ دیکھ کر راجر ہوش کھو بیٹھا تھا لیکن جب کچھ دیر بعد ہم تینوں کے حواس قابو میں آئے تو میں نے اسے سمجھایا۔ آرتھر نے زبان بند رکھنے کے لیے اسے پچاس ہزار ڈالرز دیے۔ راجر کے لیے یہ بہت بڑی رقم تھی۔ آرتھر نے سمجھایا کہ اگر وہ خاموش رہا تو میکنزی کی انشورنس رقم بھی اسے مل جائے گی۔ لوری کے بقول اُس نے بھی عشوہ طرازی کے تیر چلائے۔ راجر کو بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ زبان بند رکھنے میں ہی بہتری ہے۔ یوں طے پایا کہ آرتھر اور لوری جائے واردات کی صفائی کرتے ہیں اور راجر اس کی لاش گھر لے جا کر پھینکے گا اور پچھلے حصے سے باہر چلا جائے گا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد لوری پبلک فون بوتھ سے پولیس کو فون کر کے غلط نام سے گھر میں گولی چلنے کی آواز سنائی دینے کی خبر دے گی۔ یوں سارا معاملہ نمٹ جائے گا۔ منصوبہ اچھا تھا مگر افسوس کہ ڈارنیل نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اس نے ملزمان کی گرفتاری کے بعد مجھ سے رابطہ کیا، اپنی خواہش پر پولیس کو باقاعدہ بیان دیا۔ ویسے راجر بھی اناڑی مجرم تھا ورنہ پولیس کو اپنے پہلے بیان میں یہ نہیں کہتا کہ وہ سارا دن کام پر تھا اور رات کو بار اور ریستوران میں۔

میرے لیے یہ کیس ایک نعمت ثابت ہوا۔ میں کئی مہینوں سے شہر میں سرگرم منشیات فروشوں کے گروہ کے سرغنہ کو پکڑنے میں سرکھپا رہا تھا۔ مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ میکنزی قتل کیس اور منشیات کیس ایک ساتھ حل ہو جائیں گے۔ ویسے اس کیس میں ڈارنیل کا کردار بہت اہم تھا۔ اگر وہ منہ نہ کھولتا تو شاید منشیات فروش گروہ کا سرغنہ پادری آرتھر نہ پکڑا جاتا۔

☆☆☆

''اور کیا ہو رہا ہے باس؟'' سہ پہر کے وقت ایلن میرے کمرے میں داخل ہوئی اور کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''امید ہے کہ میری طرح مکھیاں نہ مار رہے ہوں گے۔''

''تمہارا اندازہ سو فیصد درست ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ میکنزی اور منشیات کیس کے بعد ہم دونوں ان دنوں فارغ ہی تھے۔

''چھٹیاں چاہئیں وہ بھی دو ہفتے کی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے چھٹی کی درخواست میری طرف بڑھائی۔ ''اس پر دستخط کر دو۔ میں بیٹے کو ساتھ لے کر کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر تفریح کے لیے جانا چاہتی ہوں۔''

''یہ لو، جاؤ مزے کرو۔'' میں نے فوراً درخواست منظور کرتے ہوئے اس پر دستخط کر دیے۔ راجر کے جیل جانے کے بعد عدالت کے ذریعے ایلن نے بچے کو بطور لے پالک بیٹا اپنا لیا تھا۔ میکنزی کے بہیمانہ قتل کے بعد شاید اس معصوم بچے کو ایلن سے زیادہ خیال رکھنے والی ماں نہیں ملتی۔

''شکریہ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ویسے جب سے تم بغیر اسپتال گئے ماں بنی ہو تب سے تمہارا دل دفتر میں نہیں لگ رہا ہے۔'' میں نے مذاق سے کہا۔

''شٹ اپ... روکنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ میرا بیٹا گھر پر انتظار کر رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

ناکردہ

میمونہ عزیز

شوق جنوں کی حدوں کو نہ چھوئے تو پھر وقت گزاری کا مشغلہ ٹھہرتا ہے... اور ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کا رنگ نہ پکڑیں تو پھر یہ تعلق صرف شناسائی تک ہی محدود رہتا ہے... چاہے قربتوں میں کتنی ہی گہرائی کیوں نہ ہو... وہ دونوں بھی ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے... ایک اپنے شوق سے جنون کی حد تک عشق کرتا تھا تو دوسرا جانے انجانے میں اس کے رنگ میں ڈھلتا جا رہا تھا مگر جب تک یہ حقیقت آشکارا ہوئی تب تک بہت دیر ہو چکی تھی...

عشق اور جنون خیز شوق کے درمیان جھولتا دلچسپ و مختصر نا...

باوردی افسر کو رخصت کرتے ہوئے سراغ رساں کارل نے نوجوان عورت کو تفتیشی کمرے میں پہنچا دیا۔ عورت نے ایک مہنگا پرفیوم لگایا ہوا تھا جس کی خوشبو نے نہ صرف کمرے کی فضا کو خوشگوار بنا دیا بلکہ اس قیدی کے جسم میں برقرار رہ جانے والی بدبو کو بھی ڈھانپ دیا تھا جو اس سے پہلے اس کمرے میں لایا گیا تھا۔

''کیا میں تمہارے لیے کافی منگواؤں؟'' سراغ رساں نے عورت سے پوچھا۔

”نہیں۔“

”پانی؟“

”نہیں، شکریہ ڈیٹکٹیو۔“ عورت نے لبوں پر خوشگوار مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا اور اپنے دودھیا رنگ کے بلاوز کی آستین کو درست کرنے لگی جس پر خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ اس کے سرخی مائل بھورے گھنگھریالے بالوں کی ایک لٹ اس کی پیشانی پر آگئی جسے اس نے ہاتھ سے پیچھے ہٹاتے ہوئے ایک نظر اپنی کلائی کی گھڑی پر ڈالی۔

”مجھے امید ہے کہ تم اپنا کام جلد ختم کرلو گے۔“ اس عورت نے کہا۔ ”میں اسپتال بھی جانا چاہتی ہوں۔“

”یقیناً۔“ سراغ رساں کارل نے کھنکارتے ہوئے اپنا حلق صاف کیا اور اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کردی۔ کام کے معاملے میں وہ وقت ضائع کرنے کا عادی نہیں تھا۔ مطلب کی بات پر آتے ہی اسے ہمیشہ خوشی محسوس ہوتی تھی اور اس عورت نے گفتگو شروع کرنے کا اشارہ دے دیا تھا۔

”تم اس بات کو بہ خوبی سمجھتی ہو کہ تمہارا یہ بیان عدالت میں تمہارے خلاف استعمال ہوسکتا ہے؟ اور پوچھ گچھ کے دوران میں تمہیں اپنے وکیل کو طلب کرنے کا حق حاصل ہے؟“ سراغ رساں کارل نے کہا۔

عورت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تم اپنے وکیل کی موجودگی کے بغیر اپنا بیان قلمبند کرانا چاہتی ہو؟“

”ہاں، مجھے کچھ نہیں چھپانا۔“ عورت نے جواب دیا۔

”تم پر بیان دینے میں کسی قسم کا دباؤ بھی نہیں ہے؟“

”بالکل نہیں۔“ عورت نے اس طرح ہاتھ لہرایا جیسے کسی پریشان کرنے والی مکھی کو اڑا رہی ہو۔ ”دراصل یہ سب ایک زبردست غلط فہمی ہے۔“

”آل رائٹ... مس... کیا میں تمہیں لیزلی کہہ سکتا ہوں؟“ سراغ رساں کارل نے پوچھا۔

”یس، پلیز۔“

”یہ... مسٹر کوپر... یہ تمہارا...؟“

”میرا بوائے فرینڈ ہے۔ ہم اپریل کے مہینے میں شادی کرنے والے ہیں۔“ لیزلی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ساتھ ہی اپنے بائیں ہاتھ میں موجود زمرد تراش ہیرے کی انگوٹھی سے کھیلنے لگی۔

”تمہاری مراد ہے... میرا مطلب ہے کہ مسٹر کوپر سے شناسائی کب سے ہے؟“

”ہم لگ بھگ تین سال سے ڈیٹنگ کر رہے ہیں۔“ لیزلی نے جواب دیا۔

”تم اپنے تعلق کی وضاحت کس طرح کروگی؟“

”ہمارے آپس میں تعلقات ویسے ہی تھے جیسے کہ ہونے چاہئیں۔“

”کیا تمہارے ساتھ اس کا سلوک مناسب ہوتا تھا؟“

”ہاں۔“

”کبھی باہمی اختلاف ہوتا تھا؟“

”ہاں معمول کی نوک جھونک تو ہوتی رہتی تھی۔“

”آج شب تم دونوں کے درمیان کوئی اختلافی بحث... کوئی جھگڑا ہوا تھا؟“

”اوہ، ہمارے درمیان حقیقت میں کوئی جھگڑا یا تکرار نہیں ہوئی تھی۔“

”نہیں؟“ سراغ رساں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”درحقیقت یہ بس ایک... حادثہ تھا۔“ لیزلی نے قدرے اٹکتے ہوئے کہا۔

”کیا تم وضاحت سے بیان کرسکتی ہو کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“ سراغ رساں کارل نے اپنی نوٹ بک کھول لی اور قلم سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”ویل، کوپر کو چاقوؤں سے خصوصی دلچسپی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ وہ انہیں جمع کرتا ہے؟ شوقیہ جیسے کہ ایک کلیکٹر ہوتا ہے؟ کوائن کلیکٹر، اسٹیمپ کلیکٹر؟“ سراغ رساں کارل نے اپنی نوٹ بک میں لکھتے ہوئے پوچھا۔

”اسے کلیکٹر تو نہیں کہہ سکتے۔ البتہ اسے اپنی کٹلری پر بے حد فخر تھا۔“ لیزلی نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”کٹلری؟“ سراغ رساں کارل نے بھویں اچکاتے ہوئے دہرایا۔ اسے گمان ہوا کہ شاید اسے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔

”ہاں، کٹلری! کچن میں استعمال ہونے والے ظروف!“ لیزلی نے وضاحت کی۔

”اوہ، اچھا۔“

”خاص طور پر وہ اپنے چاقوؤں کے بارے میں نہایت سیریس ہوجاتا تھا۔“

”آئی سی۔ آگے بتاؤ۔“ سراغ رساں کارل نے تیزی سے قلم چلاتے ہوئے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”ویل، ہم ڈنر تیار کر رہے تھے۔ میں سلاد کے لیے ٹماٹر کاٹ رہی تھی کہ اس نے اعتراض کرنا شروع کردیا کہ میں غلط چاقو استعمال کررہی ہوں۔“

”غلط چاقو؟“

”ہاں وہ چاقوؤں کے استعمال کے بارے میں ہمیشہ عجیب نکتہ نظر رکھتا تھا۔“

”کیا پہلے بھی کبھی ایسا ہوا تھا؟“

”ہاں ایسا ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔“

”اچھا تو پھر؟“

”اس کا اعتراض درست تھا۔ میں اسٹیک کا چاقو استعمال کررہی تھی۔ کوپر نے کہا کہ یہ چاقو ٹماٹر کاٹنے کے لیے درست نہیں ہے۔“

”آئی سی، اس کے بعد کیا ہوا؟“

”ویل، میں نے کہا۔ ’یہ چاقو ان اسٹوپڈ ٹماٹروں کو کاٹ تو رہا ہے۔ کیا تمہیں نظر نہیں آرہا؟‘ لیکن اس کی زبان بند نہیں ہوئی۔ تو میں نے اپنا کام مکمل کرنے کے لیے ایک اور چاقو اٹھا لیا۔“

”اوہ!“ سراغ رساں کارل نے اپنی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔

”ہاں۔“

”کیا اس نے پھر کوئی اعتراض کیا؟“

”ہاں، اس مرتبہ اس کا اصرار تھا کہ جو چاقو میں استعمال کررہی ہوں وہ مچھلی اور مرغی کے گوشت سے ہڈیاں علیحدہ کرنے والا چاقو ہے۔ وہ مطالبہ کررہا تھا کہ میں اپنا ہاتھ روک دوں۔ لیکن اس چاقو کی دھار بہت تیز تھی۔ وہ ٹماٹروں کو بہت خوب صورتی کے ساتھ کاٹ رہا تھا۔ سو میں نے اس کے مطالبے کو نظر انداز کردیا۔“

”آئی سی، پھر کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔ میں نے ٹماٹر اور کھیرے کی قاشیں بنانے کا کام مکمل کرلیا۔ پھر اس کے بعد میں نے ناشپاتی کے چھلکے اتارنے شروع کردیے۔“

”مگر ناشپاتی۔ اور... اسے یہ اچھا نہیں لگا؟“ سراغ رساں کارل نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”نہیں۔ اس نے گلہ شکوہ شروع کردیا کہ میں کس طرح اس چاقو کا پھل تباہ کررہی ہوں اور ایوا کیڈو کو کاٹنے سے اس کا بلیڈ خراب ہوجائے گا۔ تب اس نے مجھے سبزیوں کے چھلکے اتارنے والا چاقو تھما دیا۔ ساتھ ہی وہ اپنی آنکھیں بھی گول گول مٹکا رہا تھا۔ لیکن وہ چاقو صحیح کام نہیں کررہا تھا۔ تم تو جانتے ہو کہ ایوا کیڈو کا چھلکا کتنا موٹا ہوتا ہے۔“

اسلامی قانون کی برتری

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ جب بیت المقدس پر اسلامی پرچم لہرانے لگے تو ان کے وزیروں نے مشورہ دیا کہ عیسائی رعایا کے لیے کوئی سخت قسم کا قانون بنانا چاہیے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ یہ سرکش قوم ہے اور ان پر قابو پانے کے لیے اسلامی قانون بہت نرم ہے۔ اس سے مفسد لوگ دب نہیں سکتے۔ سلطان صلاح الدینؒ نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ کو قرآن نازل کرنے سے پہلے ہی معلوم تھا کہ مسلمانوں کو کس قسم کی فتوحات حاصل ہوں گی اور ان کی رعایا کس قماش کی ہوگی، اس لیے ہمارے لیے قرآن و حدیث ہی کافی ہے، کسی نئے قانون کی ضرورت نہیں۔“

(مرسلہ: انعام، نارتھ ناظم آباد، کراچی)

”اور پھر؟“

”پھر صورتِ حال قدرے کشیدہ سی ہوگئی۔ اس نے ایک عجیب مضحکہ خیز سی آواز نکالی جیسے کہ اس کا سانس گھٹ رہا ہو اور تب اس نے اس پر جھپٹنے کی کوشش کی۔ تب ہی وہ اس کے ہاتھ میں گھس گیا۔“

”سبزیوں کے چھلکے اتارنے والا چاقو؟“

”نہیں، نہیں۔ مچھلی اور گوشت سے ہڈیاں اور کانٹے جدا کرنے والا چاقو۔“

”اوہ رائٹ، آئی سی۔ سو جب وہ چاقو اس کی ہتھیلی سے آر پار ہوگیا گویا یہ زخم خود اس کا اپنا لگایا ہوا تھا؟“ سراغ رساں کارل نے نوٹ پیڈ پر تیزی سے قلم چلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ایسا ہی تھا۔ تب میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کم بخت ایوا کیڈو کو خود ہی چھیل لے۔ اور میں نے آگے بڑھ کر خود ہی کھانے کا فیصلہ کیا کیونکہ میرا اسٹیک ٹھنڈا ہورہا تھا۔ لیکن اسٹیک بنانے کا چاقو کیونکہ اس کے پاس تھا تو میں نے اپنا اسٹیک کاٹنے کے لیے قاشیں بنانے والا چاقو پکڑ لیا۔“

”اور اس نے حسبِ عادت اعتراض کیا؟“

”اس کا رویہ جارحانہ ہوگیا۔ نہایت جارحانہ۔“ لیزلی نے بتایا۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس نے وہ چاقو مجھ سے لے لیا اور پھر وہ مجھے یہ بتانے کی کوشش کرنے لگا کہ قاشیں قتلے بنانے والا چاقو درحقیقت اتنا تیز دھار نہیں ہے کہ گوشت کو کاٹ سکے۔ اس نے وہ چاقو اپنی ٹانگ پر آزمانا شروع کر دیا اور اپنی جینز کو کاٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ مجھے اس چاقو کی کند دھار کا ثبوت دینا چاہ رہا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"لیکن وہ چاقو اس کی ران میں دھنس گیا اور ہر طرف خون بہنے لگا۔ وہ بہت گہرا زخم تھا جو ثابت کر رہا تھا کہ چاقو کی دھار کے بارے میں اس کا خیال غلط تھا۔ ظاہر سی بات ہے۔"

"ظاہر سی بات ہے۔" سراغ رساں کارل نے دہرایا۔ "اور پھر اس کے بعد کیا ہوا؟"

"میں خاصی ناراض تھی اور میں اب بھی اپنے اسٹیک کے سلائس کاٹنا چاہتی تھی۔ اور اب صرف بریڈ کا چاقو باقی رہ گیا تھا کیونکہ باقی تمام چاقو وہ مجھ سے لے چکا تھا۔ سو میں نے بریڈ کا چاقو اٹھایا اور ڈائننگ روم کی جانب چل پڑی۔ لیکن کوپر کے چہرے پر پاگلوں کی سی کیفیت طاری تھی۔"

"کیا اس نے وہ چاقو لینے پر کوئی اعتراض نہیں کیا جیسا کہ اس کی عادت تھی؟" سراغ رساں کارل نے جاننا چاہا۔

"نہیں، وہ بس اچانک مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں تو صرف بریڈ کا چاقو ہاتھ میں تھامے ہوئے تھی اور اس نے ایک طریقے سے خود کو چاقو کی نوک پر گرا لیا۔ یہ سب کچھ بہت تیزی سے ہو گیا تھا۔" لیزلی کی سبز آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ بلند آواز سے سوں سوں کرنے لگی۔

"اور سبزیوں کا چھلکا اتارنے والا چاقو؟ وہ مسٹر کوپر کی پیشانی میں کس طرح دھنس گیا تھا؟ مجھے صحیح صحیح تفصیل سے بتاؤ۔" سراغ رساں کارل نے کہا۔

"ویل، میں اس بارے میں باوثوق نہیں ہوں۔" لیزلی نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر سیدھے رکھ دیے اور اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے جیسے کہ ان حالیہ واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

سراغ رساں کارل خاموش نگاہوں سے لیزلی کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔

چند لمحے ذہن پر زور دینے کے بعد وہ گویا ہوئی۔ "وہ قتلے بنانے والا چاقو پکڑے میری جانب بڑھا لیکن اس کے قدم ہر طرف ڈگمگا رہے تھے۔ تاہم بریڈ کا چاقو بدستور اس کے سینے میں گڑا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید خون پر اس کا پیر پھسل گیا تھا۔ اس وقت تک فرش پر ہر طرف خون پھیل چکا تھا اور بہت پھسلن ہو گئی تھی۔"

"آئی سی۔ اس کے علاوہ مزید کچھ؟"

"نہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"اس وقت تک اس کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ سو میں نے ایمبولینس طلب کر لی۔"

"بس یا اور کچھ؟"

"بس۔"

"تم اپنے بیان میں مزید کچھ شامل کرنا چاہو گی؟" سراغ رساں کارل نے حتمی لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ جیسا کہ کہہ سکتے ہیں یہ حقیقت میں بس ایک حادثہ تھا۔"

"ویل، مجھے افسوس ہے کہ یہ معاملہ سلجھانے کے لیے ہمیں جج کے سپرد کرنا ہوگا۔" سراغ رساں کارل نے اپنی نوٹ بک سنبھالتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے یہ یقین کرنا خاصا مشکل ہو رہا ہے کہ وہ تمام زخم اور چوٹیں اس نے خود لگائے تھے۔ یہ آزار اس کا خود کردہ تھا۔"

"تم کوپر سے واقف نہیں ہو۔" لیزلی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اپنے ظروف کے معاملے میں وہ بے حد سیریس ہے۔"

"ٹھیک... اگر تمہیں مزید اور کچھ نہیں کہنا تو میں تم سے اس بیان پر دستخط کرنے کی درخواست کروں گا۔ پھر بقیہ مراحل کے لیے تمہیں ہم نیچے کی منزل پر لے جائیں گے۔ اب تمہیں اپنے وکیل کو طلب کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔" سراغ رساں کارل نے کہا۔

"اگر تم ضروری سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے۔" لیزلی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک ضروری بات میں ان چاقوؤں کے بارے میں کہنا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیا؟"

لیزلی میز پر آگے کی جانب جھک گئی اور پُرجوش لہجے میں بولی۔ "تم ان کا خاص خیال رکھنا، ٹھیک؟ اس بات کا یقین کر لینا کہ کوئی بھی انہیں ڈش واشر میں نہ ڈال دے۔ ڈش واشر میں ان کی دھار خراب ہو جاتی ہے... اس کا پوری طرح خیال رکھنا... ایسی بے احتیاطی سے وہ جنون کی حد تک بے چین ہو جاتا تھا!"

انوکھی تفریح

جمال دستی

تفریحی مشاغل زندگی کے مسائل کی سنگینی کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں... وقت کے پیشِ نظر ہر روز ایک نئی تبدیلی ہماری منتظر رہتی ہے... ایک ایسی ہی خاتون کا ماجرا جو اپنی مسحور کن شخصیت کے باعث ہر شخص کے دل کی پہلی خواہش بن جاتی تھیں... حیرت انگیز بات یہ کہ وہ ایک انوکھے شوق میں بھی مبتلا تھیں...

ایک طرح دار حسینہ کے گرد گھومتی رنگین و سنگین کہانی کے پیچ در پیچ موڑ

ٹرنر نے جھک کر لاش کے پیروں کی طرف دیکھا کیونکہ اس کا یقین تھا کہ انسان کے پاؤں ہی اس کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کی نظر فرش پر پڑے ہوئے سینڈل پر گئی جو چینل نامی کمپنی کے تھے اور اس سے اس عورت کی مالی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ کیونکہ کسی عام عورت کے لیے اتنے مہنگے برانڈ کے سینڈل افورڈ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کی پنڈلی میں ایک سونے کا بریسلیٹ چمک رہا تھا جس کی

وجہ سے اس کے نرم اور ملائم پیروں کی خوب صورتی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ٹرنر کے دل میں ان خوب صورت پیروں کو چھونے کی خواہش جاگ اٹھی کیونکہ اس کی سینئیس سالہ بیوی برینڈا کے پیر بے حد سخت اور کھردرے تھے۔

اس عورت کو ہونڈا ورکشاپ کی انتظار گاہ میں گولی ماری گئی تھی۔ ٹرنر نے ایک آہ بھرتے ہوئے اپنے جسم کو سیدھا کیا اور نیم دائرے کی شکل میں لاش کے گرد چکر لگا کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے سفید بلاؤز سے جھلکتی ہوئی زیتونی جلد اور خوب صورت جسم کسی بھی مرد کو پاگل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ ٹرنر کے دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ قیامت خیز حسن ہی اس کے قتل کا سبب ہو سکتا ہے۔

''تم اس قتل کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' اس نے اپنے زیرِ تربیت افسر تھم براؤنی سے پوچھا جو میئر کا بھتیجا تھا۔ وہ پچیس سال کا معصوم اور سیدھا سادہ شخص تھا جس نے ابھی تک پولیس کی روایتی مکاری اور عیاری نہیں سیکھی تھی بلکہ اس کے برعکس وہ دوستانہ انداز میں تفتیش کرنے کا عادی تھا۔

''یہ عورت دو روز قبل اپنی اسکیلیٹ کار لے کر یہاں آئی تھی۔ اس کے والوز میں کوئی خرابی تھی اور آج وہ اپنی کار واپس لینے آئی تھی لیکن اس نے کار دیکھ کر شکایت کی کہ اسے دھونے اور پالش کرنے کی ضرورت ہے چنانچہ گاڑی دوبارہ ورکشاپ میں چلی گئی اور وہ یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔''

''یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس نے تنہائی سے اکتا کر اپنے آپ کو گولی مار لی ہو۔ یقیناً یہ کام کسی اور کا ہے۔ تمہارے خیال میں وہ کون ہو سکتا ہے؟''

''ایک شخص انتظار گاہ میں آیا اور اس نے اس کے ہونے والے بچے کے بارے میں کوئی بات کی اور اسے گولی ماردی پھر وہ اطمینان سے ٹہلتا ہوا باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سب بری طرح دہشت زدہ ہو گئے تھے کیونکہ اس سے پہلے کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔''

ٹرنر نے لاش پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''یہ عورت حاملہ نظر نہیں آتی۔ اس شخص کا حلیہ کیا تھا؟''

''دبلا پتلا، بھورے بال، عمر چالیس کے لگ بھگ، اس نے خاکی پتلون، نیلی قمیص اور سر پر بیس بال کیپ پہن رکھی تھی۔''

''بہت اچھے۔'' ٹرنر نے طنزاً کہا۔ ''اس کا حلیہ تو شہر کے سبھی سفید فام باشندوں جیسا ہے۔ چلو، کنٹری کلب جا کر وہاں کچھ مشتبہ لوگوں کا جائزہ لیتے ہیں۔''

اسی دوران میں شوروم کا منیجر بھی آ گیا اور [illegible] کہ وہاں پر نصب ویڈیو کیمرا چند روز سے خراب ہے اور مرمت کے لیے گیا ہوا ہے۔ ٹرنر نے اسے نا گواری سے دیکھا اور منیجر سے کہے بغیر ہی اس عورت کی کار کا ورک آرڈر پکڑ دیا جس پر اس کا نام کیٹ کونز لکھا ہوا تھا۔ وہ ہیری پلانٹیشن کے علاقے میں رہتی تھی جہاں پر سبھی مکانات نئے اور قیمتی تھے۔

''اس کے شوہر کا نام کیا ہے؟'' ٹرنر نے پوچھا۔

''اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔'' منیجر بولا۔ اس نے سفید رنگ کی آدھی آستینوں والی قمیص پر سیاہ ٹائی لگا رکھی تھی اور سینے پر آویزاں بیج پر اس کا نام ٹنک جاسپر لکھا تھا۔

''کیا ورک آرڈر کی خانہ پُری کے لیے شوہر یا باپ کا نام جاننا ضروری نہیں؟''

''بالکل نہیں، ہم صرف کار کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔''

''گویا تم نے اسے یہاں آنے کا مشورہ دیا تھا؟''

''بالکل نہیں بلکہ میں تو خود اس کے گھر سے کار لے کر آیا تھا۔ ہم یہ خدمت چند خاص گاہکوں کو ہی فراہم کرتے ہیں البتہ گاڑی لینے وہ خود آئی تھی۔''

ٹرنر نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ منیجر کا چہرہ سرخ ہو گیا اور پیشانی پر پسینے کے ننھے قطرے نمودار ہونے لگے۔

''اپنے آدمیوں سے کہہ دو۔'' ٹرنر نے حکم دینے والے انداز میں کہا۔ ''اگر انہیں اس واقعے کے بارے میں کچھ یاد آ جائے تو ہمیں بتا دیں۔ بہتر ہوگا کہ تم تین بجے مجھے فون کر کے تازہ معلومات سے آگاہ کرو۔'' پھر وہ براؤنی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''چلو اس کے شوہر کا پتا کرتے ہیں۔''

براؤنی کراؤن وکٹوریہ چلا رہا تھا جس پر کوئی نمبر پلیٹ نہیں تھی جبکہ ٹرنر سڑک کے کنارے واقع فاسٹ فوڈ ریسٹوران اور ٹائر کی دکانوں کا جائزہ لے رہا تھا جن کی اس شہر میں کثرت تھی۔ وہ آٹھ ماہ قبل اٹلانٹا پولیس ڈپارٹمنٹ سے ریٹائر ہو کر یہاں آیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ برینڈا تھی۔ یہ اس کا آبائی شہر تھا اور وہ اپنی بیمار ماں کی دیکھ بھال کے لیے یہاں رہنا چاہتی تھی۔ ٹرنر چند ہی دنوں میں اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ دن بھر گھر میں پڑا بور ہونے لگا۔ بار بار دروازے پر دستک ہوتی اور کوئی نہ کوئی اجنبی بوڑھی عورت اپنے ساتھ بنائی ہوئی چیزیں بیچنے کے لیے اس کا دماغ چاٹ

ضرور کرتی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہ گھر چھوڑ کر چلا جاتا لیکن برینڈا کی وجہ سے مجبور تھا پھر قسمت کو اس پر رحم آ گیا اور اسے میئر سیسل ووڈ کی مہربانی سے سراغ رساں کی ملازمت مل گئی لیکن میئر نے پہلے روز ہی سے یہ بات سمجھا دی تھی کہ اس کی بنیادی ذمے داری اس کے بھتیجے براؤنی کو تربیت دینا ہوگا تاکہ وہ ایک کامیاب [illegible] سراغ رساں بن سکے۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ اپنی اسکیلیٹ کار کو ہونڈا کی ورکشاپ پر کیوں لے کر آئی تھی؟''

''کیونکہ اس شہر میں کیڈی لیک کاروں کا کوئی ڈیلر نہیں ہے۔ قریب ترین ڈیلر بھی یہاں سے چالیس میل دور اٹلانٹا میں ملے گا۔''

''اس شہر میں کھیل کی ٹیموں اور اچھے ریسٹوران کے علاوہ بھی کچھ اور ہے؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ٹریفک جام، بچوں کے ساتھ زیادتی اور قتل جیسے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں۔ گو کہ بہت زیادہ نہیں۔ آخری قتل تین سال پہلے ہوا تھا جب برٹ برنیٹ نے اپنے پڑوسی کو صرف اس لیے مار ڈالا کہ اس کے کتے نے برٹ کے بچے کو کاٹا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے کتے کو بھی گولی ماردی۔ اس قتل کی وجہ تو سمجھ میں آتی تھی لیکن یہ واقعہ لوگوں کو دہشت زدہ کر دے گا۔''

''سب سے زیادہ دہشت تو میئر پر طاری ہوتی ہے۔ وہ مجھے چار مرتبہ فون کر چکا ہے لیکن میں نے اس کی کسی کال کا جواب نہیں دیا۔''

براؤنی چونکتے ہوئے بولا۔ ''کیوں؟''

''کیونکہ میں اور تم اس وقت ایک کیس پر کام کر رہے تھے اور میں اس مرحلے پر کسی غیر متعلقہ شخص سے بات نہیں کرنا چاہتا۔''

براؤنی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی شخص اس کے چچا کو نظر انداز کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات ٹرنر کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ اس نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ براؤنی سیکھ جائے گا کہ کوئی ناگوار بات سننے کے بعد اپنے آپ پر کس طرح قابو پایا جاتا ہے جو کہ کسی بھی پولیس والے کا لازمی ہتھیار ہے۔

براؤنی نے اپنی گاڑی ایک یورپین طرز کے بنے ہوئے مکان کے سامنے کھڑی کر دی جس کی مالیت ٹرنر کے اندازے کے مطابق کم از کم آٹھ لاکھ ڈالر تھی۔ پورچ میں ایک چمکتے نیلے رنگ کی . . . جیپ بھی کھڑی تھی۔ دروازہ کھولنے والی سنہرے بالوں والی لڑکی تھی جس نے کام کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے رسمی طور پر اس سے ہائے ہیلو کیا اور بولی۔ ''ٹونی تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔''

وہ انہیں لے کر کچن کی طرف چلی گئی جہاں ایک سرمئی بالوں والا شخص میز پر بیٹھا ایک ہاتھ سے لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کر رہا تھا جبکہ اس کے دوسرے ہاتھ میں سیل فون تھا۔ اسے دیکھتے ہی ٹرنر کا ماتھا ٹھنکا۔ قاتل کا جو حلیہ بیان کیا گیا تھا، وہ اس سے کافی ملتا جلتا تھا۔ البتہ لباس مختلف تھا۔ اس نے خاکی پتلون اور زرد رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی جبکہ پیروں میں ایتھلیٹ شوز اور لمبے موزے پہن رکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس نے فون بند کر دیا اور اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ ٹرنر کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ شخص اپنی بیوی کا قاتل ہے یا ایک غم زدہ شوہر۔

''میری بیوی کے ساتھ کیا ہوا؟'' وہ اپنے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔ اس کا لہجہ واضح اور تاثرات سے عاری تھا۔ ''کیمبلے کو کس نے قتل کیا؟''

''ہم یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' ٹرنر نے کہا اور پھر وہی رسمی تعزیتی جملے ادا کرنے لگا جو ماضی میں درجنوں بار مقتولین کے پس ماندگان سے کہہ چکا تھا۔ وہ تینوں میز کے گرد بیٹھ گئے جبکہ عورت ایک جانب کھڑی رہی۔ ٹرنر نے اپنی جیب سے نوٹ بک اور قلم نکالا اور بولا۔ ''میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم صبح دس بجے کے قریب کہاں تھے؟''

''میں گھر پر ہی تھا۔'' اس نے نظریں گھماتے ہوئے کہا۔ ''میرا دفتر گھر پر ہی ہے اور میں ایک انویسٹمنٹ کمپنی چلاتا ہوں۔ اس وقت میں کیتھی سے ایک مکان کے بارے میں تفصیلات طے کر رہا تھا۔''

ٹرنر اس عورت سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ رئیل اسٹیٹ کا کاروبار کرتی تھی اور اس نے کیتھی کے بل بورڈز بھی دیکھے تھے لیکن وہ اس کی شکل سے واقف نہیں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ جس عورت نے دروازہ کھولا وہی کیتھی تھی۔ اس نے عورت کی جانب دیکھا تو وہ تصدیق کرتے ہوئے بولی۔ ''میں ایک مکان کے سودے کے سلسلے میں اس سے ملنے آئی تھی۔ میئر نے اس کی بیوی کے قتل کی اطلاع دی اور مجھے ہی یہ خبر اس تک پہنچانے کا ناگوار فریضہ سرانجام دینا پڑا۔''

کیتھی کے فون کی گھنٹی بجی اور وہ اپنا پرس لہراتے ہوئے چلی گئی۔ وہ ٹونی کولنز سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''کیا تمہاری بیوی کا کوئی دشمن تھا یا اسے کسی جانب سے دھمکیاں مل رہی تھیں؟''

''نہیں۔'' وہ اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہر کوئی اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے دل کی مالک تھی۔''

کولنز اپنی بیوی کو اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا۔ ان کی شادی کو صرف تین ماہ ہوئے تھے۔ وہ ڈیلٹا ائر لائن میں ائر ہوسٹس تھی اور ان کی ملاقات جہاز پر ہی ہوئی تھی۔ اس کا اصل نام ہیلن تھا۔ اس کی عمر اتالیس سال تھی اور وہ اٹلانٹا کی رہنے والی تھی لیکن وہ کبھی وہاں نہیں گئی تھی۔ اسی طرح اس کا خاندان فلوریڈا میں رہائش پذیر تھا لیکن وہ کبھی ان سے ملنے نہیں گئی جبکہ ٹرنر کے اندازے کے مطابق کولنز کی عمر پچاس برس سے کم نہ تھی گویا دونوں کی عمروں میں گیارہ سال کا فرق تھا۔

''تم نے اس کے ماضی کے بارے میں کوئی چھان بین نہیں کی۔ یہ بڑی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔''

''ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ ہم ایک نئی شروعات کرنا چاہ رہے تھے۔ اس لیے کچھ نہ پوچھو نہ کچھ بتاؤ، والے فارمولے پر عمل کیا۔ اسی لیے ہم نے ماضی کو بھلا کر آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔''

''جس شخص نے اسے گولی ماری۔ اس نے ہونے والے بچے کے بارے میں کچھ کہا تھا۔ کیا تمہاری بیوی امید سے تھی؟''

''کیا؟'' کولنز آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''یہ ناممکن ہے۔ ہمیں بچے کی کوئی خواہش نہیں تھی اس لیے اس کے حاملہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

اس سوال نے کولنز کے اعصاب کو متاثر کیا تھا اور وہ خاصا مضطرب نظر آرہا تھا۔ ٹرنر کو اندازہ ہو گیا کہ اس سے مزید کوئی مفید معلومات نہیں مل سکیں گی لہٰذا اس نے کیبلے کی تصویر مانگنے پر ہی اکتفا کیا۔ کولنز اسے لونگ روم میں لے گیا جہاں عمدہ فرنیچر سجا ہوا تھا اور باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ دیوار پر کیبلے کی تین تصویریں آویزاں تھیں جبکہ مینٹل پیس پر اس کی ایک آئل پینٹنگ بھی لگی ہوئی تھی۔ پیانو پر بھی میاں بیوی کی فریم شدہ تصویر رکھی ہوئی تھی۔ کولنز نے اسے اٹھایا اور ٹرنر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ حال ہی میں کھینچی گئی تھی۔''

تصویر میں وہ بہت زیادہ خوب صورت نظر آرہی تھی اور کولنز کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ ٹرنر دل ہی دل میں رشک کرتے ہوئے بولا۔ ''میں یہ تصویر تمہیں واپس کردوں گا۔''

''جب تک ضرورت ہو تم اسے اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔'' کولنز فراخ دلی سے بولا۔ ''بس میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جلد از جلد قاتل کا سراغ لگالو۔''

دفتر پہنچ کر اس نے براؤنی سے کہا۔ ''تمہیں کم از کم کیتھی سے میرا تعارف تو کروانا چاہیے تھا۔''

''سوری، میں سمجھا کہ تم اسے جانتے ہوگے۔''

''میں اس شہر میں نیا ہوں۔ اتنی جلد سب لوگوں کو کیسے جان سکتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ہمارے لیے کارآمد ہو سکتی ہے۔''

''وہ ہر ایک کے لیے کارآمد ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ کوئی اس سے کام لینا چاہے۔'' براؤنی معنی خیز انداز میں بولا۔

''تم اسے یہاں بلالو۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ کچھ بتانا چاہ رہی تھی لیکن کولنز کی موجودگی میں کہہ نہ سکی۔''

وہ عورت آدھے گھنٹے بعد ہی اس کے دفتر پہنچ گئی اور بولی۔ ''تمہیں میری ضرورت کیوں پیش آگئی؟''

ٹرنر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اسے برابر والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''وہ کون شخص ہے جو کیبلے کو قتل کرنا چاہتا ہوگا؟''

''اس شہر کی ہر عورت کیونکہ مرد اس کے قدموں میں لوٹتے تھے۔''

''کیا وہ مردوں کو اپنی جانب متوجہ کیا کرتی تھی؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' اس نے پرس میں ہاتھ ڈال کر اپنا فون بند کیا اور بولی۔ ''لیکن میں اس کی ایک مثال دے سکتی ہوں۔ میرا شوہر ریٹائر ہو چکا ہے اور کاروبار کا حساب کتاب دیکھنے میں میری مدد کرتا ہے۔ ایک دن اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھایا تو اس پر ایک پیغام آرہا تھا۔ کیبلے نے اسے کافی شاپ پر ملنے کی دعوت دی تھی۔ میں اپنے شوہر کو ایک جانب لے گئی اور اس سے اس پیغام کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے مجھے سب کچھ بتادیا۔ کیبلے نے شروع شروع میں اس سے مکانوں کی خرید و فروخت کے بارے میں معلومات حاصل کیں پھر ذاتی باتیں شروع ہو گئیں۔ فطری طور پر ہر مرد عورت کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو بات یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ایک روز وہ اس کے کپڑے لے کر ڈرائی کلیننگ کی دکان تک بھی چلا گیا۔''

''گویا تم اس کے قتل کا اعتراف کررہی ہو؟''

''نہیں۔'' وہ بناوٹی طور پر مسکراتے ہوئے بولی۔

''اگر مجھے کسی کو قتل کرنا ہوتا تو وہ میرا شوہر ہوتا۔ میں صرف یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ کیبلے کو حسن پسند تھا۔ وہ لوگوں کو بے وقوف بنا کر خوش ہوتی تھی۔ میرے شوہر کے ساتھ بھی وہ یہی کھیل رہی تھی۔''

ٹرنر اپنی گھومنے والی کرسی پر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ان لوگوں کے ہاتھ جو مکان فروخت کیا، وہ بہت ہی عمدہ ہے۔ مسٹر کولنز یقیناً مطمئن ہوگئے ہوں گے۔''

''ہاں، لیکن اتنا اچھا بھی نہیں ہے جیسا کہ اسے توقع تھی۔'' اس نے قدرے مدھم آواز میں کہا۔ ''اس مکان کی وجہ سے وہ خاصا زیر بار ہوگیا۔ اسے اپنے کچھ کاموں سے محروم ہونا پڑا پھر اس نے کیبلے کو نئی جیگوار کنورٹیبل خرید کردی لیکن اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی کیبلے اپنی ملازمت چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئی۔''

''کیا وہ اب بھی ائر ہوسٹس تھی مگر کیوں؟ جبکہ کولنز نے اسے اتنا کچھ دے دیا تھا؟''

''وہ خود پیسے کمانا چاہتی تھی اور اس نے وہی کیا جو وہ کرنا چاہتی تھی۔''

''کیا وہ ہمیشہ سے ہی ایسی تھی؟'' ٹرنر نے پوچھا۔

کیتھی نے سر ہلادیا تب ٹرنر نے اسے بتایا کہ قاتل نے اس سے بچے کے بارے میں کچھ کہا تھا۔

''وہ بچہ نہیں چاہتی تھی اور یہ بات وہ کئی بار کہہ چکی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ٹونی اس کے برعکس چاہتا تھا۔''

اس کے بعد ان دونوں نے اپنے کارڈز اور سیل فون نمبرز کا تبادلہ کیا۔ اس کے جانے کے بعد ٹرنر نے براؤنی سے کہا کہ وہ ٹونی اور کیبلے دونوں کے ماضی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے علاوہ ان کی ٹیلی فون کالز کا ریکارڈ بھی حاصل کرے۔ اس کی بات پوری ہوتے ہی میز پر رکھے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''میں ہونڈا کی ورک شاپ پر موجود تھا۔'' کسی اجنبی شخص نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں نے اسے کار میں جاتے دیکھا ہے اور اس کی گاڑی کی نمبر پلیٹ کا ایک حصہ نوٹ کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔''

''بہت خوب، کیا تم اپنا نام بتانا پسند کروگے؟'' ٹرنر نے کہا۔

''نہیں، کیونکہ میں عدالت میں گواہی دینے کے لیے نہیں جانا چاہتا۔''

ٹرنر نے اس کا بتایا ہوا نامکمل نمبر ایک کاغذ پر لکھ لیا جو کسی پرانے ماڈل کی سیاہ لیکسس کنورٹیبل کا تھا۔ اس نے فون رکھا ہی تھا کہ براؤنی نے کمپیوٹر سسٹم نہ چلنے کی اطلاع دی۔

''میں گھر جاکر اپنے لیپ ٹاپ پر کام کرلوں گا۔'' براؤنی نے کہا۔ ''کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہی رہے گا البتہ ہم براہ راست اسٹیٹ سسٹم سے یہ نمبر چیک نہیں کرسکیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم جانے سے پہلے کسی کمپیوٹر والے کو فون کرکے یہ مسئلہ بتادو۔ میں یہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرلیتا ہوں۔''

اس کے بعد اس نے اٹلانٹا پولیس میں اپنے دوست ریمسی کو فون کرکے کہا۔ ''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ ایک نامکمل نمبر دے رہا ہوں جو کالے رنگ کی لیکسس کا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔''

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم مفت میں کوئی کام نہیں کرتے۔'' ریمسی نے کہا لیکن ٹرنر کی بورڈ کی آواز سن رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ریمسی نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ جارجیا کی ایک کار کا نمبر ہے جو اٹلانٹا میں کیبلے ہیلن کے نام پر رجسٹرڈ ہوئی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ شخص مقتولہ کی کار میں فرار ہوا تھا۔'' ٹرنر نے کہا۔ ''لیکن وہ اس کار میں ورکشاپ نہیں گئی تھی۔ کیا اس کار کی چوری کی رپورٹ درج کروائی گئی تھی؟''

ایسی کوئی رپورٹ پولیس کے ریکارڈ میں نہیں تھی۔ البتہ کیبلے کولنز کے نام پر ایک اسکلیٹ رجسٹرڈ تھی اور پتا نارتھ پیس فیری روڈ اٹلانٹا کا لکھا ہوا تھا جبکہ نئی جیگوار ملیٹروں میں رجسٹرڈ تھی گویا ایک عورت بیک وقت تین تین گاڑیوں کی مالک تھی۔

براؤنی اپنی بغل میں لیپ ٹاپ دبائے داخل ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں کافی کے کپ تھے۔ ٹرنر نے اس کے ہاتھ سے کافی کا کپ لیا اور بولا۔ ''لیپ ٹاپ آن کرکے یہ چیک کرو کہ لینوکس روڈ والے پتے پر کون رہتا ہے۔ میں اس کو پکڑنے کا آرڈر کرواتا ہوں۔ ہم ابھی اٹلانٹا کے لیے روانہ ہورہے ہیں۔''

☆☆☆

وہ دونوں کار میں سوار ہوئے اور ٹرنر نے اٹلانٹا فون کرکے اپنے سابق باس کو تمام تفصیلات سے آگاہ کیا پھر اس نے دوسرا فون اسٹیٹ کرائم لیبارٹری کو کیا جہاں کیبلے کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے جائی گئی تھی۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ یہ پوسٹ مارٹم فلٹن کاؤنٹی میڈیکل ایگزامنر کے دفتر میں ہو

گا۔

”ہم اس لاش کا پوسٹ مارٹم کل صبح یا دوپہر میں کریں گے۔“ ڈاکٹر اینڈریو نے بتایا۔ ”اس سے پہلے ہمارے پاس چار لاشیں آئی ہیں۔ ان کا پوسٹ مارٹم پہلے ہوگا۔“

”میرے پاس اس قتل کے سلسلے میں کوئی معلومات نہیں ہیں۔ کیا تم کچھ بتا سکتے ہو؟“

”ابھی تو لاش میرے پاس آئی ہی نہیں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ تم مجھ سے کس معجزے کی توقع کر رہے ہو؟“

”اگر کچھ معلوم ہو جائے تو مجھے ضرور یاد رکھنا۔“ ٹرنر نے کہا۔

ٹرنر کے سابق باس نے وعدے کے مطابق ایک پٹرول کار بھیج دی تھی جو پیچ اسٹریٹ کی پارکنگ لاٹ میں پہلے سے موجود تھی۔ براؤنی نے اپنی کار بھی اس کے برابر میں لے جا کر کھڑی کر دی۔ دونوں گاڑیوں کے شیشے بیک وقت نیچے ہوئے۔ ٹرنر اس پولیس والے کو شکل سے پہچانتا تھا لیکن اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانک کر کہا۔ ”سنا ہے کہ وہاں کوئی قتل ہو گیا ہے اور تم قاتل کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے ہو؟“

”ہاں۔“ ٹرنر نے جواب دیا۔ ”تم ہمارے پیچھے پیچھے آؤ۔“

اس نے براؤنی کو لینوکس روڈ کا پتا سمجھایا جس پر کیمبلے کی لیکسس رجسٹرڈ تھی۔ وہ ایک پانچ منزلہ عمارت تھی جس کی بالکونیاں دور سے ہی نظر آ جاتی تھیں۔ انہوں نے اپنی گاڑیاں مرکزی دروازے کے قریب کھڑی کر دیں اور لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچ کر یونٹ نمبر تین سو بارہ کے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

دروازہ کھولنے والا شخص وردی میں ملبوس اٹلانٹا کے پولیس آفیسر کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، وہ تینوں اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر چکے تھے۔

”یہ سب کیا ہے؟“ اس شخص نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں ملیٹرون پولیس ڈپارٹمنٹ کا سراغ رساں جوے ٹرنر ہوں۔ تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ کیمبلے کولنز مر چکی ہے۔“

اس شخص کا چہرہ سکڑ گیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے یہ خبر سن کر واقعی صدمہ ہوا ہے۔ اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور لونگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ان تینوں کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ ٹرنر اس کی دلی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مختصر الفاظ میں کیمبلے کے قتل کے بارے میں بتایا۔ جسے سننے کے بعد اس نے کہا۔

”کم ذہنی طور پر بہت مضبوط عورت تھی اور مردوں کو پاگل کر دیتی تھی۔ اسے کون مار سکتا ہے؟ اب تم یہاں کس لیے آئے ہو؟“

”قاتل جس کار میں فرار ہوا، وہ اس پتا پر رجسٹرڈ ہے۔“

”تم اس سیاہ رنگ کی لیکسس کنورٹیبل کی بات کر رہے ہو۔ وہ میں نے ہی کم کو خرید کر دی تھی اس کے چند روز بعد ہی وہ یہاں سے چلی گئی۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ جب یہ قتل ہوا، تم اس وقت کہاں تھے؟“

”میں اپنے اسٹور پر گاہکوں کے ساتھ مصروف تھا۔“ زیک نے کہا۔ ”کیا تم مجھ پر اس کے قتل کا شبہ کر رہے ہو؟ اگر تم چاہو تو اسٹور فون کر کے میری مصروفیت کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہو۔ یہ رہا میرا کارڈ۔ اس پر اسٹور کا نام اور فون نمبر درج ہے۔“

ٹرنر نے پڑھے بغیر وہ کارڈ جیب میں رکھ لیا اور براؤنی کی طرف دیکھا جو اس کا اشارہ سمجھ کر عمارت سے باہر چلا گیا۔ زیک نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور ایک منٹ تک اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔ اس دوران میں ٹرنر کو لونگ روم کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔ کمرے میں قیمتی اور جدید قسم کا فرنیچر رکھا ہوا تھا لیکن اس پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے یہاں کوئی نہیں رہتا۔

زیک نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ کم کی موت کی خبر سن کر مجھے خوشی ہوگی کیونکہ میں اس سے نفرت کرنے لگا تھا جب وہ مجھے چھوڑ کر اس وکیل کے پاس چلی گئی تھی۔ اب مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی ہے کہ میں نے اس انداز میں کیوں سوچا۔“

”مجھے افسوس ہے کہ تم تک یہ خبر پہنچائی۔“

”میں اب بھی اسے یاد کرتا ہوں۔“ زیک نے کہا۔ ”میری کئی لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن ان میں کوئی بھی کم جیسی نہیں۔ اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔“ وہ اپنی انگلی سے دائیں آنکھ صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”اسے لباس پہننے کا سلیقہ اور فیشن کرنے کا ڈھنگ آتا تھا۔“

ٹرنر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری اس سے ملاقات کیسے ہوئی؟“

”وہ میں پرواز میں نے اس سے کوک مانگی تو اس نے اٹلانٹا کے بارے میں ایک لطیفہ سنا دیا۔ اسی طرح جب جہاز نے ٹیک آف کیا تو ایک نو عمر لڑکے نے شور مچانا شروع کر دیا اور کم نے بڑے ماہرانہ انداز میں اسے خاموش کر دیا۔ اس کی اپنی آواز میں بھی بہت سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ اس کے بعد اس سے ٹرمنل پر ملاقات ہوئی۔ میں نے اس کی تعریف میں چند الفاظ کہے اور اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ مجھے بالکل بھی یقین نہیں آیا جب اس نے میری پیشکش قبول کر لی۔ بہت جلد ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ وہ میرے ساتھ ایک نئے سفر کا آغاز کرنا چاہ رہی تھی۔ میں نے اس کے لیے یہ اپارٹمنٹ خریدا، ہم دونوں نے مل کر اسے سجایا۔ سچ تو یہ ہے کہ ساری محنت اس کی تھی۔ میں تو بس پیسے خرچ کرتا رہا۔“

”بہت خوب۔۔۔۔ پھر اختلاف کس بات پر ہوا؟“

”میں نے اسے شادی کے لیے پروپوز کیا تو اس نے دو شرطیں لگا دیں۔ وہ چاہتی تھی کہ پورے گھر کو نئے رنگ و روغن کے ساتھ دوبارہ سے سجایا جائے۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ یہ میری برداشت سے باہر ہے۔“

”اور دوسری شرط کیا تھی؟“

زیک کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ بولا۔ ”وہ چاہتی تھی کہ میں نس بندی کروا لوں۔“

”نس بندی!“ ٹرنر حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو بہت بڑی بات کہہ دی۔“

”اب یہ ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے لیکن اس وقت میں اس بارے میں سوچنے لگا تھا۔ مجھے ہمیشہ سے ہی باپ بننے کی خواہش رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے مطالبے سے دستبردار ہو جائے گی۔ میری عمر پینتالیس سال ہے لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ وہ اس امر کو یقینی بنانا چاہتی تھی کہ کبھی ماں نہیں بنے گی۔ ہمارے درمیان کئی ہفتوں تک بحث چلتی رہی پھر اس نے کہا کہ اسے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کسی دوسرے مرد کی تلاش میں ہے۔“

ٹرنر کی بھویں تن گئیں لیکن اسے یہ سن کر کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔

زیک نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کا نام جان پامر ہے۔ پیشے کے اعتبار سے وکیل ہے اور اس کی رہائش نارتھ میں فیری روڈ پر جبکہ دفتر پیچ ٹری پر ہے۔ میں وہاں سے کئی دفعہ گزر چکا ہوں اور ہمیشہ اس امید کے ساتھ اس دروازے پر نظر ڈالتا ہوں کہ شاید کم باہر آتی دکھائی دے اور میں اسے ایک مرتبہ اور دیکھ لوں۔ اس نے جانے کے بعد ایک دفعہ بھی میرے فون یا ای میل کا جواب نہیں دیا اور اس طرح قطع تعلق کر لیا جیسے میرا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔“

دروازے پر دستک ہوئی اور ان کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اٹلانٹا سے تعلق رکھنے والے پولیس مین نے دروازہ کھولا۔ براؤنی اندر داخل ہوا اور بولا۔ ”مسٹر زیک کے بیان کی تصدیق ہو گئی ہے۔ جس وقت کیمبلے کو گولی ماری گئی یہ اپنے اسٹور میں موجود تھے۔“

اب ان کا رخ جان پامر کے دفتر کی جانب تھا۔ براؤنی نے اپنے سیل فون کے ذریعے نہ صرف اس کے گھر اور دفتر کا پتا معلوم کر لیا تھا بلکہ یہ تصدیق بھی ہو گئی تھی کہ کیمبلے کولنز کی اسپورٹس کار کی رجسٹریشن اسی پتا پر ہوئی تھی۔ انہوں نے پیچ ٹری اسٹریٹ پر اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت کے ساتھ گاڑی روک دی جس پر جلی انگریزی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ”لا کمپلیکس۔“

استقبالیے پر ایک سیاہ فام عورت بیٹھی ہوئی تھی جس نے تین پولیس والوں کو دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ شاید اس کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ دو منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک بھورے بالوں والا شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اور بولا۔ ”تم کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے ہو؟“

”کم کولنز کا انتقال ہو چکا ہے۔ اسے آج صبح کسی نے گولی مار دی۔“

”یہ ایک افسوسناک خبر ہے۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ میرے تعلق کی وجہ سے یہاں آئے ہو۔ مجھے تمہارے سوالوں کے جواب دے کر خوشی ہوگی۔ پہلے میں اپنے وکیل کو بلا لوں۔“

ٹرنر نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور کمرے سے باہر آ کر ہونڈا اور کشاپ کا نمبر ملانے لگا۔ رابطہ ہونے پر اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ”سوا تین ہو چکے ہیں۔“

”میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔“ دوسری طرف سے نک جانسن نے جواب دیا۔ ”اس وقت میں اپنے دفتر میں سیکیورٹی کمپنی کے نمائندے کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ اس نے چیک کر کے بتایا ہے کہ اس وقت ایک کیمرا کام کر رہا تھا۔ اس سے کچھ ایسی فوٹیج ملی ہیں جو تمہارے لیے کارآمد ہو

سکتی ہیں۔''

''مجھے وہ فوٹیج فوراً چاہیے۔ میرا مطلب ہے ابھی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم مجھے ای میل ایڈریس بھیج دو۔''

وہ واپس کمرے میں آگیا جہاں پامر کے ساتھ ایک اور وکیل نیڈ جیننگ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ ٹرنر اسے عدالت میں دیکھ چکا تھا۔ وہ عام طور پر ایسے امرا کے مقدمات لڑتا تھا جو اونچے طبقے کے لوگوں جیسے جرائم کرتے تھے مثلاً اپنی گرل فرینڈ کو مارنا یا گلی کوچوں سے منشیات خریدنا۔ اس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا موکل کئی ماہ پہلے اس عورت سے تعلق ختم کر چکا ہے اور وہ اس کے لیے ماضی کا قصہ بن چکی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جان پامر قاتل ہے؟ تم جانتے ہو کہ یہ کون ہے؟ اس کا شمار ملک کے ممتاز وکیلوں میں ہوتا ہے۔''

''ہمارے پاس جو معلومات ہیں وہ اس کے برعکس کہانی بیان کر رہی ہیں۔'' براؤنی نے کہا۔

ٹرنر نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''عینی شاہدین نے قاتل کا جو حلیہ بیان کیا ہے، یہ اس پر پورا اترتا ہے اور شناختی پریڈ میں اسے با آسانی پہچان لیا جائے گا۔ یہ مقتولہ کے ساتھ رہ چکا ہے۔ ہم اس کے گھر کی تلاشی لے کر مزید ثبوت برآمد کرلیں گے۔''

''بس اتنا کافی ہے۔'' جیننگ بولا۔ ''تم اس کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہو۔ اس ملاقات کے لیے بھی اسے اپنا ایک اہم اپائنٹ منٹ کینسل کرنا پڑا۔''

ٹرنر نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور پامر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''کِم سے تم نے آخری بار بات کب کی تھی؟''

''تقریباً تین ماہ قبل۔''

''جب تمہاری دورانِ پرواز کِم سے پہلی ملاقات ہوئی تو تم کہاں جا رہے تھے؟''

''ڈلاس سے اٹلانٹا۔'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''تم نے اپنی بیوی کو کب چھوڑا؟''

جیننگ مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ اس سوال کا قتل کی تفتیش سے کوئی تعلق ہے۔''

''تم نے اس کے لیے جو اسکیلیٹ کار خریدی، اس کی کیا قیمت تھی؟''

''ایک منٹ۔'' جیننگ نے پھر مداخلت کی۔ ''تم کس اسکیلیٹ کی بات کر رہے ہو؟''

''یہ وہی کار ہے جو کمبلے کولنز کے نام پر رجسٹرڈ ہوئی اور اس کا پتا مسٹر پامر کے گھر کا ہے۔ وہ نئی کار ہے شوروم کی تھی جہاں سے گولی ماری گئی۔''

''میں کبھی میٹرو نہیں گیا۔'' پامر نے کہا۔

''اب تم کچھ نہیں بولو گے۔'' جیننگ نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے کے عقبی حصے میں جا کر سرگوشیاں کرنے لگے۔ ٹرنر نے کچھ دیر انتظار کیا پھر چلاتے ہوئے بولا۔ ''دوستو! وقت بھی بہت قیمتی ہے۔''

جیننگ واپس میز کی طرف آیا اور بولا۔ ''تم بالکل فضول قسم کی گفتگو کر رہے ہو۔''

براؤنی نے اپنا لیپ ٹاپ کھول کر ایک ای میل کو کلک کیا۔ اسکرین پر ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر ابھری جس میں ایک شخص گہرے رنگ کی قمیص، سرمئی پتلون اور بیس بال کیپ پہنے ہوئے ہونڈا ورک شاپ کی پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہا تھا۔ براؤنی نے دوسری تصویر پر کلک کیا۔ اس میں اس شخص کا چہرہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا اور اس کی شکل پامر سے مل رہی تھی۔ ٹرنر نے پنسل کی نوک اس جگہ رکھی اور بولا۔ ''یہی ہے تمہارا موکل۔''

''اب کوئی سوال نہیں ہوگا۔'' جیننگ نے کہا۔

''ہمیں تو ابھی بہت سے سوال پوچھنے ہیں۔'' ٹرنر نے جواب دیا۔

اندر کھڑے پولیس مین نے ہتھکڑی نکال کر پامر کے دونوں ہاتھ پشت سے باندھ دیے۔

''کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جیننگ بولا۔ ''میں کل صبح تمہاری ضمانت کا بندوبست کرلوں گا۔ فی الحال تمہارے والد کو فون کر کے اطلاع دے دیتا ہوں۔''

☆☆☆

براؤنی ایک بار پھر ڈرائیور کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ شام کے سات بج رہے تھے اور سڑک پر ٹریفک خاصا کم ہو گیا تھا۔ وکیل پامر کسی مجسمے کی طرح پچھلی سیٹ پر بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کی ساری تیزی طراری ختم ہو چکی تھی۔ ائرپورٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے ٹرنر کا سیل فون بجنے لگا۔ دوسری طرف میڈیکل ایگزامنر آفس سے ڈوور بول رہا تھا۔ ''میں نے ابھی ابھی اس کا پوسٹ مارٹم ختم کیا ہے۔ گولیاں اس کے سینے اور پیٹ میں لگی ہیں اور وہ موقع پر ہی انتقال کر گئی۔ ایسا نہیں لگتا کہ اس نے کوئی دوا لی ہوئی تھی۔''

''وہ کتنے ہفتوں سے حاملہ تھی؟'' ٹرنر نے پوچھا۔

اس کے بعد وہ دو منٹ تک بات کرتے رہے پھر ٹرنر نے فون بند کر دیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر پامر کی طرف دیکھا جو اچانک ہی اس کی فون کال کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

''میڈیکل ایگزامنر کا فون تھا۔'' ٹرنر نے اسے بتایا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ تم بچے کے بارے میں کتنے فکرمند رہے تھے جبکہ وہ حاملہ نہیں تھی۔''

''تم مجھ سے کچھ اگلوانا چاہ رہے ہو؟'' پامر بولا۔ ''وہ یہ جھوٹ کیوں بولتی؟''

''یہ تم بہتر جانتے ہوگے۔'' ٹرنر نے کہا اور سامنے کی جانب دیکھنے لگا۔

''مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں ہے۔'' پامر نے کہا اور بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔

ٹرنر نے براؤنی کو ایک اسٹور کے سامنے رکنے کا اشارہ کیا اور تین کوک کے ڈبے لے کر آگیا۔ پھر اس نے پچھلی سیٹ پر جا کر پامر کی ہتھکڑی کھولی اور ایک ڈبا اسے پکڑا دیا۔

''جھوٹی عورت۔'' پامر نے کوک کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کے جھوٹ کی وجہ سے ہی مجھے جیل جانا پڑ رہا ہے۔''

''تم نے نس بندی کیوں کروائی تھی؟'' ٹرنر نے گویا اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

پامر کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی۔''

''میں ایک سراغ رساں ہوں۔'' ٹرنر نے کہا۔ ''اور اندازے کی بنیاد پر بھی نتیجہ اخذ کر لیتا ہوں۔''

پامر نے اداس لہجے میں کہا۔ ''ہماری جوڑی بہت شاندار تھی اور لوگ ہمیں رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ میری بیوی پرانی وضع کی بدمزاج عورت تھی جبکہ کِم نے ہمیشہ مجھے مسرت سے سرشار کیا پھر اچانک اس کے رویے میں تبدیلی محسوس ہونے لگی اور اس نے مجھ سے دور ہونا شروع کر دیا۔ لگتا تھا کہ اسے جو چاہیے وہ مل چکا ہے۔''

''میں مانتا ہوں کہ وہ شکاری عورت تھی لیکن تم نے اسے یہ مشورہ کیوں نہیں دیا کہ وہ خود اپنا آپریشن کروا لے؟''

''وہ اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔''

''وہ حاملہ نہیں تھی پھر تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟''

''اس نے مجھے خود ای میل کے ذریعے بتایا تھا۔''

[illegible] کال نہیں لے رہی تھی جبکہ میں اسے مسلسل فون کر رہا تھا لیکن ایک مہینے پہلے اس نے مجھے ای میل بھیجی۔''

اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ ٹرنر نے اسے رومال دیا تاکہ وہ اپنے آنسو پونچھ سکے۔ پامر نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ''میں نے اس کی ای میل کا جواب دیا کیونکہ میں اس عورت سے بات کرنے کا خواہشمند تھا۔ مجھے اب بھی اس کا بہت خیال ہے۔ اس نے مجھے اپنے نئے شوہر اور اس کی دولت کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ اس نے کِم کے لیے نئی جیگوار خریدی ہے۔ ان دونوں کی ملاقات سان فرانسسکو کے ایک گرجا میں ہوئی تھی۔ آخر میں اس نے کہا کہ وہ حاملہ ہو گئی ہے اور زندگی میں اتنی خوش کبھی نہ تھی۔ کیا تم اس پر یقین کر سکتے ہو کہ اس نے میری نس بندی کروا دی اور خود کسی دوسرے مرد سے تعلق قائم کر کے حاملہ ہو گئی؟''

یہ کہہ کر وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے کوک کا خالی ڈبا کار کے دروازے پر دے مارا۔

''اتنا غصہ دکھانے کی ضرورت نہیں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' ٹرنر نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔'' پامر اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''اسی کتیا کی وجہ سے میں جیل جا رہا ہوں۔''

ٹرنر نے اس کے ہاتھوں میں دوبارہ ہتھکڑی ڈال دی۔ پولیس اسٹیشن پہنچ کر وہ اسے تفتیشی کمرے میں لے گیا۔ جہاں پامر نے بیان حلفی پر دستخط کیے۔ ٹرنر نے ٹیپ ریکارڈر آن کر کے اس سے سوالات کرنا شروع کر دیے۔

''نیڈ نے مجھے منع کیا تھا کہ اس کے آنے تک میں خاموش رہوں۔'' پامر نے کہا۔ ''لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے بیان تو دینا ہی ہے۔''

''ہم تمہارے تعاون کو نظر انداز نہیں کریں گے۔'' ٹرنر نے کہا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ ہونڈا کے ورکشاپ جا رہی ہے۔ کیا تم نے اس کا تعاقب کیا تھا یا اس کام کے لیے کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کی تھیں؟''

''نہیں، وہ ای میل ملنے کے بعد میں اس سے لاتعلق ہو چکا تھا۔ گزشتہ روز مکینک کو ایک پرزے کے سلسلے میں کِم سے بات کرنا تھی لیکن اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے کمپارٹمنٹ بکس کھولا تو وہاں اسے گاڑی کی رسید مل گئی جس پر میرا نام اور فون نمبر درج تھا۔ اس نے مجھے فون کر کے بتایا کہ گاڑی اگلے روز دس بجے تک تیار ہو جائے گی۔ مجھے بہت غصہ آیا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور اس کے فون ابھی تک

سننے پڑ رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹرنر کی طرف دیکھا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"میں نے وہ گاڑی سے اپنے لیے کچھ ڈالر میں خرید کر دی تھی اور اب میں اس کی پرانی بیکس چلا رہا ہوں جو وہ چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ذرا سوچو کہ مجھ پر کیا گزرتی ہوگی اگر میری جگہ تم ہوتے تو ایسی عورت کو قتل نہ کر دیتے۔"

"مانا ہوں کہ اس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم اسے جان سے مار ڈالو۔"

اس کے بعد ٹرنر نے کوئی سوال نہیں کیا اور اسے حوالات میں بند کر دیا۔ براؤنی نے کاغذی کارروائی مکمل کی اور وہ دونوں عقبی دروازے سے نکل کر پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیے۔

"واقعی وہ بہت خاص قسم کی عورت تھی۔ اسی وجہ سے یہ سب مرد اس کے لیے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔" براؤنی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"ہاں، وہ مردوں کو قابو کرنے کا ہنر جانتی تھی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر پامر اس کی پرانی کار کی وجہ سے پریشان تھا تو اس نے دوسری گاڑی کیوں نہیں خریدی؟"

"کیونکہ وہ ابھی تک جذباتی طور پر اس سے وابستہ ہے۔ اس سے نفرت کرنا بھی پامر کو اچھا لگتا تھا۔"

براؤنی سوچ میں پڑ گیا لیکن ٹرنر کو یقین تھا کہ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ہوگی۔ وہ تو یہی سمجھتا تھا کہ محبت اور نفرت دو متضاد جذبے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ تم کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہو گے۔"

براؤنی نے پوچھا۔

"کسی حد تک البتہ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کم نے پامر کو اپنے حاملہ ہونے کی اطلاع کیوں دی جبکہ یہ سچ نہیں تھا۔ مجھے اس کی آخری ای میل چیک کرنا ہوگی۔"

☆☆☆

دوسری صبح ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے وہ ٹونی کولنز کے دروازے پر تھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں ہی دروازے پر آیا اور ناگواری سے بولا۔ "تمہیں آنے سے پہلے فون کر دینا چاہیے تھا۔"

"ہم نے ایک شخص کو گرفتار کیا ہے۔" ٹرنر نے کہا تو ٹونی نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں کچن ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ ٹرنر نے وہ تصویر نکال کر اس کے سامنے رکھ دی جو وہ اس سے مانگ کر لے گیا تھا۔

"تمہاری بیوی کو جان پامر نامی ایک شخص نے قتل کیا ہے جو اٹلانٹا میں رہتا ہے۔" ٹرنر نے کہا۔ "کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"کیا یہ بات تم یقین سے کہہ سکتے ہو؟"

"ممکن ہے کبھی کم نے اس کا تذکرہ کیا ہو لیکن میں اس سے واقف نہیں ہوں۔"

"پامر کا کہنا ہے کہ تمہاری بیوی نے اسے ای میل کے ذریعے اپنے حاملہ ہونے کی اطلاع دی تھی جس پر وہ پریشان ہو گیا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا اور دوسرے یہ کہ اسی کے اصرار پر اس نے اپنی نس بندی کروائی تھی۔"

"نس بندی، او میرے خدا۔" ٹونی اپنی جگہ سے اٹھ کر فریج تک گیا۔ بوتل سے ایک گلاس پانی نکال کر پیا اور گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "وہ حاملہ نہیں تھی۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔"

"اس نے کچھ اور باتیں بھی کہی تھیں۔" ٹرنر نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ ای میل اس نے گزشتہ ہفتے بھیجی تھی۔ اس میں لکھا ہے۔ "ڈیئر جان! الٹرا ساؤنڈ سے معلوم ہوا ہے کہ میں ایک لڑکے کو جنم دینے والی ہوں۔ ہم اس کا نام انتھونی رکھیں گے۔ میں بہت خوش ہوں اور امید کرتی ہوں کہ ایسے تمہیں بھی ایسی ہی خوشی ملے گی۔"

"واؤ، یہ تو پیٹ پر لات مارنے والی بات ہوئی۔" ٹونی نے کہا۔ "اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اپنی بیوی کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔"

یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا۔"

ٹرنر نے اس کا بازو پکڑا اور اپنی جگہ پر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "مسٹر پامر نے اپنی گرفتاری کے بعد ہمیں اپنا ای میل باکس دیکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس میں تمہاری بیوی کی جانب سے بھیجی گئی ایک ای میل گزشتہ روز دس بج کر پانچ منٹ پر وصول کی جبکہ کم کو پانچ منٹ پہلے گولی ماردی گئی تھی۔"

کولنز کے لب ہلے جیسے کچھ کہنا چاہ رہا ہو پھر وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہم جانتے ہیں کہ تمہاری بیوی نے وہ ای میل نہیں

بھیجی بلکہ یہ تمہارا کارنامہ ہے۔"

کولنز نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبایا پھر میز پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس کی نس بندی کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس نے اسی کی بیوی کی وجہ سے کم کو قتل کیا؟"

"ہاں، وہ کم سے محبت کرتا تھا اور انہی ای میلز نے اسے اس پر مجبور کر دیا۔"

کولنز دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ نوچتے ہوئے بولا۔ "نہیں، وہ صرف میری تھی۔"

ٹرنر نے میز پر سے کمیلے کی تصویر اٹھائی اور اسے کولنز کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ "صرف تمہاری وجہ سے یہ خوب صورت عورت ماری گئی۔"

کولنز نے اس کے ہاتھ سے تصویر چھین کر فرش پر پھینک دی جس سے فریم کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ وہ چلاتے ہوئے بولا۔ "بس کرو، میں نے کبھی نہیں چاہا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ میں تو بس پامر کو پریشان کرنا چاہ رہا تھا کیونکہ ہر وقت اس کی باتیں سن کر تنگ آ چکا تھا۔ کم کی زبان پر اسی کا تذکرہ رہتا تھا۔ کبھی وہ اس کی دی ہوئی گاڑی کی تعریفیں کرتی، کبھی اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کو یاد کرتی لہٰذا میں نے پامر کا ای میل ایڈریس حاصل کیا اور کم کی جانب سے پیغامات بھیجنا شروع کر دیے اور میں نے ہی یہ جھوٹ بولا کہ وہ حاملہ ہو گئی ہے اور یہ اطلاع دے کر مجھے خاصا سکون محسوس ہوا۔"

یہ کہہ کر وہ کچن کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "جان پامر کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے۔"

ٹرنر اس کے بالمقابل آن کھڑا ہوا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "تم نے یہ صرف اس لیے کیا کیونکہ وہ تم سے بھی نس بندی کے لیے کہہ رہی تھی؟"

کولنز کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ وہ جھینپتے ہوئے بولا۔ "میں نے اسے سب کچھ دیا۔ نیا مکان، نئی کار، اس کی خاطر اپنے دوستوں کو چھوڑ دیا لیکن یہ سب کچھ اس کے لیے کافی نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ شاید اسی طرح میں اسے خوش رکھ سکوں گا۔"

وہ لڑکھڑاتا ہوا کچن سے باہر نکلا اور لونگ روم سے ہوتا ہوا باہر نکل گیا۔ ٹرنر بھی اس کے پیچھے چل دیا۔ باہر گاڑی میں براؤنی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ سارے راستے دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ پولیس اسٹیشن پہنچ کر براؤنی نے پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی کی اور بولا۔

"مجھے اس نتیجے کی توقع نہیں تھی۔ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ پامر کی طرح کولنز نے بھی نس بندی کروائی تھی؟"

"میں نے کم کے طور طریقے دیکھ کر یہ اندازہ لگایا۔ وہ بہت مستقل مزاج عورت تھی۔ وہ پہلے ایک مرد کو تلاش کرتی، اس سے کار، پیسے اور مکان بٹورتی پھر اسے نس بندی پر مجبور کرتی اور اپنا مطلب پورا ہونے کے بعد چھوڑ کر چلی جاتی۔ وہ عام طور پر بھورے بالوں والے مردوں کو پسند کرتی تھی۔"

"کیا ٹونی کولنز پر بھی مقدمہ چلے گا؟" براؤنی نے پوچھا۔

"کس لیے۔ اس نے تو گولی نہیں چلائی۔ کوئی بھی اچھا وکیل اسے منٹوں میں بری کرا دے گا۔ البتہ وہ خود ساری عمر پچھتاتا رہے گا۔ اس کے لیے یہی سزا کافی ہے۔"

"میرا دل چاہ رہا ہے کہ ابھی واپس جاؤں اور تھپڑوں سے اس کا منہ لال کر دوں۔ میری نظر میں وہ بھی مجرم ہے۔"

"اس طرح تو اس کی بیوی بھی مجرم تھی۔" ٹرنر نے کہا۔ "میں نے ایک بات ابھی تک تمہیں نہیں بتائی کیونکہ میرا خیال تھا کہ یہ جان لینے کے بعد تم پامر یا کولنز سے ہمدردی محسوس کرنے لگو گے۔ میڈیکل ایگزامنر نے مجھے بتایا ہے کہ کم کئی سال پہلے اپنا آپریشن کروا چکی تھی۔ لہٰذا اس کے ماں بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

براؤنی پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "کیا؟ پھر وہ مردوں کو نس بندی پر کیوں مجبور کرتی تھی؟"

"ممکن ہے یہ بھی اس کے نزدیک ایک تفریح ہو لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں بدل سکتی کہ جان پامر ایک قاتل ہے۔ مجھے اس پر افسوس ہو رہا ہے۔ شاید اس کا وکیل کوئی راستہ نکال لے۔"

براؤنی نے اپنا سر اسٹیئرنگ پر رکھ دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنا سر اٹھایا اور بولا۔ "میرا خیال تھا کہ مجھے اچھے برے کی پہچان ہے لیکن اب میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"جب تمہیں معلوم ہو جائے تو مجھے ضرور بتا دینا۔" ٹرنر نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "ہمیں جلد از جلد کاغذی کارروائی مکمل کر لینی چاہیے۔ آج شام میں اپنی بیوی کے ساتھ ڈنر کرنا چاہتا ہوں۔"

☆

للکار

ظہر جاوید معل
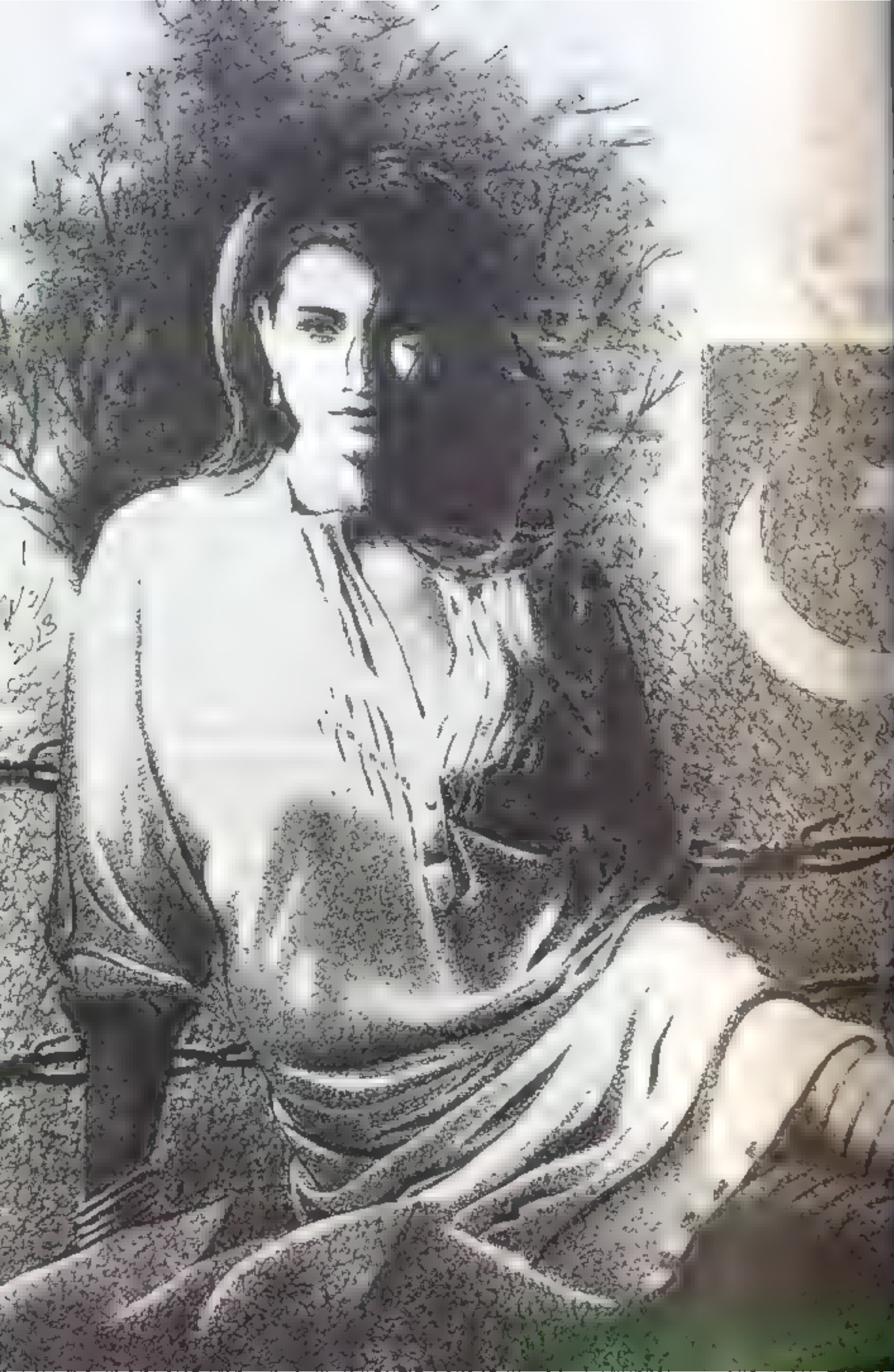
زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے ۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھار اجو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے ۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر ... ایک للکار ہے ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف وکی نے ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت کے [illegible] ایک تو جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اس کے گھر والوں کو ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میری ملاقات عمران [illegible] ہوئی۔ میں اور ثروت کا [illegible]۔ بچانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا۔۔۔ جلد ہی [illegible] پتا چلا کہ سیٹھ سراج ان [illegible] میں رہتا میڈم صنوبر کے لیے کام کرتا ہے۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اسی دوران میں [illegible] نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں ایک راجپوت لڑکی سلطانہ نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے اور میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا [illegible] ساتھیوں سے جا ملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کر لیا۔ ہم جوڈو کراٹے کے ماہر چیمپیئن جیکی کو اپنے ساتھ لے آئے۔ [illegible] کی وجہ سے ماریہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ پھر سلطانہ اور آفتاب ایک گاؤں کے شفاخانے میں گھس گئے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنا لیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کر کے یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ پھر مقابلہ ہوا ماریہ ماری گئی۔ آفتاب اور سلطانہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں نرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ ہم وہاں سے فرار ہو کر پرانے قلعے میں آ گئے۔ چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے نرگاں سے نکلے اور الٰہ آباد پہنچ گئے پھر ہمیں [illegible] کی جانب سے ایک کام کی آفر ہوئی۔ ہمیں سہراب جلالی نامی عمر رسیدہ شخص کے پاس کسی ماں بیٹے کے موجود ہونے کا پتا لگانا تھا۔ میں اور عمران [illegible] میں سہراب جلالی کے ہاں پہنچ گئے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے دو خوب صورت نرسیں بھی موجود تھیں۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی سے خفیہ نکاح کر لیا تھا۔ پھر ایک [illegible] میں نے باغیچے میں فتح محمد کو کسی سے راز داری سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور ایک کوٹھی میں گھس گیا لیکن وہاں کئی لوگوں نے مجھے پکڑ کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ فتح محمد بھی زخمی حالت میں وہیں پڑا تھا۔ ان لوگوں نے فتح کو مار ڈالا۔ جلالی کے سیکرٹری ندیم کو وہاں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ جاوا گروپ سے ملا ہوا ہے۔ پھر وہاں میں نے جاوا کو دیکھا۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا اور عمران تک پہنچ گیا۔ [illegible] کو ہوٹل میں چھوڑ کر میں اور عمران [illegible] ہاؤس آ گئے۔ ایک رات پتا چلا کہ مہناز فارم ہاؤس سے کسی کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ جلالی صاحب موت کے قریب تھے۔ انہیں اسپتال پہنچایا گیا۔ ہم مہناز [illegible] والدہ کو لے کر ڈیفنس والی کوٹھی پر آ گئے۔ اسی دوران میں ہمیں مہناز کے حوالے سے تھوڑا سا سراغ ملا۔ ایک دن جیلانی کے ذریعے ہمیں پتا چلا کہ وہ ایک بنگلے [illegible] کسی ڈی ایس پی [illegible] کے ساتھ رات گزار رہا ہے۔ وہاں سے واپسی میں اس کا جھگڑا ہو گیا۔ مجھے مدد کے لیے پہنچنا پڑا تاہم اس دوران میں یوسف زخمی ہو چکا تھا [illegible] اسپتال پہنچایا گیا۔ پھر یوسف اسپتال سے غائب ہو گیا۔ میں نے نیتو عرف کرشمہ کپور کو ڈھونڈ کر اس کا پیچھا کیا۔ میں ایک سرحدی گاؤں پہنچ گیا جہاں جیل [illegible] تھی۔ میں لطیف نامی شخص سے معلومات لے کر آ گیا۔ پھر میں اور ثروت دوبارہ گاؤں پہنچے۔ ثروت نے بڑی حویلی میں وقتی ملازمت کر لی۔ ادھر حنیف کی بیوی نے چودھری کو ہمارے بارے میں آگاہ کر دیا۔ ہمیں پکڑ لیا گیا تاہم راجا کی مدد سے ہم وہاں سے فرار ہوئے۔ رستے میں راجا کے گولیاں لگیں اور وہ مارا گیا۔ ہمیں چودھری کے کارندوں نے گھیر لیا تاہم میری جنونیت کے آگے وہ سب پسپا ہو گئے۔ ہم وہاں سے بھاگ کر ایک ٹیلے پر پہنچ گئے۔ یہاں پکی اینٹوں سے بنا ایک کوٹھا سا تھا۔ ہم نے وہیں پناہ لے لی۔ ہم یہاں سے جگت سنگھ نامی ایک سکھ کی مدد سے نکل کر اس کے گھر پہنچ گئے۔ ہم پاکستانی بارڈر پار کر گئے تھے اور اس وقت انڈین علاقے میں تھے۔ جگت سنگھ کی مدد سے ہم نے یوسف کا سراغ لگایا جو ایک سکھ سردار کی حویلی میں قید تھا۔ میں اور ثروت ملازم بن کر سکھ سردار اوتار سنگھ [illegible] حویلی میں پہنچ گئے۔ پتا چلا کہ یوسف سے کوئی خطرناک کام لیا جانا ہے اور اس کی جان جا سکتی ہے۔ میں یوسف کو وہاں سے نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے جگت سنگھ [illegible] مدد لی۔ جس رات یوسف کو خطرناک سفر پر لے جایا جانا تھا، اس دن میں نے کارروائی کی۔ یوسف کی گاڑی میں بم نصب تھا۔ میں بم کو گاڑی سے علیحدہ کرنے [illegible] تاہم مجھے پکڑ لیا گیا۔ اوتار سنگھ کے مخالفین نے حویلی پر ہلہ بول دیا جس کی وجہ سے ہم وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ یوسف نے ثروت کو میرے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ وہ دونوں مجھ سے اکھڑے اکھڑے تھے۔ ایک موقع پر وہ دونوں مجھے چھوڑ کر نکل گئے۔ تاہم پھر میں ہی ان کی مدد کو پہنچا۔ ہم بھاگ کر ایک گاؤں میں آ گئے۔ جگت بھی ہمارے ساتھ تھا۔ پھر مخبری پر وہاں جاوا پہنچ گیا۔ جگت کی منہ بولی بیوی اور بھائی گوبندر مارے گئے۔ ثروت بھاگ نکلی تھی تاہم اسے بھی پکڑ [illegible] گیا۔ میری دھڑکنیں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ میں ایک کمرے میں بند تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر جاوا نے مجھے الگ کمرے میں بات کرنے کے لیے بلایا اور کہا وہ مجھے اور عمران کو بخش دے گا اگر اس کا ایک کام کر دیا جائے اور وہ کام تھا ریان ولیم کو شکست دینا۔ ہمیں ایک گیم میں حصہ لینا تھا جس میں ریوالور اپنی کنپٹی پر رکھ کر گولی چلانی تھی اور اس کے پانچ خانوں میں گولیاں ہوتیں جبکہ ایک خانہ خالی ہوتا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں نے کہا۔ ”مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔ کیا تم نے یہی کہا ہے کہ پانچ خانوں میں گولی ایک خانہ خالی؟“

”میں مسخری نہیں بول رہا۔“ جاوا نے زہریلے انداز میں کہا۔ ”یہ بڑا مقابلہ ہے۔ انٹرنیشنل بازی ہے۔ اس پر بہت بڑی بڑی رقمیں لگیں گی۔ بہرحال، چانس تو ہر پرکھشا (امتحان) میں ہوتی ہے۔ اس میں بھی تھوڑی بہت ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ہر کھیلنے والے کے پاس ایک اختیار ہو گا۔ وہ پانچ خانوں میں گولی رکھ کر خود پر ایک دفعہ فائر کرے گا یا پھر چار خانوں میں گولی رکھ کر دو دفعہ فائر کرے گا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ریوالور کے چار خانوں میں گولی اور کنپٹی پر نال رکھ کر دو دفعہ ٹریگر دبانا۔۔۔ یعنی تم

کیوں؟ یہ تم مہربانی ہے؟“

”نہیں جی۔ اس سے بڑی مہربانی اور کیا ہو سکتی [illegible] آپ نے بھی اپنے بارے میں کس طرح کی بات [illegible] ہے؟ چار خانوں میں گولی رکھی جائے اور آپ سے کہا جائے [illegible] دونوں چلیں ایک دفعہ ہی خود پر ٹریگر دبائیں۔“

”میں [illegible] پیمبر نہیں ہوں۔ جس کا کام اسی کو ساجھے۔ ہاں [illegible] یہ کام بڑی اچھی طرح سے کر سکتا ہوں۔ اب دیکھو، تم جیسے زہریلے سانپ کا سر میرے پاؤں کے نیچے ہے۔ [illegible] اپنی دُم ہلا سکتے ہو اور کچھ نہیں کر سکتے۔ دم بھی زیادہ ہلاؤ گے تو [illegible] لیں گے، ورنہ تمہاری وہ ناگن ہمارے قبضے میں ہے۔ تمہارے سامنے اس کا زہر نکالیں گے۔ زہر نکل جائے گا تو وہ ایک دم مچھلی بن جائے گی۔۔۔ ناگ یا ناگن میں زہر نہ ہو تو وہ ایک دم مچھلی کی طرح کھانے کے قابل ہوتے ہیں۔ ہم اس ناگن کو کھانے کی میز پر سجائیں گے۔ ہر کوئی اسے چکھ سکے گا۔ اگر وہ کمینہ سپیرا عمران تمہارے پیچھے آیا تو اس کی تو ایسی بینڈ بجے گی کہ دیکھنے والے کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔ بڑی زبردست قسم کی نس بندی ہو گی اس کی۔“

جاوا واقعی ایک بے رحم ذات تھا۔ اس میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو کسی بھی جنونی قاتل میں ہو سکتی ہیں۔ وہ بندے کو مکھی کی طرح مارتا تھا۔ آج رات کے ایک پہر کے دوران میں ہماری آنکھوں کے سامنے اس نے تین جیتے جاگتے انسانوں کو لاشوں میں تبدیل کر دیا تھا اور وہ تینوں لاشیں بھی اسی چار دیواری میں ہی موجود تھیں۔ مخبر روہیل سنگھ اور جواں سال آشا کور کی لاشیں ایک پچھلے کمرے میں رکھی گئی تھیں۔ گوبندر ابھی تک اس پنجرہ نما کمرے میں بے گور و کفن پڑا تھا۔

میں نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری ساری بات سمجھ گیا ہوں جاوا صاحب! مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”سوچنے کی کیا بات ہے بچے۔ سب کچھ تو تیرے سامنے ہے۔ تو بھی یہیں ہے اور تیری معشوقہ بھی۔ انکار کی گنجائش تو تیرے پاس ہے ہی نہیں۔ انکار کرے گا تو ابھی اس چھوکری کے ساتھ میرے لونڈے کھیل تماشا شروع کر دیں گے۔ نہ وہ جی سکے گی، نہ مر سکے گی۔“

میرا جی چاہا، سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر جاوا پر جھپٹ پڑوں [illegible] مار دوں، یا مر جاؤں لیکن میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔۔۔ اور تھوڑے ہی فاصلے پر دو رائفل بردار چوکس کھڑے تھے۔ میں نے [illegible] سے میں کہا۔ ”جو شرط تم بتا رہے ہو، وہ بہت کڑی ہے۔ بے شک عمران اس سے پہلے سرکس میں یہ ریوالور والا کھیل کھیلتا رہا ہے۔ اس میں گولی کنپٹی پر نہیں بلکہ چھت پر رہ کر چلائی جاتی تھی اور چھ گولی والے چیمبر میں ایک یا دو گولیاں رکھی جاتی تھیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی ہوش مند بندہ چیمبر میں چار گولیاں رکھ کر اپنی کنپٹی پر فائر کر سکتا ہے اور وہ بھی ایک نہیں دو دفعہ۔“

جاوا نے سگریٹ کا گاڑھا دھواں میرے منہ پر چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”بچے۔۔۔ اس ہیرو نے مرنا تو ویسے بھی ہے۔ تم سے بڑا بے وقوف پورے جگ میں کوئی نہیں ہو گا اگر تم یہ سمجھو کہ میں اسے زندہ چھوڑ دوں گا۔ لیکن جو طریقہ میں تمہیں بتا رہا ہوں، اس میں اس کے بچنے کے امکانات ہیں۔ وہ بچ سکتا ہے، اس کی لک کام کر سکتی ہے۔۔۔ اور بھگوان جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ وہ کتا بچ جائے گا اور میرے سینے پر مونگ دلنے کے لیے زندہ رہے گا۔ لیکن اگر وہ ہمارے لیے کوئی بڑا کارنامہ انجام دے کر زندہ رہا تو میں اس کا جینا جیسے تیسے برداشت کر ہی لوں گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ جو کہہ رہے ہیں، ویسا ہی ہو گا۔ اسے صرف مقابلے کے لیے ہی بلایا جائے گا؟“

”ہاں، یہ تم نے کام کی بات کی ہے۔ اس طرح کی ڈیل میں اس طرح کی گارنٹی تو ہونی چاہیے۔ میں تمہیں جو گارنٹی دے سکتا ہوں، وہ میری زبان ہی ہے۔ پورے ممبئی میں بلکہ پورے انڈیا میں اس زبان کی گارنٹی مانی جاتی ہے۔۔۔ کھیل میں حصہ لینے کے بعد نہ صرف تمہاری اور ہیرو کی جان کی گارنٹی ہے بلکہ اتنا روکڑا بھی ملے گا کہ تمہاری سات پشتیں سونے چاندی میں دب جائیں گی۔“

”میں پھر بھی چاہتا ہوں کہ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیا جائے۔“

”سوچ لو لیکن کوئی حرامزدگی نہیں چلے گی۔ کوئی ہیرو پن، کوئی بروس لی پن کوئی جیمز بانڈ اسٹائل، کچھ نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو تمہیں تو شاید ابھی ہم کچھ نہ کہیں لیکن تمہاری اس معشوقہ کا بیڑا غرق و خانہ خراب ہو جائے گا۔“

میں خاموشی سے جاوا کو دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ”میرے سامنے ایسے دیدے نہ پھاڑا کرو۔ میرا میٹر گھوم جاتا ہے۔ میں غلطی سے قتل کر دیا کرتا ہوں۔“

میں نے ناگواری سے رخ پھیر لیا۔

وہ بولا۔ ”میں تمہارے لیے علیحدہ کمرے کا انتظام کر

دیتا ہوں تاکہ تم تسلی سے سوچ سمجھ سکو... بلکہ اگر تم چاہو تو تمہاری سہیلی کو بھی تمہارے پاس ہی بھیج دیتا ہوں۔ مل کر سوچ لینا ورا پنا بُرا بھلا سمجھ لینا۔“

قریباً آدھ گھنٹے بعد میری الٹی ہتھکڑی کھول کر مجھے پھر اسی کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں میں یوسف اور گوبندر کے ساتھ بند تھا۔ لیکن اب وہاں یوسف موجود نہیں تھا۔ گوبندر کی لاش بھی وہاں سے ہٹائی جا چکی تھی۔ کچے فرش سے خون اچھی طرح صاف کر کے وہاں ایک چٹائی بچھا دی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد ثروت بھی اس کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ تھیں۔ حسب توقع اس نے سب سے پہلے یوسف کے بارے میں پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ یوسف بالکل خیریت سے ہے۔

”انہیں کہاں رکھا گیا ہے؟“ ثروت نے دوسرا سوال پوچھا۔

مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا لیکن میں نے بتایا کہ وہ یہیں اسی گھر میں موجود ہے۔ وہ میری طرف دیکھتی تھی تو اس کی آنکھوں میں ایک بیگانگی آمیز خوف نظر آتا تھا۔ اس خوف کا تعلق یقیناً میرے بدلے ہوئے لائف اسٹائل اور میرے اجنبی مزاج سے تھا۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ان لوگوں نے بتایا ہے کہ انہوں نے آشا کو گولی مار دی ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی دوسرا بھی ان کی بات نہیں مانے گا تو وہ اس کے ساتھ بھی یہی کریں گے۔ کیا واقعی آشا...؟“

میں خاموش رہا۔ میری خاموشی نے اسے سمجھا دیا کہ یہ دل ہلا دینے والی اطلاع درست ہے۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے پھر آنسو گرنے لگے۔ وہ بھیگی آواز میں بولی۔ ”اور رجنی کیسے بے ہوش ہوئی ہے؟ میں نے ابھی اسے ساتھ والے کمرے میں دیکھا ہے۔“

”آشا کو گولی لگی تو اس نے دیکھ لیا۔ بس اسی صدمے سے وہ گر گئی۔“

”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہوئی؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”اور گوبندر نظر نہیں آ رہا... وہ کہاں ہے؟“

”وہ بھی یہیں ہے۔ مگر تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ تمہیں نمبردار کے گھر سے پکڑا ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہم... میرا خیال تھا کہ وہ لوگ مجھے پناہ دیں گے اور آپ کی مدد کے لیے بھی باہر نکلیں گے۔ مگر وہ بزدل نکلے اور دھوکے باز بھی۔ انہوں نے یہاں اطلاع پہنچا دی۔ یہ لوگ مجھے پکڑ لائے۔ مجھے... یہ بہت خطرناک لوگ ہیں تابش! یہ کون ہیں؟ ہم سے ان کی کیا دشمنی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ثروت! یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے یوسف کو لاہور کے اسپتال سے اٹھایا اور یہاں پہنچایا۔ سردار اوتار کی حویلی سے تو نکل آئے لیکن ان لوگوں کے چنگل سے نہیں بچ سکے۔“

”مجھے اس بڑی آنکھوں والے سے بڑا خوف آ رہا ہے۔ جس کے چہرے پر ہلکے داغ سے ہیں۔ وہ انسان نہیں کوئی جانور لگتا ہے۔“

”وہی ان کا سرغنہ ہے۔“

”مجھے یہ سوچ کر ہی ڈر آتا ہے کہ مجھے پھر اس کی شکل دیکھنا پڑے گی۔“

”جو کچھ بھی ہے ثروت! میرے ہوتے تمہیں اور یوسف کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تم دونوں کو ان شاء اللہ حفاظت سے پاکستان پہنچاؤں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔“

”آپ... اپنی بات بھی کریں۔ ہم تینوں یہاں سے جائیں گے۔“

”تم دعا کرو کہ ایسا ہو سکے۔ ان لوگوں سے ایک معاملے پر بات چل رہی ہے۔ یہ کچھ شرطیں بتا رہے تھے... میری کوشش ہے کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم تمہارے اور یوسف کے لیے کچھ رعایت حاصل کر سکوں۔“

وہ ڈبڈبائی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ ”تابش! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں یوسف کی طرف سے آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ یوسف یقیناً غلط فہمیوں کا شکار رہے ہیں۔ انہوں نے راستے میں آپ پر گولی چلائی۔ مجھے اس کا بے حد رنج ہے۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اللہ نہ کرے ان کی گولی سے آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہ کر سکتی۔“

”یوسف سے میری جان پہچان پرانی نہیں ہے ثروت! بندہ ایک دوسرے کو زیادہ جانتا نہ ہو تو اس طرح کی بدگمانیاں ہو جاتی ہیں۔“

وہ میرے لہجے سے چونکی اور میرا اشارہ سمجھ کر بولی۔ ”ہم... میں بہت شرمندہ ہوں تابش! میں بھی تو آپ کی طرف سے بدگمان ہوئی۔ میں نے وہاں سردار اوتار کی حویلی میں آپ سے غلط باتیں کہیں۔ میں نے بہت غلط کیا تابش! میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ میں کئی دن سے خود کو ملامت کر رہی ہوں۔ میں نے یہ کیوں سوچا کہ آپ یوسف کا برا چاہتے ہیں... اپنی اس سوچ پر میں آپ سے معافی مانگتی ہوں تابش!“ اس کی آواز بھرا گئی۔

میں خاموش رہا۔ وہ بولی۔ ”میری عقل ماری گئی تھی تابش! آپ ہم دونوں کو بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ آپ نے زخم کھائے ہیں اور میں اتنا سخت بولی آپ کے ساتھ۔“

میں نے کہا۔ ”چلو پچھلی باتیں چھوڑو ثروت! تمہیں احساس ہو گیا، میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اب آگے کے بارے میں سوچو۔“

”مجھے یوسف کے بارے میں بہت فکر ہے تابش! وہ اتنے مضبوط نہیں ہیں۔ اس قسم کے حالات سے کبھی ان کا واسطہ نہیں پڑا۔ یہاں پر ان لوگوں کا اصل شکار تو یوسف ہی ہیں... وہ ان کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”پانچ چھ دن پہلے تک مجھے بھی کچھ پتا نہیں تھا ثروت کہ اصل میں یہ چکر ہے کیا؟ پھر میں نے سردار اوتار کے بیمار والد کے پاس ایک فوٹو البم دیکھی۔ اس میں گھر کے لوگوں کی تصویریں تھیں۔ انہی تصویروں میں مجھے سردار اوتار کے بڑے بیٹے اشوکا سنگھ کی تصویر بھی نظر آئی۔ میں حیران رہ گیا۔ وہ شکل صورت میں بہت حد تک یوسف سے ملتا تھا۔ اس کے چہرے پر زخم کا ویسا نشان بھی تھا جیسا یوسف کے چہرے پر بنایا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سردار اوتار کے بیٹے کا کوئی چکر ہے جس کی وجہ سے یوسف کو یہاں لایا گیا ہے۔ میں نے حویلی کے ایک خاص ملازم کو پکڑا اور اس سے ساری معلومات حاصل کیں۔ سردار اوتار کے قاتل بیٹے کا پیچھا پولیس سے چھڑانے کے لیے یہ لوگ یوسف کی جان لینا چاہ رہے تھے۔ یہ لوگ یوسف کو اس کالی جیپ پر بارڈر کی طرف بھیجتے۔ یوسف کو پولیس والے اشوکا کے طور پر پہچان لیتے اور اس کے فوراً بعد یوسف کی گاڑی کے ٹکڑے ہو جاتے۔ بڑا تفصیلی منصوبہ تھا اور یقیناً اس کے پیچھے جاوا کا دماغ ہی تھا۔ سردار اوتار سنگھ نے اس خونی ڈرامے کے لیے جاوا کو ایک بھاری رقم دی ہے۔“

”تو اب یہ لوگ یوسف کو کیسے چھوڑیں گے؟“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”میں نے کہا ہے نا، دعا کرو۔ کام مشکل ہے لیکن ایک سبب لگ رہا ہے۔“

”کیسا سبب؟“

”جاوا میرے دوست عمران سے ایک خاص کام لینا چاہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ بارگیننگ ہوگی۔ میں نے سوچا ہے کہ اس بارگیننگ میں یوسف والا معاملہ شامل کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔“

”آپ بتا رہے ہیں کہ یہ جاوا کوئی بہت بااثر شخص ہے۔ اس کو آپ کے دوست سے کیا کام ہو سکتا ہے؟“

”بس کوئی ایسا کام ہے جو عمران کر سکتا ہے۔“

اس نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو، آپ کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ کیسے لوگوں سے ناتے ہو گئے ہیں آپ کے۔

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ جیسے کہنے کو کوئی بات ہی نہیں رہ گئی تھی۔ بہت قریب رہنے کے بعد بچھڑ جانے والوں کے ساتھ شاید ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ کہیں قریب ہی کسی کچے راستے سے کوئی ٹریکٹر ٹرالی گزر رہی۔ لاؤڈ اسپیکر پر اونچی آواز میں گانا چل رہا تھا۔ کسی بھارتی پنجابی فلم کا گانا تھا جس میں سردیوں کی چاندنی رات کا ذکر تھا اور چنبیلی کے پودوں میں گم ہو جانے والے دو پریمیوں کی بات تھی۔

کچھ چاندنی راتیں میرے تصور میں بھی گھوم گئیں۔ وہ پھولوں کے گجرے، وہ ہونٹوں کی نرم پنکھڑیاں، وہ ریشمی سرگوشیاں، وہ پل میں ایک پورا منظرنامہ نگاہوں کے سامنے چمک گیا۔

ثروت نے کہا۔ ”ایک بات کہوں، آپ برا نہ مانیے گا۔“

”میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مان سکتا ثروت۔“

”اگر میں آپ کے پاس اس کمرے میں رہوں گی تو میرے لیے مزید مشکلیں پیدا ہو جائیں گی۔“

”کیا مطلب؟“

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”آپ جانتے ہیں تابش! یوسف میرے بارے میں ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ شاید آپ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ مجھے یوسف کو نہیں بتانا چاہیے تھا کہ ہم اکٹھے سفر کرتے رہے ہیں اور اس سفر کے دوران میں رات دن ایک ساتھ رہے ہیں۔ مجھ پر بھروسا رکھنے کے باوجود وہ شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید اس سلسلے میں انہیں اپنے دل پر بس نہیں۔“

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ میں نے کہا۔ ”کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمہیں میرے ساتھ نہ رکھا جائے، دوسرے کمرے میں یوسف کے پاس بھیج دیا جائے؟“

"اگر ایسا ممکن ہو تو پلیز... ضرور کر لیجیے۔"

میں نے سلاخ دار کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دو مسلح افراد چند میٹر دور کھڑے تھے اور ہمیں ہی گھور رہے تھے۔ جادا اور چودھری انور کہیں نظر نہیں آ رہے تھے، نہ ہی ان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کسی کو آواز دیتا، گھر سے باہر ایک بار پھر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ دروازے بند ہونے کی آواز سے پتا چلا کہ یہ کوئی بھاری بھرکم لگژری گاڑی یا جیپ ہے۔ ایک منٹ بعد گھر کا بیرونی دروازہ کھلا اور دو تین افراد اندر آ گئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ اس فربہ اندام عورت کو دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ وہی لاہور کے بازارِ حسن والی نائکہ شارہ بائی تھی۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ میں اسے یہاں دیکھوں گا۔ چودھری انور کو یہاں دیکھ کر بھی میری کچھ ایسی ہی کیفیت ہوئی تھی۔

شارہ بائی کے ٹھاٹ دیکھنے والے تھے۔ اس نے شوخ شلوار قمیص کے اوپر ایک ہلکی پھلکی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں سینڈل وغیرہ کی جگہ جوگر شوز تھے۔ گھنگرالے بال اس کے کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں موبائل فون، دوسرے میں سگریٹ تھامے وہ بڑے طنطنے سے اندر داخل ہوئی۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے رک کر ذرا دھیان سے مجھے دیکھا، پھر تیر کی طرح میری طرف آئی... سلاخ دار کھڑکی کے ساتھ اپنا تھوبڑا لگا کر اس نے اپنی ناک کو غصیلے انداز میں پھلایا اور بولی۔ "میرا دل کہتا تھا کہ تم سے ملاقات ہوگی اور جلد ہی ہوگی۔ لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ تم یہاں ملو گے۔" پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئی اور ان سے پوچھا۔ "یہ خبیث کس طرح آیا ہے یہاں؟"

لمبی گردن والے ایک شخص نے کہا۔ "یہ لمبی اسٹوری ہے باجی جی۔ یہ لوگ اپنا بندہ چھڑانے کے لیے لاہور سے یہاں پہنچے ہیں۔ پہلے سردار اوتار سنگھ کی حویلی میں تھے..."

"وہ ساری رام کہانی جانتی ہوں میں۔ لیکن یہ لوگ یہاں اس گاؤں میں کیسے آئے؟"

"سردار صاحب کی حویلی میں لمبا لفڑا ہو گیا تھا جی۔ سردار کی بیٹی کے رشتے کا جھگڑا تھا۔ کئی بندے مارے گئے ہیں۔ بس اسی لفڑے میں یہ لوگ بھی وہاں سے بھاگ نکلے۔ ان کے برے لیکھ کہ یہاں اس گاؤں کے تھانے دار صاحب اپنے بھیا صاحب کے چاہنے والوں میں شامل ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ بھگوڑی اور دونوں بھگوڑے پکڑے گئے۔"

"دوسرا بھگوڑا کون؟"

"وہی لونڈا یوسف جس کا سارا ٹینٹا تھا۔ یہ اس کی چتی

ہے... رم ہو تو یہی جاتا ہے۔"

شارہ بائی نے جیسے آخری چند الفاظ سنے ہی نہیں۔ اس کی ساری کی ساری توجہ مجھ پر تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ وہ شاید نشے میں بھی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اگر درمیان میں آہنی سلاخیں نہ ہوں تو وہ جنگلی بلی کی طرح مجھ پر پل پڑے گی۔

میں اس کی اس کیفیت کا سبب [illegible] لاہور کے تھانے میں عمران نے شارہ بائی سے تفتیش کے لیے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ اس نے لیڈی انسپکٹر سے شارہ بائی کی اچھی خاصی چھترول کروائی تھی۔ نہ اس کی کوئی سفارش چلنے دی تھی نہ چھٹکارے کا کوئی اور طریقہ استعمال کرنے دیا تھا۔ مجبوراً شارہ بائی نے ہمیں یوسف کے اغوا اور روپوشی کے بارے میں اہم معلومات مہیا کر دی تھیں۔ اس ساری کارروائی کے دوران میں، میں بھی عمران کے ساتھ رہا تھا۔

وہ دانت پیس کر بولی۔ "وہ بھگیاڑ کی شکل والا دوسرا مردود کہاں ہے؟" اس کا یہ "مہربان" اشارہ یقیناً عمران کی طرف تھا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر شعلہ جوالا بن کر اپنے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا پسٹل نکال لیا۔ وہ دہاڑی۔ "میں مار دوں گی تمہیں، تمہاری کھوپڑی توڑ ڈالوں گی۔ بتاؤ کہاں ہے وہ... کا..."

اس کو جذباتی حالت میں دیکھ کر اس کے ایک ساتھی نے پسٹل اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ وہ [illegible] برآمدے کی طرف بڑھی۔ وہاں ایک لمبے دستے کی کلہاڑی پڑی تھی۔ اس نے کھڑکی کی سلاخوں کے درمیان سے مجھ پر کلہاڑی کا وار کرنے کی کوشش کی۔ یہ بالکل ناکام کوشش ثابت ہوئی۔ وہ جھنجلاہٹ میں کھڑکی کی سلاخوں پر اندھا دھند کلہاڑی کے وار کرنے لگی اور گالیاں بکنے لگی۔ اس کے پان سے رنگے ہونٹوں کے اندر سے پیک کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ شور سن کر جادا کا ملازم خاص پریم چوپڑا باہر نکل آیا۔ اس نے شارہ کو کندھوں سے تھاما اور ذرا سختی سے بولا۔ "باجی! یہ کیا کر رہی ہو؟ یہ فی الحال جادا صاحب کا مہمان ہے۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔" اس نے بمشکل شارہ کو سلاخ دار کھڑکی سے دور کیا۔ ثروت جو پہلے ہی خوف زدہ تھی، اس افتاد سے اور سکڑ سمٹ کر رہ گئی۔

جادا کا ملازمِ خاص پریم چوپڑا، شارہ بائی کو سنبھال کر دوسرے کمرے میں لے گیا۔ چند منٹ بعد ہمارے اور

مجھ پر سکون ہو گیا۔ لیکن اس سکون کے اندر کئی طرح کا تلاطم بھی تھا۔ یقیناً ثروت کے ذہن میں کئی طرح کے سوالات ابھر رہے تھے۔ شاید اسے یہ جان کر حیرت بھی ہوئی تھی کہ میرے تعلقات شارہ بائی جیسی عورتوں سے ہیں۔ اس بے چاری کو معلوم نہیں تھا کہ شارہ سے میرا تعلق یوسف کی وجہ سے ہی [illegible] میری نہیں یوسف کی "واقف کار" تھی۔

وہ [illegible] کے حوالے سے اتنا کچھ "برا" دیکھ چکی تھی کہ اس نے شارہ والے معاملے کو بھی بہت اہم نہیں جانا اور اس بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ بس سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میں ابھی تک حیرت میں گم تھا۔ لاہور کی ہیرا منڈی سے انڈیا کے اس چھوٹے سے گاؤں تک کا سفر شارہ بائی نے معلوم نہیں کیسے اور کیونکر طے کیا تھا؟

ثروت کی کمزور لیکن مترنم آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ "آپ ابھی کسی "کام" کا ذکر کر رہے تھے جو یہ لوگ آپ کے دوست سے لینا چاہ رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ وہ ضرور کوئی خطرناک کام ہی ہوگا۔"

"ظاہر ہے ثروت! جس قسم کے لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑا ہے یہ سیدھے کام تو کرنے والے نہیں۔"

"کوئی... غیر قانونی کام ہوگا؟"

"یہاں جو کچھ ہو رہا ہے ثروت غیر قانونی ہی ہے۔ یوسف کے گم ہونے سے لے کر اب تک کیا چیز قانون کے دائرے میں ہوئی ہے؟ راجا مارا گیا، کرشمہ کپور کی جان گئی۔ مجھ سے پانچ چھ بندوں کا خون ہوا اور سردار اوتار کی حویلی میں جو کچھ ہوا وہ کون سا قانونی تھا..."

وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ ان نظروں میں گم گشتہ محبت کی جھلک تھی، ایک خوف آمیز حیرت بھی تھی اور آنسوؤں کی چمک بھی۔ مجھے لگا کہ اس کی حسین آنکھوں میں اب بھی وہ خونی منظر چھینٹے اڑا رہا ہے جب میں چاقو بدست دیوانہ وار ان پانچ چھ افراد سے بھڑ گیا تھا جنہوں نے بارڈر لائن کے قریب مجھے اور ثروت کو گھیرا تھا۔

وہ بولی۔ "آپ کتنے بدل گئے ہیں تابش! کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں آپ کو پہچان ہی نہیں پاتی۔ میں آپ کے اندر اس تابش کو ڈھونڈتی رہتی ہوں جو چار پانچ سال پہلے تک ہماری فیملی کا حصہ تھا... بالکل ہمارے جیسا تھا۔"

"مجھے بھی وہ تابش اچھا لگتا تھا ثروت... لیکن ایک دن اس تابش نے زندہ رہنے کا حق کھو دیا۔ وہ جب تمہاری حفاظت نہ کر سکا، تمہیں اپنا نہ رکھ سکا، اپنی ماں کی جان نہ بچا سکا تو پھر وہ کیسے زندہ رہتا؟ اسے مر ہی جانا چاہیے تھا۔"

"حالات... اتنے برے تو نہیں تھے تابش... وہ جتنے آپ نے کر دیے ہیں۔ آپ تو وہ رہے ہی نہیں ہیں جو کبھی تھے..."

"جب تم سے جدائی ہو گئی ثروت... تو پھر ہر چیز سے جدائی ہو گئی۔ پھر کچھ بھی اپنا نہ رہا۔"

"وہ... جدائی بھی تو ایک حادثہ ہی تھی۔ اور اس حادثے کو بڑھاوا بھی آپ ہی کی طرف سے ملا تھا تابش! میرے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا... لیکن آپ کے گھر والوں نے... خاص طور سے خالہ جان نے مجھے قصوروار ٹھہرایا تابش! میں باعزت گھر واپس آ گئی تھی لیکن میرے ساتھ وہ رویہ اختیار کیا گیا جو کسی لٹی پٹی لڑکی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مجھے ہر قدم پر احساس دلایا گیا کہ میں اب آپ کے بلکہ شاید کسی کے قابل بھی نہیں رہی۔"

"ثروت! تم دوسروں کے بارے میں تو شاید ایسا کہہ سکو لیکن ہمارے گھر والوں کے بارے میں نہیں کہہ سکتی ہو۔ ہاں میں اتنی بات ضرور مانتا ہوں کہ اس واقعے کے بعد امی کچھ دن تک الجھن میں رہی تھیں اور ان کو الجھانے میں بھی زیادہ کردار دوسروں ہی کا تھا۔ میں نے اور فرح، عاطف نے مل کر انہیں بالکل ٹھیک کر لیا تھا۔ وہ تم سے ملنے آ رہی تھیں۔ ہم تینوں بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ تمہیں سینے سے لگا کر بہت بہت پیار کرنا چاہتی تھیں۔ تمہارے سارے شکوے دور کر دینا چاہتی تھیں۔ لیکن جب ہم تمہارے گھر کے دروازے پر پہنچے تو ہم پر انکشاف ہوا کہ تم سب لوگ تو بڑی خاموشی سے ملک ہی چھوڑ کر جا چکے ہو..."

اس نے عجب شکوہ کناں نظروں سے مجھے دیکھا۔ "اور آپ واپس چلے گئے...؟"

میری آواز بھرا گئی۔ "میں کہاں واپس گیا تھا ثروت! میں نے تمہیں بتایا ہے نا، میں ڈھائی تین سال کے لیے ایسے حالات میں جکڑا گیا تھا جن سے مفر کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں تھی۔ وہ میری زندگی کا بدترین دور تھا ثروت..."

"اب ان باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ؟" اس نے سر جھکایا اور دو آنسو اس کی آغوش میں گم ہو گئے۔

اسی دوران میں شارہ بائی پھر ہمارے کمرے کی طرف آتی دکھائی دی۔ غالباً اس نے کھانا کھایا تھا اور اپنے پان سے رنگے ہوئے دانتوں میں خلال کر رہی تھی۔ وہ مستی میں آئی ہوئی نیل گائے کی طرح سلاخ دار کھڑکی کے عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اب وہ مجھ پر اتنا غور نہیں کر رہی تھی جتنا ثروت پر۔ اسے اوپر سے نیچے تک تاکتے ہوئے بولی۔

"تو یہ ہے وہ شریف زادی جو اپنے عیاش خصم کے پیچھے پیچھے یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ وہ بھی وہ، خمر گرہستن ہوتو ایسی۔ اپنی جوانی اور عزت ہتھیلی پر رکھ کر نکل پڑی ہے، اللہ کی بندی۔"

"کیا کیا ہے اس کے خصم نے؟" پریم چوپڑا نے دریافت کیا۔

"یہ پوچھو، کیا نہیں کیا۔ اس جیسی نیک پروین زنانیاں گھروں میں بیٹھ کر آلو گوشت پکاتی رہتی ہیں اور ان کے خصم روسٹ وشیر اور مچھلی کباب کھاتے ہیں طوائف زادیوں کے ساتھ بیٹھ کر۔ اس کا شوہر بھی یہی کرتا رہا ہے۔"

"تم اپنی زبان بند رکھو تو بہتر ہے۔" میں نے کڑوے لہجے میں شاربہ بائی کو مخاطب کیا۔

"اوئے، میں نے تو سنا ہے کہ تو یار ہے اس شریف زادی کا۔ میں تو تیرے فائدے کی بات کررہی ہوں۔ اس کے خصم کا کچا چٹھا بتا رہی ہوں۔ اور کوئی جھوٹ تو نہیں بول رہی ہوں نا۔ یہ کہے گی تو ثبوت بھی دے دوں گی۔"

پریم چوپڑا مسکرایا اور اس کی ناک کچھ اور بھی چوڑی ہوگئی۔ وہ بولا۔ "بائی جی! کس بات کی دشمنی لے رہی ہو بے چاری سے؟ دیکھو رنگ کیسے پیلا پڑ گیا ہے اس کا۔"

"دشمنی تو مجھے" ہے "ایسی شریف زادیوں سے۔" وہ شرابیوں کی طرح ہاتھ لہرا کر بولی۔

"کس بات کی دشمنی؟" پریم چوپڑا نے پوچھا۔

"بس ہمارے پیٹ پر لات مارتی ہیں اس طرح کی خاوند پرست زنانیاں۔ چپٹی رہتی ہیں، چپٹی رہتی ہیں۔ گالیاں سنتی ہیں۔ اپنے گھر والوں سے... جوتے کھاتی ہیں۔ سب کچھ پتا ہوتا ہے ان کو پھر بھی ذلیل ہو کر پڑی رہتی ہیں گھر میں... میں نے ایک ایسی عورت کو بھی دیکھا ہے جو فجر کی اذانوں تک اپنے خصم کے انتظار میں بیٹھی رہتی تھی۔ وہ مجرا دیکھ کر آتا تھا اور آتے ساتھ ہی گالی گلوچ شروع کر دیتا تھا۔ کبھی کبھی اسے جوتا بھی دے مارتا تھا اور پھر اسی سے کہتا تھا کہ جوتا پکڑ کر لاؤ تاکہ مزید پٹائی کر سکوں۔ اور یہ کوئی ایک مثال نہیں ہے۔ گھروں کے گھر بھرے پڑے ہیں ایسی چڑیلیں زنانیوں سے۔"

پریم چوپڑا اپنا زخمی کندھا دباتے ہوئے بولا۔ "تو بائی جی! تم چاہتی ہو کہ خصم اگر کہیں مجرا وغیرہ دیکھنے چلا جائے تو عورت طلاق لے لے اس سے؟"

"نہیں... میں یہ کہہ رہی ہوں کہ جو خصم پکے تماش بین اور طوائف باز بن جائیں، ان کی عورتوں کو لات مار دینی چاہیے ان کی تشریف پر۔ کہیں اور گھر بسا لینا چاہیے۔ وہ بھی سکھی ہو جائیں گی، ہمارا کاروبار بھی چمکے گا۔ اب دیکھو، ستی ساوتری کو۔ کیسا نچڑے لیموں کی طرح منہ ہو گیا ہے اس کا۔ پر بھی یہ پھر رہی ہے پتی دیو کے پیچھے۔ اور ایک وہ کہ طوائف کے ساتھ گھر بسانے کے لیے بھی تیار ہے۔ مہینے کے لیے تو طوائف زادی کا گھر والا بن ہی گیا تھا وہ۔"

"وہ کس طرح؟" پریم چوپڑا نے پوچھا۔

شاربہ بائی نے نشیلے انداز میں سب کچھ بتایا... اور ہمارے گوش گزار کر دیا۔ ڈی ہیروئن کے ساتھ یوسف ایک رنگین رات گزارنا، پھر مزید راتوں کی خواہش ظاہر، پھر چھ مہینے کے لیے ایک پیکیج ڈیل کرنا... اور آئندہ کے بھی نیت و ارادہ رکھنا۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے ثروت کو کانٹا چبھا کر اسے راحت مل رہی ہے۔ میں سناٹے میں تھا۔ جو بھی تھا، میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یوسف کا کچا چٹھا اس طرح ثروت کے سامنے کھلے اور وہ بھی ایسے تضحیک آمیز انداز میں۔

پریم چوپڑا کے ایک سانولے ساتھی نے پوری بے حسی سے انڈین وسکی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں جی! کچ بات پوچھو تو اپن کو تو وہ لمبی ناک والا چھوکرا ایسا نہیں لگا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے جب ہم نے گوبند سنگھ کو ٹھکایا تو وہ بالکل چھوکریوں کی طرح تھر تھر کانپنے لگ گیا تھا۔"

ایک دم جیسے شاربہ بائی کو کچھ یاد آیا۔ وہ مخمور لہجے میں بولی۔ "ٹھہرو، میں تم کو اس کا پکا ثبوت بھی دیتی ہوں۔ ایک منٹ ٹھہرو۔"

وہ گھوم کر اندرونی کمرے کی طرف گئی۔ اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ بتاتی تھی کہ وہ واقعی نشے میں ہے۔ اس کا چربیلا جسم اس کے چست لباس میں سے چھلکا پڑ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ اپنا شولڈر بیگ تھامے واپس آ گئی۔ اس بیگ سے اس نے ایک چھوٹا سا ڈیجیٹل کیمرا نکالا۔ ایک دو منٹ تک کیمرے سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہی۔ اس میں موجود تصویروں میں سے کوئی تصویر چھانٹ رہی تھی۔ آخر اس کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ کیمرے کی اسکرین کا رخ ہماری طرف کرتے ہوئے بولی۔ "تو یہ دیکھو۔ یہ تصویر تو جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

میں نے دیکھا۔ یہ یوسف ہی کی تصویر تھی۔ یہ کوئی ایسی ویسی تصویر نہیں تھی۔ پھر بھی یہ بات ثابت کرتی تھی کہ یوسف رنگ رلیوں کی غرض سے شاربہ بائی کے پاس جاتا ہے۔ اس تصویر میں یوسف کا ہمراز دوست فلم ایڈیٹر وسیم بھی نظر آ رہا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں نشہ تھا۔ ورسائٹ پر جن کی بوتل بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ پس منظر میں ایک دو نیم عریاں لڑکیوں کے دھندلے سے پوز تھے۔ یوسف بڑے نوٹوں کی ایک گڈی شاربہ کے "دست مبارک" میں تھما رہا تھا۔

ثروت نے بھی تصویر دیکھی۔ پھر ایک اور تصویر سامنے آئی۔ یوسف صوفے پر تھا اور رقاصہ اس سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ یوسف نے شاربہ کو نیلے نوٹوں کی جو گڈی دی تھی، وہ صوفے کی تپائی پر پڑی تھی۔

شاربہ گھاگ نائکہ کے انداز میں بولی۔ "یہ نوٹ اس عیاش نے مجھے یتیم مسکین لڑکیوں کی شادی کے لیے نہیں دیے تھے... خود دولہا بننے کے لیے دیے تھے۔ ایک رات کا دولہا..."

ہمیں دکھانے کے بعد شاربہ بائی نے یہ تصویر پریم چوپڑا اور اس کے ساتھی کو بھی دکھائی۔ وہ شاید ابھی کچھ دیر تک مزید، ثروت کو کچوکے لگاتی لیکن اسی دوران میں ایک مائکل بردار تیزی سے اندر آیا اور شاربہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "بائی جی! لونڈیا ہوش میں آ گئی ہے۔ بھیا صاحب کہہ رہے ہیں کہ آ کر دیکھ لو۔"

شاربہ نے ایک نگاہ غلط انداز ثروت پر ڈالی اور ایک بار پھر اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی۔

کارندے کی بات چونکا دینے والی تھی۔ غالباً اس نے نوخیز رجنی کا ذکر کیا تھا۔ اور اب یہ گھاگ نائکہ نہ جانے کس مقصد سے رجنی کو تاکنے کے لیے گئی تھی۔ شاید وہ یہاں اس گاؤں میں آئی ہی اس کام کے لیے تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ آج کل یہ بدقماش عورت جاوا کے ساتھ منسلک ہو کر یہاں پہنچی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ گھوم رہی ہے۔

ثروت نے اپنی پیشانی اپنے اٹھے ہوئے گھٹنوں پر ٹکا دی تھی اور... چہرہ چھپا لیا تھا، یقیناً اس کا چہرہ رنج و الم کی تصویر تھا۔ چوپڑا اور اس کے دونوں ساتھی بھی کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئے تھے۔ میں نے نرمی سے ثروت کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "ثروت! ان لوگوں کی باتوں پر نہ جاؤ۔ یہ بڑھا چڑھا کر بتا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یوسف کہیں ایک آدھ بار اس فاحشہ عورت سے ملا ہو۔ ملنے کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ اس عورت کی نیت کی خرابی اس بات سے ظاہر ہے کہ اس نے یوسف کی تصویریں اتاری ہوئی ہیں۔"

وہ خاموش آنسو بہاتی رہی۔ کچھ دیر بعد اس کی گمبھیر آواز ابھری اور میرے کانوں تک پہنچی۔ "...تابش! مجھے آپ کے دوست جگت سنگھ نے بھی کچھ باتیں بتائی تھیں لیکن اس وقت میں نے یقین نہیں کیا تھا۔"

جگت سنگھ کی صورت میری نظروں میں گھومی اور میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے اسے سختی سے منع بھی کیا تھا کہ وہ ثروت سے ایسی کوئی بات نہیں کہے گا لیکن اس نے اپنی مرضی کی تھی۔

"کیا کہا تھا جگت نے؟"

"وہی سب کچھ جو ابھی اس عورت نے بتایا ہے... اور جو شاید... آپ بھی جانتے ہیں۔ مجھ سے چھپاتے رہے ہیں۔ یوسف اب کسی بہت خوب صورت بازاری عورت کے چکر میں ہیں۔ اور اسی چکر کی وجہ سے یہ یہاں تک پہنچے، اس مصیبت میں بھی پھنسے ہیں۔" وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ اس کا پورا جسم دہل رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں؟ اسے کس طرح دلاسا دوں؟

وہ عجیب رات تھی۔ دکھ درد اور ناخوشگوار واقعات سے بھری ہوئی۔ کسی کمرے سے جاوا کے گونج دار قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ کسی وقت ان قہقہوں میں چودھری انور اور شاربہ بائی کی مدھم ہنسی بھی شامل ہو جاتی تھی۔ پھر میں نے ایک بہاری لڑکی کو دیکھا۔ عام بہاری لڑکیوں کی نسبت وہ خاصی خوش شکل تھی۔ اس کے پاؤں میں گھنگھرو چھن چھن کر رہے تھے۔ شاربہ بائی اس لڑکی کو لے کر جاوا اور چودھری انور والے کمرے میں چلی گئی۔

"کہاں کا مال ہے بائی؟" جاوا کی بہکی آواز آئی۔

"مال تو یہیں کا ہے جی۔" شاربہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "پاکستان، ہندوستان بنا تو یہ مشرقی پاکستان چلا گیا۔ مشرقی پاکستان بنگلا دیش بنا تو یہ پاکستان آ گیا۔ پاکستان سے یہ پھر آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ آپ کی خدمت کے لیے۔"

جاوا نے بلند آواز میں کہا۔ "مجھے کوئی خدمت شدمت نہیں کرانی۔ لیکن یہ اپنا چودھری انور شہری کڑیوں کا شوقین ہے۔ اس کی رات ضائع نہیں جانی چاہیے۔" کچھ دیر بعد ٹیپ ریکارڈر پر گانا گونجنے لگا۔ ہائے ہائے یہ مجبوری... یہ موسم اور یہ دوری... بہاری لڑکی اس گانے پر رقص کر رہی تھی اور گھنگھروؤں کی چھن چھن دور تک پھیل رہی تھی۔ یقیناً اڑوس پڑوس کے لوگ بھی سب کچھ سن رہے ہوں گے اور جان رہے ہوں گے مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔ جاوا کی سفاکیت حیران کن تھی۔ اس چار دیواری میں کم از کم تین لاشیں موجود تھیں۔ تین جیتے جاگتے انسانوں کو قتل کیا گیا تھا اور جاوا رقص و سرود کی محفل سجائے بیٹھا تھا۔ یہ ایک طرح سے طمانچہ بھی تھا گاؤں والوں کے چہروں پر۔ ان میں کئی چھوٹے خان زمیندار، چودھری اور چودھری زادے موجود تھے۔

انہوں نے اپنے کان اور آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

مجھے رہ رہ کر جگت سنگھ کا خیال بھی آ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ گاؤں میں موجود نہیں تھا۔ اگر وہ ہوتا تو شاید وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا تھا۔ کم از کم شدید قسم کی مزاحمت تو ضرور ہوتی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کب واپس آنا ہے اور آنے کے بعد اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہاں دو بہت بڑے صدمے موجود تھے۔ اس کی محبوبہ آشا کور قتل ہو چکی تھی اور اس کا ماں جایا بھائی گوبندر بھی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔

☆☆☆

وہ رات جیسے تیسے گزر گئی۔ اگلے روز نو بجے کے لگ بھگ ہمیں کمرے میں ہی ناشتا دیا گیا۔ غالباً نمبردار کے گھر سے پراٹھے، حلوہ اور انڈے وغیرہ آئے تھے۔ ثروت نے ناشتے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میری نگاہوں میں بھی آشا اور گوبندر کی خونچکاں لاشیں گھوم رہی تھیں۔ اس ناشتے میں دودھ جلیبی دیکھ کر آشا کی ناگہانی موت کا دکھ اور بڑھ گیا۔ میں نے بھی ناشتے کو ہاتھ نہیں لگایا۔

دس بجے کے لگ بھگ میری اور جاوا کی ایک ملاقات اور ہوئی۔ یہ ملاقات جاوا کے کمرے میں ہوئی۔ ثروت کو مجبوراً وہیں سلاخ دار کھڑکی والے کمرے میں رہنا پڑا۔ یوسف اسی چار دیواری میں تھا لیکن مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مجھے لگا کہ جاوا دوٹوک بات کرنے کے موڈ میں ہے۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے پوچھا۔ ”تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟“

”میں عمران سے بات کر کے ہی کچھ بتا سکوں گا۔“

”اور عمران سے بات تم کر سکتے ہو۔ لیکن یہ بات تمہیں ابھی کرنا پڑے گی۔“

”مجھے منظور ہے۔“

جاوا نے اپنے ایک کارندے کو آواز دی کہ وہ میرا موبائل فون لے کر آئے... یہ موبائل فون کچھ دیگر چیزوں سمیت میری تلاشی کے بعد قبضے میں لے لیا گیا تھا۔ یہ دراصل شکاری اجو والا فون ہی تھا... میں نے تین چار بار عمران سے رابطے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ پہلے کسی طرح عمران خود مجھ سے رابطہ کرے۔

میں نے کہا۔ ”جاوا صاحب! میں تمہیں حتمی بات تو عمران سے ڈسکس کرنے کے بعد ہی بتا سکوں گا لیکن اس سلسلے میں ایک دو شرطیں میری بھی ہیں۔“

”شرطوں کی اتنی زیادہ گنجائش تو نہیں ہے لیکن چلو تم بتاؤ۔“

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”اگر یہ ڈیل آگے بڑھتی ہے تو اس کے لیے میری سب سے پہلی اور اہم شرط یوسف کے حوالے سے ہوگی۔ آپ کو یوسف کو چھوڑنا پڑے گا اور اسے اس کی بیوی سمیت حفاظت سے پاکستان واپس پہنچانا ہوگا۔“

وہ دھیان سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہندی پرانی فلموں جیسے عاشق لگتے ہو تم۔ [illegible] تمہیں۔ محبوبہ کا پتی سورگ باشی ہونے جا رہا ہے اور تم بچانے اور یہاں سے نکالنے کی باتیں کر رہے ہو؟“

”میں مذاق نہیں کر رہا جاوا صاحب! میری پہلی شرط ہی یہ ہے کہ یوسف کو چھوڑنا ہوگا اور میاں بیوی کو اپنی [illegible] کے ساتھ پاکستانی علاقے میں واپس پہنچانا ہوگا۔“

”میرے بچے! یہ تو کافی مشکل کام بتا رہے ہو تم۔ سردار اوتار سنگھ تو اچھل اچھل کر چھت کو لگے گا۔ اس کو بڑی مشکل سے ایسا گولڈن چانس ملا ہے اور اس کے لیے روکڑا بھی خرچ کیا ہے اس نے۔ وہ نہیں ماننے کا اس لیے۔ نہیں چھوڑنے کا چھوکرے کو۔“

”تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکے گا جاوا صاحب! سارا کام بگڑے گا۔ آپ ہماری جان تو شاید لے لیں لیکن کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔“

”دوسری شرط کیا ہے میرے بالکے؟“

”رجنی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس پر پہلے ہی بہت ظلم ہو گیا ہے۔ اس کے منگیتر کو مار دیا ہے آپ لوگوں نے۔“

”چلو یہ رجنی والی شرط تو ہو جائے گی۔ حالانکہ شارا بائی کو لڑکی پسند آگئی ہے۔ وہ اپنے ایک خاص گاہک کے لیے انڈیا کے مختلف حصوں سے پانچ چھ بڑے تیکھے ”پیس“ پسند کر رہی ہے۔ کوئی بات نہیں۔ اسے کوئی پنجابن مٹیار پسند کرا دیں گے۔ یہ سندر ناری کو ”مٹیار“ کہتے ہیں نا پنجابی بھاشا میں؟“

میں نے سرد مہری سے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور بولو؟“

”میرے اور عمران کے بارے میں آپ کہہ چکے ہو کہ اس کھیل میں حصہ لینے کے بعد ہم حفاظت سے پاکستان پہنچ سکیں گے۔“

”بالکل ایسا ہی ہوگا۔“ جاوا نے کہا اور اپنی انگلی سے اپنی زبان کو چھوا۔ ”یہ ممبئی کا سب سے مہنگا اور بھروسے دار اسٹامپ پیپر ہے بچے۔“

”یہ کھیل کب اور کہاں ہونا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ممبئی میں۔ اس کی فائنل ڈیٹ تو نہیں آئی لیکن اندازہ ہے کہ چند دن کے اندر ہی ہوگا۔“

”آپ اپنے پرانے حریف ریان ولیم کی بات بھی کر رہے ہو... کیا وہ بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے؟“

”وہ خبیث اس معاملے میں دلچسپی کیوں نہیں لے گا جس میں 100 ملین ڈالرز کا سرکل چلنا ہے۔ مجھے وشواس ہے وہ بھی عمران کو اس کھیل پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا بلکہ ہو سکتا ہے کہ اپنی کوشش میں سپل (کامیاب) بھی ہو چکا ہو۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے، تمہیں عمران کو یہاں لانا ہے اور اس کو اس کھیل کے لیے تیار کرنا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ کوئی بھی ہوش مند بندہ کسی ایسے تماشے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ عمران بھی نہیں ہوگا۔ ہاں... اگر تم کہو تو میں خود کو اس بازی کے لیے پیش کر سکتا ہوں...؟“

قریباً یہی وقت تھا جب اس سیل فون کی بیل ہونے لگی جس پر عمران کی کال آتی تھی۔ میں نے اسکرین پر نظر دوڑائی۔ یہ عمران ہی تھا۔ میں نے کہا۔ ”جاوا صاحب! عمران کی کال ہے۔ میں اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور، تم شانتی سے بات کرو۔ ہر اونچ نیچ اسے سمجھا دو۔ خاص طور پر اپنی شادی شدہ محبوبہ کے بارے میں۔“

وہ باہر چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر کے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے عمران کی توانا آواز ابھری۔ وہ سنجیدہ موڈ میں تھا۔ ”کیا حال ہے؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”حال بالکل ٹھیک نہیں ہے...“

وہ جلدی سے بولا۔ ”گھبراؤ نہ... اب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہاری مدد کے لیے ڈاکٹر رتن اور شہباز احمد کل کسی وقت ایمبولینس لے کر گاؤں میں پہنچ جائیں گے... وہ سب سنبھال لیں گے...“

”نہیں عمران۔“ میں نے مدھم آواز میں کہا۔ ”اب ان کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اگر انہیں کہہ دیا ہے تو فوراً منع کر دو۔ یہاں معاملہ بہت خراب ہو چکا ہے۔“

”کیا ہوا؟“ وہ چونک گیا۔

”وہی جس کا اندیشہ تم نے ظاہر کیا تھا۔ جاوا اور اس کے ساتھی اسی علاقے میں موجود تھے اور ہمیں ڈھونڈ رہے تھے... انہوں نے ہمیں ڈھونڈ لیا ہے عمران۔ ہمارے میزبانوں میں سے آشا کور اور گوبندر مارے جا چکے ہیں۔ ہم جاوا کے پاس ہیں۔ پورے گھر میں جاوا کے رائفل بردار دندنا رہے ہیں۔“

”او مائی گاڈ!“

میں نے کہا۔ ”جگت سنگھ ابھی ان کے ہاتھ نہیں آیا۔ وہ گاؤں میں نہیں ہے اور بہتر ہے کہ نہ ہی آئے ورنہ یہ لوگ اسے بھی دھر لیں گے۔ گاؤں میں جاوا کی اتنی دہشت ہے کہ کوئی اونچی آواز میں بولتا بھی نہیں۔ ہر طرف سناٹا ہے۔ یہ بدبخت اپنی من مرضی کر رہے ہیں۔“

”ثروت تو خیریت سے ہے؟“

”ہاں لیکن آئندہ کیا ہوگا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ اسے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں اور اس کی جان بخشی کے لیے کچھ کڑی شرطیں رکھ رہے ہیں۔“

”دیکھو تابش! میں اس کتے جاوا کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بڑا بے رحم گینگ ہے۔ تم نے کسی طرح کی مزاحمت نہیں کرنی۔ کوئی رسک نہیں لینا۔ مجھے پوری تفصیل بتاؤ۔ یہاں کیا ہوا ہے؟“

اگلے پانچ دس منٹ میں، میں نے تقریباً سب کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح یوسف کی شکل سے دھوکا کھا کر ایک مقامی مخبر نے پولیس کو بتایا کہ گاؤں میں مفرور اشوکا سنگھ موجود ہے اور کس طرح پولیس والے کی اطلاع پر جاوا ہم تک آ پہنچا۔ پوری روداد سننے کے بعد اور یہ جاننے کے بعد کہ آشا کو بہیمانہ طریقے سے قتل کیا گیا، عمران کا لب ولہجہ کچھ اور گمبھیر ہو گیا۔ وہ ثروت کے حوالے سے بہت فکرمندی محسوس کر رہا تھا۔

وہ بولا۔ ”تم نے ابھی کچھ شرطوں کی بات کی ہے۔ کیا کہہ رہا ہے جاوا؟“

”وہ جوئے کی ایک بڑی بازی کی بات کر رہا ہے عمران! اس کے مطابق یہ بازی ممبئی کے ایک بڑے جوا خانے میں کھیلی جائے گی جہاں دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے کھلاڑی بھی حصہ لیں گے۔“

”او میں سمجھ گیا۔ تم ”سیلف شوٹنگ“ کی بات کر رہے ہو۔ اس کا ایک مقابلہ ممبئی میں کسی جگہ ہونے والا ہے۔ بہت بڑی بڑی رقمیں داؤ پر لگائی جانے والی ہیں۔ لیکن یہ کھیل نہیں ہے۔ یہ تو سیدھی سیدھی قتل و غارت ہے یار! کھیل تو وہ ہوتا ہے جس میں کھلاڑی اپنی مرضی سے حصہ لیتے ہیں۔ کھیل میں خطرہ اور تھرل ہوتا ہے لیکن سیدھی سیدھی موت تو نہیں ہوتی۔ یہ تو دیوانہ پن ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں لوگ اپنی مرضی سے حصہ لیں گے۔ اس میں ان کی مجبوریوں کو خریدا جائے گا۔“

”تمہیں کیسے پتا ہے اس مقابلے کے بارے میں؟“

”ریان ولیم نے دو تین دن پہلے بات کی ہے۔ وہ بھی

س کو خودکشی پر مجبور ہی بتا رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی چاہ رہا تھا کہ کوئی اس کی طرف سے اس ایونٹ میں حصہ لے۔ وہ باتوں باتوں میں مجھے ٹٹول رہا تھا کہ کیا میں یا میرا کوئی ساتھی اس کھیل میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کام میں تو وہی دلچسپی لے گا جس کی ٹانگ سے بم باندھ کر اسے کھیلنے پر مجبور کیا جا رہا ہو یا وہ ویسے ہی خودکشی کا ارادہ کر چکا ہو۔ جاوا نے یہ بات کس حوالے سے کی ہے؟ کہیں وہ...."

"ہاں عمران! اس نے ثروت کی زندگی کی قیمت یہی بتائی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اس کی طرف سے چار چھ یا پانچ چھ والا کھیل کھیلو۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ میں نے کہا۔ "عمران! میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ وہ تمہاری جگہ مجھے قبول کر لے لیکن وہ نہیں مانتا۔ میرے بس میں کچھ نہیں ہے عمران۔ کچھ بھی نہیں۔ میں نے تمہیں پورے حالات بھی بتا دیے ہیں۔ اب تم خود فیصلہ کر لو کہ کیا کرنا ہے۔ میں لڑتے مرنے کے لیے بھی پوری طرح تیار ہوں اور تمہیں سچ بتاتا ہوں عمران! اگر ثروت کی زندگی کا خیال نہ ہوتا تو اب تک میں جو بھی کر سکتا تھا، کر چکا ہوتا۔"

"یعنی وہ تمہیں اور ثروت کو چھوڑنے کے بدلے میں یہ چاہتا ہے کہ میں اس کی طرف سے یہ بازی لگاؤں؟"

"ہاں عمران! بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی تمہاری "لک" پر بہت بھروسا کر رہا ہے۔ لیکن میں تمہاری بات سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ یہ قسمت آزمائی نہیں، خودکشی ہے۔ چیمبر میں چار گولیاں رکھ کر دو دفعہ فائر کرنا یا پانچ گولیاں رکھ کر ایک دفعہ۔ اس مسئلے کا کوئی اور حل نکلنا چاہیے عمران۔"

دوسری طرف کئی سیکنڈ تک خاموشی رہی۔ پھر عمران کی آواز آئی۔ "حل اتنی دور بیٹھ کر نہیں نکل سکتا تابی.... میں آ رہا ہوں تمہارے پاس۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر۔"

"لیکن عمران...."

"باقی باتیں وہاں پہنچ کر ہوں گی۔ میں پہلے تم سے فون پر ہی رابطہ کروں گا۔ تمہیں یہ فون آن رکھنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"تم اس وقت ہو کہاں؟"

"لنگری پورہ گاؤں میں ہی ہیں۔ گوبندر کے سسرالی گھر میں۔ یہ کافی بڑا گھر ہے۔ سامنے کی طرف برآمدہ ہے...."

میری بات کو بریک لگ گئے۔ باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور پریم چوپڑا کی گرج دار آواز آئی۔ "ہاں بھئی، تمہاری بات ختم ہوئی یا نہیں؟"

مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ لوگ اندر ہونے والی گفتگو سنیں گے تاکہ میں کوئی فالتو بات نہ کر سکوں۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے عمران! ہم پھر بات کریں گے۔ میرا فون آن ہے، اوکے.... خدا حافظ۔"

دس پندرہ منٹ بعد جاوا اپنے پورے کروفر کے ساتھ پھر آ دھمکا۔ وہ واقعی ایک ہیبت ناک شخص تھا۔ اس کی موجودگی جیسے اردگرد کی ہر جاندار شے کو سہما دیتی تھی۔ اس کے جسم سے ایک حیوانی سی بو پھوٹتی رہتی تھی۔

میں نے جاوا کو یہی بتایا کہ عمران نیم رضامند ہے۔ ایک ڈیڑھ روز میں یہاں پہنچ رہا ہے۔ وہ فون پر بات کرے گا۔ براہِ راست ملاقات سے پہلے اسے ایک دو یقین دہانیاں چاہیے ہوں گی۔

جاوا بولا۔ "بچے! ایک بار کہہ دیا ہے نا کہ اس [illegible] سے بڑی یقین دہانی پورے مہاراشٹر اور پورے انڈیا میں کوئی نہیں۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "جاوا صاحب! ثروت اور یوسف کو کب چھوڑو گے؟"

"نہیں بچہ جی! ابھی تو اس چھوکری کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ وہ تو کھیل پورا ہونے کے بعد ہی چھوٹے گی۔ ہاں لونڈے یوسف کی بات پر غور کیا جا سکتا تھا لیکن اس میں بھی زبردست قسم کا لفڑا ہے۔ سردار اوتار کی دُم پر بڑے زور کا پاؤں آئے گا۔ وہ بھی نہیں مانے گا۔ اس کے ساتھ [illegible] سال کا یارانہ بھاڑ میں چلا جائے گا۔"

"جاوا صاحب! آپ یہ کہہ رہے ہو کہ یوسف کو خدانخواستہ اشوکا سنگھ کی جگہ مرنا پڑے گا۔"

"خدانخواستہ کہہ لو یا بھگوان نہ کرے کہہ لو۔ لیکن بات تو کچھ ایسی ہی ہے بچے۔"

"تو پھر یہ ڈیل نہیں ہو سکے گی۔ تم ہماری جان لینا چاہتے ہو تو لے لو.... بلکہ ابھی مار دو ہم سب کو۔" میں نے دو ٹوک حتمی لہجے میں کہا۔

میرے لہجے نے جاوا کو ذرا چونکایا۔ اس نے [illegible] نظروں سے مجھے گھورا۔ "جاوا کی دی ہوئی موت اتنی [illegible] نہیں ہوتی بچہ جی! اس کی تمنا نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ بہرحال میں اس بارے میں سردار اوتار سے بات کر کے دیکھوں گا۔ وچن کوئی نہیں دیتا اور نہ ہی دے سکتا ہوں۔ ہاں اگر تم چاہو تو تمہیں ابھی رہا کرنے کو تیار ہوں۔ کہو تو تمہیں پاکستان [illegible] پارسل کیا جا سکتا ہے تاکہ تم ہیرو کو جلد از جلد یہاں [illegible]

تمہارے علاوہ اس چھوکری رجنی کو بھی ابھی چھوڑا جا سکتا ہے۔ بتاؤ پروگرام بن رہا ہوتے کا؟"

"نہیں، میں ثروت اور یوسف کو یہاں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

"اوئے بلونگڑے! یوسف کا تو تو بس یونہی نام لے رہا ہے۔ تیرا اصل مسئلہ تو وہ چھوکری ثروت ہے۔ مجھے پتا ہے، ہندی فلموں والا کلاسیکل عاشق ہے تو۔ وہ مکیش کا گانا کیا تھا، جس کی دھن اپنے چاچا شنکر جے کشن نے بنائی تھی۔ جینا یہاں، مرنا یہاں اس کے سوا جانا کہاں۔ میرے چندا! تو بھی اس چھوکری کے سوا کہیں نہیں جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی مرے گا اور اس کے ساتھ ہی قبر میں لیٹنا پسند فرمائے گا۔ میں تاڑ گیا ہوں تیری آنکھوں میں دیکھ کر۔ چھوٹا موٹا ڈپلوما نہیں ہے تیرے پاس، پوری پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے تو نے عاشقی میں۔"

"جو بھی آپ سمجھ لو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں یہاں سے نہیں جاؤں گا... تم چھوڑ سکتے ہو تو ان دونوں کو چھوڑ دو۔"

"یہ تو ہو نہیں سکتا... ہاں رجنی کے بارے میں میری آفر اب بھی برقرار ہے۔"

میں نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "کب چھوڑو گے اسے؟"

"کہو تو ابھی چھوڑ دیتا ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جہاں من چاہے، چلی جائے گی اور ہمارے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دے گی۔ وہ اس گاؤں کے جس گھر میں چاہے، جا سکتی ہے۔ تمہیں اس کی طرف سے ضمانت دینا ہوگی کہ وہ گاؤں سے باہر نہیں جائے گی اور نہ اپنی زبان کھولے گی۔"

... اس روز سہ پہر کے بعد جاوا نے وعدے کے مطابق رجنی کو چھوڑ دیا۔ وہ اس خطرناک چار دیواری سے نکل کر گاؤں میں ہی اپنے ایک ماموں کے گھر چلی گئی۔ میں نے بڑے پُرزور طریقے سے اسے اور اس کے ماموں کو زبان بندی کی ہدایت کر دی۔ آشا کور کی ہلاکت کا تو رجنی کو علم ہو چکا تھا، میں نے گوبندر کی ہلاکت کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔ اسی رات جاوا گروپ کے افراد نے آشا کور، گوبندر اور مخبر روبیل سنگھ کی لاشیں ایک بند گاڑی میں ڈالیں اور کسی نامعلوم جگہ غتربود کر دیں۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کام میں مقامی تھانے دار نے بھی جاوا کے کارندوں کی مدد کی۔ میرا یہ اندازہ بعد میں غلط ثابت ہوا۔ تین جیتے جاگتے انسانوں کو مار کر ان کا مدعا غائب کر دینا جاوا کے لیے ایسا ہی تھا جیسے تین مکھیوں کو مار دینا۔ اس رات جاوا نے مجھے فون کی ایک نئی سم بھی دی تاکہ میں عمران سے رابطہ بحال رکھ سکوں۔

شام کو ایک اور اہم شخص کی آمد اس چار دیواری میں ہوئی۔ یہ اونچے زنّار شملے والے سردار اوتار سنگھ تھا۔ اس کے شملے میں پہلے جیسا تناؤ اور لہراؤ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یقیناً سردار اوتار کی بیٹی ہی تھی۔ سردار اوتار سنگھ ترشو۔۔۔ علاقے کا سب سے باعزت شخص تھا اور وہ اپنی ہی بیٹی کے ہاتھوں بے طرح رسوا ہوا تھا۔ اس کی چودھراہٹ اور ... کے بے جا گھمنڈ نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ جاوا اور سردار اوتار سنگھ کے درمیان جو گفتگو ہو رہی تھی، اس کا کوئی فقرہ میرے کانوں تک بھی پہنچ رہا تھا۔ مجھے پتا چلا، نہال برادری کے لوگوں نے ایک بار پھر سردار اوتار کی ... پاکستان پہنچا دیا ہے... اور اب وہ ننکانہ صاحب میں ہے۔ سردار اوتار سنگھ جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا تھا۔ اس کی بےقراریاں عروج پر تھیں لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بیٹی ... ہاتھوں ہار چکا ہے۔

مجھے وہ خوب صورت لیکن بیمار بابو یاد آیا جس نے بستر مرگ پر ہوتے ہوئے بھی اپنی پوتی کی مدد کی تھی۔ اس نے اپنی پوتی کا یہ حق مانا تھا کہ وہ اپنی زندگی اپنی پسند کے مطابق گزارنے کے لیے آزاد ہے۔ وہ چلا گیا تھا لیکن جاتے جاتے اپنی پوتی کے راستے سیدھے کر گیا۔

جاوا نے شاید سردار اوتار سنگھ کے کندھے پر ہاتھ ... تھا، دھپ کی آواز آئی پھر جاوا بولا۔ "اب چھوڑ ... اوتارے! جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب یہ بڑے والا پیگ لے، دوسری باتوں کے بارے میں سوچ۔"

اس کے ساتھ ہی بوتل اور گلاس وغیرہ کی کھنک سنائی دی۔ جاوا، سردار اوتار کا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سردار اوتار کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ "... صاحب! اب تو من کرتا ہے کہ شراب کا تالاب ہو اور ... میں چھلانگ مار دوں۔ اس میں ڈبکی لگا کر نیچے چلا جاؤں۔ نہ کسی کی شکل دیکھوں، نہ کوئی آواز سنوں۔"

"اوئے تو چل میرے ساتھ ممبئی، وہاں یہ انتظام کر دیں گے۔ ساتھ تین چار فلمی پریاں بھی تیرے ... تالاب میں اتار دیں گے اور شراب بھی اصلی فرانسیسی ... سیدھی سورگ میں پہنچا دے گی تجھے۔"

"جاوا صاحب! سورگ نہ ہو لیکن یہ نرگ تو ... ہے کہ پورا شریر آگ میں جل رہا ہے۔"

"تو آگ پر یہ پانی ڈال نا یار! کہتا ہے تو تیرے ... کچھ چھن چھن کا انتظام بھی کر دیتے ہیں۔" جاوا کا اشارہ ...

... ان بھاری رقاصہ کی طرف تھا جو کل شاربہ بائی کے ساتھ ... آئی تھی اور رات کو چودھری انور کے پاس رہی تھی۔

... اسی کمرے میں تھا جہاں آج صبح بھی جاوا سے میری ... ہوئی تھی۔ ثروت اسی سوراخ دار کھڑکی والے کمرے میں ... مجھے یقین تھا کہ جاوا اپنی گارنٹی پر پورا عمل کرے گا اور ... بالکل خیریت سے رہے گی۔ کم از کم اس وقت تک جب ... ہدایت پر چلتے رہیں گے۔ جب سے شاربہ بائی نے ثروت کے سامنے یوسف کے پول کھولے تھے، وہ عجیب کیفیت میں تھی۔ بالکل گم صم تھی۔ آنکھوں کے کنارے گیلے رہتے تھے لیکن آنسو جیسے رکے ہوئے تھے۔

ثروت سے زیادہ فکر مجھے یوسف کی طرف سے تھی۔ یوسف بھی اسی چار دیواری میں موجود تھا، تاہم کل رات سے میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ اب سردار اوتار سنگھ بھی یہاں آن موجود ہوا تھا۔ سردار اوتار سنگھ یقیناً یوسف کے لیے یہاں آیا تھا۔ یوسف سرداروں کے لیے بہت اہم تھا۔ وہ اس کی بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے۔ یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی تھی کہ وہ اپنے مفرور بیٹے کی زندگی آسان کرنے کے لیے یوسف کی جان لینا چاہ رہے ہیں۔ ان کا ایک طریقہ ناکام ہو گیا تھا لیکن وہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کر سکتے تھے۔

یہ بڑے تناؤ والی صورتِ حال تھی۔ میں نے جاوا کو صاف بتا دیا تھا کہ وہ جو بھی ڈیل کرنا چاہتا ہے، اس میں یوسف کی جان بخشی پہلی شرط ہوگی۔ جو آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں، ان سے پتا چلتا تھا کہ سردار اوتار بلانوشی کر رہا ہے۔ جب وہ بالکل ٹن ہو گیا تو اس نے نہال برادری کے لوگوں کے لیے گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ وہ ان کی ماؤں بہنوں سے ناجائز و شرمناک رشتے جوڑ رہا تھا۔ پھر یہ رشتے جوڑتے جوڑتے ہی وہ شاید سو گیا۔ میں نے ایک کارندے کے ہاتھ جاوا کو پیغام بھیجا کہ میں ثروت کے لیے فکرمند ہوں۔ وہ اسے میرے پاس بھیج دے۔

چند منٹ بعد پریم چوپڑا اس کا جواب لے کر آیا۔ اس نے کہا۔ "تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ چھوکری اپنے اصلی پتی کے پاس بالکل خیریت سے ہے۔ ایک دم فسٹ کلاس۔ وڑی، تم اپنا مغز پلپلا مت کرو۔"

پریم چوپڑا نے جھوٹ بولا تھا۔ ثروت بالکل خیریت سے تھی لیکن یوسف کے کمرے میں نہیں تھی۔ اس کا ثبوت مجھے بعد میں ملا اور یہ خاصا حیران کرنے والا ثبوت تھا۔ ابھی رات کا جالا پھیلنا شروع نہیں ہوا تھا کہ شور سے میں جاگ اٹھا۔ "بھاگو، دوڑو" کی صدائیں آ رہی تھیں۔ پھر ایک فائر ہوا۔ پریم چوپڑا نے کسی کو للکارا۔ تب ایک دوسرے کارندے سورج کی آواز سنائی دی۔ "ادھر سے نکلا ہے۔ دور نہیں گیا ہوگا۔"

تب اوپر تلے دو فائر مزید ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ یہ جیپ بڑی تیزی سے کسی کے پیچھے گئی۔ پورے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ سب جاگ گئے تھے۔ ان میں جاوا اور سردار اوتار سنگھ بھی تھے۔ پھر جاوا کے گرجنے برسنے کی آواز آنے لگی۔ اس نے کسی کارندے کو زوردار تھپڑ رسید کیا اور گندی گالیاں دیں۔ کارندے نے لرزاں آواز میں کہا۔ "بھیا صاحب! میں بس ایک منٹ کے لیے اندر آیا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ چودھری انور صاحب آوازیں دے رہے تھے۔ بس اتنی دیر میں وہ نکل گیا۔"

جاوا نے کارندے کو ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ "ایک منٹ کم ہوتا ہے کتے کے بچے۔" وہ دہاڑا۔ "ایک منٹ میں انڈیا کے اندر تین درجن لوگوں کی ہتھیا ہوتی ہے... چار پانچ سو عزتیں لوٹی جاتی ہیں۔ تیرے جیسے بہت سے حرام خور ملازموں کو ان کے مالک زندہ جلا دیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آج تیرے پر بھی پیٹرول پھینکنا پڑے گا۔"

کارندہ دہشت زدہ آواز میں فریادیں کرنے لگا۔ دو تین منٹ بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ یوسف کسی طرح یہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ یہ حیرت ناک انکشاف تھا۔ گوبندر کی موت کے بعد سے یوسف کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بالکل سکتہ زدہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح کی کوشش کرے گا۔ اب تک دو افراد اس جگہ سے بھاگے تھے اور دونوں پکڑے گئے تھے۔ یعنی ثروت اور رجنی۔ اب یوسف کا پتا نہیں کیا انجام ہونا تھا۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ وہ بچ نکلے گا۔ یہاں کوئی بھی جاوا کے مطلوب شخص کو پناہ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پولیس بھی نہیں۔

سردار اوتار سنگھ سب سے زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ جاوا کے کارندوں کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے تین چار بندے بھی یوسف کے پیچھے بھگا دیے تھے۔ یوسف کے بھاگنے کی تفصیل مجھے کچھ دیر بعد پریم چوپڑا سے ہی معلوم ہوئی۔ اب صبح کے ساڑھے نو بجنے والے تھے۔ پریم چوپڑا ابھی ابھی جیپ پر کہیں سے واپس آیا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ گرد سے اٹا ہوا تھا۔ اس کی چڑھی ہوئی تیوریاں دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہ ناکام لوٹا ہے۔

میرے پوچھنے پر پہلے تو اس نے ناک بھوں چڑھائی پھر بتایا کہ وہ لیٹرین کی طرف سے نکلا ہے۔ سویرے

سو رہے دہائی دے رہا تھا کہ اسے مروڑ لگی ہے۔ نریندر اسے لیٹرین کی طرف لے کر گیا تھا۔

’’نریندر تو وہ کھڑا رہا ہو گا۔‘‘ میں نے تفصیل چاہی۔

’’وہ بس ذرا دیر کے لیے اندر گیا تھا۔ چودھری آوازیں دے رہا تھا۔ اسی دوران میں اس کتے نے دیوار پھلانگی اور باہر گلی میں کود گیا۔ لیکن جائے گا کہاں، چوہے کے، تی پکڑیں گے اور دم کی طرف سے کھینچتے ہوئے واپس لائیں گے۔‘‘

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یوسف ایسی جرأت کر چکا ہے۔ کبھی کبھی موت کا حد سے بڑھا ہوا خوف بھی انسان کو کچھ کر گزرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آگ کے ڈر سے لوگ بلند عمارتوں سے کود جاتے ہیں۔ اونچی سپاٹ دیواروں پر چڑھ جاتے ہیں۔ یوسف بھی شاید اسی طرح نریندر کی عقابی نظروں سے بچ نکلا تھا۔ یہ نریندر کوئی عام کارندہ نہیں تھا۔ پریم چوپڑا کے بعد جو دو تین کارندے زیادہ اہم تھے، یہ ان میں سے ایک تھا۔ سلاخ دار کھڑکی والے کمرے میں گوبند سنگھ کو اسی نے گولی سے اڑایا تھا۔ اس سے پہلے پرسوں رات مخبر روڈیل کو قتل کرنے کے لیے بھی جاوا نے اسی نریندر کے حوالے کیا تھا۔

میں دل ہی دل میں دعا گو ہو گیا کہ یوسف اس خونی گھیرے سے کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔

سارا دن عجیب سی کشمکش میں گزرا۔ موبائل فون میری مٹھی میں تھا اور میں مسلسل عمران کی کال کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن کال ابھی نہیں آئی تھی۔ شام کے کچھ ہی دیر بعد پریم چوپڑا جھلایا ہوا میرے پاس آیا۔ اس کے عقب میں دو خونخوار صورتوں والے رائفل بردار موجود تھے۔ ان لوگوں کی صورتیں ہی یہ بتا دیتی تھیں کہ درجنوں کے حساب سے قتل کر چکے ہیں۔ وہ جب دروازہ کھولتے تھے تو ان کی انگلیاں ٹریگر پر ہوتی تھیں اور وہ بڑی مہارت سے میرے اور اپنے درمیان ایک خاص فاصلہ برقرار رکھتے تھے۔ پریم چوپڑا بھی یقیناً اس طرح کی نقل و حرکت کا ماہر تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی میرے اور رائفل برداروں کے درمیان نہیں آتا تھا۔

پریم چوپڑا نے دروازہ کھلوایا اور چڑھی ہوئی تیوریوں سے بولا۔ ’’چلو، وہ تمہاری سکھی یاد کر رہی ہے تمہیں۔ بے چاری کی بھوک مری ہوئی ہے تمہارے بغیر۔‘‘

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ ثروت کی طرف ہے۔ یقیناً وہ یوسف کے جانے کے بعد اکیلی خوف کھا رہی تھی۔

وہ لوگ مجھے گن پوائنٹ پر اسی کمرے میں لے آئے جہاں سلاخ دار کھڑکی کا منظر حوالات کی سی جھلک دکھاتا تھا۔

اسی ’حوالات‘ میں گوبند کا افسوسناک قتل ہوا تھا۔ میں نے دیکھا، ثروت سکڑی سمٹی ایک گوشے میں بیٹھی تھی۔ اس نے چادر مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی جیسے یہ آخری سہارا ہو۔ ان شرابیوں، سفاک بدمعاشوں کے بیچ میں وہ اس نازک آبگینے کی طرح تھی جو پتھروں کی بارش میں رکھا ہو۔ آشا کور کی جان تو مر کر یہاں سے چھوٹ گئی۔ رجنی کو انہوں نے ویسے ہی آزاد کر دیا تھا۔ اب صرف ثروت یہاں موجود تھی۔

میں کمرے میں گیا تو چوپڑا نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اس نے طنزیہ لہجے میں سرگوشی کی۔ ’’اب کہیں [illegible] گی۔۔۔ ہاں پہرے دار کی نظر بچا کر چوما چاٹی کر سکتے ہو۔‘‘

میں نے بمشکل ضبط کیا۔ ثروت چوبیس گھنٹے میں ہی کئی دنوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔۔۔ اس کے رخسار زردی کھنڈی تھی۔ ہونٹوں کی پنکھڑیاں جیسے مرجھا کر [illegible] تبدیل کر چکی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب کیوں ہے۔ شاربہ بائی نے اس کے سامنے جو کچھ یوسف کے بارے میں بولا تھا، اس نے اسے اندر تک ہلا دیا تھا۔ وہ یوسف کی سب غلطیاں معاف کر کے اس کے ساتھ نئے سرے سے زندگی کے سفر کا آغاز کرنا چاہ رہی تھی مگر یہاں اس کو پتا چلا تھا کہ ’’وفا کا پتلا‘‘ تو نئی غلطیوں کا آغاز کر چکا ہے۔

میں ثروت سے دل جوئی کی باتیں کرنے لگا۔ میں نے دھیمی آواز میں اس سے پوچھا۔ ’’ابھی تک یوسف ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آیا۔ یہ اچھا شگون ہے۔‘‘ وہ خاموش رہی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو میں نے پوچھا۔ ’’کیا اس نے تمہیں تھوڑا بہت اشارہ دیا تھا کہ یہاں سے نکلنے کا ارادہ رکھتا ہے؟‘‘

’’مجھے کیا پتا؟‘‘ وہ بالکل سپاٹ لہجے میں بولی۔

’’وہ تمہارے ساتھ اسی کمرے میں تھا۔ تمہیں کچھ اندازہ نہیں ہوا؟‘‘

’’وہ میرے ساتھ نہیں تھا۔‘‘ ثروت نے مدھم آواز میں انکشاف کیا۔

’’کیا مطلب؟ پریم چوپڑا وغیرہ تو بتا رہے ہیں کہ رات کو تمہارے ساتھ یہاں تھا۔‘‘

’’جھوٹ بول رہے ہیں۔ انہیں ساتھ والے کمرے میں رکھا گیا تھا۔ میں رات کو یہاں اکیلی رہی ہوں۔‘‘

’’پھر انہوں نے جھوٹ کیوں بولا؟‘‘

’’انہوں نے اور بھی کئی جھوٹ بولے ہیں تابش! تمہیں کیا پتا ہے، کیا چاہتے ہیں یہ؟‘‘

’’میں سمجھا نہیں ثروت؟‘‘

ثروت نے ایک نظر کھڑکی سے باہر کھڑے پہرے دار پر ڈالی پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ’’یوسف خود یہاں سے نہیں نکلے تابش۔۔۔ ان لوگوں نے انہیں نکالا ہے۔‘‘

’’کیا کہہ رہی ہو؟‘‘

’’وہ کل رات ساتھ والے کمرے میں تھے۔ گیارہ بجے کے قریب وہ چوڑی ناک والا کمرے میں آیا تھا جسے چوپڑا کہتے ہیں۔ اس نے یوسف سے کچھ باتیں کی تھیں۔ دو چار باتیں میرے کانوں میں بھی پڑیں۔ چوپڑا یوسف کو یہاں سے نکالنے کا کہہ رہا تھا۔ اس نے یوسف سے کہا کہ وہ تیار رہے۔ تین چار گھنٹے میں اسے یہاں سے نکال لے جائے گا۔‘‘

’’یوسف نے جواب میں کیا کہا؟‘‘

’’وہ تیار ہو گئے تھے۔‘‘ وہ پژمردگی سے بولی۔

’’تو پھر یہ ڈراما کیوں رچایا گیا؟‘‘

’’میں کیا کہہ سکتی ہوں۔‘‘

اچانک میرے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹی۔ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی۔ جاوا اور سردار اوتار سنگھ میں یارانہ تھا۔ سردار اوتار کو ہر صورت میں یوسف درکار تھا جبکہ میں نے جاوا کو صاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر یوسف کو نہیں چھوڑا جائے گا تو پھر کوئی ڈیل بھی نہیں ہو سکے گی۔ یوں لگتا تھا کہ عیار جاوا نے اس مسئلے کا ایک درمیانی راستہ نکالا ہے۔ اس نے ظاہر کیا ہے کہ یوسف بھاگ نکلا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں۔

’’کیا سوچ رہے ہیں؟‘‘ ثروت نے پوچھا۔

میں نے اسے وہ سب کچھ بتایا جو سوچ رہا تھا۔ یوسف کے حوالے سے یہ ایک اچھی صورت حال تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ ثروت کو اس کی کوئی خاص خوشی نہیں ہے۔ شاید اسے اس بات کا بھی دکھ ہوا تھا کہ یوسف نے اپنی رہائی کے موقع پر اس کے بارے میں نہیں سوچا۔

ہم رائفلوں کی چھاؤں میں تھے۔ درجنوں نگاہیں ہمیں ہر وقت گھور رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ سردار اوتار سنگھ کے ساتھ جو ڈراما ہوا ہے، اس کا علم جاوا اور بس اس کے ایک دو قریبی ساتھیوں ہی کو ہے۔ سردار اوتار کا ’’غم‘‘ اور بڑھ گیا تھا لہٰذا ’’غم غلط کرنے کی رفتار‘‘ بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ سارا دن پیتا رہا اور کبھی کبھی بھڑکیں بھی لگاتا رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ بے چاری بہاری رقاصہ بھی اس کے ’’غم‘‘ کی زد میں آئی ہو۔ منی کے فرار کے بعد یہ دوسری آفت تھی جو اوتار پر ٹوٹی تھی۔

رات کا کھانا ہمیں کمرے میں ہی پہنچایا گیا۔ میرے اصرار پر ثروت نے آج چند لقمے لے لیے۔ اس نے میرے لیے بھی پلیٹ میں کھانا نکالا اور میرے سر پر آنے والی چوٹ کا حال بھی دریافت کیا۔ وہ یوسف کے بارے میں کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ نہ ہی اس نے یوسف کے متعلق شاربہ بائی کے انکشافات پر کوئی تبصرہ کیا تھا۔

رات تاریک اور نیم سرد تھی۔ نہ جانے کیوں ابھی تک عمران نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ شاید اسے انڈیا پہنچنے میں ذرا تاخیر ہوئی تھی۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ جاوا اپنی لگژری جیپ پر اپنے حفاظتی دستے کے ساتھ کہیں گیا ہوا تھا۔ سردار اوتار سنگھ بھی اس کے ساتھ تھا۔ تاہم چودھری انور اور چوپڑا وغیرہ یہیں تھے۔ ہمارے اردگرد رائفلوں کی گردش بھی اسی طرح تھی۔ کمرے میں رنگین پایوں والی بس ایک چارپائی تھی۔ میں نے ثروت سے کہا کہ وہ چارپائی پر لیٹ جائے لیکن وہ کسی صورت آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ’’بھئی، میں تکلف کے طور پر نہیں کہہ رہا۔ میں تو سوتا ہی نیچے ہوں۔‘‘

’’تو پھر میں بھی نیچے ہی لیٹ جاؤں گی۔‘‘ اس نے ایک طرف پڑی چٹائی کھول لی۔ اسے ایک کپڑے سے اچھی طرح صاف کیا۔ چٹائی لمبائی میں دس فٹ کے لگ بھگ تھی۔ ثروت نے اس کے ایک سرے پر اپنا اور دوسرے پر میرا تکیہ رکھ دیا۔ رنگین پایوں والی چارپائی خالی پڑی رہی۔

چوپڑا کہہ رہا تھا کہ کمرے کی بتی حسب معمول جلتی رہے گی لیکن پھر لائٹ چلی گئی۔ گھر میں تین چار لالٹینیں روشن ہو گئیں۔ ایک لالٹین کی مدھم روشنی سلاخ دار کھڑکی کے راستے ہمارے کمرے میں بھی آتی رہی۔ ہم اپنی اپنی جگہ خاموش لیٹے رہے۔ مختصر سے فاصلے بھی کبھی کتنے طویل ہوتے ہیں۔ ہم سیدھے لیٹے تھے۔ پتھریلے مجسموں کی طرح ساکت۔ بے روح اور بے تعلق۔ کچھ دیر بعد سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ثروت نے کروٹ بدلی ہے۔ اپنا رخ میری طرف کیا ہے۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ’’آپ نے مجھے ابھی تک اس کام کے بارے میں نہیں بتایا جو یہ لوگ آپ سے اور آپ کے دوست سے لینا چاہ رہے ہیں۔‘‘

’’ثروت! تم پہلے ہی بہت پریشان ہو۔ ان سوالوں میں خود کو نہ الجھاؤ۔ یہ ہمارا کام ہے، ہم کر لیں گے۔‘‘

’’لیکن یہ جاننا تو میرا حق ہے نا کہ آپ ہمارے لیے کتنی بڑی قربانی دینا چاہ رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہوا تو میں فرح اور عاطف کو کیا منہ دکھاؤں گی۔‘‘

''ایسا کچھ نہیں ہوگا ثروت! ہم اس معاملے کو اچھی طرح ہینڈل کرلیں گے۔ ہمیں اس کا تجربہ ہے۔''

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''تابش! آپ پہلے ہی بہت قانون شکنی کرچکے ہیں۔ کیا اب اور کریں گے؟ خود کو اور سزا کی دلدل میں دھنسائیں گے؟''

''یہ تو مقدر ہے ثروت اور مقدر سے کوئی نہیں بھاگ سکتا۔''

''لیکن یہ بھی تو کہتے ہیں کہ مقدر ہم خود بناتے ہیں۔''

''اب تو جو بننا تھا بن چکا ہے ثروت! اب اس کا اور کیا بگڑے گا۔''

''میرا بھی جو بننا تھا، بن چکا ہے تابش! اب میں وہ پہلے والی ثروت نہیں بن سکتی۔ آپ میرے لیے خود کو کانٹوں میں نہ گھسیٹیں۔''

''ایسی بات کیوں کرتی ہو۔ تمہارے سامنے ایک زندگی پڑی ہے۔ ایک صاف ستھری خوب صورت گھریلو زندگی۔''

''نہیں تابش! پلیز آپ میرے لیے خود کو مصیبت میں نہ ڈالیں۔ میں نے کل آپ کی باتیں بھی سنی ہیں... آپ پلیز مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں کہ میں دب کر مر جاؤں۔''

''میں نے کیا کیا ہے؟''

''میں نے سب سنا ہے۔ یہ بدمعاش جس کو آپ جادا کہتے ہیں، آپ کو چھوڑ رہا تھا۔ یہاں سے جانے کی اجازت دے رہا تھا لیکن آپ نے میرا نام لیا اور کہا کہ آپ مجھے یہاں چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ اگر آپ کو آزادی مل رہی تھی تو آپ نے کیوں نہ لی؟ کیا پتا کہ باہر نکل کر آپ ہمارے لیے کچھ بہتر کرسکتے...''

''بہتر کام کسی سے کسی بھی وقت ہوسکتا ہے ثروت! کیا پتا یوسف کے باہر جانے سے کوئی فائدہ ہوجائے۔''

اس نے مایوسی سے سر ہلایا لیکن بولی کچھ نہیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یوسف کے یوں خاموشی کے ساتھ چلے جانے سے اسے رنج ہوا ہے۔ وہ یوسف کے جانے کا موازنہ میرے نہ جانے سے کررہی تھی۔ اس موازنے سے اسے یوسف کا رویہ زیادہ بُری طرح کھٹک رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے ثروت کہ یوسف نے یہ پیشکش کچھ سوچ کر ہی قبول کی ہو۔ وہ سمجھ گیا ہو کہ یہ لوگ ابھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ وہ یہاں رہ کر کچھ نہیں کرسکتا تھا، اس نے باہر جاکر کوشش کرنے کا سوچا ہو۔''

''میں جانتی ہوں تابش! آپ مجھ سے باتیں چھپاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ یوسف کی باتوں پر بھی پردہ ڈالتے ہیں۔ جب لاہور میں یوسف اسپتال پہنچے تو آپ بھی وہاں کیسے پہنچ گئے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ سب کچھ اتفاقیہ نہیں تھا آپ شاید... پہلے سے یوسف کے آس پاس تھے۔ اگر ایسا تھا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یوسف کی مصروفیات کیا ہیں۔ یوسف کے چہرے پر شو ہونے والے جھوٹ کا بھی آپ کو پتا چل گیا ہوگا پھر بھی آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔''

''ثروت! میں نے کہا ہے نا، تم خود کو ان سوالوں میں جتنا الجھاؤ گی، اتنا ہی پریشان ہوگی۔ تم پہلے ہی کچھ کم پریشان نہیں ہو۔ یہاں آئینہ نہیں ہے ورنہ میں تمہیں صورت دیکھنے کا مشورہ دیتا۔ چہرہ ہلدی ہوگیا ہے۔ آنکھیں بجھی ہوئی ہیں۔ کیا حال بنایا ہوا ہے تم نے۔ تم تو مجھے توانائی دیتی ہو ثروت! تم سے مجھے آگے بڑھنے کی ہمت ملتی ہے۔ اگر تمہارا یہ حال ہوگا تو میں کیا کرسکوں گا۔''

آخری دو تین جملے میں نے بے ساختہ ہی کہہ ڈالے تھے۔

وہ جیسے چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ تمہیں کیا پتا تم میرے لیے کیا ہو ثروت! ہاں... میں سچ کہتا ہوں، میں تم سے توانائی پکڑتا ہوں۔ زندگی کی مصیبتیں جھیلنے کا حوصلہ پاتا ہوں۔ تم ہر ہر قدم پر میرے لیے ہمت اور ترنگ کا سرچشمہ ہو ثروت۔ اگر سرچشمے سوکھ جائیں تو بڑے بڑے دریا ریت کے ڈھیر بن جاتے ہیں، زندگیاں بنجر ہوجاتی ہیں...'' میری آواز بھرّا گئی۔

میں اس سے آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا۔ جذبات کے ریلے میں کچھ مزید بہہ جانا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ بھانڈیل اسٹیٹ میں، میں نے کیسے کیسے اسے یاد کیا ہے۔ کیسے کیسے تڑپا ہوں اس کے لیے۔ لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا۔ عشق کی آبرو خاموشی میں تھی۔ برداشت میں اور تسلیم رضا میں تھی۔ عشق ازل سے ''خود دار'' رہا ہے۔ ہاتھ پھیلا کر صلہ نہیں مانگتا، چپ رہ کر دل میں اترتا ہے، سب کچھ پا جاتا ہے یا سب کچھ کھو دیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں کامران ٹھہرتا ہے۔ میں نے پانچ برس پہلے ثروت کو بہت قریب آنے کے بعد کھویا تھا۔ آج وہ پھر میرے آس پاس تھی... شادی شدہ ہوکر بھی شادی شدہ نہیں تھی۔ اس کی اور میری زندگی کے راستے پھر سے ایک ہوسکتے تھے لیکن میں اس یکجائی کے لیے اپنی محبت کو لفظوں اور خواہشوں کے داغ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت نے مجھے اندر سے بڑا امیر چشم کردیا تھا۔ میں اپنے دل کو ٹٹولتا تھا تو لگتا تھا کہ میرے اندر ثروت کو پھر سے کھونے کا حوصلہ بھی موجود ہے۔

وہ خاموش لیٹی تھی۔ مجھے لگا کہ پھر یوسف کے بارے میں سوچ رہی ہے... میں نے کہا۔ ''ثروت! پریشان نہیں ہونا۔ یوسف جہاں بھی ہوگا، جادا کی حفاظت میں ہوگا۔ میں جادا سے اس کے متعلق ساری تفصیل معلوم کروں گا۔''

''وہ مجھ سے ملے بغیر کیوں چلے گئے؟ میں ان کی بیوی ہوں۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا کہ [illegible]''

''ثروت! کئی سوالوں کا جواب ہمارے پاس نہیں، وقت کے پاس ہوتا ہے۔ ہم خود کو خوامخواہ ہی سوچ سوچ کر ہلکان کرتے ہیں۔ بہرحال، اتنا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، وہ ہم سے کہیں زیادہ محفوظ ہے اور ہوسکتا ہے کہ اسے پاکستان ہی پہنچا دیا گیا ہو۔''

''مجھے نصرت کی بھی بہت فکر ہے تابش! وہ پہلے ہی اتنی بیمار ہے۔ کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہوسکتا کہ اس سے میری بات ہوسکے۔''

''میں اس بارے میں بھی کوشش کروں گا ثروت! مجھے امید ہے کہ جادا ہماری بہت سی باتیں مانے گا۔ تم بالکل بےفکر ہوجاؤ۔''

''جی۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس کی اس ''جی'' نے مجھے گئے وقتوں کی یاد دلادی۔ جب ہر چیز پر بہار تھی۔ ساری خوب صورتیاں جوان تھیں۔ میں جب اسے ''ثروت'' کہہ کر بلاتا تھا، وہ اتنے پیار سے ''جی'' کہتی تھی کہ میں آگے کی ساری بات ہی بھول جاتا تھا۔ میں اس سے کہا کرتا تھا۔ تم جان بوجھ کر ایسا کرتی ہو۔ عام باتوں کے جواب میں ''ہاں'' کہتی ہو لیکن جب تم تاڑ جاتی ہو کہ میں کوئی فرمائش کروں گا تو ''جی'' کہہ دیتی ہو۔ میری یادداشت کا فیوز اڑ جاتا ہے۔ وہ ہنس ہنس کر سرخ ہوجاتی تھی۔

میں یادوں کی کھڑکی میں جھانکتا رہا۔ وہ اسی طرح میری طرف کروٹ بدلے بدلے سو گئی۔ دلنشین آنکھوں پر پلکوں کی چلمن تھی۔ اغیار کے نرغے میں، رائفلوں کی چھاؤں میں گر وہ یوں سو رہی تھی تو یہ میرے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ یہ مجھ پر اس کے بے پناہ بھروسے کا خاموش اظہار تھا۔ اس نے خود اصرار کرکے مجھے یہاں اس کمرے میں بلوایا تھا اور جب میں آگیا تھا تو وہ اپنے اردگرد کے سارے حالات سے لاتعلق ہوکر دنیا و مافیہا سے بےخبر ہوگئی تھی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں، میں اس کا میٹھا چہرہ دیکھتا رہا۔ دل چاہا اس چہرے کو سینے میں چھپالوں۔ دنیا جہان کی رکاوٹوں اور آنتوں کو چیر کر نکلوں اور کسی ایسے بے آباد جزیرے میں جا بسوں جہاں میرے اور اس کے سوا اور کوئی نہ ہو۔

صبح نو بجے کے قریب جادا سے پھر میری ملاقات ہوئی۔ جب بھی مجھے جادا سے ملاقات کے لیے لے جایا جاتا تھا، میرے ہاتھ عقب میں ''ہینڈ کف'' سے جکڑ دیے جاتے تھے۔ یہ ملاقات اسی کمرے میں ہوئی جہاں اس سے پہلے ہوئی تھی۔ یہاں بڑے پلنگ پر جادا پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ الکحل کی بو، سگریٹ کا دھواں اور خود جادا کی حیوانی بو باس، سب کچھ یہاں موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ سردار اوتار سنگھ آج صبح سویرے یہاں سے واپس جاچکا ہے۔ چودھری انور گنجا بھی یہاں موجود نہیں تھا۔ جادا نے مجھ سے تنہائی میں بات چیت کی۔ اس بات چیت سے پہلے اس نے اپنے دونوں سیل فون بند کردیے۔ کھڑکی بھی بند کرادی۔

''ہاں بچے! بات ہوئی تمہاری ہیرو سے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی نہیں۔ لیکن امید ہے کہ آج ضرور ہو جائے گی۔''

''دیر نہ کرو۔ یہاں بہت کچھ بہت تیزی سے تبدیل ہورہا ہے۔ سردار اوتار سنگھ بہت بے قرار ہے۔ وہ اس لونڈے یوسف کو ہر صورت یہاں سے لے کر جانا چاہتا تھا۔''

''اور یوسف کہاں ہے؟''

جادا نے ایک گہری سانس لی اور قدرے دھیمی آواز میں بولا۔ ''اس کے لیے ہمیں ناٹک رچانا پڑا ہے۔ اس کے فرار کا ناٹک۔ بہرحال، وہ ہمارے پاس ہے اور بالکل محفوظ ہے۔ اس وقت فرید کوٹ کے ایک گھر میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا ہوگا۔ کوئی ڈراما وراما ''ساس بھی تو خانہ خراب بھی بہو تھی۔'' لیکن بچہ جی! یہ بات تمہارے گلے کے نیچے رہنی چاہیے۔ گلے سے اوپر آگئی تو گلا بھی نہیں رہے گا۔'' اس نے ہاتھ سے گردن کاٹنے کا اشارہ دیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

رات کو میں نے جو اندازہ لگایا تھا، وہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ جادا نے اپنے مطلب کے لیے سردار اوتار سنگھ کو یادگار دھوکا دیا تھا۔ یقیناً جادا ان لوگوں میں سے تھا جو آگے بڑھنے اور اوپر جانے کے لیے سب کچھ کرسکتے ہیں۔ لاشوں کے زینے بناسکتے ہیں۔

وہ بولا۔ ''میرے بارے میں کسی وہم کا شکار نہ ہونا۔ جو کچھ بھی ہوں، زبان کا پکا ہوں۔ میں جو جو وچن تمہیں دے رہا ہوں پورے کروں گا۔ تمہارا ہیرو کھیل پر آمادہ ہوجائے گا تو وہ چھوکری رجنی اور یوسف کہیں بھی جانے کے لیے آزاد

ہوں گے۔ اور کھیل کے بعد تم تینوں بھی آزاد ہو جاؤ گے۔''

''یہ کیسی آزادی ہے جادا صاحب! تم جسے کھیل کہہ رہے ہو، وہ موت ہے۔ تم میرے دوست کو مرنے کی بات کر رہے ہو۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو ہماری آزادی کا کوئی مطلب نہیں ہوگا۔''

''کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے میرے بچے... اپنی جانِ من کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو، پنے دوست کے لیے تو کچھ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔''

''اس کو آپ ''کچھ خطرہ'' کہہ رہے ہو۔ یہ تو سراسر خودکشی ہے۔''

وہ سفاک انداز میں مسکرایا۔ ''خودکشیاں ناکام بھی تو ہو جاتی ہیں لیکن جس کو ہم قتل کرتے ہیں، اسے واقعی قتل ہونا پڑتا ہے۔''

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا اور سگریٹ کا دھواں چھوڑتا رہا۔ پھر گمبھیر انداز میں بولا۔ ''سنا ہے تمہیں درد نہیں ہوتا۔ سلطان چیتا کہہ رہا تھا، تم درد سے بچتے نہیں بلکہ درد کے پیچھے بھاگتے ہو۔ ایسے کام ڈھونڈتے ہو جن میں تمہیں شریر کا دکھ سہنا پڑے؟''

میں خاموش رہا۔ وہ بولا۔ ''جواب دو... کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟''

''میں خود سے کچھ نہیں کرتا۔ بس میرا مزاج ہی ایسا ہو چکا ہے۔''

''تمہارے جیسے مزاج والے کی ہمارے پاس بڑی ڈیمانڈ ہے۔ یہ کھیل والا معاملہ نمٹ جائے پھر میں تمہارے لیے ایک بڑا اچھا سا کام ڈھونڈوں گا ممبئی میں۔''

''کیا یہ بھی کوئی دھمکی ہے؟''

''نہیں میرے سونو! میرے چندرے، یہ تو تمہاری اپنی اکھشا کی بات ہوگی۔ اگر چاہو تو مان لینا۔ ورنہ تمہارا اپنا راستہ ہماری اپنی پگڈنڈی۔ ویسے واقعی کیا تمہیں درد جھیلنے میں شانتی ملتی ہے؟''

''میں نے کبھی اس بارے میں سوچا نہیں۔''

اچانک اس نے جلتا ہوا سگریٹ میرے سینے پر عین بائیں چھاتی کے اوپر ٹھوک دیا۔ قمیص اور بنیان فوراً جل گئی۔ پھر گوشت جلا، سگریٹ بجھ گیا۔ درد کی ایک ناقابلِ بیان لہر میرے پورے جسم میں پھیل گئی۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ میں بس خود کو تھوڑا سا پیچھے ہی ہٹا سکا۔

اس نے میرا چہرہ دیکھا۔ ''ہاں بھئی، میری جانکاری غلط نہیں ہے۔ کچھ بات ہے تمہارے اندر۔''

میری پیشانی پر پسینا آ گیا تھا لیکن میں نے کوشش کے چہرے کے تاثرات کو نارمل ہی رکھا۔ وہ سفاک درندہ تو دور میں کراہ کر اس کی سفاکی کو حظ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔

... کچھ دیر بعد مجھے دوبارہ ثروت کے پاس پہنچا دیا گیا۔ میرا اسٹیل کا ہینڈ کف کھول دیا گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر ثروت کے چہرے پر اطمینان کی ایک نمایاں لہر نظر آئی تو... اس سے پہلے کہ ہم دونوں کوئی بات کرتے، میرے فون کی بیل ہونے لگی۔ میں نے اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ عجیب سا نمبر تھا۔ صرف تین ہندسوں کا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے عمران کی زندگی بخش آواز ابھری۔ ''میں عمران بول رہا ہوں۔'' میرے پورے جسم میں جوش کی لہر دوڑ گئی۔

''کہاں ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''آئی ایم ہیئر ان انڈیا... تمہارے پاس... سگڑے ہو جاؤ۔''

''یار! یہ کس نمبر سے بات کر رہے ہو، تین ہندسوں کا نمبر ہے؟''

''یہ ''پہیلی نمبر'' ہے اور اس کو سمجھنے میں تمہیں کافی وقت لگے گا۔ فی الحال کام کی بات کرتے ہیں۔ میں اس وقت فرید کوٹ پہنچ چکا ہوں۔ تم کہاں ہو؟''

''میں یہیں لنگڑی پورہ گاؤں میں۔ گوبندر کے سسرالی گھر میں۔'' میں نے عمران کو اس نئی سم کے بارے میں بھی بتایا جو اب میں اپنے فون سیٹ میں ڈالنے والا تھا عمران نے میرا نیا نمبر نوٹ کر لیا۔

''جادا سے بات ہوئی ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''اس نے رجنی اور یوسف کو چھوڑ دیا ہے لیکن دونوں ابھی تک اس کی نگرانی میں ہیں۔ وہ کہتا ہے، جب ہماری ڈیل فائنل ہو جائے گی، وہ انہیں کہیں بھی جانے کی اجازت دے دے گا۔''

وہ بولا۔ ''تابی! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ میں یہ گیم کھیلوں گا۔ میں نے اس ایونٹ کے بارے میں کافی معلومات حاصل کر لی ہیں۔ تم جادا سے میری براہِ راست بات کراؤ۔''

''لیکن عمران...''

''نہیں تابی! کوئی سوال جواب نہ کرنا، یہ میری درخواست ہے تم سے۔ بس جو کہتا ہوں، وہ کرتے جاؤ۔ ہمیں جادا کی شرط قبول ہے۔ کیا تم ابھی اس سے میری بات کرا سکتے ہو؟''

''ابھی تو وہ باہر نکلا ہوا ہے۔''

ٹھیک ہے جیسے ہی وہ پہنچے، وہاں آئے تم اس سے بات کرنا۔''

''مگر عمران! یہ بھی تو دیکھو...''

''میں سب کچھ دیکھ چکا ہوں جگر۔'' اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ ''جیسا کہتا ہوں، ویسا کرو۔ میں ابھی ایک گھنٹے تک دوبارہ کال کروں گا۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

میں سن ہو گیا تھا، وہ بہتر تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ عمران کیا چاہ رہا ہے۔ وہ ایک ایسی شرط قبول کر رہا تھا جس میں ننانوے فیصد تک جان چلے جانے کا امکان تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ گلے میں جیسے کچھ اٹک کر رہ گیا تھا۔

ثروت میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے پتا نہیں چل رہا تھا کہ ہمارے درمیان کیا بات ہوئی ہے۔ اچانک ثروت کی نظر میرے سینے پر پڑی۔ قمیص اور بنیان جلی ہوئی تھی۔ سینے پر داغے جانے کا تازہ نشان نظر آرہا تھا۔ ''ہائے اللہ! یہ کیا ہوا؟'' اس نے کہا۔

پھر میرے بتائے بغیر ہی وہ جان گئی کہ مجھے سگریٹ سے داغا گیا ہے۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نظر آئے۔ وہ اینٹی بایوٹک مرہم جو جادا کے کارندے نے مجھے سر پر لگانے کے لیے دیا تھا، کمرے میں ہی پڑا تھا۔ روئی بھی تھی۔ ثروت جلدی سے گئی اور مرہم لے آئی۔

مجھے زخموں کو لا دوا رکھنا آ گیا تھا۔ زخم خود ہی لگتے تھے، خود ہی خراب ہو کر ٹھیک ہو جاتے تھے۔ لیکن آج ثروت مجھے اپنے ہاتھ سے دوا لگا رہی تھی۔ ایسے علاج کے لیے تو میں اپنے پورے جسم کو زخم زخم کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی حنائی انگلی پر مرہم لگایا اور میری جلی ہوئی جلد پر رکھا۔ تاثیر زخم سے روح تک چلی گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔

''درد ہو رہا ہے؟'' اس نے محبت سے پوچھا۔

''ہاں ثروت! بہت درد ہے۔ سر سے پاؤں تک درد میں ڈوبا ہوا ہوں۔ لیکن مجھے پتا ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں۔ یہ درد... مجھے اپنے ساتھ قبر میں لے کر جانا ہوگا۔''

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''آپ میرے دکھ میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں۔ میں آپ کو منع نہیں کروں گی۔ جو کہنا ہے کہہ لیں۔ میں سب کچھ سہنے کو تیار ہوں۔ میں نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں تابش۔ میں اس کا اعتراف کرتی ہوں۔ آپ جو بھی سزا دیں، میرے لیے کم ہے۔''

''دونوں ہی قصوروار ہیں ثروت اور دونوں ہی بے گناہ بھی... یہ جرم و سزا کی بات نہیں ہے ثروت! یہ تو وفا اور جفا کی کہانی ہے۔''

''تو پھر دعا کریں، میں فنا ہو جاؤں۔ آپ کے سامنے آپ کے ہاتھوں میں ختم ہو جاؤں۔ جینے میں تو کوئی خوشی نہیں مل سکی، شاید مرنے میں مل جائے۔''

''تم بس مرنے کی بات ہی کیوں کرتی ہو ثروت؟''

''مجھے جینے میں کچھ نظر نہیں آتا تابش! کچھ بھی نہیں۔ میری زندگی ایک بوجھ بن گئی ہے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی۔ میری نہ پوری ہونے والی خواہشوں کا وبال میرے آس پاس والوں پر پڑا ہے۔ امی ابو چلے گئے۔ ناصر بھائی چلے گئے اور اب نصرت... نصرت میری زد میں ہے۔''

''نصرت تمہاری زد میں نہیں ہے ثروت... نہیں ہے... وہ اپنی بیماری کی زد میں ہے اور یہ بیماری بھی کوئی لاعلاج نہیں ہے۔ نصرت نے ٹھیک ہونا ہے پھر سے ہنسنا بولنا ہے۔ لیکن تم شاید پھر بھی جینا نہ سیکھ سکو۔ پھر کوئی اور واہمہ تمہیں جکڑ لے گا۔ زندگی کی کسی اور دشواری کو تم اپنی طرف منسوب کر لو گی۔ اس گھیرے سے نکلو ثروت! اس جال کو توڑ دو۔ میاں بیوی کا رشتہ بہت مقدس رشتہ ہے۔ اس کا ٹوٹنا بڑی بدقسمتی ہے لیکن جب یہ رشتہ ایک ناقابلِ علاج ناسور بن جائے تو پھر اس کو کاٹ دینا بھی جائز ہے۔ مذہب، معاشرہ، اخلاقیات، سب میں اس کی اجازت موجود ہے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تابش!''

''نہ سمجھ میں آنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ سب کچھ تمہارے سامنے واضح ہے۔ مجھے آج کہنے دو ثروت کہ یوسف نے کبھی تم سے محبت نہیں کی۔ وہ جرمن بیوی کے عشق میں گرفتار رہا اور اس کی وجہ سے اس نے تم سے قطع تعلق رکھا۔ تمہیں کبھی بیوی سمجھا ہی نہیں۔ جب جرمن لڑکی والا بھوت سر سے اترا تو اسے ہوش آیا۔ لیکن تب بھی اس نے تم سے محبت نہیں کی، صرف تمہاری قربت کی خواہش کی۔ اسے احساس ہوا کہ ایک خاوند کی حیثیت سے اسے تم سے مستفید ہونا چاہیے۔ مگر اس کے لیے بھی اس نے تادیر انتظار کرنا گوارا نہیں کیا۔ جب تمہاری طرف سے سرد مہری دیکھی تو وہ فوراً دوسری عورتوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔''

وہ کراہی۔ ''بے شک ان میں غلطیاں ہیں تابش! لیکن... اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اتنا بڑا فیصلہ کر لیں۔ وہ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ جب خدا انسان سے مایوس نہیں تو ہم اتنی جلدی مایوس کیوں ہو جائیں۔ میں اپنی پوری کوشش کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے امید ہے...'' اس کی آواز بھرا گئی۔

"تم اپنی زندگی کو کانٹوں میں گھسیٹنے کی کوشش کررہی ہو ثروت! اور ساتھ یہ امید بھی رکھتی ہو کہ کانٹے تمہیں زخمی نہیں کریں گے۔ ایسا نہیں ہوگا۔ ابھی وقت ہے ثروت! کوئی اچھا فیصلہ کرلو۔"

ثروت نے اپنا سر گھٹنوں میں کرلیا اور نفی میں ہلانے لگی۔ وہ جیسے مجھے چپ رہنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ میں چپ ہوگیا۔

وہ کچھ دیر تک اسی طرح گٹھری بنی بیٹھی رہی پھر بولی۔ "میں نے آپ سے کہا تھا، آپ نصرت سے میری بات کروادیں۔"

میں نے طویل سانس لی۔ "میں جاوا سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن پھر نہیں کی۔ ابھی ہمیں نصرت کو اس معاملے سے الگ رکھنا چاہیے۔ یہ بدترین لوگ ہیں ثروت! ہم نصرت کو ان کی نگاہوں میں کیوں لائیں۔"

وہ میری بات سمجھ گئی اور سر جھکالیا۔

☆☆☆

نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ عمران کوئی نہ کوئی درمیانی راستہ نکال لے گا۔ وہ کتنا بھی دلیر اور جوشیلا سہی، قسمت اس پر کتنی بھی مہربان سہی لیکن سامنے اندھا کنواں دیکھ کر آنکھیں بند کرنے والا وہ بھی نہیں تھا۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی خاص پلاننگ تھی۔ پھر بیٹھے بٹھائے مجھے اچانک راجا یاد آگیا۔ دل افسردہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ گزرنے والے آخری وقت کے مناظر فلم کی طرح ذہن کے پردے پر چلنے لگے۔ اس کی تیزی طراری، اس کا شاطر انداز اور ہر لمحے زندگی کے چھتے میں سے شہد نچوڑنے کی کوشش... مگر وہ بھول گیا تھا کہ زیادہ شہد کے ساتھ زیادہ زہر بھی ہوتا ہے...

اسی دوران میں پھر عمران کا فون آگیا۔ مکمل نمبر کے بجائے پھر وہی تین کا ہندسہ نمودار ہوا۔ اس نے تمہید میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا اور بولا۔ "تابی! میں جاوا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"عمران! میں ایک بار پھر کہوں گا کہ..."

"تم جو کہنا چاہتے ہو، میں سمجھ رہا ہوں۔ تم اس سے میری بات کرواؤ۔"

میں نے جاوا کے کارندے کو آواز دی اور اسے سیل فون تھماتے ہوئے کہا۔ "بھیا صاحب کے لیے کال ہے، ان کو دو۔"

کارندہ فون لے کر چلا گیا۔ اس کی واپسی ایک گھنٹے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ فون سیٹ گرم ہورہا تھا۔ لمبی چوڑی بات ہوئی تھی جاوا کی۔ مجھے اس گفتگو کا کوئی لفظ سنائی نہیں دیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی کسی قریبی کمرے سے جاوا کی گونج دار [illegible] کانوں میں پڑ جاتی تھی۔

...اگلے دو تین گھنٹے میں صورت حال تیزی سے تبدیل ہوئی۔ پریم چوپڑا نے ہمیں بتایا کہ ہم جانے کے لیے تیار ہوجائیں۔ ہمیں فرید کوٹ لے جایا جارہا ہے۔

میں نے اس سے کہا۔ "جاوا صاحب سے [illegible] بات کرواؤ۔"

وہ مجھے گھور کر چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید بات نہ کرائے لیکن قریباً پندرہ منٹ بعد جاوا ہماری کھڑکی کے سامنے آیا اور بولا۔ "ہاں میرے چندا! کیا بات ہے۔ بڑی جلدی اداس ہوجاتے ہو میرے بغیر۔"

"رجنی اور یوسف کا کیا بنا ہے؟"

"وہ دونوں خوشی کے ڈھول بجارہے ہیں۔ اپنی مرضی سے کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہیں۔ رجنی اپنے ماموں کے ساتھ کسی دوسرے گاؤں نکل گئی ہے۔ اس لونڈے یوسف کے بارے میں جانکاری ملی ہے کہ وہ دہلی کی طرف جانا چاہتا ہے۔ وہاں اس کا کوئی مجسٹریٹ دوست رہتا ہے۔"

"ہمیں کیسے یقین آئے گا؟"

"تمہارا وہ لنگوٹیا عمران، ایک دم گرو ہے بلکہ گرو گھنٹال ہے۔ وہ سب جان لے گا اور شاید اب تک جان بھی چکا ہو۔ اس کے ہرکارے بڑے تیز ہیں۔ ایک دم [illegible] کے ماتق۔ تم چنتا نہ کرو۔ وہ تمہیں فون پر ساری رام کہانی سنا دے گا۔ تم بس چلنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ زبردست قسم کا موج میلا کرائیں گے تمہیں۔"

☆☆☆

ہم اس مکان سے نکل کر ہائی روف گاڑی میں آبیٹھے۔ یہ گاڑی باہر سے جتنی خوب صورت تھی، اندر سے بھی اتنی ہی آرام دہ تھی۔ مجھے ایک بار پھر الٹی ہتھکڑی لگادی گئی تھی۔ اوپر سے چادر کی بکل ماردی گئی تاکہ ہتھکڑی نظر نہ آئے۔ ثروت بھی سرتاپا ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ فقط اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ ہمیں گاڑی کی درمیانی نشستوں پر بٹھا دیا گیا۔ عقب میں دو مسلح افراد بالکل چوکس حالت میں موجود تھے۔ ہمارے سامنے فرنٹ سیٹ پر پریم چوپڑا خود موجود تھا اور وہ بھی مسلح تھا۔ مزاحمت کی گنجائش زیرو فیصد تھی۔ ہمارے آگے ایک کار تھی جس میں جاوا کے مسلح ڈشکرے بھرے ہوئے تھے۔ عقب میں لگژری جیپ تھی۔ اس جیپ میں جاوا کے علاوہ چودھری انور گنجا اور شاربہ بائی بھی موجود تھے۔

گاؤں میں ہو کا عالم تھا۔ حالانکہ یہ سہ پہر تین چار بجے کا وقت تھا مگر کہیں کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ گھروں کی کھڑکیاں دروازے بند تھے، گلیاں سنسان نظر آرہی تھیں۔ گاڑیاں روانہ ہوئیں تو میں نے مڑ کر اس چار دیواری کو دیکھا جہاں ہم نے چند نہایت برے دن گزارے تھے۔ اسی چار دیواری میں آشا کور ہنستی کھیلتی داخل ہوئی اور لاش بن گئی۔ [illegible] گوبندر بھی یہیں پر موت کے گھاٹ اترا۔ ہم ابھی زندہ تھے لیکن یہ زندگی کب تک ساتھ دے گی، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ جاوا اور اس کے کارندے میری توقع سے بڑھ کر خطرناک تھے۔ بندے کو چیونٹی کی طرح مسل دینے کا محاورہ میں نے کئی بار سنا تھا مگر اس محاورے کی عملی شکل پہلی بار یہاں دیکھی تھی۔

نہ جانے کیوں بار بار اس نوجوان سائیں کی شکل میری نگاہوں میں گھوم جاتی تھی جو ہمیں ہارون آباد کے ہوٹل میں ملا تھا۔ اس کی آنکھوں کی ماورائی چمک ذہن میں آتی تھی اور اس کی آواز کانوں میں گونجنے لگتی تھی۔ اس نے ثروت کو خاص طور پر نشانہ بنایا تھا اور کہا تھا کہ ساری مصیبت کی شروعات اسی سے ہوئی ہے، اس نے موت کا اور قبروں کا ذکر کیا تھا۔

ہمارا قافلہ دھول اڑاتا، لنگڑی پورہ سے "انڈین پنجاب" کے معروف شہر فرید کوٹ کی طرف روانہ ہوا۔ ہم کچے اور نیم پختہ راستوں سے گزر رہے تھے۔ ہماری اطراف میں کماد اور چاول کے کھیت تھے۔ باغ تھے اور پگڈنڈیاں تھیں۔ کہیں کہیں کاشت کار مردوزن بھی دکھائی دیتے تھے۔ پس منظر میں مویشیوں کے ریوڑ تھے اور مغرب کی طرف جھکتا سورج تھا۔ دیہی زندگی اپنی مخصوص آہستہ روی کے ساتھ متحرک تھی۔ مگر اس ہائی روف گاڑی کے اندر کی دنیا بالکل مختلف تھی۔ یہاں خوف کے سائے تھے اور تناؤ کی حکمرانی تھی۔ ہم انڈیا کے کچھ خطرناک ترین لوگوں کے نرغے میں تھے۔ سفر بالکل خاموشی سے طے ہورہا تھا۔

اچانک میری آنکھوں کے سامنے برق سی کوندگئی۔ ہمارے سامنے ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ میں نے بہت سی مٹی فضا میں اچھلتے دیکھی۔ دوسرا دھماکا سامنے جانے والی کار کے عین سامنے ہوا۔ کار بری طرح اچھلی۔ میں نے اس کے بونٹ کو فضا میں اڑتے اور انجن کو آگ پکڑتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی آٹو میٹک رائفل کا طویل برسٹ چلا۔ کار کی دائیں جانب کے شیشے چکنا چور ہوگئے۔

ثروت چلا اٹھی اور اس نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑلیا۔ دونوں مسلح افراد ہمارے عقب میں چوکس بیٹھے رہے تاہم پریم چوپڑا اپنا مشین پسٹل نکالتا ہوا گاڑی سے اتر آیا۔ اترتے ساتھ ہی چوپڑا کو مچھلی کی طرح پٹ سے کچی زمین پر گر پڑا۔ کئی گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے سر پر سے گزر گئی تھیں۔

...اور یہی وقت تھا جب میں نے اپنے میزبان جگت سنگھ کو دیکھا۔ وہ ایک درخت کی اوٹ سے نکلا۔ اس کا چوڑا سینہ دیوار نظر آرہا تھا۔ اس کی نیلی پگڑی کے نیچے اس کا چہرہ غیظ وغضب کی تصویر تھا۔ اس نے بالکل سامنے آکر ایک پورا برسٹ کار پر چلایا اور کم از کم دو کار سواروں کو چھلنی کردیا۔ اس کی للکار گونجی... "ماردوں گا... فنا کردوں گا..."

گاڑی میں بچ جانے والے افراد چھلانگیں لگا کر باہر نکلے اور مختلف درختوں کی آڑ لی۔

جگت کے ساتھیوں نے فلک شگاف نعرہ لگایا۔ ست سری اکال... جو بولے سونہال...

تب میں نے جگت سنگھ کو اپنا بازو فضا میں لہراتے دیکھا۔ ایک سیکنڈ بعد کار سے چند میٹر دور ایک اور زبردست دھماکا ہوا۔ گردوغبار کے ساتھ ہی جاوا کا ایک اور کارندہ ہوا میں اچھلا اور چاول کے ہرے کھیت میں گرا۔ میں سمجھ گیا کہ جگت سنگھ اور اس کے ساتھی وہی "کالے ناگ" چلارہے ہیں جن کا ذکر جگت نے فون پر کیا تھا۔ جگت کی رنگیلی محبوبہ آشا کور ماری جاچکی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی گوبندر بھی موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ اندازہ ہورہا تھا کہ جگت سنگھ ان اندوہناک خبروں سے آگاہ ہوچکا ہے اور اب سرتاپا قہر ہے۔

ان لوگوں نے ہماری گاڑی کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اس گاڑی میں ہماری موجودگی کے بارے میں جانتے ہیں۔ میرے ہاتھ عقب میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود اگر ثروت میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں ضرور مزاحمت کرتا۔ موجودہ صورت میں یہ خودکشی کے زمرے میں آرہا تھا۔ کم از کم ابھی تو یہ خودکشی ہی تھی۔ پھر میں نے اس پرانی فوجی جیپ کو دیکھا جو جگت سنگھ کے دوست پرتاب کی ملکیت تھی۔ یہ جیپ تیزی سے لہراتی ہوئی ہماری گاڑی کے قریب آئی۔ اس میں ابھرے رخساروں اور گھنی مونچھوں والا ایک جواں سال شخص موجود تھا۔ یہی جگت سنگھ کا ساتھی پرتاب سنگھ تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور میں نے اسے۔ اس کے تاثرات سے عیاں تھا کہ وہ لوگ ہمیں یہاں سے چھڑا کر لے جانے کا پختہ ارادہ رکھتے ہیں۔ اب ضروری تھا کہ موقع محل دیکھ کر ہم بھی ہاتھ پیر ہلائیں۔

ایک گولی ہائی روف کی پچھلی اسکرین توڑتی ہوئی آئی اور ہمارے ایک نگراں کے کندھے میں لگی۔ اس کے منہ سے

بے ساختہ گالی نکلی اور وہ تکلیف کی شدت سے نیچے جھک گیا۔ ہم دونوں بھی جھک گئے تاکہ دوطرفہ فائرنگ کی زد سے محفوظ رہیں۔ نیچے جھکے جھکے میں نے دستی بم کے ایک اور دھماکے کا منظر دیکھا۔ کار کے اگلے حصے کے پرخچے اڑ گئے اور وہ پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آگئی۔

تیسری گاڑی یعنی جاوا والی لگژری جیپ ہمارے پیچھے کچھ فاصلے پر تھی۔ میرا خیال تھا کہ آگے کا حال دیکھ کر یہ جیپ دور ہی رک جائے گی۔ اس میں جاوا، چودھری انور اور شارپ بائی تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ جیپ سیدھی آگے بڑھتی آئی۔ پھر وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ مجھے حیرت کا دوسرا دھچکا لگا۔ جیپ کی کھڑکیاں محفوظ رہیں... یہ بلٹ پروف جیپ تھی۔ بکتر بند کی طرح اس کی باڈی کو شاک پروف بھی بنایا گیا تھا۔ اس کا ثبوت "کالے انار" کے ایک اور دھماکے سے ہوا۔ یہ دھماکا جیپ کے بالکل نزدیک ہونے کے باوجود اسے آگ لگانے یا کوئی نقصان پہنچانے میں ناکام ہوا۔

جیپ دندناتی ہوئی ان دو افراد پر چڑھ دوڑی جو کندھے سے کندھا ملائے فائرنگ کر رہے تھے۔ جیپ انہیں روندتی ہوئی نکل گئی۔ اس کی چھت کا چوکور خلا یعنی سلائڈنگ سن روف اوپن ہوا۔ اس میں سے ایک شخص کا بالائی دھڑ نمودار ہوا۔ میں نے گرد و غبار میں سے دیکھا۔ یہ جاوا کا سب سے خطرناک رائفل بردار نریندر رکاری تھا۔ اس نے جگت کے ساتھیوں پر آٹو میٹک رائفل سے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ نریندر بہترین پوزیشن میں تھا۔ پلک جھپکنے میں جگت کے دو ساتھی شدید زخمی ہو کر گر گئے۔ تیسرا زخمی ہو کر بھاگا لیکن کسی اور طرف سے آنے والی گولیوں نے اسے بھی اوندھے منہ گرا دیا۔

ایک دم ہی پانسا پلٹتا ہوا نظر آیا۔ جاوا کی بلٹ پروف گاڑی کی آڑ لے کر اس کے ساتھیوں نے اندھادھند فائرنگ کی۔ جگت کے ساتھی بے حد پرجوش ہونے کے باوجود اس ہلے کو جھیل نہیں سکے۔ میں نے جگت کے ایک اور ساتھی کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ جگت سنگھ نے خود بھی پسپائی اختیار کی۔ وہ ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر بھاگا۔ جاوا کی جیپ نے اس کا پیچھا کیا۔ شاید وہ لوگ اسے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ غالباً ان کی یہی خواہش جگت سنگھ کی زندگی کا بہانہ بن گئی۔ وہ اکا دکا فائر کرتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ اس کی سفید دھوتی ہوا میں پھڑپھڑاتی نظر آرہی تھی۔ پھر وہ برق رفتاری سے درختوں اور جھاڑیوں کے ایک گھنے جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ جاوا کی جیپ رک گئی۔ پیچھا کرنے والے پیادے بھی رک گئے۔ وہ جھنڈ میں داخل نہیں ہو رہے تھے۔ بس فاصلے سے فائرنگ کر رہے تھے۔ جھنڈ ایک ڈیک نالے کے عین کنارے پر تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ جگت جھنڈ میں نہیں ہے۔ وہ شام کی نیم تاریکی کا فائدہ اٹھا کر نالے میں کود چکا ہے۔ میرے دل کی گواہی بعد میں بالکل درست ثابت ہوئی۔ جگت رواں دواں نالے میں کودا تھا۔ زخمی حالت میں۔

اس زوردار اور خونی جھڑپ نے اردگرد کے کاشتکاروں اور راہ گیروں کو موقع پر جمع کر دیا تھا مگر وہ دور دور کھڑے رہے۔ قریب آنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی۔ یقیناً یہ مقامی لوگ آج کل جاوا گروپ کی گاڑیوں کو اچھی طرح جان پہچان رہے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ یہ گاڑیاں آج کل یہاں کیا گل کھلا رہی ہیں۔

جتنے زوردار دھماکے یہاں ہوئے اور جتنی شدید فائرنگ ہوئی تھی، پولیس کو بھی یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن پولیس تو اسی وقت آسکتی تھی جب جاوا کی اجازت ہوتی... عین ممکن تھا کہ جاوا نے فون پر ہی انہیں "دخل در معقولات" سے منع کر دیا ہو۔

ثروت دم بخود بیٹھی تھی۔ آج کل وہ موت کو بہت قریب سے دیکھ رہی تھی اور وہ بھی ایسے انداز میں جس کا اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ اس خون ریز لڑائی میں جاوا گروپ کے دو بندے جان سے چلے گئے تھے۔ دو تین کو زخم آئے تھے۔ جگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کا زیادہ نقصان ہوا تھا۔ دو افراد کی لاشیں ہم سے چند میٹر کے فاصلے پر پڑی تھیں۔ تین چار افراد شدید زخمی حالت میں فرار ہوئے۔ جیپ سے پیچھے کچلے جانے والے ایک نیم مردہ شخص کو اس کے ساتھی اٹھا کر درختوں میں غائب ہوئے تھے۔

بالکل آخر میں زخمی ہونے والے شخص کو پکڑ لیا گیا۔ اس کی ٹانگ میں شاٹ گن کے موٹے چھرے لگے تھے۔ یہ چوڑے چہرے والا جگت کا قریبی ساتھی پرتاب تھا۔ ایک اور جوان لڑکے کو بھی پکڑا گیا۔ اس کی عمر بمشکل انیس بیس سال رہی ہوگی۔ اس کی باریک مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ اس نے بسنتی رنگ کا چولا پہن رکھا تھا۔ "جو بولے سو نہال" کا نعرہ لگانے والوں میں وہ پیش پیش تھا۔

اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھنے کے بعد جاوا غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا پستول نکال کر نوجوان لڑکے کے سر پر رکھ دیا اور دو تین منٹ کے اندر اس سے پوچھ لیا کہ حملہ کرنے والے کون تھے اور ان کا مقصد کیا تھا۔ نوجوان کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ اس نے جگت سنگھ کا نام بتایا اور ساتھ

ہی یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ جگت کے چھوٹے بھائی گوبند سنگھ اور اس کی بیوی آشا کی ہتھیا کا بدلہ لینے کے لیے حملہ آور ہوئے تھے۔ نوجوان کا نام دیپک سنگھ تھا۔ جاوا کی قہرناک صورت دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر دیپک کا مورال ڈاؤن سے ڈاؤن ہوتا چلا جا رہا تھا۔ غالباً اس نے اس مشہور ڈان کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اب وہ اس کے روبرو تھا اور اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ جاوا کے حکم پر زخمی پرتاب کو ہمارے والی گاڑی میں بٹھا دیا گیا جبکہ نوجوان دیپک کے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف رسی سے باندھ دیے گئے۔ سرخ نائلون کی یہ رسی پندرہ بیس فٹ لمبی تھی۔ اس کا دوسرا سرا جاوا کے ہاتھ میں تھا۔ وہ زہرخند انداز میں بولا۔ "میرے چندا! گاڑیوں کے اندر جگہ کم ہے۔ تمہیں ذرا کٹھنائی (دشواری) تو ہوگی لیکن تمہیں ہمارے ساتھ بھاگ کر جانا پڑے گا۔"

اس نے رسی کا دوسرا سرا اپنی جیپ کے عقب میں موجود آہنی حلقے میں بندھوا دیا۔ نوجوان نے منت کے انداز میں کہا۔ "میرا دوش نہیں ہے۔ میں جگت سنگھ کے دوست کا دوست ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے کھول کر کچھ نہیں بتایا جی۔ بس اتنا کہا کہ ایک پُن کا کام ہے..."

"تو ہم کون سا پاپ کا کام کر رہے ہیں بچے۔ یہ بھی پُن کا کام ہی ہے۔ فرید کوٹ پہنچ کر تمہاری خاطرداری کریں گے۔ بڑا موج میلا ہوتا ہے وہاں۔ پر شرط یہی ہے کہ تم فرید کوٹ پہنچ جاؤ۔" جاوا کا لہجہ سفاک تھا۔

اسی دوران میں پریم چوپڑا جو موبائل فون سن رہا تھا، جاوا کے قریب آکر بولا۔ "بھیاجی! انسپکٹر چاولہ کا فون آیا ہے۔ پولیس موقع پر آرہی ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم یہیں رہو۔ دو تین لڑکے بھی ساتھ ہی رکھو۔ ہم جا رہے ہیں۔"

نوجوان نے ایک بار پھر منت سماجت کی مگر جاوا اپنے کان بند کر چکا تھا۔ وہ جیپ میں بیٹھ گیا۔ چودھری انور اور شارپ بائی بھی بیٹھ گئے۔ جیپ روانہ ہوگئی۔ نوجوان دیپک جیپ کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ ہماری ہائی روف، جیپ کے عقب میں تھی۔ جاوا کے خونخوار کارندوں نے زخمی پرتاب کے ہاتھ عقب میں باندھ دیے تھے اور اسے ہائی روف کی پچھلی سیٹوں کے درمیانی خلا میں کسی بھیڑ بکری کی طرح ٹھونس دیا تھا۔ وہ گاہے بگاہے اسے گالیاں دے رہے تھے اور اس کی پیٹھ پر ٹھوکریں بھی رسید کر رہے تھے۔ وہ پوری طرح اس پر حاوی ہو چکے تھے۔

دونوں گاڑیاں گہری تاریکی میں اونچے نیچے راستوں پر چلتی رہیں۔ رفتار زیادہ نہیں تھی۔ دیپک اب ہانپنا شروع ہو گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ شاید اسے اچھی طرح تھکانے کے بعد اس کی سزا موقوف کر دی جائے گی اور اسے ہمارے والی گاڑی میں بٹھا لیا جائے گا لیکن اگلے آدھ گھنٹے کے اندر جاوا کی سفاکی بالکل کھل کر سامنے آگئی۔ جیپ نہیں روکی گئی۔ دیپک اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا۔ اس کے بھاگنے کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ بری طرح ہانپ چکا ہے اور اس کی ٹانگیں شل ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ بھاگتے بھاگتے کچھ بول بھی رہا تھا۔ شاید خود کو باندھنے والوں سے رحم کی درخواست کر رہا تھا... یا اس قسم کی کوئی اور بات کر رہا تھا۔ مگر اس کی آواز جیپ سواروں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ انہوں نے کھڑکیاں چڑھا رکھی تھیں۔ مظلوموں کی آہ و بکا کے لیے یہ کھڑکیاں ہمیشہ سے چڑھی رہتی ہیں۔ زندگی کے لیے بھاگنے والے، ہانپتے ہوئے اور زخموں سے چور لوگ پکارتے رہتے ہیں، چلا چلا کر بتاتے رہتے ہیں کہ وہ موت کی دہلیز پر ہیں، وہ مر جائیں گے مگر یہ کھڑکیاں نہیں کھلتیں... اندر بیٹھے ہوئے فرعون اپنے ماحول میں مست رہتے ہیں۔ اندر اور باہر کی دنیا میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہی فرق اس دنیا کو بدصورت بنا رہا ہے... اجاڑ رہا ہے۔

دیپک بھی بھاگتا رہا، گرتا پڑتا رہا۔ شاید اب وہ بولنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ ایک ہلکی سی... معمولی سی ٹھوکر بھی اسے گرا سکتی تھی۔ نائلون کی سرخ رسی کو لگنے والا ایک ذرا سا جھٹکا بھی اسے زمین بوس کر سکتا تھا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اس کے ہاتھوں کی رسی کو ایک جھٹکا لگا اور وہ گر گیا۔ طاقتور جیپ نے اسے کھینچنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کی۔ وہ اسے کھینچتی گئی، گھسیٹتی گئی۔ ہماری گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں دیپک کا المناک انجام صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دھول اور خون میں لتھڑتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کس وقت مرا؟ اس کا اندازہ نہیں ہوا لیکن یقیناً اس کی موت المناک تھی۔ کچھ دیر بعد جیپ کی ایک عقبی کھڑکی کھلی، کسی نے ہاتھ باہر نکالا۔ ہاتھ میں کوئی تیز دھار چیز تھی۔ چلتی گاڑی میں سے ہی نائلون کی رسی کاٹ کر دیپک کو "آزاد" کر دیا گیا۔

ان لوگوں کی دیدہ دلیری حیران کن تھی۔ انہوں نے ایک جیتے جاگتے شخص کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا اور اس کی لاش کو سرِراہ پھینک کر جا رہے تھے۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

فرید کوٹ انڈین پنجاب کا ایک درمیانے سائز کا قصبہ ہے۔ اس کی آبادی لگ بھگ چھ لاکھ ہوگی۔ اس کا نام بابا فرید گنج شکرؒ کے نام پر رکھا گیا تھا۔ مجھے جگت سنگھ سے معلوم ہوا تھا کہ سکھوں کی مذہبی کتابوں میں بابا فرید کے صوفیانہ اشعار موجود ہیں۔ فرید کوٹ کی سڑکیں زیادہ کشادہ نہیں تھیں۔ ہمیں سفر کے دوران میں بلند و بالا عمارتیں بھی دکھائی نہیں دیں۔ ہمیں شہر کے مضافات میں ایک ایسی کوٹھی میں لایا گیا جس کی چار دیواری دس فٹ سے زیادہ اونچی تھی اور اس کے اوپر خاردار تار کے چھلے تھے۔ کوٹھی کا رقبہ دو کنال کے لگ بھگ تھا۔ دوسری منزل کی چھت پر ایک بہت بڑی سرچ لائٹ دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگا جیسے ہم کسی رہائشی عمارت کے بجائے کسی سفارت خانے کی بلڈنگ میں گھس رہے ہیں۔ دو باوردی مسلح افراد نے آہنی گیٹ کھولا اور ہم ڈرائیووے سے گزر کر وسیع پورچ میں رک گئے۔ یہ عمارت باہر سے تو عام ہی لگ رہی تھی لیکن اندر سے اسے جدید انداز میں سجایا گیا تھا اور خوب سجایا گیا تھا۔ کئی کمروں کی دیواریں اور فرش بھی شیشے کے تھے۔ ایک راہداری کے بلوری فرش کے نیچے ایسا خاص انتظام کیا گیا تھا کہ اس میں نارنجی اور زرد رنگ کی مچھلیاں شفاف پانی میں تیرتی نظر آرہی تھیں۔

ایک نہایت فربہ اندام شخص نے جاوا کا استقبال کیا۔ اس شخص نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ماتھے پر تلک اور کانوں میں طلائی بالیاں تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق اس درمیانی عمر کے شخص کی کمر کا گھیرا کسی صورت بھی سات آٹھ فٹ سے کم نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے سفید گوشت کا پہاڑ ریان ولیم یاد آگیا۔ تاہم ریان ولیم انتہائی موٹا ہونے کے باوجود قدرے چست اور تندرست نظر آتا تھا۔ اس شخص کے ہاتھوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں تھیں۔ چوبیس پچیس سال کی ایک دبلی پتلی اسمارٹ لڑکی اس دیو کے پہلو میں تھی۔ جیسے کہ بعد میں معلوم ہوا یہ اس کی دھرم پتنی امرتیا سنگھ تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ دولت سے بہت کچھ خریدا جاسکتا ہے۔

فربہ اندام شخص نے ہاتھ جوڑ کر جاوا کو نمستے کیا پھر ہاتھ ملایا۔ وہ بڑے غور سے مجھے اور ثروت کو گھور رہا تھا۔ "تو یہ ہیں ہمارے مہمان۔" اس نے قدرے باریک آواز میں کہا۔

"ہاں لیکن اتنا مت گھورو۔ یہ تین چار ہفتے یہاں رہیں گے۔ شانتی سے دیکھتے رہنا۔" جاوا نے کہا۔

ہمیں ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ چوکور کمرا اسی طرح لوگوں کو بند کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کا اسٹیل کا دروازہ بڑا مضبوط تھا اور سلائڈ کر کے کھلتا تھا۔ دروازے کے علاوہ کمرے میں فقط ایک راستہ اور تھا۔ یہ ایک فٹ مربع دو ڈھائی فٹ کی ایک مختصر سی کھڑکی تھی۔ یہ بھی سو فیصد تنگ تھی۔ اس میں سے "بند افراد" [illegible] وغیرہ پہنچایا جاتا تھا۔ کمرے میں ایک ہی بڑا بیڈ موجود تھا۔ فرش پر قالین اور ایک الماری بھی تھی۔ اٹیچ باتھ روم کا دروازہ الماری کے بالکل ساتھ تھا۔ دروازے کے اوپر مائک کی جالی نظر آتی تھی۔

ہمیں کمرے میں پہنچا کر دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ چند سیکنڈ بعد مختصر کھڑکی کھلی۔ نریندر نے چابی اندر پھینکی اور ثروت سے مخاطب ہو کر پھنکارا۔ "اس کی کڑی کھول دو۔"

ثروت نے تھوڑی سی کوشش کے بعد میری ہتھکڑی کھول دی۔ مختصر کھڑکی نما خلا بند ہوگیا۔

ثروت نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کر دیا۔ اس بات کا قوی امکان موجود تھا کہ یہاں مائکروفون بلکہ کیمرا وغیرہ بھی موجود ہو۔ میں نے بڑی احتیاط سے کمرے کا جائزہ لیا۔ تاہم مائک کی جالی کے علاوہ کوئی شے نظر نہیں آئی۔ فقط دو انچ قطر کا ایک سوراخ دکھائی دیا جس میں شیشہ لگا تھا۔ غالباً اس شیشے کا مقصد وقتاً فوقتاً کمرے میں جھانکتے رہنا تھا۔

اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ راستے میں دیکھے جانے والے خونی منظر کی وجہ سے ثروت بالکل گم صم نظر آتی تھی۔ ابھی اس نے نوجوان دیپک کے جیپ کے پیچھے گھسٹنے اور مرنے کا منظر نہیں دیکھا تھا ورنہ اس کے اعصاب پر مزید برا اثر پڑتا۔ اچانک موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ وہی تین فگرز والا نمبر تھا۔

عمران کی توانا آواز ابھری۔ "ہیلو جگر! کیا رومانی سین چل رہا ہے؟"

"بکواس بند کرو۔ راستے میں بڑی مارا ماری ہوئی ہے۔ ابھی تک آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ثروت کے ساتھ مارا ماری ہوئی ہے لیکن وہ تو ایسی نہیں لگتی۔ تم نے ضرور کوئی بے ہودگی کی ہوگی۔"

"عمران! میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔ تمہیں بالکل بے وقت کی شوخیاں سوجھ رہی ہیں۔ راستے میں بڑی سخت لڑائی ہوئی ہے۔ دستی بم پھینکے گئے ہیں۔ آٹومیٹک رائفلوں سے دس پندرہ منٹ فائرنگ ہوئی ہے۔ کم از کم پانچ بندے جان سے گئے ہیں۔"

وہ بے پروائی سے بولا۔ "یار! پتا ہے مجھے اور یہ کوئی

بڑی بات نہیں ہے۔ جہاں یہ جاوا صاحب تشریف فرما ہوتے ہیں، وہاں اس طرح کے کرتوت لے یعنی غنڈے ہوتے ہیں۔ آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا؟"

"یار! میں جگت کی طرف سے پریشان ہوں۔ یہ لوگ اس کو مار ڈالیں گے۔ تم کچھ کر سکتے ہو؟"

"فی الحال تو دعا ہی کر سکتا ہوں بھیا! میرا سارا گیان دھیان تمہاری اور ثروت کی طرف ہے۔ پہلے تمہیں اس جالو مرشات سے نکال لوں۔ چالو بھرشاٹ سمجھتے ہو نا تم۔ یہ ہندی کا شبد (لفظ) ہے۔"

اس پر پھر خود ساختہ ہندی کا بھوت سوار تھا۔ میں نے کہا۔ "عمران! میری ایک بات دھیان سے سنو۔ تم نے کہا تھا کہ ہم اس کا کوئی حل نکال لیں گے۔ میرا مطلب ہے اس دیوالی والے منحوس کھیل کا۔ لیکن اب تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم یہ کھیل کھیلنے کے لیے تیار ہو۔ یہ دیوانے پن کے سوا کچھ نہیں عمران۔ میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔"

"اور میں تمہیں اس بارے میں کوئی بحث نہیں کرنے دوں گا۔ میں آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں کہ اس بارے میں تم ایک لفظ بھی نہیں بولو گے۔ ورنہ میں تمہیں فون نہیں کروں گا اور میں تمہاری ہی قسم کھا کر یہ بات کہہ رہا ہوں۔"

عمران کا لہجہ بے حد سنجیدہ اور حتمی تھا۔ شاید اس کے پیچھے کوئی راز تھا۔ میں خاموش ہوگیا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے کہا۔ "عمران! ثروت کئی دن سے نصرت کے لیے بہت پریشان ہے۔ کیا کسی طرح نصرت سے اس کی بات نہیں ہوسکتی؟"

"ہاں، اس طرح کی فرمائش کرو جو میں پوری بھی کر سکوں۔ اپنا شیخ لاہور میں ہی ہے۔ میں اس سے رابطہ کرتا ہوں۔ وہ یقیناً کچھ کرے گا۔"

"کیا تم یہاں نہیں آؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں لیکن گھبراؤ مت، تمہارے آس پاس ہی رہوں گا اور وقتاً فوقتاً تم سے فون پر رابطہ بھی رکھوں گا۔"

"ہمیں کتنے دن یہاں اور رہنا پڑے گا؟"

"ایک نمبر کے چغد ہو تم۔" وہ آواز دبا کر بولا۔ "دیکھو، قدرت نے کتنا نرالا موقع فراہم کیا ہے تمہارے لیے۔ ثروت اور تم ایک جگہ ہو بلکہ ایک ہی کمرے میں۔ یہ پچویشن شریف ترین ہیرو شاہ رخ کو بھی جوہی چاولہ یا کاجل وغیرہ کے ساتھ ملی ہوتی تو انڈیا کی فلمی تاریخ کیا سے کیا ہوگئی ہوتی۔ تم جانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہو۔"

موبائل کے اسپیکر سے ہلکی سی آواز نکل کر کمرے میں بکھر رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ آواز ثروت کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ میں نے کہا۔ "اوّل نمبر کے خبیث ہو تم۔" اور فون بند کر دیا۔

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ نصرت سے رابطہ کرانے والا وعدہ، عمران دو تین دن سے پہلے پورا کر سکے گا۔ وہ خود بھی انڈیا میں تھا مگر اس کے ہاتھ واقعی لمبے تھے۔ اپنے ذرائع سے وہ بہت جلد اپنے مقررہ ہدف تک پہنچ جاتا تھا۔ شاید سلطان چیتا وغیرہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ عمران کا قریبی دوست ہونے کے باوجود میں کئی پہلوؤں سے اسے نہیں جانتا تھا۔ اس کی زندگی کے کئی تاریک گوشے بھی موجود تھے۔

اگلے ہی روز دوپہر سے پہلے ایک کال موصول ہوئی۔ یہ پاکستان کا نمبر تھا۔ پہلے جیلانی (شیخ) کی آواز ابھری۔ اس نے میرا حال احوال پوچھا اور رسمی کلمات ادا کیے پھر بولا۔ "لو تابش صاحب! نصرت بہن سے بات کرو۔"

"ہیلو تابش بھائی!" نصرت بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"ہیلو نصرت! تم ٹھیک ہو نا؟"

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے ہیں آپ لوگ؟ اور باجی کہاں ہیں؟ میں دن رات ان کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا میرے ساتھ۔"

"ہم بالکل خیریت سے ہیں نصرت اور ثروت بھی بالکل خیریت سے ہے۔ بس ایک معاملے میں پھنس گئے تھے ہم۔ لیکن اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ بہت جلد تم ہمیں اپنے پاس دیکھو گی۔ ہوسکتا ہے کہ یوسف ہم سے پہلے ہی تم تک پہنچ جائے۔"

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ "وہ پہنچ چکا ہے تابش بھائی! وہ پرسوں شام ہی آگیا تھا۔" نصرت کے لہجے میں یوسف کے لیے بیگانگی اور تلخی تھی۔

"وہ خیریت سے ہے نا؟"

"وہ تو خیریت سے ہے لیکن... وہ دوسروں کی خیریت کو برباد کر رہا ہے۔"

"کیا ہوا؟" میں نے ذرا چونک کر پوچھا۔

"بس کچھ نہیں۔ آپ پہلے ہی پریشان ہیں۔"

"نہیں نصرت! مجھے بتاؤ۔ میں نے اسی لیے تو تم سے فون کرایا ہے۔ ہم تمہارے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے۔"

ذرا توقف کے بعد نصرت بولی۔ "تابش بھائی! یہاں وہی کچھ ہو رہا ہے جو میں بار بار باجی سے کہہ چکی ہوں۔ آپ باجی کو نہ بتائیے گا لیکن یہاں یوسف نے وہی کیا ہے جس کی اس سے توقع تھی۔"

کھل کر بتاؤ نصرت۔''

وہ سسکنے لگی۔ ''تابش بھائی! چند روز سے گھر کے نمبر پر پھر اسی خبیث جرمن لڑکی کے فون آ رہے ہیں۔ کل رات پھر فون آیا ہوا تھا۔ یوسف اس سے بڑی دیر باتیں کرتا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ان دونوں میں پھر صلح ہو رہی ہے... میں نے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ان دونوں کی کچھ باتیں سنی ہیں۔ یوسف کو شک ہوا۔ اس نے کھڑکی کھول کر مجھے دیکھ لیا۔ سخت برا بھلا کہا... اسی وقت گھر سے نکل جانے کو کہا۔ میں قدرت اللہ صاحب کے آستانے پر آ گئی ہوں۔ اس وقت وہیں سے بول رہی ہوں۔ میں نے چھوڑ دیا ہے اس کا گھر۔''

میں حیران رہ گیا۔ یوسف کے حوالے سے ایسی خبر کی توقع مجھے نہیں تھی۔ جرمن بیوی کے پھر سے رابطے والی بات بھی غیر متوقع ہی تھی۔ لیکن نصرت جو بتا رہی تھی، وہ یقیناً سچ تھا۔

نصرت سسکتے ہوئے بولی۔ ''تابش بھائی! آپ لوگ جلدی آ جائیں۔ آپ جسے ڈھونڈنے نکلے تھے، وہ تو یہاں دندنا رہا ہے اور آپ ابھی تک نہ جانے کہاں ہیں۔ یہ ٹھیک بندہ نہیں ہے تابش بھائی! اب کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ اس نے کل رات بڑی بدتمیزی کی ہے۔ باجی کے لیے ایسی ایسی باتیں کی ہیں کہ وہ سن لیں تو رو رو کر برا حال کر لیں۔ اسے باجی پر بالکل بھروسا نہیں۔ وہ آپ کے لیے بھی بہت غلط سوچ رکھتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، اگر اب بھی باجی کی آنکھیں نہیں کھلیں گی تو کب کھلیں گی۔ آپ انہیں سمجھائیں تابش بھائی! اب تو ہوش میں آ جائیں۔''

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا نصرت۔''

''آپ باجی کو فون دیں۔ کہاں ہیں وہ؟''

''لیکن تم کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرو گی۔''

میں نے فون ثروت کو تھما دیا۔ ان کی گفتگو شروع ہوئی تو طویل ہوتی چلی گئی۔ نصرت نے گو مجھ سے کہا تھا کہ وہ ثروت کو مزید پریشان نہیں کرے گی لیکن جب دونوں بہنوں نے دکھ سکھ شروع کیا تو وہ کچھ بھی چھپا نہیں سکی۔ میں نے ثروت کی آنکھوں سے آنسو رستے دیکھے اور اس کے چہرے کو رنج و الم کے رنگ اوڑھتے دیکھا۔ یہ اطلاع ثروت کے لیے یقیناً تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی کہ یوسف اسے نہ صرف یہاں چھوڑ کر پاکستان واپس جا چکا ہے بلکہ نصرت سے سخت جھگڑا بھی کر چکا ہے۔

کچھ دیر بعد نامعلوم وجہ سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ثروت کچھ دیر ہیلو ہیلو کرتی رہی پھر فون مجھے تھما کر بستر پر دراز ہو گئی۔ اس نے بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔

☆☆☆

ہم اس کمرے میں بند تھے۔ ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ فرید کوٹ کی اس رہائشی عمارت کے اندر و باہر کیا ہو رہا ہے۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ فقط اس چھوٹے سے خلا کے ذریعے تھا۔ اسی میں سے کھانے کی ٹرے اندر آتی تھی اور دیگر ضروریات بشمول لباس وغیرہ۔ ہمیں مہیا کی جاتی تھیں۔ جادا سمیت کسی نے بھی ہم سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ قریباً اڑتالیس گھنٹے سے عمران کا فون آیا تھا اور نہ نصرت کی طرف سے کال ہوئی تھی۔ میں جگت کے لیے پریشان تھا کیونکہ اس کی طرف سے کوئی اطلاع مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس نے ایک سچے خاصے کی طرح بڑی بے جگری سے جادو کے ٹھکانے پر حملہ کیا تھا۔ اس کی دلیری اور ہمت پر کوئی شک نہیں تھا لیکن جادا جیسے بدنام زمانہ بدمعاش کے سامنے اس کی کوئی پیش نہیں چل سکی تھی۔

یہ دوسری تیسری رات کا واقعہ ہے۔ ثروت نے میرے سینے کے زخم کی مرہم پٹی کی اور اصرار کر کے مجھے اینٹی بایوٹک دوا بھی کھلائی۔ پھر وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ میں نے اسے بہت کہا تھا کہ وہ بستر پر سو جایا کرے لیکن گاؤں کی طرح وہ یہاں بھی نہیں مانی تھی۔ وہ قالین پر ہی سوتی تھی۔ ہاں، ہم دونوں کے درمیان چھ سات فٹ کا فاصلہ رہتا تھا۔ چھ سات فٹ کا فاصلہ جو درحقیقت چھ سات صدیوں کا فاصلہ بن چکا تھا۔ دل کے تار نہ مل رہے ہوں تو جسموں کا قرب کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رات کی تاریکی، سناٹا، مکمل تنہائی اور غنودگی مل جل کر انسان پر جادو سا کر دیتے ہیں۔ وہ کہیں سپنوں اور بیداری کے درمیان بھٹک رہا ہوتا ہے اور اس کی ساری کیمسٹری بدل جاتی ہے۔

اس رات بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ میں نے کروٹ بدلی تو مجھے لگا کہ میرا چہرہ ایک خوشبو میں دھنسا ہوا ہے۔ اپنی ناک کے قریب مجھے ریشمی سرسراہٹ محسوس ہوئی، یہ ثروت کی چوٹی تھی۔ میں نہ جانے کب کروٹ بدلتا ہوا ثروت کے قریب چلا آیا تھا۔ کچھ شرارت اس کی چوٹی نے کی تھی اور میری طرف بڑھ آئی تھی۔ اب اس کے ریشمی بال عین میری ناک اور ہونٹوں سے چھو رہے تھے۔ ایک بے نام سی کیفیت پیدا ہوئی۔ ان بالوں کے لمس اور ان کی مہک نے بہت سی حسین یادوں کے در کھول دیے۔ کئی دل گداز ملاقاتوں کا منظر نگاہوں کے سامنے کھلتا چلا گیا۔

میں نے دیکھا، زیادہ قصور میرا ہی تھا۔ میں نیند کی حالت میں اپنے تکیے سے کافی دور چلا آیا تھا۔ میں نے جلنا

یوں جیسے کسی جادوئی گرفت نے مجھے جکڑ لیا۔ ہاں، یہ تاریکی اور تنہائی کا جادو تھا۔ میں ثروت کے کچھ اور قریب چلا گیا۔ اپنے پوروں سے اس کے چہرے کے نشیب و فراز انگلیوں سے سہلانے لگا۔ اس کی پیشانی، ناک اور ہونٹ جو کبھی میرے بہت قریب تھے، میرے اپنے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر جب میں نے اس کے رخسار کو چوما تو وہ بیدار ہو گئی۔

''تابش'' گہری تاریکی میں اس کی تھکی ہوئی آواز ابھری۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی انگلیوں کے ساتھ تیزی سے میرے چہرے کو چھوا۔ جیسے اپنی انگلیوں سے مجھے دیکھنا چاہ رہی ہو پھر وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں بس اس کا مدھم ہیولا ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے میری طرف سے رخ ذرا سا پھیرا ہوا تھا۔ وہ جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ کیا ہوا ہے۔

ایک عجیب سی دلیری میرے سینے میں آتشیں لہر کی طرح دوڑ گئی۔ میں نے عقب سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی صراحی دار گردن کا عقبی حصہ میرے سامنے تھا۔ میں نے اس کی گردن کے ریشم پر اپنے جلتے ہونٹ رکھ دیے۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ میں نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے کو، اس کے کان کی لو کو، اس کی گردن کو بوسے دینے لگا۔

اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ ''پلیز تابش... پلیز تابش!'' وہ کراہ رہی تھی۔

پھر وہ جلدی سے اٹھی اور میرے ہاتھ پیچھے ہٹاتی ہوئی بستر پر جا بیٹھی۔ ''آپ ایسا نہ کریں تابش!'' وہ کراہی۔ ''آپ مجھے کمزور کر رہے ہیں۔ مجھے تو ڈر رہے ہیں۔ پلیز ایسا نہ کریں۔''

''بس... سوری ثروت! میں بھی تو اتنا مضبوط نہیں ہوں اور تمہارے حوالے سے تو بالکل نہیں... میں... معافی مانگتا ہوں ثروت۔'' میں نے تہ دل سے کہا۔ میں واقعی بے پناہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

وہ خاموش رہی۔ جیسے میری کیفیت کو سمجھ رہی ہو اور کسی حد تک میرے ساتھ ہمدردی بھی محسوس کر رہی ہو۔ کتنی ہی دیر تک ہمارے درمیان گمبھیر خاموشی طاری رہی۔

آخر میں نے کہا۔ ''ثروت! اگر تم چاہو تو میں جادا سے بات کرتا ہوں۔''

''کس بارے میں؟''

''ثروت! جادا تمہاری سلامتی اور حفاظت کی ضمانت

دے چکا ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ پٹھان زبان سے پھرنے کا نہیں۔ اگر... تم چاہو... تو میں اپنے لیے کسی دوسرے کمرے کا انتظام کر لیتا ہوں۔''

''نہیں تابش! میں ایسا نہیں چاہتی لیکن...'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''لیکن کیا؟''

''میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔''

"ہاں... ثروت! میں سن رہا ہوں۔"

وہ کچھ دیر چپ رہی پھر عجیب لہجے میں بولی۔ "تابش! میں نے خود سے عہد کر رکھا ہے کہ میں کبھی آپ کے بارے میں نہیں سوچوں گی۔ کبھی آپ کے... قریب نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں ثروت... کیوں؟"

"بس تابش! میرے دل میں کچھ خوف جم گئے ہیں۔ میں جتنی بھی کوشش کرلوں لیکن اپنے خیالات کو اپنے ذہن سے علیحدہ نہیں کرسکتی۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر میں نے اپنا عہد توڑا تو نصرت کی زندگی اذیت اور دکھ کا مجموعہ بن کر رہ جائے گی۔ اس نے سو سال بھی عمر پائی تو اپنی بیماری سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکے گی۔ یہ بیماری اس کے روئیں روئیں میں سرایت کر جائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے اس سلسلے میں سمجھانے کی کوشش کریں۔ اسے میرا واہمہ اور کمزور عقیدہ قرار دیں لیکن میں کیا کروں تابش! آپ کی قربت کو اور اس واہم کو ایک دوسرے سے جدا کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ خدا کے لیے تابش! مجھ پر رحم کریں۔ مجھے آزمائش میں نہ ڈالیں۔ میں اس آزمائش پر پوری نہ اتر سکی... کمزور پڑ گئی تو ساری زندگی خود کو معاف نہ کرسکوں گی۔"

میں اس کا ہیولا دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے اور اپنی پیشانی ان ہاتھوں پر رکھ کر سسکتی چلی گئی۔

کتنی ہی دیر تک ایک گمبھیر سناٹا بیڈ روم پر طاری رہا۔ اس سناٹے میں بس وال کلاک کی ٹک ٹک تھی یا میرے زخمی دل کی مایوس دھڑکن۔ آخر میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "ثروت! میں نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے۔ کبھی تمہیں کسی کام پر مجبور نہیں کروں گا۔ آج کے بعد میری طرف سے ہر طرح کا اطمینان رکھو۔ میں کوئی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔"

میں نے اپنا تکیہ اٹھایا اور کچھ مزید پیچھے ہٹا کر دیوار کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ چادر بھی دور کھینچ لی اور لیٹ گیا۔ ثروت نے اپنا تکیہ اٹھا کر بستر پر رکھ لیا اور لیٹ گئی۔ وال کلاک کی ٹک ٹک کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یہ کمرا اگر مکمل نہیں تو کافی حد تک ساؤنڈ پروف تھا۔

میں نے اپنی آنکھوں میں ہلکی سی نمی محسوس کی۔ محبت میں انسان کیوں اتنا بے بس ہو جاتا ہے؟ وہ اپنے سامنے بند گلی دیکھتا ہے پھر بھی رکتا نہیں، مڑتا نہیں، آگے بڑھنا چاہتا ہے لیکن بند گلیوں سے راستے کہاں پھوٹتے ہیں؟

اب ثروت بستر پر تھی اور میں نیچے تھا۔ مجھے لگا کہ آج اس نے وہ "احترام" واپس لے لیا ہے جو وہ مجھے دے رہی تھی۔ آج اس نے بستر پر سونا مناسب سمجھا ہے۔ اس صورتِ حال کا ذمے دار میں تھا، خود میں ہی تھا۔

میں لیٹا رہا۔ خود کو ملامت کرتا رہا۔ زخمی دل مزید زخمی ہوتا رہا۔ سینے کے زخم کچھ اور لو دیتے رہے۔ تو بھی احساس رگوں کو کاٹتا رہا۔ میں نے خود سے کہا... تم نے دیوار کو دیکھ لیا ہے۔ پھر کیوں رک نہیں جاتے؟ کیوں پتھر سے ٹکرا کر خود کو لہولہان کرنا چاہتے ہو؟ ان لوگوں میں خود شامل کرنا چاہتے ہو جو عشق کے دکھ جھیلتے جھیلتے بے نیل مرام دنیا سے چلے گئے۔ یہ گلی کسی کو رستہ نہیں دیتی۔ تمہیں کیسے دے گی؟ رک سکتے ہو تو رک جاؤ۔ پلٹ سکتے ہو تو پلٹ جاؤ۔ دل نے کہا، رکنا ہوتا تو بہت پہلے رک جاتا، پلٹنا ہوتا تو بہت پہلے پلٹ جاتا۔ میں عشق ہوں۔ میں دلیل کو نہیں مانتا۔ میں کچے گھڑے پر تیرتا ہوں۔ آنکھوں سے دیکھ کر زہر پیتا ہوں۔ میں نے مرتے دم تک آس کا دامن چھوڑنا نہیں سیکھا۔ میں یقین کے بل بوتے پر میں نے پتھر موم کیے ہیں، گہرے پانیوں میں دیے جلا کر دکھائے ہیں۔ موت ملے یا زندگی میں ہر حال میں سرخرو ہوتا ہوں۔

میں لیٹا رہا، سوچتا رہا۔ سینے میں درد کی ایک لہر سی چلتی رہی۔ چار پانچ منٹ بعد میں نے گہری تاریکی میں محسوس کیا کہ کوئی میرے پاؤں کی طرف موجود ہے۔ یہ ثروت کا ہیولا تھا... اچانک اس نے میرے پاؤں پکڑے اور اپنی پیشانی ان پر رکھ دی۔

"ثروت! کیا کرتی ہو؟" میں نے پاؤں چھڑانا چاہے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس نے پاؤں نہیں چھوڑے۔ ان پر اپنا چہرہ ٹکائے رکھا۔

اس کے گرم بھیگے چہرے کا سارا گداز میرے پاؤں میں منتقل ہو رہا تھا۔ اس کے ریشمی بالوں کی لٹیں میرے ٹخنوں سے چھو رہی تھیں۔

میں نے اسے پیچھے ہٹانا چاہا۔ وہ نہیں ہٹی۔ میرے پاؤں سے چمٹی رہی، سسکتی رہی۔ مجھے پاؤں کی انگلیوں پر گرم سیال کی موجودگی کا احساس ہوا۔ یہ ثروت کے آنسو تھے۔ میں تڑپ اٹھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کا کندھا تھام کر نرمی سے اسے پیچھے ہٹانے کی کوشش جاری رکھی۔ بہت مشکل سے اس نے اپنی گرفت ختم کی پھر تیزی سے اٹھ کر بیڈ پر چلی گئی۔

اگلے روز دوپہر کے بعد جب ثروت واش روم میں تھی... اسپیکر پر جادا کی بھاری بھرکم منحوس آواز سنائی دی۔ "ہیلو بچو، بچی! کیا کر رہے ہو تم دونوں؟"

"کچھ خاص نہیں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر کچھ خاص کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آج شام تم ایک بڑی ست پارٹی میں شریک ہو رہے ہو۔ خوب موج میلا ہوگا۔"

"کس قسم کی پارٹی ہے؟"

"بچے! جس قسم کی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ شراب، کباب، ڈانس، گانا بجانا۔ ڈانس آتا ہے تمہیں؟"

"نہیں۔"

"چلو دیکھنا تو آتا ہوگا نا۔ بڑی اچھی فلمی ڈانسر ہے۔ ممبئی سے خاص ہم لوگوں کی تفریح کے لیے یہاں پدھاری ہے۔ مزہ نہ آیا تو پیسے واپس۔ تم دونوں میاں بیوی کو دعوت ہے اور شرکت لازمی ہے۔" وہ ثروت کو بڑے یقین کے ساتھ میری بیوی قرار دے رہا تھا۔ شکر تھا کہ وہ کمرے میں نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ "جادا صاحب! ہم نہیں آسکیں گے۔"

"نہیں، یہ تو نہیں ہوسکتا۔ اگر دونوں نہیں تو ایک کو تو ضرور آنا ہوگا۔"

میں نے کوشش کی کہ اس پارٹی سے پیچھا چھڑا سکوں لیکن جادا بضد تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ اپنی رعایت واپس نہ لے لے۔ یعنی دونوں کی شرکت ضروری قرار نہ دے دے۔ ہماری حیثیت اس کے قیدیوں کی تھی۔ وہ کوئی بھی حکم لاگو کرسکتا تھا۔

شام کے وقت میں ثروت کو بمشکل سمجھانے میں کامیاب ہوسکا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ میں اسے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر جاؤں۔ وہ ٹھیک ٹھیک جاننا چاہتی تھی کہ میں کتنے بجے واپس آؤں گا۔ مجھے خود پتا نہیں تھا، اسے کیا بتاتا۔

میں جانے لگا تو اس نے میرا بازو تھام لیا۔ "پلیز تابش! اپنا خیال رکھیے گا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ حسبِ دستور پہلے ایک قریب ڈھائی فٹ کی مختصر کھڑکی کھلی۔ اس میں سے پریم چوپڑا نے جھانکا اور ثروت سے مخاطب ہو کر تحکمانہ انداز میں "کنڈی لگا دو اسے۔ الٹی کنڈی۔"

ہتھکڑی کے ہینڈ کف الماری کے اوپر رکھے تھے۔ میں نے ثروت کو اشارہ کیا۔ اس نے ہینڈ کف اتارے۔ میں نے ہاتھ پیچھے کی طرف موڑے۔ ثروت نے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑ دیے۔ چابی ثروت کے پاس ہی رہی۔ دروازہ کھول کر مجھے باہر نکال لیا گیا۔ ثروت کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید "پارٹی" کے حوالے سے جھوٹ بولا جا رہا ہے اور مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے مجھے باہر نکالا گیا ہے...

ثروت کا اندیشہ غلط ثابت ہوا اور میرا یقین درست نکلا۔ ایک طویل راہداری سے گزار کر مجھے ایک خم دار راہداری میں لایا گیا۔ یہ وہی خوب صورت راہداری تھی جس کے شیشے کے فرش کے نیچے پانی تھا اور رنگ برنگی مچھلیاں تیرتی تھیں۔ راہداری کا اختتام ایک محرابی دروازے پر ہوا۔ دروازے کی دوسری جانب سے بہت سے مرد و زن کی طرح طرح کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہلکے پھلکے قہقہے بھی گونج رہے تھے۔ میں ایک کیبن نما جگہ پر پہنچا۔ یہاں دو نیم عریاں لڑکیاں میرے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ وہ خوشبو میں بسی ہوئی تھیں اور ہر "مہربانی" پر مائل نظر آتی تھیں۔ کیبن کا مخملی پردہ ہٹایا گیا تو میں دنگ رہ گیا۔ میرے سامنے گول دائرے کی شکل کا ایک خوب صورت ہال تھا۔ یہ ہال سارے کا سارا شیشے کا بنا ہوا تھا۔ یہاں موجود بیشتر فرنیچر بھی شیشے ہی کا تھا۔ مضبوط اور چمک دار شیشہ۔ فرش راہداری جیسا تھا۔ نیچے پانی تھا اور رنگین مچھلیاں، چھوٹے کچھوے اور اسی طرح کی دیگر آبی مخلوقات۔ پورے ہال میں خوشبوؤں، رنگوں اور روشنیوں کی بہار تھی۔ بہت بڑے ڈانسنگ فلور پر کوئی دو تین درجن مرد و زن رقص کے لیے تیار تھے۔ پھر آرکسٹرا دھن بکھیرنے لگا اور رقاص جوڑے متحرک ہوگئے۔

ایک لڑکی نے مؤدب لہجے میں کہا۔ "کوئی خدمت جناب؟"

"میرے ہاتھ کھول دو۔"

وہ دلنشیں انداز میں مسکرائی۔ "کوئی ایسی خدمت جو آپ کی یہ خادمائیں انجام دے سکیں... کوئی ڈرنک، کھانا، سگریٹس یا جو بھی آپ چاہیں۔"

میں نے دیکھا۔ ایک طرف میز پر شراب خانہ خراب سمیت بہت سے ڈرنکس رکھے تھے۔ مہنگے ترین امپورٹڈ سگریٹ اور سگار وغیرہ بھی موجود تھے۔ میں نے کہا۔ "نہیں، ابھی ضرورت نہیں۔"

وہ دونوں میرے دائیں بائیں بڑے اسٹائل سے کھڑی ہوگئیں۔ میں نے انہیں بیٹھنے کا کہا۔ وہ پہلے تو جھجکتی رہیں پھر مسکراتی ہوئی ایک ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔ موسیقی کی لے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہال میں موجود مہمان کھانے سے پہلے،

ہلکے پھلکے ڈرنکس لے رہے تھے اور اسموکنگ کر رہے تھے۔

میں نے دھیان سے دیکھا اور حیران ہوا... مہمانوں میں انڈین فلم سکرین کے دو چار جانے پہچانے چہرے بھی نظر آئے۔ ایک معروف ہیرو کی دید نے تو مجھے واقعی حیران کیا۔ اس کے گرد چلبلی لڑکیوں کا گھیرا تھا اور آٹوگراف وغیرہ لیے جا رہے تھے۔ صورتِ حال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ نقلی نہیں... واقعی اصلی ہیرو ہے۔ جادا کے قریب چودھری انور کی جھلک بھی دکھائی دی۔

میں نے سوچا، کتنا اچھا ہو کہ یہاں کہیں عمران بھی موجود ہو۔ میں اس کی صورت دیکھنے کو ترسا ہوا تھا۔ میں اردگرد نگاہ دوڑانے لگا لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔

اسی دوران میں موسیقی تھم گئی۔ رقص ختم ہو گیا۔ جوڑے میزوں پر واپس آ گئے۔ ایک طرف بنے ہوئے بلوری اسٹیج پر ورائٹی شو پیش کیا جانے لگا۔ انڈیا کے چند ٹی وی اسٹارز اپنی الٹی سیدھی حرکتوں کے ذریعے حاضرین کو ہنسانے کی کوشش کرتے رہے اور کہیں کہیں واقعی کامیاب بھی ہوتے رہے۔

اسی دوران میں کھانے کا دور شروع ہو گیا۔ میرے سامنے بھی شیشے کی دیدہ زیب تپائی پر شاندار کھانا چن دیا گیا۔ بائیں جانب بیٹھی حسینہ نے پوچھا۔ ”کیا کھائیے گا۔ اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں پتا ہے آپ مسلمان ہیں۔ یہ سارا حلال کھانا ہے۔“

”کھانے کے علاوہ تو سب کچھ حرام ہے نا۔“ میں نے اس کے سراپا پر اچٹتی نظر ڈالی۔

”آپ معزز مہمان ہیں۔ جو چاہے کہہ سکتے ہیں مگر حرام حرام میں فرق تو ہوتا ہے نا۔“ بائیں طرف والی لڑکی ادا سے مسکرائی۔

وہ مجھے اپنے ہاتھ سے کھلانا چاہتی تھی لیکن میں کھانے سمیت کسی چیز میں رغبت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

کھانے کے بعد بلوری ہال کی تیز روشنیاں بجھا دی گئیں۔ بس ہلکی نیلگوں اور سرخ روشنیاں رہ گئیں۔ ڈانسنگ فلور پر ایک قتالہ نمودار ہوئی۔ اس کی شکل بھی کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ اسے فلموں میں رقص کرتے دیکھا تھا لیکن اس کے نام سے آگاہی نہیں تھی۔ کوئی دوسرے درجے کی ایکٹریس تھی لیکن ”جسم“ پہلے درجے کا تھا... کچھ روشنیوں کے زاویے ایسے تھے کہ وہ قیامت اٹھا رہی تھی۔ مختصر لباس میں بھی اس کا شباب اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ ہال کے شاندار آڈیو سسٹم پر گانا گونجنے لگا۔ کچھ اس طرح کے بول تھے۔ رات بھر جام سے جام ٹکرائے گا... جب نشہ چھائے گا تب مزہ آئے گا...

اور واقعی رقاصہ کے رقص کا نشہ پوری محفل پر چھانے لگا۔ پیمانوں کی گردش تیز ہو گئی۔ دھوئیں کے مرغولے گنجلک ہوتے گئے۔ وہ ایک ایک کر کے اپنے جسم سے کپڑوں کا بوجھ کم کرتی گئی۔ اس کے انداز میں فنکارانہ چابک دستی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں رکے گی۔ لیکن وہ کہیں نہیں رکی۔ وہ مادر پدر آزاد ہو گئی۔ روشنیوں نے اس کے بدن... کو... سرتاپا شعلہ بنا دیا۔ موسیقی کی لے بھی تیز تر ہوتی چلی گئی۔ میں حیران ہو رہا تھا۔ بہت سے معروف لوگ یہاں موجود تھے جن میں ایک بہت بڑا انڈین فلم اسٹار بھی تھا۔ ان کی موجودگی میں یہ برہنہ تماشا جاری تھا۔

پہلے گانے کے بعد ایک دوسرا ہیجان خیز گانا چلنے لگا اور وہ اس گانے سے بھی پورا انصاف کرنے لگی۔ چند منٹ بعد کئی اور باڈی بلڈر نوجوان بھی اس شرمناک تماشے میں شامل ہو گئے۔ یہ وحشی جنگلیوں کے روپ میں تھے۔ یہ بھی عریاں تھے۔ بس اتنا فرق تھا کہ ان کے زیریں جسموں کو چند سبز پتوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ حسین ترشے جسم والی رقاصہ کے گرد ہیجان خیز انداز میں منڈلانے لگے اور ”کیمپ“ کے انداز میں اپنی جنسی پیاس کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے سنا تھا کہ انڈیا میں فار ایسٹ اور یورپ کی طرح نائٹ کلبوں میں لائیو سیکس شوز ہوتے ہیں۔ آج ان کی دید بھی ہو رہی تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس محفل میں بہت سی خواتین بھی موجود تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر اپنی نسوانی جھجک کو ”الکحل“ میں ڈبو چکی تھیں اور ساتھی مردوں کے ساتھ قہقہے بکھیر رہی تھیں۔ شراب پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ اچانک ایک شرابی کے دھکے سے شراب کی ایک ٹرالی الٹ گئی۔ کسی کا سگریٹ بھی گرا اور ایک دم آگ بھڑک اٹھی۔ یہ آگ اس تیزی سے پھیلی کہ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ چلانے کی آوازیں آئیں۔ مرد و زن ٹھوکریں کھاتے ہوئے بھاگے۔ کوئی آگ کی لپیٹ میں تو نہیں آیا لیکن خوف و ہراس بہت شدید تھا۔ میں نے ناہنجار شاربہ پائی کو دیکھا۔ وہ بچی گری دو عورتوں کو پاؤں تلے روندتی ہوئی سیڑھیوں تک پہنچی اور دھوئیں کے مرغولوں میں گم ہو گئی۔ میرے اردگرد بیٹھی دونوں لڑکیاں بھی باہر لپکیں۔ دھواں تیزی سے کیبن کی طرف بڑھ رہا تھا۔

مجھے وہ افراتفری یاد آ گئی جو سردار اوتار سنگھ کی حویلی میں پھیلی تھی اور جس سے فائدہ اٹھا کر میں اور ثروت سردار کی حویلی سے نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ کیا آج بھی کچھ ہو سکے گا؟ میرے ذہن سے سوال ابھرا۔

میں اٹھا اور کیبن سے باہر نکل آیا۔ شیشے کے فرش والی ... ری میں بھی دھواں بھر رہا تھا اور کوئی محافظ نظر نہیں آ رہا ... کوئی شرابی خوف زدہ انداز میں اپنی ساتھی کو پکار رہا تھا ... ای... کہاں ہو... کاشی!“

میں ... کے پہلو سے گزرتا ہوا بڑی راہداری میں ... نکل سیدھی تھی، وہ عمارت کے اسی حصے میں جاتی تھی ... موجود تھی۔ میں اس کمرے کی طرف لپکا لیکن ... ابھی بمشکل دس قدم آگے ہی گیا تھا کہ پریم چوپڑا نظر آیا۔ اس کے عقب میں دو اسلحہ بردار تھے۔ ان کی نظر سے بچنے کے لیے میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے پھر نیچے جانا چاہا لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر مسلح محافظ موجود تھے۔

اس دوران مجھے محسوس ہوا کہ بھگدڑ میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ نچلی منزل پر شعلے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہاں گاڑھا دھواں پھیل رہا تھا۔ اندازہ ہوا کہ جدید FIRE EXTINGUISHERS کے ذریعے ہال کمرے کی آگ پر کنٹرول حاصل کر لیا گیا ہے اور اب اسے بالکل ختم کیا جا رہا ہے۔ کاربن ڈائی آکسائڈ کی ہلکی سی بو محسوس ہو رہی تھی۔ میرے عقب کی کسی راہداری میں بھاری قدموں کی ٹھک ٹھک ابھری۔ میں ایک قریبی دروازہ کھول کر جلدی سے اس میں داخل ہو گیا۔ چند قدم آگے ایک اور دروازہ تھا۔ اس کے بھی تالے میں چابی لگی ہوئی تھی۔ شاید یہ چابی افراتفری میں یہاں لگی رہ گئی تھی۔ دروازے پر OX کے ناقابلِ فہم الفاظ لکھے تھے۔

میں نے یونہی تجسس کے تحت چابی گھمائی اور اندر چلا گیا۔ اس مستطیل کمرے کی دیواریں سفید تھیں۔ ایک طرف دو بڑے فریزر نظر آ رہے تھے۔ پوری ایک دیوار ان فریزرز نے گھیری ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ جس طرح ہاتھ موڑ کر میں نے قفل میں چابی گھمائی تھی، اسی طرح ایک فریزر کا ڈھکنا اٹھایا اور اندر جھانکا۔ اندرونی ... کی روشنی میں مجھے جو کچھ نظر آیا، وہ مجھے سکتہ زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے تو مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا ہی نہیں ہوا... فریزر میں گوشت محفوظ کیا گیا تھا، لیکن یہ کسی جانور کا گوشت نہیں تھا۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے آشا کور کو دیکھا اور گوبندر سنگھ کو دیکھا... ہاں، میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ یہ نیم برہنہ منجمد لاشیں ان دونوں ہی کی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے لکڑی کی طرح سخت نظر آتے تھے۔ پھر میری نگاہ ایک اور لاش پر پڑی۔ یہ آشا کور اور گوبندر کی لاش کے نیچے دبی پڑی تھی۔ چہرے کی صرف ایک سائڈ نظر آ رہی تھی۔ پھر بھی میں نے پہچان لیا۔ یہ پولیس کے مخبر روبیل سنگھ کی لاش تھی، جسے جادا کئی دن سے پہلے میں منصوبہ کر ... کر رہا تھا۔ چہروں کے نقوش دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے یہ تینوں افراد ابھی ابھی مرے ہیں۔

تب میری نگاہ ایک اور منظر پر پڑی اور اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ جواں سال کھلاڑی گوبندر کی لاش کا ایک بازو کندھے سمیت غائب تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے تیز دھار چھری سے بڑی صفائی کے ساتھ بازو کو جسم سے علیحدہ کیا گیا ہو۔ گوبندر کے جسم پر فقط ایک زیر جامہ تھا۔ اس کے اکڑے ہوئے جسم پر برف کے ذرات تھے۔ مجھے لگا جیسے میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہ کیا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے دیکھا، خوبرو آشا کور کا منہ خوفناک انداز میں کھلا پڑا ہے۔ جیسے ابھی ابھی اسے گولی مارنے کے بعد پسٹل کی نال اس کے منہ میں سے نکالی گئی ہو۔ یہ سب کچھ بہت ہولناک تھا۔ میں نے جلدی سے فریزر کا دروازہ بند کیا اور واپس پلٹا۔

یہی وقت تھا جب مجھے کسی قریبی کمرے سے بڑی عجیب سی آواز سنائی دی۔ یہ در و دیوار کو چیرتی ہوئی سی تیز آواز کسی انسان کی تو ہرگز نہیں تھی۔ یہ کسی درندے کی آواز تھی لیکن کس درندے کی؟ شیر، ہاتھی، چیتے وغیرہ کی آواز میں نے سن رکھی تھی۔ کسی اور آواز کا تجربہ نہیں تھا۔ چند لمحوں بعد آواز دوبارہ سنائی دی۔ آواز کا ماخذ عمارت کے اندر ہی تھا لیکن کچھ فاصلے پر تھا۔ غالباً کئی دیواروں نے اس آواز کو ملفوف کر رکھا تھا۔

اب سامنے والی راہداری میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرا یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے دونوں دروازے کھولے اور باہر آ گیا۔ آگ بجھ چکی تھی لیکن دھواں راہداریوں میں پھیلا ہوا تھا۔ دھوئیں کے سبب لوگ کھانس رہے تھے اور آنسو بہا رہے تھے۔ میں سیڑھیوں تک ہی پہنچا تھا کہ زہندر کمار کی پکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”وہ ہے... وہ سامنے۔“

دو مسلح افراد لپک کر میرے پاس آ گئے اور مجھے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اتنے میں چوڑی ناک والا پریم چوپڑا بھی پہنچ گیا۔ ”تم اوپر کیسے آ گئے؟“

”جیسے کئی دوسرے لوگ آئے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

”تم ٹھیک ہو؟“

...اس نے کہا۔ "مجھے پتا چلا ہے تابش بھائی! وہ خبیث پھر پاکستان میں ہے۔ اسلام آباد کے ایک فائیو اسٹار [ہوٹل] میں ٹھہری ہوئی ہے۔ وہ اپنا کتا یہیں چھوڑ گئی تھی نا... [illegible] کہتے" میت اس سے ملنے گیا ہوا ہے۔ لگتا ہے وہ یوسف کو اور اس کے علاوہ وہ اپنے کتے کو یہاں سے لے جانے کے لیے آئی ہے... یقیناً اسلام آباد میں دونوں [اس] کے آگے پیچھے دُم ہلا رہے ہوں گے۔ پلیز تابش بھائی! [illegible] ان سے کہیں کہ اب تو اپنی آنکھیں کھول لیں۔ آپ کوشش تو کریں تابی بھائی! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں، ان کے دل میں اب بھی آپ کے لیے بے پناہ محبت ہے۔ بس اس محبت پر لوہے کے خول چڑھائے ہوئے ہیں انہوں نے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا۔"

"مجھے ٹھیک سے پتا نہیں کہ آپ اس وقت کہاں ہیں اور کن حالات میں ہیں۔ لیکن یہ تو ہے نا کہ قدرت نے آپ کو ایک بہترین موقع دیا ہوا ہے۔ یوسف پاکستان میں ہے اور آپ دونوں وہاں اکٹھے ہیں۔ آپ اس قربت سے فائدہ اٹھائیں۔ کسی وقت... سارے اندیشے ایک طرف رکھ کر باجی کا ہاتھ پکڑ لیں۔ ان سے کہہ دیں کہ آپ انہیں برباد نہیں ہونے دیں گے۔ آپ انہیں نہیں چھوڑیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے بات ختم کرنا چاہی۔

"آپ کو پتا ہے... پرسوں کون سا دن ہے؟"

"کون سا؟"

"آپ مرد حضرات بھول جاتے ہیں لیکن ہم خواتین نہیں بھولتیں۔ پرسوں کے دن آپ کی اور باجی کی منگنی ہوئی تھی۔ مجھے اس دن کی ایک ایک گھڑی یاد ہے... ایک ایک واقعہ۔ مجھے پتا ہے اس دن باجی بہت اداس ہو جاتی ہیں۔ خود کو کسی کمرے میں بند کر لیتی ہیں۔ اپنی آنکھیں بھگوتی رہتی ہیں۔ پرسوں آپ ضرور اس بارے میں ان سے بات کرنا۔"

"ٹھیک ہے نصرت... یوسف کی طرف سے پھر تو کوئی رابطہ نہیں ہوا تمہارے ساتھ؟"

"نہیں تابی بھائی! اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ صرف ایک بار فاروقی انکل کا فون آیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں قدرت اللہ کے گھر پر ہوں۔ بس یہی جاننے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے دوسری بار پوچھنے کی زحمت ہی نہیں کی کہ زندہ ہے یا مر گئی۔"

میں نے کہا۔ "لو باجی سے بات کرو۔" اور فون ثروت کو تھما دیا۔ دونوں بہنیں باتیں کرنے لگیں۔

میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی۔ اور خاص کمرے کے اندر دیکھا ہوا منظر جیسے دل پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے یہ منظر جیتی جاگتی زندگی کا حصہ ہی نہیں ہے۔ میں نے کسی ڈراؤنی فلم کا سین دیکھا ہے۔ وہ سب کیا تھا؟ ان لاشوں کو کیوں حنوط کیا گیا تھا؟ یہ سفاکی اور درندگی کی انتہا تھی اور پھر وہ آواز جو بالائی منزل کے کسی حصے سے ابھری تھی۔ ایک خون آشام آواز۔ کیا ان منجمد لاشوں کا اور اس آواز کا کوئی تعلق تھا؟ جاوا جیسے لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ میں سوچتا رہا اور اپنی حیرت میں اضافہ کرتا رہا۔

مجھے عمران کے فون کا شدت سے انتظار تھا لیکن فون نہیں آ رہا تھا۔ میری نگاہ بار بار فون سیٹ کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ ثروت اپنی گفتگو ختم کر چکی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میری ہدایت کے مطابق نصرت نے اسے پریشان کن خبروں سے دور رکھا ہے۔ ثروت نے زیادہ تر نصرت کی طبیعت اور اس کے علاج معالجے کی بات ہی کی تھی۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ نصرت نے پیر قدرت اللہ سے بھی ثروت کی تھوڑی سی بات کرا دی تھی۔ ان پر ثروت کو بہت یقین تھا۔ ان کی گفتگو سے اس پر اچھے اثرات پڑے تھے...

اگلے روز سویرے میں اپنے فرشی بستر سے اٹھا تو سب سے پہلے رات والے بھیانک مناظر ہی ذہن میں آئے۔ ثروت بیڈ پر موجود نہیں تھی۔ میں نے دیکھا، وہ بے چین سی ٹہل رہی تھی۔ "کیا بات ہے ثروی؟" میں نے پوچھا۔

"دم سا گھٹ رہا ہے۔ پتا نہیں یہ کیسی بو ہے۔ رات کو بھی پریشان کرتی رہی ہے۔"

بو واقعی موجود تھی۔ یہ دھوئیں اور آگ بجھانے والی گیسوں کی ملی جلی بو تھی۔ کمرا چونکہ بالکل بند تھا، یہ بو یہاں ٹھہر کر رہ گئی تھی۔ میں نے بیل بجا کر گارڈ کو طلب کیا۔

مختصر کھڑکی کے پینل نے سلائڈ کیا اور نریندر کا کرخت چہرہ نظر آیا۔ "ہاں جی، کیا پرابلم ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اسے بو کے بارے میں بتایا... اس نے کہا۔ "ایگزاسٹ فین چلا دو۔"

میں نے کہا۔ "وہ کل سے چل نہیں رہا۔ اسے ٹھیک کراؤ لیکن اس سے پہلے کچھ دیر کے لیے دروازہ کھول دو۔"

"دروازہ نہیں کھل سکتا۔ ہاں، یہ کھڑکی میں کھلی رہنے دیتا ہوں۔" اس نے خشک لہجے میں کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔

مختصر کھڑکی کھلی رہی۔ اس سے تھوڑا بہت فرق پڑ گیا۔ اسی دوران میں ناشتا بھی آ گیا۔ میں واش روم سے نکلا تو ثروت ناشتا میز پر سجا چکی تھی۔ میری پسند ناپسند کا اسے بہت

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ میرے ہینڈ کف چیک کرنے کے بعد وہ لوگ مجھے نیچے لے آئے۔ بیرونی کھڑکیاں اور دروازے کھول دیے گئے تھے، ایگزاسٹ چل رہے تھے۔ دھواں تیزی سے چھٹنا شروع ہو گیا تھا۔ گول ہال میں شیشے کی قیمتی کرسیاں اور میزیں الٹی پڑی تھیں۔ کافی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔ رقص گاہ والی سائڈ جل گئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر اس آتشزدگی میں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ دو تین افراد معمولی زخمی ہوئے۔ ان میں شاربہ بائی بھی تھی۔ اس کا ایک بازو، کہنی کے پاس سے جل گیا تھا۔ معروف فلمی اداکار اب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ غالباً وہ واپس جا چکا تھا۔ بیشتر مہمان بھی کچھ بدمزہ سے ہو گئے تھے۔ تاہم جاوا نے اعلانیہ انداز میں کہا۔ "دوستو! پارٹی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ پارٹی جاری ہے۔ ہم دوسرے ہال میں انتظام کر رہے ہیں۔ کیول چند منٹ انتظار کرنا پڑے گا آپ کو۔ بہت سے مزیدار تماشے آپ کے منتظر ہیں۔"

مجھے واپس کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ مجھے دیکھ کر ثروت کا چہرہ کھل اٹھا۔ کمرے کا سلائڈنگ دروازہ باہر سے لاک کر دیا گیا۔ پھر مختصر کھڑکی کھلی اور پریم چوپڑا نے اس میں سے جھانک کر ثروت کو مخاطب کیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "اس کی کڑی کھول دو۔" ثروت نے میرے ہاتھ کھول دیے۔ مختصر کھڑکی بند ہو گئی۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ... اور یہ بھاگ دوڑ کی آوازیں کیسی تھیں؟" وہ شکوہ کناں آواز میں بولی۔

"اوپر ہال کمرے میں آگ لگ گئی تھی۔ جہاں شراب کی بدمستیاں زیادہ ہوں وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔"

"مجھے بھی دھوئیں کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟"

"ہو جاتا تو اچھا تھا لیکن... پھر ہم تم بھی خطرے میں پڑ سکتے تھے۔"

"آپ... مجھے اس طرح چھوڑ کر نہ جایا کریں۔" وہ پلکیں جھکا کر بولی۔

میں بغور اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے ہولے سے کہا۔ "میں زندہ رہنے کے لیے تھوڑی سی آس چاہتا ہوں ثروت! بس امید کی ایک کرن... جو مجھے... اس اندھے رستے پر نظر آتی رہے... میں کچھ اور نہیں چاہتا۔ بس میری اتنی سی بات مان لو۔"

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ "ثروت! تم نے کہا ہے کہ تمہارے دل و دماغ میں نصرت کی بیوگی کا خوف بیٹھ گیا ہے۔ مجھے [illegible] سے پوری امید ہے کہ وہ اچھی ہو جائے گی۔ جب وہ بالکل ٹھیک ہو جائے، پہلے کی طرح چلنے بولنے لگے تو پھر تمہاری سوچ کیا ہوگی ثروت... کیا پھر بھی تم مجھے اسی طرح سے VOID کرتی رہو گی۔ ایک خطرہ سمجھتی رہو گی؟"

وہ بے دم سی ہو کر بیٹھ گئی... ہونٹوں پر چپ [illegible] تھی۔

میں نے جواب پر اصرار کیا تو وہ بولی۔ "تابش! آپ ایسے سوال کیوں کرتے ہیں جو مجھے اندر سے زخمی کر دیتے ہیں۔ میں آپ کے سوال کا کیا جواب دوں جو کچھ بھی ہے۔ میں یوسف کی بیوی ہوں۔ قانونی، شرعی، اخلاقی ہر لحاظ سے پابند ہوں تابش۔"

"کم از کم "اخلاق" کی بات تو نہ کرو ثروت... وہ کچھ کر رہا ہے اس کے بعد اخلاق کے حوالے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ اور اب تو وہ بالکل کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ گریس اپنی تمام بے راہ روی کے باوجود پھر اس کی زندگی میں گھس رہی ہے اور کامیاب بھی ہو رہی ہے۔"

"لیکن آئندہ کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں تابش؟ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اگر حالات بہتر نہیں ہوتے تو بھی خراب ہو جاتے ہیں... تب بھی مجھے یقین ہے کہ یوسف اتنی آسانی سے... مجھے... آزاد نہیں کریں گے۔"

"ہاں... حق ملکیت کا احساس تو اس میں بہت زیادہ ہے۔ لیکن تم نے یہ بھی ٹھیک کہا ہے کہ کل کے بارے میں ہم آج کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیا پتا کل کسی اور کے اصرار پر وہ تمہیں آزاد کرنے پر مجبور ہو جائے۔" میرا اشارہ گریس کی طرف تھا۔

ثروت کی خوب صورت پیشانی پر الجھن کی لکیریں گہری ہو گئیں۔ "پلیز تابش! آپ کسی اور موضوع پر بات کریں۔ میرا دل گھبرانے لگتا ہے..."

میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ پاکستان سے کال تھی۔ نصرت والا نمبر تھا۔ "ہیلو نصرت! کیا حال ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ پیر صاحب کے گھر پر ہی ہوں۔ وہ سگی بیٹیوں کی طرح میرا خیال رکھ رہے ہیں۔ اگر کسی نے انسان کے روپ میں فرشتہ دیکھنا ہو تو انہیں دیکھے۔ [illegible] سے ڈاکٹر رضوان جو میرا ٹریٹ منٹ کر رہے ہیں، وہ بھی [illegible] صاحب کے عقیدت مندوں میں سے نکل آئے ہیں۔ [illegible] مجھے زیادہ توجہ دینے لگے ہیں..."

دو منٹ کی گفتگو کے بعد وہ پھر یوسف والے موضوع

کریدنے سے بچالیا تھا۔ اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی
... دونوں پر آدھا مکھن آدھا ... جسم۔
میں اس کے کومل ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ چوڑیوں کی ہلکی کھنک سنائی دیتی رہی۔ ایک بھولا بسرا منظر پردۂ تصور پر چمک گیا۔ وہ ہمارے گھر میں تھی۔ کچن میں کھڑی اسی طرح سلائس پر چھری سے مکھن لگا رہی تھی۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کردیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور میری نیت بھانپ کر چھری سیدھی کرلی۔ ”خبردار! میں شریف لڑکی ہوں، میرے قریب نہ آنا۔ میں قتل کردیا کرتی ہوں۔“

”شریف لڑکیاں اپنے ہونے والے شوہروں کو چھری سے نہیں اداؤں سے قتل کرتی ہیں۔ تھوڑی سی بات پر خون خرابا اچھا نہیں ہوتا۔“

”میں جانتی ہوں آپ کی تھوڑی سی باتیں۔“ وہ شوخی سے بولی۔

”ارے آگ ہے پیچھے۔“ میں نے ایک دم کہا۔

وہ پلٹی اور میں نے اسے بانہوں میں جکڑ لیا۔ اس کی چھری والی کلائی میری گرفت میں تھی۔ ”اب بتاؤ تھانے جانا ہے، یا یہیں پر مک مکا کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”رشوت لینے اور دینے والا دونوں آگ میں جلتے ہیں۔“

”رشوت لینے والا تو ویسے بھی آگ میں جل رہا ہے... فائر بریگیڈ والی کو کچھ خبر ہی نہیں ہے۔“ دست درازی روکنے کے لیے اس نے آخری حربہ آزمایا اور فرح کو آوازیں دینے لگی۔ حربہ کامیاب رہا اور مجھے موقع سے کھسکنا پڑا۔

ایسے بھولے بسرے مناظر ہر وقت میرے ذہن پر یلغار کرتے رہتے تھے اور میرے بے پناہ آتشیں درد کو ہوا دیتے تھے۔

ناشتے کے بعد میں نے اٹھ کر مختصر خلا میں سے جھانکا اور میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ایک بار پھر مجھے لگا کہ میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے مختصر کھڑکی سے صرف چھ سات فٹ کی دوری پر دو عدد بہت بھاری بھرکم ریچھ دیکھے۔ ان کی جسامت ناقابلِ یقین تھی۔ ان کے رنگ براؤن تھے، وہ مست ہاتھیوں کی طرح ہال کمرے میں چکرا رہے تھے۔ ان کی ایک ایک پچھلی ٹانگ سے اسٹیل کی نہایت مضبوط زنجیر بندھی ہوئی تھی... فرش پر گھسٹنے سے یہ زنجیر رگڑ کی زوردار آواز پیدا کرتی تھی۔ سفید پولر ریچھوں کے برعکس ان کے دانت زیادہ بڑے اور خوفناک تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کل شب میں نے بالائی منزل پر جو نامانوس آوازیں سنی تھیں، وہ ان میں سے ہی کسی خوفناک درندے کی تھی۔ ان جانوروں کا قوی ہیکل سیاہ فام ... بھی ان کے قریب موجود تھا۔ تاہم وہ ان سے معقول ... رکھے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر ... ہوتا تھا کہ وہ بھی ان سرخ انگارہ آنکھوں والے جانوروں پر پوری طرح بھروسا نہیں کر پا رہا۔ جانور غالباً چہل قدمی کے لیے اس وسیع مستطیل ہال میں ... تھا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ آیا۔ ثروت ... درست کررہی تھی۔ وہ اس ساری صورتِ حال سے بے ... تھی اور بے خبر ہی رہتی تو اچھا تھا۔

وہ آج قدرے بہتر موڈ میں نظر آرہی تھی۔ ... ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے تھوڑی سی توجہ اپنے ... جیسے پر بھی دی تھی۔ بالوں میں برش کیا ہوا تھا۔ تین چار ... بعد اس نے لباس بھی تبدیل کیا تھا۔ سرخ پھولوں ... شلوار قمیص اس کے جسم پر بہت سج رہی تھی۔ شانوں پر ... تھا۔ وہ جھاڑ پونچھ کرتی ہوئی مختصر کھڑکی کی طرف چلی ... میری خواہش تھی کہ وہ کھڑکی سے باہر نہ جھانکے لیکن اس سے پہلے کہ میں اس سلسلے میں کچھ کرتا، اس نے جھانک لیا۔ وہ یہی وقت تھا جب دونوں میں سے ایک جانور اپنی مخصوص آواز نکالتا ہوا تیزی سے کھڑکی کی طرف آیا۔ اس نے ... وحشت سے اپنا چہرہ کھڑکی کے ایک فٹ چوڑے خلا میں گھسانے کی کوشش کی تھی۔ یوں لگا کہ اس نے پوری دیوار ہلا دی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی کوشش میں ناکام ہوا مگر ثروت کی آواز لرزہ خیز تھی۔ وہ چلا کر میری طرف پلٹی اور مجھ سے چمٹ گئی۔ ”تابش... تابش!“ وہ پکارتی جارہی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ میری چھاتی میں گھسیڑ دیا۔ میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔

اسی طرح اپنے ساتھ لگائے لگائے میں اسے کھڑکی سے دور لے آیا۔ وہ سرتاپا لرز رہی تھی۔ اس کی ... نسوانیت دل لبھانے والی تھی۔ شاید ایسے ہی کسی حسین ... کی ”قربت“ کے لیے شاعر حضرات، بجلی کڑکنے یا طوفان اچھلنے کی تمنا کرتے ہیں۔ سنگین صورتِ حال کے باوجود میں ان لمحوں سے محظوظ ہوا۔ کچھ دیر بعد میں نے اسے خود سے جدا کیا تو وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کی پشت کھڑکی کی طرف تھی۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”پلیز تابش! اسے بند کرائیں... ابھی بند کرائیں۔“ اس کا اشارہ کھڑکی کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ ”ثروت! گھبراؤ مت۔ وہ جانور کمرے میں نہیں آسکتے۔ ان کا رکھوالا بھی ساتھ ہے۔“

”پہلے آپ کھڑکی بند کرائیں۔“ وہ ذرا غصے سے

میں نے زیندر کو پکارا اور اس سے کہا کہ وہ کھڑکی بند ... وہ مجھے طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے آیا ... شاید تمہاری سندر پتنی جانوروں کو دیکھ کر ڈر گئی ... سندر لڑکیوں کو زیادہ ڈرانا نہیں چاہیے لیکن اپنی ... رکھنا۔ ہم جس بٹن کو دبا کر یہ کھڑکی کھولتے ہیں، ... دبانے سے یہ دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔“

اس کا ... دھمکانے والا تھا۔

اس نے کھڑکی بند کردی۔ میں ثروت کے قریب بیٹھ ... اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ میں اپنے ... نارمل نظر آنے کی کوشش کررہا تھا مگر ذہن میں کھلبلی سی تھی۔ اس چھت تلے آنے کے بعد کچھ انوکھے مناظر دیکھنے میں آئے تھے۔ فریزر میں منجمد انسانی لاشیں اور یہ دیوہیکل ... ریچھ۔ یہ سوچ بار بار دماغ میں آتی تھی کہ منجمد لاشوں اور ان جانوروں میں ضرور کوئی تعلق ہے۔ شاید انسانی لاشیں ان کی خوراک کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ جاوا جیسے لوگ اپنی ہیبت میں اضافہ کرنے کے لیے اکثر اس قسم کے شوق پالا کرتے ہیں۔ شیر، شکاری چیتے، خونخوار عقاب اور ... وغیرہ ان لوگوں کے اردگرد نظر آتے ہیں اور خوف و ہراس کی فضا قائم کرتے ہیں۔ لیکن ریچھوں کے اس جوڑے کی دید تو ناقابلِ یقین تھی۔ ایسے دیوہیکل جانور اور اتنی خونخوار شکلیں... میں نے اتنے بڑے ریچھ کبھی دیکھے تھے، نہ ان کے بارے میں سنا تھا۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہولناک چنگھاڑ سنائی دی۔ یوں لگا کہ ہمارے کمرے کے دھاتی دروازے سے کوئی بم آ ٹکرایا ہے۔ پورا دروازہ ہل کر رہ گیا۔ ثروت ایک بار پھر چلا کر میرے بازو سے لپٹ گئی۔ دوسرا دھماکا ہوا اور سلائڈنگ دروازہ ٹیڑھا ہوگیا۔ یہ وحشی جانور تھا جو دروازے سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے ثروت کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ یوں محسوس ہوا کہ جانور کسی بھی لمحے اندر گھس آئے گا۔ میرے اندر مزاحمت کی حس پوری توانائیوں سے بیدار ہوگئی۔ میں ثروت کو اپنے ساتھ لگائے لگائے واش روم تک لایا، واش روم کا دروازہ کھولا۔ ثروت کو اندر دھکیل ... دروازے کو باہر سے بولٹ لگا دیا۔

تھرتھرا خیز آوازیں اب ہال کمرے کے وسط سے آرہی تھیں۔ ٹیڑھے ہو جانے والے سلائڈنگ ڈور کی جانب ... چوڑی اور تین چار فٹ لمبی جھری سی بن گئی تھی۔ میں نے آنکھ لگا کر دیکھا۔ کسی وجہ سے دونوں ریچھوں میں

سے ایک مشتعل ہو گیا تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس ریچھ نے وحشت کے عالم میں اپنے پاؤں کی وزنی زنجیر توڑ ڈالی تھی۔ زنجیر کا قریباً دو فٹ لمبا ٹکڑا ریچھ کے ساتھ ساتھ فرش پر گھسٹ رہا تھا۔ یہ دیوہیکل جانور اپنے سامنے آنے والی ہر شے پر دیوانہ وار جھپٹ رہا تھا۔ اس نے لوہے کی ایک الماری پر پنجہ رسید کیا اور اسے کھلونے کی طرح دور لڑھکا دیا۔ الماری کے ساتھ ہی شیشے کی ایک دیوار بھی دھماکے سے چکنا چور ہو گئی اور تب میں نے ایک اور چونکا دینے والا منظر دیکھا۔ ریچھوں کا رکھوالا چوڑا چکلا شخص ہال کے عین وسط میں اوندھا پڑا تھا... خدا کی پناہ... اس کے پہلو پر سے قریباً دو کلو گوشت غائب تھا۔ اس گوشت کے ساتھ ہی بدقسمت شخص کے اندرونی اعضا بھی غائب تھے۔ اس بہت بڑے زخم میں سے بہنے والا خون فرش پر بکھرا ہوا تھا۔ ابھی دس پندرہ منٹ پہلے میں نے اس چاق و چوبند بندے کو جیتی جاگتی حالت میں دیکھا تھا، اب وہ یقیناً زندگی کی سرحد پار کر چکا تھا۔ اس ہال کمرے میں اندر کی طرف تین سائڈز پر ایک گیلری سی تھی۔ اس گیلری پر کئی افراد موجود تھے اور شور مچا رہے تھے۔ ان کے پاس رائفلیں موجود تھیں لیکن وہ گولی نہیں چلا رہے تھے۔ یقیناً، انہیں اس کا حکم نہیں تھا۔ وہ نیچے ایک گوشے میں دیکھ رہے تھے۔ میں نے غور کیا اور ایک بار پھر پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ گیلری کے بالکل نیچے ایک اور خونچکاں جسم نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی بہاری رقاصہ تھی جسے ہم نے لنگڑی پورہ گاؤں میں دیکھا تھا۔ اسے شاردا بائی جاوا اور اس کے ساتھیوں کی تفریحِ طبع کے لیے وہاں لائی تھی۔ اب یہ رقاصہ پہلو کے بل فرش پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا تاہم جسم میں حرکت موجود تھی۔ وہ زندہ تھی۔ مگر شدید خطرے میں تھی۔ وحشی جانور کسی بھی وقت اس پر جھپٹ سکتا تھا۔ وہ جتنا طاقتور تھا، پلک جھپکتے میں اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر سکتا تھا۔ گیلری میں موجود افراد اس پر مختلف اشیا پھینک رہے تھے تاکہ وہ لڑکی کی طرف آنے سے باز رہے۔

پھر میں نے پریم چوپڑا کو دیکھا۔ اس نے اپنے مشین پسٹل سے کئی ہوائی فائر کیے اور پکار کر بولا۔ "فائر نہیں کرنا... کسی نے سیدھا فائر نہیں کرنا۔"

بدمست جانور نے فرش پر پڑی ایک رائفل کو پنجوں سے بھنبھوڑا اور یوں توڑ موڑ دیا جیسے وہ کاغذ کی بنی ہوئی ہے۔ طاقت کا ایسا مظاہرہ میں نے زندگی میں دیکھا تھا اور نہ کبھی اس کا تصور کیا تھا۔ وہ پلٹ کر بہاری لڑکی کی طرف آیا، گیلری میں کھڑے افراد نے اس پر شیشے کی بوتلیں اور چھوٹے گملے پھینکے، وہ غضب ناک انداز میں چلاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹا پھر گیلری کی سیڑھیوں کی طرف آیا۔ یہ منظر دیکھ کر گیلری میں موجود افراد بھی دہشت زدہ ہو گئے، وہ نکاسی کے دروازوں کی طرف سمٹنے لگے۔

"گولی نہیں چلانی... گولی نہیں۔" پریم چوپڑا دہاڑا۔

یہی وقت تھا جب دو افراد تیزی سے گیلری میں نمودار ہوئے۔ ان میں ایک جاوا تھا... اور دوسرا وہی شخص جو پیدائشی طور پر خطروں کا کھلاڑی تھا۔ وہ موت کے پیچھے بھاگتا تھا اور زندگی اپنی تمام تر خوش بختیوں کے ساتھ اس پر نثار تھی۔ وہ عمران تھا۔ میں اسے جاوا کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یوں لگا کہ وہ اسی عمارت میں موجود تھا۔

وحشی ریچھ (جس کا وزن بعد ازاں 1400 پاؤنڈ یعنی چودہ پندرہ من کے قریب معلوم ہوا) سیڑھیوں کی ریلنگ لکڑی کی تیلیوں کی طرح بکھیر رہا تھا۔ اس کے قریب دوسرا ریچھ بھی موجود تھا۔ وہ بندھا ہوا تھا لیکن وہ اضطراب کی حالت میں تھا۔

"عمران... عمران!" میں نے بے ساختہ پکارا لیکن اس قیامت کے شور میں میری آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی۔

وحشی جانور سیڑھیاں اتر کر پھر خون آلود فرش پر آ گیا۔ اب وہ کسی بھی وقت پھر لڑکی کی طرف بڑھ سکتا تھا۔ لڑکی کے جسم میں موجود حرکت اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اور پھر میں نے عمران کو موقع کی طرف بڑھتے دیکھا۔ ہیرو... جو واقعی ہیرو تھا۔ چوڑا سینہ، روشن پیشانی، آنکھوں میں ذہانت اور دلیری کی بجلیاں چمکتی ہوئی۔ وہ دیواروں میں در بناتا جاتا تھا۔ پانی میں دیے جلانے کا ہنر اسے آتا تھا اور وہ یہاں تھا۔ اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ۔ میں نے دیکھا، اس کے ہاتھ میں فقط ایک لپٹا ہوا اخبار ہے۔ وہ ناقابلِ یقین دلیری کے ساتھ دیوہیکل ریچھ کے روبرو آیا۔ دل دھڑکنا بھول گئے، سانسیں تھم گئیں۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں خود کو جمایا۔ اخبار کو فرش پر مارتے ہوئے آواز پیدا کی۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھوں کے خاص اشاروں سے جانور کو "کول ڈاؤن" کرنا چاہا۔ جانور نے چنگھاڑ جیسی آواز نکالی لیکن حملہ آور نہ ہوا۔ ایک قدم پیچھے ہٹا پھر دو قدم... عمران کا طلسم کام کر رہا تھا۔ وہ جانور جو سرتاپا وحشت تھا خود کو جیسے کسی نادیدہ حصار میں محسوس کر رہا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے یہ حصار ٹوٹ گیا۔

وہ بے پناہ درندگی سے عمران پر جھپٹا۔ اگر اسے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی بھی تاخیر ہوتی تو "کوڈیاک براؤن" ریچھ کے پنجے سے اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جاتا۔ میرا دل جیسے سینے میں اٹک گیا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈریسنگ دروازہ توڑ کر نکلوں اور عمران کے ساتھ اس میدان میں کود پڑوں... میں اب اسے پکارنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ عمران کی توجہ اپنے خونخوار دشمن سے ہٹے اور وہ اسے شدید زخمی کر دے۔ واش روم کے اندر ثروت مسلسل پکار رہی تھی۔ "تابش! کیا ہو رہا ہے؟ تابش دروازہ کھولیں۔" ساتھ ساتھ وہ دروازہ پیٹ رہی تھی۔

ریچھ اب ایک بار پھر وحشت کے جوبن پر تھا۔ عمران پر حملہ کرنے کے بعد وہ پھر زخمی بہاری لڑکی کی طرف بڑھا۔ عمران تڑپ کر لڑکی اور ریچھ کے درمیان آ گیا۔ ہاں، وہ ہیرو تھا۔ حقیقی زندگی کے حقیقی خطروں سے کھیلنے والا۔ فلمی اور کتابی دنیا کے ہیرو اس کے سامنے پانی بھرتے تھے۔ ریچھ نے اپنے سامنے رکاوٹ دیکھی تو اس کی وحشت مہمیز ہوئی، اس کی درندگی میں ابال آیا۔ وہ طاقت سے عمران پر جھپٹا۔ عمران اس کے پنجے سے تو بچ گیا مگر اس کے فولادی کندھے کی ضرب لگنے سے دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ یہ جدوجہد آنکھوں کو پتھرا دینے کے لیے کافی تھی۔ جہاں عمران گرا، وہاں ایک طویل جھاڑن پڑا تھا۔ عمران نے اس جھاڑن کو الٹی طرف سے پکڑا اور اس کے چوبی دستے سے ریچھ کی تھوتھنی پر ضربیں لگانے لگا۔ مقصد صرف یہی تھا کہ کوڈیاک ریچھ کی توجہ بے ہوش لڑکی کی طرف سے ہٹ جائے اور وہ کامیاب ہوا۔ عمران کے لیے ریچھ کے اشتعال میں اضافہ ہوا۔ وہ اس کی طرف لپکتا چلا گیا۔ عمران الٹے قدموں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چند سیکنڈ کے اندر وہ دیوہیکل جانور کو گیلری میں لے آیا۔ گیلری میں موجود افراد دروازوں میں اوجھل ہو گئے تھے۔ ہال کے عین درمیان چھت سے ایک بڑا فانوس جھول رہا تھا۔ سرکس کی تربیت عمران کے کام آئی۔ وہ جست لگا کر اس فانوس پر چڑھ گیا۔ طویل جھاڑن ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس جھاڑن سے مسلسل ریچھ کی تھوتھنی پر ضربیں لگا رہا تھا۔ یہ ضربیں اس عفریت کا کیا بگاڑ سکتی تھیں۔ بس اس کے اشتعال میں اضافہ کر رہی تھیں۔ پریم چوپڑا اور اس کے دو ساتھیوں کو موقع مل گیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترے اور بے ہوش بہارن کو گھسیٹ کر ایک دروازے میں اوجھل ہو گئے۔

جاوا پکار رہا تھا۔ "انجکشن لاؤ۔ کہاں مر گئے ہو؟ جلدی کرو۔"

نریندر کمار نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بے ہوشی کا انجکشن فائر کرنے والی ٹرنکولائزر گن تھی۔ لگتا تھا کہ وہ عام گن کی طرح اس گن کے استعمال میں بھی خاص مہارت رکھتا ہے۔ اس نے قریباً پچیس فٹ کی دوری سے گن چلائی۔ نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا۔ انجکشن ریچھ کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ اس دوران میں شہ زور جانور گیلری کا طویل جنگلہ اکھاڑ کر نیچے فرش پر پھینک چکا تھا۔ ٹرنکولائزر کا اثر ہونے میں قریباً پانچ منٹ مزید لگ گئے۔ اس دوران میں ہال کمرے کے اندر دہشت کا راج رہا اور توڑ پھوڑ ہوتی رہی۔

میں عمران کو آوازیں دیتا رہا تھا لیکن میری آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی۔ وہ واپس جا چکا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ پچھلے دو تین منٹ سے ثروت کی آواز سنائی نہیں دی۔ میں جلدی سے واش روم کی طرف آیا اور اس کا بولٹ گرا کر دروازہ کھولا۔ ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ثروت واش روم کے قالین پر گری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے تڑپ کر اسے اٹھایا اور سینے سے لگایا۔ "ثروت... ثروت... آنکھیں کھولو۔" میں نے اسے جھنجوڑا۔

وہ بے ہوش تھی۔ زرد رنگ اور بھی زرد ہو رہا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ اب بھی واش روم کے قالین پر تھا۔ میں نے اسے بازوؤں میں اٹھایا اور بستر پر لے آیا۔ اس کی نبض دیکھی۔ سانسوں کی آمد و رفت کا جائزہ لیا۔ شدید صدمے نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔ میں نے سلائڈنگ دروازے کی سلائڈ میں بن جانے والی جھری سے منہ لگایا اور سینے کی پوری طاقت سے پکارنے لگا۔ "دروازہ کھولو۔ چوپڑا! دروازہ کھولو۔"

دو افراد ریچھوں کے رکھوالے کی لاش کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ فرش پر خون کی ایک لکیری بنتی جا رہی تھی۔ میری آواز کسی نے نہیں سنی اور اگر سنی تو توجہ نہیں دی۔ اسی دوران میں، میں نے محسوس کیا کہ ثروت نے اپنے ہاتھ کو تھوڑی سی حرکت دی ہے۔ میں واپس اس کی طرف پلٹ آیا۔

میں نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیے، اس کی ہتھیلیوں کی مالش کی۔ ساتھ ساتھ میں اسے پکار رہا تھا۔ "ثروت! آنکھیں کھولو... سب ٹھیک ہو گیا ہے ثروت۔"

اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس کا چہرہ بدستور ہلدی رہا۔ ہونٹوں کی پنکھڑیاں خشک تھیں۔ تاہم سانسوں کی

آمد و رفت بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ اسے ہولے ہولے پکارتا بھی جا رہا تھا۔ کافی دیر گزر گئی۔ پھر اس میں ہوش کے آثار نمودار ہونے لگے۔ کمرے کے باہر سے جو آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں، ان سے پتا چل رہا تھا کہ دوسرے ریچھ کو بھی بے ہوش کیا گیا ہے اور اب دونوں کو مکمل طور پر "کنٹرول" میں رکھنے کے لیے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ وزنی زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ گاہے بگاہے پریم چوپڑا کی پاٹ دار آواز بھی گونجتی تھی۔ وہ کام کرنے والوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

میں نے ثروت کے چہرے پر پھر پانی کا چھینٹا دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں نیم وا کیں۔ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی، تب اس کے چہرے پر ایک دم کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ اسے یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ میں اس پر جھکا ہوا ہوں۔ ایک خوف آمیز مدہوشی کے عالم میں وہ میرے گلے سے لگ گئی... سسکنے لگی۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ میں اس سے دور ہٹ جاؤں گا۔ میں اس کے بال سہلاتا رہا۔ اسے تسلی دیتا رہا کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ بس میں اپنے سینے پر اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس کرتا رہا۔ وہ ابھی مکمل طور پر ہوش میں نہیں آئی تھی۔ تاہم اس کے تنے ہوئے اعصاب اب ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اسی طرح سو گئی۔ میں نے اسے خود سے جدا کیا اور آہستہ سے اس کا سر تکیے پر رکھ دیا۔ اس کے بال چہرے سے ہٹائے اور چادر اس کے سینے تک کھینچ دی۔ وہ نقاہت، مایوسی اور افسردگی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ وہ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہی تھی، میری چاروں طرف تاریکیاں ہیں، میں اپنے اردگرد دور دور تک زندگی اور خوشی کی کوئی کرن نہیں دیکھتی۔ اور جس طرح کی یہ زندگی ہے، مجھے ...زندہ رہ کر کرنا بھی کیا ہے...

میرا دل سینے میں کٹ کر رہ گیا۔ نہ جانے کیوں سائیں لڑکے کی پُراندیش آواز پھر میرے کانوں میں گونجنے لگی۔

میں ایک طرف قالین پر بیٹھ گیا۔ دیوار سے ٹیک لگالی۔ حالات کتنے بھی برے سہی لیکن میرے سینے میں امید کی ایک توانا کرن روشن ہو چکی تھی۔ عمران یہاں تھا... اور جب وہ یہاں تھا تو پھر یہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہر طرح کے روشن امکانات یہاں موجود تھے۔ ہر طرح کی انہونیوں کے لیے در وا ہو چکے تھے۔ وہ نہ صرف یہاں موجود تھا بلکہ جاوا کے ساتھ اس کی زبردست انڈر اسٹینڈنگ بھی نظر آ رہی تھی بس اس حوالے سے ایک پھانس میرے سینے میں چبھی ہوئی تھی۔ "گریٹ گیم" والی بات کسی طرح مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ عمران کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کسی صورت نہیں۔ یہ سوچ ہی میرے پسینے چھڑا دیتی تھی کہ عمران، ریوالور کے پانچ خانوں میں گولی ڈال کر اس کا بیرل اپنی کنپٹی پر رکھ رہا ہے اور ٹریگر دبا رہا ہے۔ میری خواہش تھی کہ میں ہر قیمت پر اسے روکوں۔ لیکن وہ مجھے اس سلسلے میں کوئی بات ہی کرنے نہیں دے رہا تھا۔ کیا وہ اندر خانے کوئی خاص پلاننگ کر رہا تھا یا پھر اس اندھے اعتماد کا سہارا لے رہا تھا جو وہ اپنے اوپر رکھتا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ یہ عمران ہی تھا۔ "ہیلو جگر پارے! کیا حال ہے؟"

"تمہارا کیا حال ہے؟ کہاں ہو تم؟"

"سمجھو تمہارے آس پاس ہی ہوں۔"

"یہ بکواس کیوں نہیں کرتے کہ ٹھیک ہمارے ساتھ ہو۔ جاوا کے ساتھ اسی گھر میں۔"

"تو تمہیں پتا چل گیا ہے؟"

"پتا چل گیا ہے اور ابھی سارا ہنگامہ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا ہے۔"

"زبردست... اب تو میری ذات پر تمہارا اعتماد کچھ اور بڑھ جانا چاہیے۔ میں جو کچھ کہوں، تمہیں اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لینا چاہیے۔ یار! میں ہوں ہی اس قابل۔ ریما ہز کس کو کتے نے نہیں کاٹا ہوا کہ یوں میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ پوری دنیا میں میرے جیسے بس دو تین "پیس" ہی اور ہوں گے۔ ایک اپنا وہ ٹام کروز، دوسرا جان ریمبو اور تیسرا جیکی چن... بلکہ جیکی چن بھی اب کچھ بڈھا ہی ہو چکا ہے..."

"تم اپنی بکواس بند کرو تو کچھ کہوں؟"

"یار! میں بہت جلدی میں ہوں۔ تم ابھی کچھ نہ کہو۔ بس تیار ہو جاؤ۔ ایک زبردست ایکشن پیک، سنسنی خیز، سچے ڈرامے کے لیے۔ تم بھی کیا یاد کرو گے، کیسے یار سے پالا پڑا تھا..."

"یاد تو میں کر ہی رہا ہوں۔"

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ "دو دن اچھی طرح ڈنڈ بیٹھکیں لگا لو۔ پرسوں رات کو کام شروع ہو رہا ہے۔" اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

حطروں کے دانتوں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

حق دار

آصف ملک

زندگی کی مسافت میں سب تجربات یکساں اہم ہوتے ہیں... بعض اوقات ایک ہی تجربے سے انسان وہ کچھ سیکھ لیتا ہے جو زندگی بھر کے تجربات سے نہیں سیکھ پاتا... ایک ایسے ہی واقعے سے شروع ہونے والی مغربی مزاج سے ہم آہنگ کہانی کے پیچ و خم... جو مسلسل اس پر قید حیات کا دائرہ تنگ سے تنگ کرتے جا رہے تھے...

مائیکل جون اپنی پرانی اور کسی قدر خستہ حال کار میں ہائی وے پر سفر کر رہا تھا۔ اس نے یہ کار حال ہی میں خریدی تھی کیونکہ اس کی شاندار دو سال پرانی کار قسط ادا نہ کرنے کے باعث بینک کے قبضے میں جا چکی تھی۔ صرف کار ہی نہیں، اس کے پاس اب کچھ نہیں رہا تھا۔ ایک سال پہلے تک وہ ایک اچھی کمپنی میں ملازم تھا اور مخصوص حلقے میں جانا پہچانا جاتا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی لیکن اسے اچھی ملازمت کی کمی نہیں

تھی۔ ملازمت ختم ہونے کے بعد وہ رفتہ رفتہ اس حلقے سے نکل گیا اور اب وہ اپنے شہر میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ اوکلوہاما سٹی سے لاس اینجلس کی طرف جا رہا تھا۔ وہ سول انجینئر تھا اور اب اس کے پاس سوائے اس کے کوئی اور راستہ نہیں رہا تھا کہ کہیں اور جا کر قسمت آزمائی کرے۔ اس نے سنا تھا کہ کیلیفورنیا میں ملازمتیں تھیں۔ وہ اس وقت ایریزونا سے گزر رہا تھا۔ یہ علاقہ بہت سنسان، خشک اور بے رنگ تھا۔ دور تک سفید یا ہلکے بھورے رنگ کا صحرا پھیلا ہوا تھا جس میں کہیں کہیں سبزی مائل بھورے رنگ کے ٹکڑے تھے۔ نشیب میں جہاں جہاں بارش کا پانی جمع ہوتا تھا، وہاں زمین پر ایسا ہی سبزہ اگ آتا تھا مگر یہ سبزہ بھی کوئی خوب صورت تاثر نہیں دے رہا تھا۔

اچانک ایک سفید کار تیزی سے اس کے پاس سے گزری۔ مائیکل نے چونک کر دیکھا۔ کار ایک جوان عورت چلا رہی تھی۔ اس کے سنہری بال سفید اسکارف کے ساتھ ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کار کی چھت کھلی ہوئی تھی۔ اسپورٹس کار نئے ماڈل کی تھی اور یقیناً کہیں زیادہ تیز رفتار تھی اس لیے چند منٹ بعد بس ایک نقطے کی طرح نظر آنے لگی۔ ہائی وے سیدھی اور سنسان تھی۔ آدھ گھنٹے میں مائیکل نے یہ پہلی گاڑی دیکھی تھی۔ اچانک ہی دور سفید کار لہرائی اور ہائی وے سے اتر گئی۔ اس کے عقب سے ایک سیاہ نقطہ نمودار ہوا اور وہ بھی ہائی وے سے اتر کر کچے میں قلابازیاں کھانے لگا۔ مائیکل کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ حادثہ پیش آ گیا تھا۔ دونوں کاریں تصادم سے بچنے کے لیے دائیں بائیں کچے میں اتر گئیں۔ سفید کار رک گئی لیکن سیاہ گاڑی قابو سے باہر ہو کر قلابازیاں کھانے لگی تھی۔

جب تک مائیکل وہاں پہنچا، سیاہ گاڑی سیدھی ہو کر ساکت ہو گئی تھی مگر اس نے اتنی قلابازیاں کھائی تھیں کہ اس کی صورت پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ مائیکل کار سے اتر کر پہلے سفید کار کی طرف بڑھا۔ عورت ساکت بیٹھی تھی اور اس کا گلابی رنگ جیسے پھیکا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ مائیکل نے جھک کر پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو نا؟"

عورت نے اس کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ خوف کے باوجود اس کی دلکشی کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ چند حسین ترین عورتوں میں سے تھی جنہیں آج تک مائیکل نے دیکھا تھا۔ اس نے ہلکے عنابی رنگ کی فراک پہن رکھی تھی جس کا گریبان نہایت کشادہ تھا۔ لباس نے اس کی دلکشی کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔ "اوکے میں اس کو دیکھ کر آتا ہوں۔ گاڑی کی حالت بُری ہو رہی ہے۔"

مائیکل ہائی وے کے دوسری طرف کچے میں سیاہ گاڑی تک آیا۔ یہ ڈبل کیبن جیپ نما گاڑی تھی۔ اس نے اندر دیکھا تو اسٹیئرنگ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا، اس کا چہرہ لہولہان تھا اور وہ بالکل ساکت تھا۔ مائیکل نے ہچکچاتے ہوئے اس کی گردن پر انگلیاں رکھ کر نبض دیکھی۔ نبض ساکت تھی۔ وہ مر چکا تھا۔ گاڑی کے مسلسل الٹنے سے دروازے اس قابل نہیں رہے تھے کہ انہیں کھول کر اس آدمی کو باہر نکالا جا سکتا۔ ویسے بھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ مائیکل پیچھے ہٹا تو اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس نے نیچے دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا خاکی رنگ کا دھات کا بنا بریف کیس تھا اور باہر گرنے کی وجہ سے اس کا لاک کھل گیا تھا۔ مائیکل نے بیٹھ کر بریف کیس کھولا اور دنگ رہ گیا۔ بریف کیس سو ڈالرز کے نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ دائیں سے بائیں چار اور اوپر سے نیچے بھی چار گڈیاں تھیں۔ مائیکل نے نکالی تو اوپر تلے پانچ تھیں۔ گویا بریف کیس میں دس ہزار ڈالرز والی اسی گڈیاں تھیں اور یہ رقم آٹھ لاکھ ڈالرز بنتی تھی۔

مائیکل کے ہونٹ سکڑ گئے۔ یہ شخص اتنی بڑی رقم کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ ویسے حلیے سے وہ مقامی نظر آتا تھا۔ اس کا فلیٹ ہیٹ سیٹ سے نیچے گرا ہوا تھا اور جینز کی پتلون کے ساتھ اس نے قمیص سے اوپر چمڑے کی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ مونچھیں بھی ویسٹرن اسٹائل کی تھیں۔ مائیکل کا اندازہ تھا کہ وہ چالیس برس سے اوپر کا نہیں تھا اور حلیے سے وہ کوئی اچھا آدمی نہیں لگتا تھا مگر یہ اس کا اندازہ تھا جو غلط بھی ہو سکتا تھا۔ وہ بریف کیس لے کر واپس آیا اور اس نے سفید کار کے پاس کھڑی عورت سے کہا۔ "ہمیں پولیس کو اطلاع دینی ہوگی، وہ مر چکا ہے۔"

"مر گیا ہے۔" عورت نے تھوک نگل کر کہا۔ "نہیں میں پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی۔ ویسے بھی اس حادثے میں میرا قصور نہیں ہے۔ یہ خود مخالف سمت سے آ گیا تھا اور جب اس نے مجھے دیکھا تو اندھا دھند اسٹیئرنگ گھمایا اور اس کی گاڑی کچے میں اتر گئی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ سڑک پر ٹائروں کے نشانات بھی یہی بتا رہے تھے کہ آدمی نے بہت بدحواسی میں کار موڑی تھی۔ اسی وجہ سے وہ اس کے قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ مائیکل نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، اس میں تمہارا قصور نہیں ہے لیکن پولیس کو اطلاع تو دینی ہوگی۔"

"میرا خیال ہے تم باہر سے آئے ہو؟"

"ہاں میں اوکلوہاما سٹی سے لاس اینجلس کی طرف جا رہا ہوں۔"

"سیاحت؟"

"نہیں، نوکری کی تلاش میں۔"

عورت کی نظر بریف کیس پر گئی۔ "یہ کیا ہے؟"

"اس آدمی کا بریف کیس ہے۔" مائیکل نے سیاہ گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں آٹھ لاکھ ڈالرز موجود ہیں۔"

عورت کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "آٹھ لاکھ ڈالرز... یہ اتنی رقم کے ساتھ سفر کر رہا تھا؟"

"اس وجہ سے بھی پولیس کے پاس جانا ضروری ہے۔ یہ رقم کسی اچکے کے ہاتھ لگ گئی تو وہ اسے غائب کر دے گا۔"

عورت اس کے قریب آئی۔ "میرا تو خیال ہے ہمیں اس رقم کو... ارے یہ کیا؟" اس نے کہتے ہوئے مائیکل کے پیچھے دیکھا تو اس نے غیر ارادی طور پر سر گھمایا اور اسی لمحے کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی۔ وہ چکرا کر نیچے گر گیا۔ ضرب شدید تھی اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود ہوش میں نہیں رہ سکا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ بدستور اسی جگہ پڑا تھا۔ سورج اب کسی قدر مغرب کی طرف جا چکا تھا۔ مائیکل کراہ کر اٹھا اور اس نے اپنا سر ٹٹولا۔ بائیں کنپٹی پر گومڑا ابھر آیا تھا اور تھوڑا سا خون بھی نکلا تھا۔ سر درد کی شدت سے پھٹ رہا تھا۔ اس نے دیکھا سفید کار، عورت اور آٹھ لاکھ ڈالرز والا بریف کیس تینوں غائب تھے۔ عورت نے اس پر دھوکے سے وار کیا اور بریف کیس لے کر بھاگ گئی۔

پتا نہیں اس نے کس چیز سے وار کیا تھا کہ ایک ہی وار میں مائیکل جیسا مضبوط مرد بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شریف اور عام سی نظر آنے والی یہ عورت اتنی چالاک اور مجرم ذہن کی نکلے گی۔ اس نے پوری مہارت اور قوت سے وار کیا تھا۔ جب مائیکل کی طبیعت بہتر ہوئی تو وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی کار کی طرف بڑھا۔ پانی کی بوتل نکال کر اس نے پانی پیا اور کچھ سر پر انڈیلا۔ پانی نے سہارا دیا تھا اور وہ خود کو ڈرائیونگ کے قابل محسوس کر رہا تھا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے بے ہوش رہا تھا اور اس دوران اس جگہ سے کوئی گاڑی نہیں گزری تھی۔ ورنہ وہ یوں نہ پڑا رہتا۔ چند لمحے بعد اس کی کار آگے جا رہی تھی۔ ایک بورڈ نے بتایا کہ وہ بل ٹاؤن نامی قصبے کے قریب ہے۔ یہ کاؤنٹی کا صدر مقام بھی تھا۔ دس منٹ بعد وہ ہائی وے سے ہٹ کر واقع اس قصبے میں داخل ہوا۔

نظر آنے والے پہلے بار پر اس نے کار روک لی اور اندر آ کر بارٹینڈر سے ٹھنڈی بیئر طلب کی۔ بارٹینڈر نے اس کی کنپٹی کا گومڑ دیکھ لیا تھا۔ اس کے سامنے بیئر کا گلاس رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کوئی حادثہ؟"

مائیکل نے ایک طویل گھونٹ لے کر سر ہلایا۔

"شیرف آفس کہاں ہے؟"

"وہ سڑک کے پار۔" بارٹینڈر نے اشارہ کیا۔ "مگر اس وقت وہ بند ہے۔ شیرف کہیں جاتا ہے تو آفس لاک کر دیتا ہے۔"

مائیکل کو حیرت ہوئی کہ کہیں شیرف آفس بھی بند ہوتا ہے۔ بارٹینڈر نے اس کی حیرت رفع کرنے کے لیے بتایا کہ یہاں مقامی طور پر جرائم کا تناسب بہت کم ہے۔ پولیس کا کام نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے اکثر شیرف آفس لاک رہتا ہے۔ مائیکل نے پوچھا۔ "اگر کوئی ایمرجنسی پیش آ جائے تو؟"

بارٹینڈر نے شانے اچکائے۔ "نائن ون ون ہے نا..."

مائیکل اٹھ کر کونے میں لگے فون بوتھ تک آیا اور اس نے نائن ون ون پر کال کر کے حادثے کی رپورٹ کی۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ شیرف آفس کے سامنے والے بار میں موجود ہے۔ اس کال کا فوری نتیجہ نکلا اور دس منٹ بعد شیرف کی گاڑی دفتر کے سامنے رکتی دکھائی دی اور شیرف اتر کر بار میں آ گیا۔ وہ سیدھا مائیکل کے پاس آیا۔ "میرا خیال ہے رپورٹ تم نے کرائی ہے؟"

"درست، تم نے کیسے جانا؟"

"اس بار میں تم ہی ایک اجنبی ہو۔" شیرف نے کہا۔ "مجھے شیرف جائل کین وڈ کہتے ہیں۔"

وہ مائیکل کو ایک کونے والی میز پر لے آیا۔ وہ بڑے اور گول چہرے والا تنومند شخص تھا۔ اس نے اپنے لیے وسکی منگوائی اور مائیکل سے حادثے کی روداد سننے لگا۔ مائیکل نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ عورت کا ذکر نہیں کرے گا۔ اس صورت میں اسے رقم کا ذکر کرنا پڑے گا اور بدقسمتی سے وہ سفید گاڑی کا نمبر بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ پولیس کو بتانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا اس لیے خاموشی ہی بہتر تھی۔ اس نے بتایا کہ سیاہ گاڑی اچانک اس کی کار کے سامنے آ گئی اور اس نے اسٹیئرنگ گھمایا تو جھٹکے سے اس کی کنپٹی اسٹیئرنگ پر لگی اور وہ عارضی طور پر بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے سیاہ گاڑی میں موجود فرد کو دیکھا، وہ مر چکا تھا اس لیے وہ رپورٹ کرانے یہاں چلا آیا۔

"حادثہ کب ہوا؟"
"بارہ بج کر کچھ منٹ پر... مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔"
شیرف نے گھڑی دیکھی۔ "یعنی دو گھنٹے پہلے... ویسے ہمیں حادثے کی اطلاع مل گئی ہے۔ تمہیں یقین ہے وہ حادثے کے فوراً بعد مر گیا تھا۔"
"یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں خود ڈیڑھ گھنٹے بے ہوش پڑا رہا مگر جب میں نے اسے دیکھا تو وہ یقینی طور پر مر چکا تھا۔"
"اس کی گاڑی میں یا آس پاس کوئی چیز دیکھی؟"
"کیسی چیز؟"
"مثلاً کوئی بریف کیس یا اسی قسم کی کوئی چیز؟"
مائیکل نے بڑی مشکل سے خود کو چونکنے سے روکا۔ وہ کچھ دیر شیرف کو دیکھتا رہا پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر وہاں اس قسم کی کوئی چیز تھی، تب بھی میرا اس کی طرف دھیان نہیں گیا، میں نے صرف آدمی کو دیکھا تھا۔ ویسے کیا اس کی شناخت ہو گئی ہے؟"
شیرف نے سر ہلایا۔ "جوزف ریڈ... ایک مقامی جرائم پیشہ ہے۔ منشیات کا دھندا کرتا ہے اور اسی چکر میں دو بار جیل کی ہوا کھا چکا ہے۔"
مائیکل سوچ رہا تھا کہ شیرف نے بریف کیس کی بات کیوں کی؟ کیا وہ اس بارے میں کچھ جانتا تھا... مگر کیسے؟ شیرف جائل نے وسکی کا ڈبل پیگ ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے مائیکل سے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"
وہ اسے سڑک پار اپنے دفتر میں لایا۔ اس نے مائیکل کا بیان لیا۔ اس کی دستاویز دیکھیں اور پھر انہیں اپنے قبضے میں لے لیا۔ مائیکل نے پوچھا۔ "یہ کیوں؟"
"ضمانت کے طور پر۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "اب تم بغیر اجازت کے یہاں سے نہیں جا سکتے۔"
مائیکل نے احتجاج کیا۔ "اگر میرا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو میں سرے سے تمہارے پاس ہی نہ آتا۔"
"پھر بھی پولیس اپنے طریقہ کار کے مطابق کام کرتی ہے۔" جائل مسکرایا۔ "تم فکر مت کرو ذاتی طور پر تم مجھے پسند آئے ہو اگر آج ڈنر تم میرے گھر کرو تو مجھے خوشی ہو گی۔ [illegible] تمہارے پاس رقم کی کمی ہے تو میں ایک دو دن کے لیے تمہیں اپنے پاس ٹھہرا سکتا ہوں۔"
مائیکل کے پاس بچی رقم کی کمی تھی۔ کار تیز کر رہی

تھی اور ابھی اسے بھی ٹھیک کرانا تھا اس لیے شیرف جائل کی پیشکش اچھی لگی مگر ساتھ ہی اسے کھٹکا بھی ہوا کیونکہ اسے یاد آیا کہ شیرف نے بریف کیس کی بات کی تھی۔ آخر وہ اس پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا تھا؟ بہر حال وہ انکار کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے شیرف سے کسی اچھے گیراج کا پوچھا۔ اس نے اسی سڑک پر واقع ایک گیراج کا بتایا۔ "ماریو اچھا مکینک ہے۔ تمہاری کار کو بالکل سیٹ کر دے گا۔ میرا نام لو گے تو چارج بھی مناسب کر دے گا۔"
ماریو جوان آدمی تھا اور خوش مزاج بھی۔ اس نے توجہ سے مائیکل کی کار کا معائنہ کیا اور پھر اس سے مسئلہ پوچھا۔ "بعض اوقات مس کرتی ہے اور مجھے اگلے وہیل کا بیلنس بھی ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔"
"بیلنس تو ٹھیک ہے لیکن میں دیکھ لوں گا۔ اگر تم کہو تو ایک جنرل چیک اپ بھی کر لوں۔ صرف بیس ڈالرز ہوں گے۔ اس میں آئل چینج ہو جائے گا اور سروس بھی ہو جائے گی۔"
اگرچہ مائیکل کے پاس رقم محدود تھی لیکن وہ راضی ہو گیا کیونکہ ابھی اسے ایک ہزار کلومیٹرز سے زیادہ سفر کرنا تھا اور وہ کار کو بالکل درست حالت میں چاہتا تھا۔ وہ شیرف آفس کے سامنے والے بار میں بیٹھا رہا حتیٰ کہ شیرف دفتر بند کر کے باہر آ گیا۔ مائیکل بھی باہر نکل آیا۔ اس نے مائیکل سے کہا۔ "چلو میں تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔ مجھے تین چیزوں سے عشق ہے، ایک میری جاب اور دوسرا میرا گھر ہے۔"
مائیکل نے تیسری چیز کے بجائے جوزف کے بارے میں پوچھا۔ جائل نے جواب دیا۔ "وہ آج کل کسی چکر میں تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ منشیات کی کسی کھیپ کا سودا کرنے جا رہا تھا کہ یہ حادثہ پیش آیا۔"
"کس سے سننے میں آیا؟"
"افواہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔ "[illegible] جوئے خانوں میں ہمارے مخبر کام کرتے ہیں۔ وہ لوگوں سے سنتے ہیں اور ہمیں بتاتے ہیں۔ کبھی ان کی کوئی اطلاع کام کی بھی نکل آتی ہے۔"
"جوزف کس سے منشیات لینا چاہتا تھا؟"
"اس کا نہیں معلوم۔"
مائیکل کو ایک بار پھر وہ بریف کیس یاد آیا جس میں [illegible] آٹھ لاکھ ڈالر تھے۔ کیا یہ جوزف منشیات [illegible] جا رہا تھا؟ جائل کی گاڑی قصبے سے باہر نکل کر اب [illegible] پر آ گئی تھی۔ وہ کہیں [illegible] رہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نشیب

کچی سڑک پر گاڑی موڑ دی جو ایک پہاڑ کے دامن تک جا رہی تھی اور وہیں جائل کا فارم ہاؤس نما صحرائی مکان تھا۔ ایک طرف ہوائی چکی لگی تھی اور مکان کے احاطے پر چوب کی باڑ لگی تھی۔ یہ دو منزلہ اور بہت دلکش طرز تعمیر والا مکان تھا مگر مائیکل کی نظریں مکان کے بجائے اس کے سامنے موجود سفید کار پر مرکوز تھیں۔ اس نے کار شناخت کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ جائل نے اپنی گاڑی اس کے برابر میں روک دی اور نیچے اتر گیا۔ مائیکل بھی نیچے اترا۔ اس نے برآمدے کی ریلنگ کے ساتھ کھڑی عورت کو دیکھا۔ یہی عورت جو اسے بے ہوش کر کے بریف کیس لے گئی تھی اور اس کا چہرہ اس وقت بھی سفید ہو رہا تھا۔ اس نے مائیکل کو دیکھ لیا تھا۔ جائل سیڑھیاں چڑھ کر عورت کے پاس پہنچا اور اس کے شانے کے گرد ہاتھ رکھ کر بولا۔
"تیسری چیز جس سے میں بہت محبت کرتا ہوں، وہ میری بیوی ہے۔ جیسی! اس سے ملو یہ مائیکل ہے اور آج رات ہمارا مہمان ہوگا۔"
"ہائے۔" جیسی نے بہ مشکل کہا۔
تعارف کے بعد وہ اندر آئے۔ جیسی ان کے لیے سوڈا لے آئی تھی۔ جائل نے اسے اپنا گھر دکھایا اور بلاشبہ یہ اس کے اندر سے بہت خوب صورت مکان تھا جس میں تمام سہولتیں اور آسائشیں میسر تھیں پھر جیسی کی موجودگی نے اس گھر کو چار چاند لگا دیے تھے۔ ڈنر انہوں نے عقبی حصے میں واقع سوئمنگ پول کے کنارے کیا۔ جیسی نے ڈنر نہیں کیا بلکہ وہ ان کے لیے کھانا لگا کر لباس تبدیل کر کے آئی اور پول میں تیراکی کرنے لگی۔ جائل نے بر[illegible] کہ اس کی بیوی جیسی کے سامنے نہ ہونے کے برابر لباس میں تیراکی کر رہی تھی۔ وہ مائیکل سے خوش گپیاں کرتا رہا۔ اسے باتوں کے دوران پتا چلا کہ مائیکل انجینئر ہے۔
"جب میں نے ہائی اسکول پاس کیا تو میرا بھی انجینئر بننے کا ارادہ تھا لیکن میرا باپ شیرف تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا بھی شیرف بنے اس لیے مجھے [illegible] بہر حال، میں نے اپنے باپ کی خواہش [illegible]"
[illegible] ڈنر جاری تھا کہ جائل کے موبائل کی بیل بجی۔ [illegible] وہاں سے ذرا دور چلا گیا۔ ایسے لگ [illegible] سرکاری ہے۔ جیسی تیرتی ہوئی کنارے کی [illegible] وہ [illegible] جلنے والی سفید روشنیوں کے پس [illegible] پڑی لگ رہی تھی۔ اس نے [illegible]

پر قابو پا لیا تھا اور اب پہلے کی طرح پُراعتماد لگ رہی تھی۔ مائیکل کو اس کی چمکتی آنکھوں میں دعوت نظر آ رہی تھی۔ جائل واپس آیا اور بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اسپتال سے کال آئی ہے، مجھے جانا ہو گا۔ دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ اس دوران میں جیسی تمہاری میزبانی کرے گی۔"
ڈنر ختم کر کے جائل نے گاڑی کی چابی لی اور چلا گیا۔ مائیکل بھی کھانا کھا چکا تھا اور اب ڈرنک ختم کر رہا تھا۔ جائل کی گاڑی کی آواز سن کر جیسی نے پانی میں ہی اپنا رہا سہا لباس بھی اتار دیا اور کنارے کی طرف آئی۔ "کیا خیال ہے تیراکی کے بارے میں؟"
مائیکل نے معذرت کر لی۔ "سوری، میں کھانے کے بعد تیراکی نہیں کرتا۔"
اگرچہ جیسی مایوس ہوئی تھی، تب بھی اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ کچھ دیر تیرتی رہی پھر کنارے کی طرف آئی اور اچک کر خود کو نمایاں کرنے کے انداز میں نصف جسم کنارے سے اٹھا لیا۔ "پلیز! مجھے باتھ روب دینا۔"
اس کا باتھ روب اسٹینڈ پر موجود تھا۔ مائیکل نے براہِ راست اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے باتھ روب اسے تھمایا جو اس نے کنارے پر بیٹھ کر پہن لیا۔ وہ بولی۔ "میں تمہاری شکر گزار ہوں۔"
"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" مائیکل خشک لہجے میں بولا۔ "میں پہلے ہی شیرف کو سنائی کہانی سے بریف کیس اور تمہیں خارج کر چکا ہوں اس لیے اب کس طرح سے دوبارہ بتاتا۔"
"مجھے اپنے رویے پر افسوس ہے۔" جیسی نے اس کی طرف دیکھا۔ "میں اس کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔"
"تم جس طرح تلافی کرنا چاہتی ہو، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" مائیکل نے اسی لہجے میں کہا۔ وہ جلد از جلد اس چکر سے نکلنا چاہتا تھا۔ جیسی شیرف کی بیوی ثابت ہو گی، اس حقیقت نے اسے مزید مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ شیرف اپنی بیوی کے معاملے میں حساس تھا۔ جیسی [illegible] اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے باہر جھانکا۔
"کیا تم سونا چاہو گے، میں تمہارا بیڈ روم دکھا دوں۔"
"ضرور۔" مائیکل کھڑا ہو گیا۔ جیسی اسے اوپری فلور پر لے گئی۔ یہاں ایک ترچھی چھت والا چھوٹا سا کمرا تھا جس میں ایک سنگل بیڈ اور فرش پر قالین بچھا ہوا تھا جبکہ ایک طرف دراز والا [illegible] ایک تھا جس کے کھلے حصے پر شو پیس اور چھوٹے رسالے رکھے تھے۔ کمرا صاف ستھرا اور آرام دہ

لگ رہا تھا۔ جیسی نے اسے باتھ روم اور نیچے کچن کے بارے میں بتایا کہ کون سی چیز اسے کہاں سے مل سکتی ہے۔ مائیکل کے رویے کے بعد جیسی بھی اب سرد انداز میں پیش آرہی تھی۔ اس نے باتھ روب کی جگہ نائٹی پہن لی تھی جو اس کے دل کش وجود کو چھپانے کے بجائے عیاں کررہی تھی مگر اب اس کے انداز میں دعوت نہیں تھی۔ اس نے بستر پر تکیہ رکھا اور جانے لگی تو مائیکل نے اسے روکا۔

"مجھے اپنے رویے پر افسوس ہے لیکن تمہیں مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک مسافر ہوں اور کسی معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ جیسے ہی شیرف مجھے جانے کی اجازت دے گا، میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔" جیسی نے مبہم انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ تمہیں اتنی آسانی سے جانے کی اجازت نہیں ملے گی اور جائل تم سے مزید تفتیش کرے گا۔"

"بریف کیس کے بارے میں؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ اسے شک ہوگیا ہے کہ تم نے اسے پوری بات نہیں بتائی ہے۔"

مائیکل نے سوچا اور پھر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ اس معاملے میں ملوث ہے کیونکہ جب میں نے اسے رپورٹ کی تو اس نے بریف کیس کے بارے میں اشارتاً پوچھا تھا۔"

جیسی نے گہری سانس لی۔ "تب تم خطرے میں ہو مائیکل... بہتر یہی ہے کہ تم خاموشی سے چلے جاؤ۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ میرے تمام کاغذات اس کے قبضے میں ہیں۔"

"کاغذات کو چھوڑو، وہ تم دوسرے بھی بنوا سکتے ہو۔ تم پر کوئی چارج نہیں ہے اس لیے جائل تمہیں پولیس کی مدد سے تلاش نہیں کرے گا اور نہ تمہاری رپورٹ ہوگی لیکن بریف کیس..."

"مجھے یہ بتاؤ کہ ایک مجرم کے قبضے سے نکلنے والے بریف کیس کا تم میاں بیوی سے کیا تعلق ہے؟"

"دیکھو، میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا پھر میں تم سے خوف زدہ بھی تھی کہ اگر تمہاری نیت خراب ہوگئی تو تم مجھے بھی مار دو گے اس لیے میں نے احتیاطاً پستول نکال لیا تھا۔"

"وہی میرے سر پر دے مارا۔ نیت تو تمہاری خراب ہوگئی تھی۔" مائیکل نے موڈ سنبھالا۔ وہ اب کم ہوگیا تھا اور تکلیف تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ جیسی شرمندہ ہوگئی۔

"میں معذرت کرچکی ہوں۔"

"میں تمہیں شرمندہ نہیں کررہا ہوں لیکن میں چور کی طرح فرار نہیں ہوں گا۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔"

جیسی فکر مند ہوگئی۔ اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ "جائل کو میں نے کبھی غیر قانونی کام میں ملوث نہیں پایا لیکن مجھے شک ہے کہ وہ کچھ کرتا ہے کیونکہ جتنی اس کی تنخواہ ہے، وہ اس سے زیادہ ہی خرچ کرتا ہے۔"

"اگر وہ کچھ غیر قانونی کرتا ہے تو تم نے بریف کیس چوری کرکے کون سا اچھا کام کیا ہے؟"

جیسی جھنجلا گئی۔ "میرے بریف کیس چرانے سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوا ہے لیکن اگر جائل کو شک ہوگیا کہ تم بریف کیس کی موجودگی سے واقف ہو تو وہ تمہیں نہیں چھوڑے گا۔"

"اگر اس نے مجھ پر دباؤ ڈالا تو میں مجبور ہو جاؤں گا کہ اسے حقیقت سے آگاہ کردوں۔"

جیسی خوف زدہ ہوگئی۔ "تم ایسا نہیں کرسکتے، نہیں جانتے کہ وہ کتنا خطرناک آدمی ہے۔ یہ دیکھو..." جیسی نے پشت مائیکل کی طرف کرتے ہوئے اپنی نائٹی اوپر اٹھا دی۔ اس کی کمر پر ہلکے ہو جانے والے سیاہ لمبے نشان موجود تھے جیسے کسی نے اسے ہنٹر سے مارا ہو۔ مائیکل نے اس سے نظریں ہٹالیں۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ جائل اس قسم کا وحشی ہوگا۔ وہ اپنی بیوی سے محبت کا دعویٰ کرتا تھا اور اس نے اسے ہنٹر سے مارا تھا۔

"او کے، تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں چاہتی ہوں تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"یہ ممکن نہیں ہے لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے سامنے تمہارا نام نہیں لوں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ پر ایک حد سے زیادہ دباؤ نہیں ڈال سکے گا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو؟" جیسی نے تلخی سے کہا۔ "یہ [illegible] نہیں ہے، یہ دیہات ہے اور یہاں شیرف [illegible] ہے۔"

جیسی چلی گئی اور مائیکل اپنی جیکٹ اور جوتے [illegible] بستر پر دراز ہوگیا۔ وہ الجھ گیا تھا۔ آج تک وہ [illegible] گزارتا آیا تھا جس میں اسے کبھی پولیس سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا آج تک ٹریفک ٹکٹ بھی نہیں کٹا تھا۔ اب وہ ایک ایسے معاملے میں الجھ گیا تھا جس میں ایک موت، اور آٹھ لاکھ ڈالرز سے بھرا ہوا ایک بریف کیس شامل تھا۔ اس کے ہاتھ صاف تھے پھر بھی وہ اس معاملے میں پھنس گیا تھا۔ اگر اس کے کاغذات شیرف کے پاس نہ ہوتے تو وہ خاموشی سے یہاں سے نکل جاتا لیکن اب یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ لیٹا رہا اور تھکن کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ اسے جیسی کا علم نہیں تھا کہ وہ کیا کررہی تھی؟ جائل کی واپسی رات بارہ بجے کے قریب ہوئی۔ اس کی گاڑی کا انجن غرایا اور پھر خاموش ہوگیا۔ اس کے جوتوں کی جانی پہچانی دھمک اوپر تک آئی اور پھر خاموش ہوگئی۔ جائل اور جیسی آپس میں بات کررہے تھے مگر ان کی گفتگو سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ مائیکل سنتا رہا پھر اسے نیند آگئی۔ اچانک اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں تاریکی تھی اور کوئی اس کے پاس موجود تھا۔ سانسوں کی آواز آرہی تھی۔

"جیسی۔" مائیکل نے آہستہ سے کہا اور اسی لمحے کوئی چیز اس کے سر پر ٹھیک اسی جگہ لگی جہاں وہ پہلے بھی چوٹ کھا چکا تھا اور نتیجہ اس بار بھی پہلے جیسا نکلا، وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ اسے آخری خیال یہی آیا کہ بریف کیس کا راز برقرار رکھنے کے لیے جیسی نے اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس بار اسے ہوش آیا تو وہ سخت تکلیف میں تھا۔ اس کی کمر میں کوئی چیز گڑی جارہی تھی اور وہ سیدھا کھڑا تھا بلکہ سیدھا کھڑا ہونے پر مجبور تھا کیونکہ وہ ایک درخت کے خشک ہو جانے والے تنے سے بندھا ہوا تھا اور تنے کا کھردرا حصہ اس کی کمر میں گڑ رہا تھا۔ ایک رسی نے اسے سینے سے لے کر پیروں تک تنے سے جکڑ رکھا تھا۔ اس کے سامنے مغرب کی طرف جھکتے چاند کی روشنی میں وہ پہاڑی تھی جو جائل کے گھر کے عقب میں تھی۔ گویا وہ کہیں پاس ہی تھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن تنا آڑے آرہا تھا۔ اس کا منہ آزاد تھا، اس نے پکار کر کہا۔ "ہیلو... کوئی ہے؟"

"تو تمہیں ہوش آگیا۔" عقب سے جائل کی آواز آئی اور وہ خود سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی جو چمک رہی تھی۔ مائیکل کا اندازہ غلط تھا، یہ جیسی نہیں اس کے شوہر تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی لالچ کا شکار ہو رہے تھے۔

"تم نے مجھے کیوں باندھ رکھا ہے؟" مائیکل بولا۔

"تم جانتے ہو۔" جائل نے بوتل اس کے سامنے لہرائی۔ "اگر میری زبان سے سننا چاہتے ہو تو وہ بریف کیس کہاں ہے جو جوزف کی کار میں تھا؟"

"میں کسی بریف کیس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"نہ... نہ، اتنے یقین سے انکار مت کرو۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر بعد تمہیں اپنا انکار بدلنا پڑے۔" جائل کے لہجے میں سفاکی آگئی۔

"دیکھو، میرا کسی معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ایک عام آدمی ہوں اور یہاں سے گزر رہا تھا۔ مجھے بریف کیس کا نہیں پتا ہے۔"

جائل یوں سن رہا تھا جیسے مائیکل کی بات اس کے سر سے گزر رہی ہو۔ اس نے بوتل سے ایک طویل گھونٹ لیا۔ "تم بکواس کررہے ہو۔ جب حادثہ ہوا تو تمہیں کچھ نہیں ہوا تھا۔ پھر تم اتر کر جوزف کی کار تک گئے اور وہ اس وقت زندہ تھا۔ جب تم نے بریف کیس ہتھیانے کی کوشش کی تو اس نے مزاحمت کی جس سے تمہارے سر پر زخم آیا لیکن تم نے بریف کیس حاصل کرلیا اور پھر اسے کہیں چھپا دیا۔ اس کے بعد تم نے پولیس سے رابطہ کیا۔ اسی وجہ سے تمہیں دیر ہوئی اور تم نے بے ہوشی کی کہانی گھڑ لی۔"

"یہ جھوٹ ہے۔"

"بکو مت۔" اچانک جائل نے اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ اس کا ہاتھ بہت سخت اور بھاری تھا۔ مائیکل کا سر گھوم گیا۔ "اگر تم نے شرافت سے نہیں بتایا کہ بریف کیس کہاں ہے تو مجھے اگلوانے کے دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔"

مائیکل نے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا۔ اس نے تھوکا۔ "تم مجھ پر تشدد نہیں کرسکتے۔ اگر تمہیں شبہ ہے تو مجھے گرفتار کرلو۔"

جائل مسکرایا۔ "اگر تمہیں گرفتار کرنا ہوتا تو اس وقت تم حوالات میں پڑے ہوتے۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے وہ بریف کیس دے دو، میں تمہیں جانے کی اجازت دے دوں گا۔"

مائیکل محسوس کررہا تھا کہ وہ مشکل میں پڑ گیا ہے۔ شیرف جائل خود بریف کیس کے چکر میں تھا اور اس کی حسین بیوی جیسی پہلے ہی اسے مائیکل سے ہتھیا چکی تھی۔ مگر وہ اس سے وعدہ کرچکا تھا کہ وہ اس کا نام نہیں لے گا۔ دوسری طرف وہ شیرف کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس کے گھونسے نے بتا دیا تھا کہ وہ بریف کیس کے لیے کسی بھی انتہا تک جا سکتا ہے۔ اس کے عزائم مجرمانہ تھے۔ حالانکہ وہ خود قانون کا رکھوالا تھا مگر لگ رہا تھا کہ قانون کی بالادستی کے جذبے پر لالچ غالب آگیا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر جائل نے اچانک ہی تابڑ توڑ گھونسے برسائے اور مائیکل کا چہرہ بگڑ کر رہ گیا۔ اس بار منہ

کے ساتھ ناک سے بھی خون بہہ نکلا تھا۔ جائل نے غراتے ہوئے اس کی گردن دبوچ لی اور خوں خوار لہجے میں بولا۔
"میری بات سنو، میں تمہیں مار کر اسی صحرا میں دفنا دوں گا اور کوئی مجھ سے نہیں پوچھے گا۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ مجھے بریف کیس کے بارے میں بتادو۔"
مائیکل کے لیے سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ نشے اور غصے میں جائل نے اس کا گلا بہت قوت سے پکڑ رکھا تھا۔ جب اس کی آنکھیں باہر آنے لگیں تو جائل نے اس کا گلا چھوڑا۔ وہ بے تابی سے سانس لینے کے ساتھ ہی کھانس رہا تھا۔ جائل نے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑا۔ "بولو کہاں ہے بریف کیس...؟"
"میں سچ... کہتا ہوں... مجھے... نہیں معلوم۔" اس نے رک رک کر کہا۔ جواب میں جائل نے اس کے پیٹ اور سینے کو پنچنگ بیگ کی طرح استعمال کیا۔ وہ یقیناً اچھا باکسر تھا۔ مائیکل پر قیامت گزر گئی۔ جب جائل نے ہاتھ روکا تو اس کا سانس لینا محال ہو رہا تھا۔ پیٹ میں درد کے گولے اٹھ رہے تھے اور شاید ایک دو پسلیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں۔ جائل نے بوتل نیچے رکھ دی تھی۔ اس نے اپنا پستول نکال لیا لیکن یہ سروس پستول نہیں تھا بلکہ اعشاریہ تین / صفر کا پرانی ساخت کا ہتھیار تھا۔ اس نے مائیکل سے کہا۔
"میں تین منٹ تک انتظار کروں گا اور پہلے تمہارے بائیں گھٹنے میں گولی اتاروں گا۔ اس کے مزید تین منٹ بعد دائیں گھٹنے میں گولی ماروں گا۔ اس کے تین منٹ بعد تمہارے بائیں ٹخنے کی باری آئے گی۔ اس پستول میں بارہ گولیاں ہیں اور تم آخری گولی پر بھی نہیں مرو گے۔ بہت اذیت کے ساتھ زندہ رہو گے اور بہت اذیت سے مرو گے۔"
مائیکل کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ شیرف جائل بالکل سنجیدہ تھا اور اس نے پستول کا رخ مائیکل کے بائیں گھٹنے کی طرف کر دیا تھا۔ ہر گزرتے منٹ پر وہ اسے خبردار کر رہا تھا پھر جیسے ہی تین منٹ پورے ہوئے، مائیکل نے جلدی سے کہا۔ "او کے بتاتا ہوں۔"
جائل کے چہرے پر رونق آگئی۔ "جلدی بتاؤ۔"
"وہ میں نے جائے حادثہ سے کچھ دور ایک جھاڑی کے ساتھ زمین میں گڑھا کھود کر دفن کر دیا تھا۔"
"ٹھیک ہے، میں تمہیں لے چلتا ہوں لیکن اگر گڑھے سے بریف کیس نہیں نکلا یا تم نے مجھے بے وقوف بنایا تو میں تمہیں اسی گڑھے میں دفن کر دوں گا۔" جائل نے کہا اور پستول رکھ کر رسی کھولنے لگا اور جیسے ہی اس نے آخری رسی کھولی، عقب سے شراب کی بوتل پوری قوت سے اس کے سر سے ٹکرائی۔ اس کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی اور وہ نیچے گیا۔ جیسی کے ہاتھ میں بوتل کی گردن رہ گئی تھی، باقی بوتل ٹوٹ گئی تھی اور اس کی شراب جائل پر گری تھی۔ مائیکل نے اسے دبے قدموں آتے دیکھ لیا تھا اس لیے اس نے جائل کو باتوں میں لگایا تھا۔ جیسی نے ریت پر رکھی بوتل اٹھائی اور اپنے شوہر کے سر پر دے ماری تھی۔ رسی کھل جانے سے مائیکل آزاد ہو گیا تھا۔ اس نے جھک کر جائل کو چیک کیا اور پھر جلدی سے اسے سیدھا کر دیا۔ اس کی سانس رکی ہوئی تھی۔ مائیکل نے اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی مگر وہاں بھی خاموشی تھی۔ اس نے گھبرا کر جیسی کی طرف دیکھا۔
"یہ... یہ تو مر گیا۔"
جیسی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "مر گیا... نہیں نہیں... میں نے اتنی زور سے تو نہیں مارا تھا۔"
مائیکل نے جائل کا سر دیکھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ "شاید نازک جگہ وار لگا ہے۔"
"اب کیا ہوگا؟" جیسی نے رو دینے والے انداز میں پوچھا۔
مائیکل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس مشکل میں پھنس گیا ہے اور مزید پھنستا جا رہا ہے۔ پہلے صرف ایک بریف کیس کا مسئلہ تھا اور اب شیرف کی لاش سامنے موجود تھی۔ اس نے جیسی سے کہا۔ "دیکھو، ہم پولیس سے رابطہ نہیں کر سکتے ورنہ قتل کا الزام سیدھا تم پر آئے گا اور میں بھی پھنس جاؤں گا۔ لاش ٹھکانے لگانا ہوگی۔"
"کہاں؟"
"یہ میں نہیں جانتا..." مائیکل نے جائل کی طرف دیکھا۔ "اگر زمین کھود کر دفنایا تو کوئی جانور نکال سکتا ہے یا پولیس کتوں کی مدد سے تلاش کر سکتی ہے۔ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں کوئی نہ جاتا ہو۔"
"ایک جگہ ہے۔" جیسی بولی۔ "کچھ دور ایک متروک سونے کی کان ہے۔ اس میں پانی بھر گیا ہے اگر [illegible] جگہ پھینک دیں تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔"
مائیکل کی حالت اچھی نہیں تھی اور شیرف کا جسم [illegible] بھاری تھا۔ اس کے لیے اسے اٹھا کر دو سو گز دور مکان کے سامنے موجود گاڑی تک لے جانا ممکن نہیں تھا۔ جیسی نے جائل کی جیب سے گاڑی کی چابی لی اور گاڑی وہاں لے آئی۔ اس دوران میں مائیکل، جائل کے پاس سے سب [illegible] نکال چکا تھا۔ [illegible] گاڑی سے [illegible] مائیکل نے جائل کو [illegible]

[illegible] کے پچھلے حصے میں ڈالا پھر وہ مکان تک آئے۔ مائیکل نے سرد پانی سے منہ دھویا اور پھر برف سے سکائی کرنے لگا۔ پیٹ اور پسلیوں کی تکلیف کچھ بہتر ہوئی تھی۔ جیسی نے اسے [illegible] دی۔ مائیکل نے گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا [illegible] بولا۔ "میرے کاغذات شیرف کے پاس ہیں۔ تم بتا سکتی [illegible] نے کہاں رکھے ہوں گے؟"
"ظاہر ہے اپنے دفتر میں۔" جیسی بولی۔
"میں اس کے دفتر جاؤں گا۔ اب یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"
"سنو، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی لیکن پہلے جائل کی لاش ٹھکانے لگانا ہوگی ورنہ پولیس شکاری کتوں کی طرح پیچھے پڑ جائے گی۔"
"وہ تو جائل کی گمشدگی پر بھی پیچھے پڑے گی۔"
"نہیں، جائل کے ساتھ میں بھی غائب ہوں گی تو سمجھا جائے گا کہ ہم کسی وجہ سے بتائے بغیر یہاں سے کہیں گئے ہیں۔ جائل کے بارے میں سارا قصبہ یہ رائے رکھتا ہے کہ وہ راشی ہے اور منشیات کے تاجروں سے بھاری رشوت لیتا ہے۔ اس کے غائب ہونے سے یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اب اتنا کما چکا تھا کہ اسے ملازمت کی ضرورت نہیں رہی اس لیے وہ مجھ سمیت یہاں سے چلا گیا۔"
جیسی کی بات میں وزن تھا۔ "تم کہاں جاؤ گی؟"
"شاید میں بھی لاس اینجلس چلی جاؤں۔ وہ بڑا شہر ہے اور کسی گم شدہ فرد کو وہاں تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔"
مائیکل پہلی بار مسکرایا۔ "شاید تمہیں وہاں شوبزنس میں چانس مل جائے۔"
"مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔" جیسی سنجیدگی سے بولی۔ "خیر، یہ بعد کی بات ہے۔ ابھی ہمیں لاش ٹھکانے لگانی ہے۔ ورنہ کچھ دیر میں روشنی ہو جائے گی۔"
مائیکل نے اس سے اتفاق کیا۔ ڈرائیونگ جیسی کر رہی تھی جو سونے کی متروک کان کا اسے ہی علم تھا۔ آدھ گھنٹے [illegible] سے پہلے وہ [illegible] اس کان کے سامنے تھے۔ جیسی [illegible] ٹارچ نکالی اور مائیکل نے جائل کی لاش اٹھائی۔ وہ بہت [illegible] تھا۔ اگر مائیکل مضبوط جسم کا مالک نہ ہوتا تو اس کے لیے [illegible] اٹھانا مسئلہ بن جاتا۔ پھر بھی اسے دشواری ہو رہی [illegible] راستہ دکھا رہی تھی۔ کان کا داخلی حصہ [illegible] تختے لگا کر بند کر دیا گیا تھا تاکہ بچے اور [illegible] شوقین نوجوان اندر نہ جانے پائیں لیکن انسانوں نے بعض جگہوں سے تختے نکال کر راستے بنا لیے تھے۔ یہ اچھا ہی ہوا ورنہ انہیں راستہ بھی بنانا پڑتا۔ شافٹ زیادہ اندر نہیں تھی۔ مائیکل نے پہلے لاش اندر ڈالی اور پھر خود اندر داخل ہوا۔ جیسی پہلے ہی اندر جا چکی تھی۔ شافٹ اتنی گہری تھی کہ اس کی تہہ تک بمشکل ہی ٹارچ کی روشنی پہنچ رہی تھی اور اس میں گدلا پانی بھرا ہوا تھا۔ مائیکل نے لاش نیچے لڑھکا دی اور وہ پانی میں جا گری۔
"بس اب چلو یہاں سے۔" جیسی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کوئی آنہ جائے۔"
"یہ [illegible] یہاں کوئی نہیں [illegible] لیکن ہمیں اب اصل مہم درپیش ہے۔"
"وہ کیا؟"

فرمانبرداری

بیویوں کی خدمت گزاری اور فرماں برداری کا تذکرہ تھا۔ ایک صاحب نے فرمایا۔ "میری بیوی عموماً شام کو میرے جوتوں کے تسمے کھولتی ہے۔"
حاضرین میں سے ایک نے کہا۔ "جب تم دفتر سے آتے ہو؟"
جواب ملا۔ "نہیں، جب میں شام کو گھومنے یا فلم دیکھنے کے لیے جانے کی تیاری کرتا ہوں۔"

☆☆☆

ایک دفعہ ایک معزز شخص برطانوی وزیر اعظم کے ساتھ کسی تھیٹر باکس میں بیٹھا تھا۔ وہ شخص وزیر اعظم کی طرف گھوما اور اس نے پوچھا۔ "جناب وہ بدصورت عورت کون تھی جو کچھ دیر قبل یہاں تھی؟"
"اوہ، وہ۔" وزیر اعظم نے جواب دیا۔ "وہ میری بیوی تھی۔"
"اوہ جناب! میں آپ سے ہزار دفعہ معذرت چاہتا ہوں۔ میرا مطلب اس احمق قسم کی لڑکی سے تھا جو ان کے ساتھ تھی۔"
"وہ میری بیٹی تھی۔"

(کوئٹہ سے گلزار احمد کا تعاون)

"تم بھول رہی ہو، مجھے جائل کے دفتر سے اپنے کاغذات لینے ہیں۔"

جیسی ہچکچائی۔ "میرا خیال ہے کہ تم انہیں بھول جاؤ۔"

"نہیں، اگر میں کاغذات کے بغیر یہاں سے گیا تو میں مشکوک ہو جاؤں گا۔ اگر میں نے چوری سے بھی کاغذ نکال لیے تو یہی سمجھا جائے گا کہ شیرف نے مجھے واپس کر دیے ہیں۔ اول تو مجھے یقین ہے کہ شیرف نے کہیں ان کا اندراج نہیں کیا ہوگا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس نے صرف تمہیں بریف کیس حاصل کرنے کے لیے روکا تھا۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ شیرف مجھے بے ہوش کر کے باہر لے گیا ہے۔"

"میری آنکھ کھلی تو وہ کمرے میں نہیں تھا پھر میں نے تمہارے کمرے میں دیکھا تو تم بھی غائب تھے۔"

"میں شکر گزار ہوں اگر تم کچھ دیر کرتیں تو شیرف مجھ پر گولی چلا چکا ہوتا۔ ویسے میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا اس لیے اسے باتوں میں الجھایا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود کو بھی بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

وہ شیرف کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی صبح ہونے میں کچھ وقت تھا۔ مائیکل کو امید تھی کہ وہ صبح سے پہلے اپنا کام کر لے گا اور پھر جیسے ہی گیراج کھلے گا، وہ اپنی کار لے گا اور یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ دفتر کے باہر سناٹا تھا۔ جیسی گاڑی میں موجود رہی اور مائیکل اتر کر دفتر تک آیا، اس نے چابی سے دروازہ کھولا مگر روشنی نہیں کی۔ باہر سے اسٹریٹ لائٹس کی روشنی آ رہی تھی وہ اسی روشنی میں درازیں کھنگالنے لگا۔ اپنے کاغذات تلاش کرنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ ایک ہی جگہ پلاسٹک شاپر میں تھے۔ اس نے انہیں جیب میں رکھا اور جہاں جہاں ہاتھ لگایا تھا، ان جگہوں کو رومال سے صاف کر کے باہر نکل آیا۔ صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ وہ جیسی کی طرف آیا۔

"اب تم جاؤ یہاں سے میرے اور تمہارے راستے الگ الگ ہیں۔"

"سنو، کیا تم مجھے لاس اینجلس تک لفٹ دے سکتے ہو؟ مجھے اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔" جیسی نے التجا کی۔

مائیکل نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ "لاس اینجلس تو نہیں، میں تمہیں نزدیکی اسٹیشن تک چھوڑ دیتا ہوں۔ وہاں سے تم کہیں بھی جا سکو گی۔"

"ٹھیک ہے۔" جیسی نے کہا۔

مائیکل نے شیرف کی چیزیں اسے دیتے ہوئے کہا۔ "تم گھر جاؤ میں اپنی کار لے کر وہاں آؤں گا اور تمہیں پک کر لوں گا۔ تم اس دوران میں تیاری کر لو۔"

مائیکل کیفے کھلنے تک سڑک پر ٹہلتا رہا پھر کیفے میں آ بیٹھا۔ اس نے ناشتے کا آرڈر دیا۔ وہ بے تابی سے گیراج کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ماریو نے اس کی کار کل ہی ٹھیک کر دی ہوگی۔ خدا خدا کر کے دس بجے ماریو آیا تو مائیکل فوراً اس کے پاس پہنچ گیا۔ "میری کار تیار ہے؟"

"اے ون۔" ماریو نے خوش دلی سے کہا۔

کار تیار ہو گئی تھی۔ مائیکل نے ماریو کو ادائیگی کی اور کار لے کر نکل آیا۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہ جیسی کو چھوڑے اور یہاں سے سیدھا لاس اینجلس کی راہ لے۔ شیرف کی لاش غائب تھی لیکن اس کی گمشدگی زیادہ دیر چھپی نہیں رہتی اور پولیس اس کی تلاش شروع کر دیتی۔ اس کا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ مگر پھر اس نے کار کا رخ شیرف کے مکان کی طرف موڑ دیا۔ اسے خیال آیا کہ جیسی پکڑی گئی تو وہ اس کی بھی نشان دہی کر دے گی اور اپنے تحفظ کے لیے ضروری تھا کہ وہ جیسی کا تحفظ بھی کرے۔ وہ شیرف کے مکان کے سامنے پہنچا تو وہاں خاموشی تھی۔ جیسی کی سفید کار کھڑی تھی لیکن شیرف کی گاڑی غائب تھی۔ شاید جیسی نے اسے کہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے برآمدے والے دروازے پر دستک دی تو کچھ دیر بعد جیسی کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

"مائیکل! یہ تم ہو؟"

"ہاں، میں ہوں... دروازہ کھولو۔"

جیسی نے دروازہ کھولا اور اسے جلدی سے اندر گھسیٹ لیا۔ "بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"ہمیں غلط فہمی ہوئی تھی... جائل مرا نہیں تھا، وہ زندہ ہے۔"

مائیکل چونکا۔ "زندہ ہے؟"

جیسی نے سر ہلایا۔ "وہ آدھ گھنٹے پہلے یہاں آیا تھا... خوش قسمتی سے میں نے اسے پہلے دیکھ لیا اور مجھے چھپنے کا موقع مل گیا۔ اس نے ایک شیشہ توڑا اور اندر آ گیا۔ وہ بہت غصے میں تھا اور ہم دونوں کو مارنے کی قسمیں کھا رہا تھا۔ اس کے خیال میں میں اور تم آٹھ لاکھ ڈالرز لے کر فرار ہو گئے ہیں۔ اس نے یہیں سے کال کر کے اپنے آدمیوں کو تمام سڑکوں کی ناکا بندی کا حکم دیا۔ پھر اس نے چڑھتے ہوئے [illegible] گاڑی لے کر چلا گیا۔"

مائیکل پریشان ہو گیا۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔"

"برے سے بھی زیادہ برا ہوا۔" جیسی رو دینے والی ہو رہی تھی۔ "جائل بہت سفاک آدمی ہے۔"

"اس نے سڑکوں کی ناکا بندی کرا دی ہے۔ یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟"

"ہاں، ایک راستہ ہے لیکن وہ بہت طویل ہے اور بہت دشوار ہے۔"

جیسی ایک نقشہ اٹھا لائی اور اس نے نقشے کی مدد سے [illegible] راستے کی وضاحت کی لیکن اس سے گزر کر وہ ایک ٹیوب اسٹیشن تک جا سکتے تھے۔ انہیں تقریباً پچاس ساٹھ میل تک ایک کچے راستے پر سفر کرنا پڑتا۔ مائیکل نے اسے تیار ہونے کو کہا، اس نے نقشہ پاس رکھ لیا تھا۔ جیسی نے عجلت میں اپنا سامان پیک کیا پھر وہ چھپایا ہوا بریف کیس لے آئی جو اس سارے فساد کی جڑ تھا۔ جائل نے اچانک زندہ ہو کر ان کے خطرات بڑھا دیے تھے۔ مائیکل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بوتل کے وار سے بچ گیا تھا لیکن اتنی گہری شافٹ میں بھرے پانی میں گرنے کے بعد کیسے بچا؟ جیسی نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ پانی میں گرنے سے اسے ہوش آیا ہوگا اور شافٹ میں اوپر آنے کے لیے دیوار کے ساتھ سیڑھی بھی لگی ہے۔ وہ اس کی مدد سے باہر آ گیا ہوگا۔"

"جائل جانتا ہے کہ میں کیلیفورنیا جا رہا ہوں۔ اس نے اس طرف ہائی وے پر خاص توجہ دی ہوگی۔"

"ہم اس طرف نہیں جائیں گے۔ اس سے پہلے ہی ہمیں شمال کی طرف مڑ جانا ہوگا۔"

دونوں باہر آئے۔ جیسی نے اپنا سوٹ کیس اور رقم والا بریف کیس کار کی ڈکی میں رکھ دیا۔ اس نے چمڑے کی پتلون کے ساتھ ریشمی قمیص اور سر پر رومال باندھ لیا تھا۔ بڑے سائز کے سن گلاسز لگا کر وہ خاصی مختلف نظر آ رہی تھی۔ [illegible] کا مقصد خود کو چھپانا ہی تھا۔ لنچ انہوں نے ایک ایسے ریستوراں میں کیا جو ہائی وے سے ذرا ہٹ کر تھا اور کار [illegible] نے عقب میں کھڑی کی تھی۔ مائیکل نے رستے کے [illegible] کچھ چیزیں لیں۔ کار کا ٹینک فل کرانے کے ساتھ اس [illegible] ایک بڑا اجیری کین پیٹرول سے بھروا لیا تھا۔ چار بجے وہ [illegible] وے پر اس جگہ پہنچے جہاں سے انہیں کچے پر مڑ جانا تھا۔ [illegible] راستہ ایک زمانے میں یہاں موجود سونے اور [illegible] کی کانوں تک جاتا تھا۔ جب کانوں پر کام بند ہوا تو یہ [illegible] بھی متروک ہو گیا۔ اب اسے کوئی استعمال نہیں کرتا تھا

سوائے ان لوگوں کے جو ویرانوں میں جا کر کیمپنگ کے شوقین تھے۔ کچے کی طرف مڑنے سے پہلے مائیکل نے کار روکی اور جیسی کی طرف دیکھا۔

"کیا جائل کو اس راستے کا علم ہے؟"

"پتا نہیں... مگر وہ شیرف تھا اور پھر بچپن سے اسی علاقے میں رہا ہے، وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف ہو گا۔" جیسی نے جواب دیا۔

"تب وہ اس راستے سے واقف ہوگا۔ جب ہم کسی اور راستے سے باہر نہیں نکلیں گے تو وہ سمجھ جائے گا کہ ہم کس راستے سے گئے ہیں اور پھر وہ یہاں ہمارے پیچھے آئے گا۔"

"مگر ہم اس کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل جائیں گے۔" جیسی نے کہا۔ "اب یہاں سے تو نکلو، ایسا نہ ہو کہ کوئی پولیس کار آ جائے۔"

سڑک دور تک صاف تھی لیکن جیسے انہیں نظر آ رہا تھا اسی طرح کسی دوسرے کو بھی دور سے مائیکل کی کار صاف نظر آتی۔ مائیکل نے کار آگے بڑھائی اور کچے راستے پر اتر آیا۔ ذرا دیر بعد وہ ہائی وے سے دور ایک ویرانے میں سفر کر رہے تھے۔ جہاں کہیں راستہ دو حصوں میں بٹا تھا، وہ نقشے کی مدد حاصل کرتے۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ جب تک سورج تھا، انہیں سمتوں کا تعین کرنے میں مشکل پیش نہیں آئی لیکن سورج غروب ہوتے ہی وہ مشکل میں پڑ جاتے۔ مائیکل نے راستہ کچا ہونے کے باوجود رفتار تیز رکھی تھی تاکہ وہ سورج ڈوبنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لیں۔ چھ بجے جب سورج غروب ہو چکا تھا تو وہ دوبارہ ایک پکی سڑک تک پہنچے۔ یہاں سے اسٹیشن کچھ فاصلے پر تھا۔ وہ اسٹیشن تک پہنچے تو تاریکی چھا چکی تھی۔ جیسی نے مائیکل سے کہا۔

"ہم ساتھ چلتے ہیں۔"

"میں اپنی کار نہیں چھوڑ سکتا۔"

"یہ تمہارے نام پر ہے؟"

"نہیں، اسے میں نے آتے ہوئے خریدا تھا۔"

"تب تم اسے چھوڑ دو۔ پولیس بعد میں خود اٹھا کر لے جائے گی اور نیلام کر دے گی۔"

مائیکل خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ جائل کے بچ جانے سے خطرہ تھا۔ وہ اسے کار کی مدد سے تلاش کر سکتا تھا اس لیے کار کو چھوڑ دینا ہی مناسب ہوتا۔ اس نے سر ہلایا تو جیسی خوش ہو گئی اور [illegible] نے ایک ایسی حرکت کی [illegible] مائیکل جھینپ [illegible] وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ "میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ تم

سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس مشکل وقت میں تم نے میرا ساتھ دے کر مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔"

"نہیں، میں خود کو بھی بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"تم نے اس رقم میں سے بھی حصہ نہیں مانگا۔ اگر تم چاہتے تو مانگ سکتے تھے۔"

"میں صرف اپنی کمائی پر گزارہ کرنے کا قائل ہوں۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "ایسی دولت میرے نزدیک ٹھیک نہیں ہے جو بغیر محنت اور کوشش کے مل جائے۔"

جیسی شرمندہ ہو گئی پھر وہ کار سے اتر آئی۔ اس نے ڈکی سے اپنا سوٹ کیس اور بریف کیس نکالا۔ سوٹ کیس مائیکل نے اٹھا لیا۔ وہ اندر آئے۔ لاس اینجلس جانے والی ٹرین تقریباً آدھ گھنٹے بعد آنے والی تھی۔ جیسی نے دو افراد کا کیبن لے لیا۔ یہ فرسٹ کلاس تھا اور وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر آرام سے سفر کر سکتے تھے۔ وہ پلیٹ فارم پر آ گئے اور ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔

مائیکل کسی قدر بے چین ہو رہا تھا۔ شاید اسے جائل کا خیال آ رہا تھا۔ وہ ضدی اور سفاک شخص تھا۔ اتنی آسانی سے کسی کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ جیسی اور اس سے زیادہ دولت کی خاطر ان کے پیچھے ضرور آتا۔ جیسی نے اس کی کیفیت بھانپ لی، اس نے مائیکل کا ہاتھ تھاما۔ "تم فکر مت کرو وہ پیچھے رہ گیا ہے۔ اب یہاں نہیں آ سکے گا۔ مجھے ایک آئیڈیا آیا ہے ہم یہ بریف کیس ساتھ رکھنے کے بجائے اسے پارسل کر دیتے ہیں اور لاس اینجلس میں اسے وصول کر لیں گے۔"

مائیکل کو یہ آئیڈیا اچھا لگا۔ انہوں نے اسٹیشن پر موجود کوریئر کاؤنٹر پر بریف کیس لاس اینجلس کوریئر کروا دیا۔ اب وہ صرف رسید دکھا کر بریف کیس وصول کر سکتے تھے۔ مگر یہ جیسی کی خام خیالی تھی کہ جائل اب ان کے پیچھے نہیں آئے گا۔ جس وقت ان کی ٹرین پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی، عین اسی وقت شیرف جائل کی گاڑی اسٹیشن کی پارکنگ میں رکی اور وہ گاڑی سے اتر کر بھاگتا ہوا پلیٹ فارم میں داخل ہوا اور ٹرین کی عقبی سرخ روشنی کو دیکھ کر اس نے دہاڑ کر دیوار پر مکا مارا۔ پلیٹ فارم خالی تھا اور اس کے شکار نکل چکے تھے۔ پارکنگ میں مائیکل کی کار دیکھ کر اس کا رہا سہا شبہ بھی جاتا رہا۔ وہ بھاگتا ہوا کاؤنٹر کی طرف آیا اور وہاں موجود آدمی سے پوچھا۔ "یہ ٹرین جو ابھی گئی ہے، آگے کس اسٹیشن پر رکے گی؟"

آدمی نے اسے اسٹیشن کے بارے میں بتایا اور پھر عقب میں دیوار پر لگے نقشے کی مدد سے اسے روٹ سمجھایا جس سے وہ اس اسٹیشن تک جا سکتا تھا۔ شیرف جائل بھاگتا ہوا پارکنگ میں آیا۔ وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ کاؤنٹی سے باہر جانے والی سڑکوں کی ناکا بندی کیے ہوئے تھا لیکن جب اسے مائیکل اور جیسی کی اطلاع نہیں ملی تو اسے اس متروک راستے کا خیال آیا اور وہ ایک امید کے ساتھ اس طرف چل پڑا۔ وہ بہر صورت جیسی اور آٹھ لاکھ ڈالرز کی واپسی چاہتا تھا۔ وہ مائیکل کو قصور وار سمجھ رہا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے قتل کر دے گا۔ سڑک پر آتے ہی اس نے گاڑی کی روشنیاں آن کر دیں اور رفتار انتہائی حد تک لے آیا... وہ بہر صورت ٹرین سے پہلے اس اسٹیشن تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ذرا دیر میں گاڑی ریل ٹریک کے ساتھ سڑک پر تھی اور لحہ بہ لحہ ٹرین کے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ ٹرین کے کیبن میں آنے کے بعد جیسی پہلے سے زیادہ مطمئن اور پر اعتماد نظر آنے لگی تھی۔ اس نے ایک بار پھر مائیکل پر مہربان ہونے کی کوشش کی لیکن اس نے نرمی سے منع کر دیا۔ "ابھی ہم خطرے کی حد سے باہر نہیں نکلے ہیں۔"

"میرا خیال ہے اگر جائل کا دھیان اس طرف جاتا تو وہ اب تک آ چکا ہوتا۔"

"ضروری نہیں ہے۔ ممکن ہے اس کا دھیان دیر سے اس طرف آیا ہو اور وہ تاخیر سے روانہ ہوا ہو۔"

"تب بھی کیا ہو گا... ٹرین تو چل چکی ہے اور اب اسے کیا معلوم کہ ہم ٹرین میں سوار ہوئے ہیں یا نہیں۔"

"تم بھول رہی ہو۔" مائیکل جھنجلا گیا۔ "میری کار اسٹیشن پر کھڑی ہے۔ ایک شیرف کے لیے بکنگ سے معلوم کرنا کیا دشوار ہے کہ یہاں سے کون کون ٹرین پر سوار ہوا ہے۔ وہ ہمارا تعاقب کر سکتا ہے۔"

اسی لمحے جیسی کی نظر ٹرین کے ساتھ چلنے والی سڑک پر گئی اور وہ خوف زدہ ہو گئی۔ "میرے خدا! وہ آ گیا ہے۔"

مائیکل نے چونک کر دیکھا تو اسے پولیس کار کی روشنیاں دکھائی دیں لیکن اتنی دور سے یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ شیرف جائل تھا یا کوئی مقامی پولیس کار تھی جو کہیں جا رہی تھی۔ اس نے جیسی کو تسلی دی۔ "ضروری نہیں ہے یہ وہی ہو۔"

"میرا دل کہہ رہا ہے یہ وہی ہے۔" جیسی بولی۔ "پلیز! اس ٹرین سے [illegible]"

"چلتی ٹرین سے؟" مائیکل نے نفی کی۔ "ہمیں [illegible] اسٹیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"اسٹیشن پر جائل موجود ہو گا۔" [illegible] ہوا ہو گی اور وہ بوکھلا گئی۔

"وہ شیرف ہے، سپر مین نہیں ہے۔" مائیکل نے کہا۔ "ٹرین ڈیڑھ سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے چل رہی ہے اور وہ اتنی تیز ڈرائیونگ نہیں کر سکتا ہے سڑک پر اسے بہت ساری رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمیں ٹرین چھوڑ دینی چاہیے لیکن ہم اسٹیشن سے نہیں نکلیں گے۔"

"تب کہاں سے نکلیں گے؟"

"جیسے ہی اگلا اسٹیشن قریب آئے گا اور ٹرین رکنے لگے گی ہم پیچھے کی طرف جائیں گے اور آخری بوگی کے دروازے سے نکل جائیں گے۔ پھر پٹری سے ہوتے ہوئے اسٹیشن سے باہر چلے جائیں گے۔" مائیکل نے اپنا پلان بتایا تو جیسی مطمئن نظر آنے لگی۔

"یہ ٹھیک ہے، ہم باقی سفر بائی روڈ کریں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں الگ الگ سفر کرنا چاہیے، ساتھ رہے تو پکڑے جانے کا زیادہ امکان ہو گا۔"

"نہیں۔" جیسی نے اس کا بازو تھام لیا۔ "ہم ساتھ ساتھ رہیں گے پلیز..."

"اوکے... اوکے۔" مائیکل نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ "لیکن ہمیں فرار کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کیا تمہارے سوٹ کیس میں کوئی خاص چیز ہے؟"

"نہیں، صرف کپڑے ہیں اور اسی طرح ضرورت کی دوسری چیزیں ہیں۔"

"آٹھ لاکھ ڈالرز کے ہوتے ہوئے تمہیں ان معمولی چیزوں کی زیادہ پروا نہیں کرنی چاہیے۔ سامان اٹھا کر لے جانا مسئلہ ہو گا اس لیے خالی ہاتھ جانا ہو گا۔"

جیسی کے زیورات اور دوسری قیمتی چیزوں سمیت اس کے تمام کاغذات بھی اس کے ہینڈ بیگ میں موجود تھے۔ اس لیے وہ آسانی سے سوٹ کیس چھوڑ کر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ جیسے ہی کسی قصبے یا شہر کے آثار نمایاں ہوئے، وہ کھڑے ہو گئے۔ ٹرین کی رفتار کم ہو رہی تھی، اس کا مطلب تھا وہ اسٹیشن پر رکنے والی تھی۔ مائیکل نے باہر آتے ہی [illegible] تیزی سے ٹرین کے پچھلے حصے میں جانے لگا۔ جیسی کو دوڑنا پڑ رہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اگر [illegible] نے ہمیں روک لیا تو؟"

"ہمیں رکنا نہیں ہے، اگر کوئی راستے میں آیا تو یہ کام [illegible] گا۔" مائیکل نے جیب میں موجود جائل کا پستول تھپتھپایا۔ [illegible] پاس ہی تھا مگر ان کی بدقسمتی کہ ٹرین میں [illegible] تھا اور انہیں کوئی درجن بھر [illegible] عبور کر کے آخری ڈبے تک پہنچنا تھا۔ ابھی وہ آٹھویں یا نویں ڈبے میں تھے کہ ٹرین رک گئی اور ٹرین مشکل سے ایک دو منٹ کے لیے رکتی تھی۔ اب انہوں نے لوگوں کی پروا کیے بغیر دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ آخری چند ڈبے سامان کے لیے مخصوص تھے یا ان میں ٹرین سروس والوں کا سامان تھا۔ وہ آخری سے پہلے والے ڈبے میں داخل ہوئے تھے کہ ٹرین دوبارہ حرکت میں آ گئی۔ مائیکل چلایا۔ "جیسی... جلدی کرو۔"

وہ آخری ڈبے میں داخل ہوئے تو ٹرین رینگ رہی تھی اور اس کی رفتار میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ یہاں تاریکی تھی اور تمام روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ جیسی آگے تھی۔ وہ دروازے کے پاس پہنچی تھی کہ مائیکل کی چھٹی حس نے خبردار کیا اور وہ بروقت جھک گیا تھا ورنہ تاریکی سے آنے والی لوہے کی راڈ اس کے سر پر لگتی۔ وار خالی جاتے ہی شیرف گھوم گیا اور مائیکل کے سامنے آ گیا۔ مائیکل نے پستول نکالا تھا کہ اس بار جائل نے اس کے ہاتھ پر وار کیا، اس نے وار تو بچا لیا لیکن پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جائل گاڑی دوڑاتا ہوا ٹرین سے ذرا پہلے ہی اسٹیشن تک پہنچ گیا تھا اور اس نے پلیٹ فارم سے جانے کے بجائے آخری حصے سے داخل ہونا مناسب سمجھا۔ یہاں کوئی اسے دیکھنے والا نہیں تھا۔ ٹرین کے دوبارہ چلنے سے پہلے وہ سوار ہو گیا تھا اور جب اس نے آگے جانے کی کوشش کی تو اس نے مائیکل اور جیسی کو پیچھے آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ تیزی سے واپس آیا اور اس نے آخری ڈبے کی روشنیاں بجھا دیں۔ اس کے پاس پستول تھا لیکن اس نے لوہے کی راڈ کا استعمال مناسب سمجھا جو اسے وہیں سے مل گئی تھی۔ وار خالی جانے پر اس نے بروقت مائیکل کو پستول نکالتے دیکھ لیا تھا اور اس نے اس بار ہاتھ پر وار کیا۔ پستول مائیکل کے ہاتھ سے نکل گیا تو جائل نے ایک بار پھر اس کے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ اس دوران میں وہ جیسی سے غافل ہو گیا تھا حالانکہ وہ پہلے بھی اس غفلت کا خمیازہ بھگت چکا تھا۔ عین اس وقت جب وہ مائیکل پر فیصلہ کن وار کرنے جا رہا تھا جیسی پیچھے سے بھاگتی ہوئی آئی اور اچھل کر اس کی گردن پر سوار ہو گئی۔ جائل پہلے ہی پیچھے جھکا ہوا تھا، اس کا توازن خراب ہوا اور وہ پیچھے گرا۔ اس کے وزنی جسم تلے دب کر جیسی چلا اٹھی لیکن اس نے جائل کی گردن نہیں چھوڑی ہے۔

مائیکل تاریکی میں فرش پر گرا ہوا پستول تلاش کرنے لگا۔ جائل گالیاں دیتے ہوئے جیسی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے اپنی گردن چھڑائی اور جیسی کو پیچھے دھکیل دیا۔ وہ کھڑا ہوا تھا جیسی نے اس کی ٹانگ

پر ٹانگ ماری۔ جائل ایک بار پھر پیچھے جا گرا۔ جیسی کوشش کر رہی تھی کہ اسے اٹھنے نہ دے اور اس دوران میں مائیکل پستول تلاش کر لے۔ اسے خبر نہیں تھی کہ جائل نے راڈ پھینک کر پستول نکال لیا تھا۔ اس نے اچانک مائیکل پر فائر کیا تو وہ نیچے گر گیا۔ اسے گولی نہیں لگی تھی لیکن وہ نیچے گر کر ساکت ہو گیا۔ اتنے قریب سے نشانہ ضائع جانا اس کی خوش قسمتی تھی۔ جائل دھوکا کھا گیا کہ مائیکل کو گولی لگ گئی ہے، اس نے گھوم کر جیسی کو بالوں سے پکڑا۔

”کتیا۔“ وہ غرایا۔ ”رقم کہاں ہے؟“

جواب میں جیسی نے اسے ایک ناقابلِ بیان گالی دی اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔ جائل نے غصے سے پاگل ہو کر اسے تھپڑ مارا۔ جیسی دروازے کے پاس جا گری۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور عقب میں دوڑتی پٹری دکھائی دے رہی تھی۔ جیسی نے دہشت زدہ ہو کر اٹھنا چاہا لیکن جائل نے اس کی نازک کمر پر جوتا رکھ دیا۔ ”بتاؤ ورنہ نیچے پھینک دوں گا۔“

جیسی چلائی۔ ”کتے... ذلیل... میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔ کاش میں نے تمہیں قتل کر دیا ہوتا۔“

”کوشش تو تم نے کی تھی لیکن میں بچ گیا۔“ جائل نے زہریلے انداز میں کہا۔ ”لیکن اب تم نہیں بچو گی۔ میں مار کر تم دونوں کو نیچے پھینک دوں گا اور رقم لے کر اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا۔“

مائیکل کو پستول نہیں مل رہا تھا البتہ اسے جائل کی پھینکی ہوئی لوہے کی راڈ مل گئی تھی۔ وہ بغیر آواز کے فرش پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ راڈ ملتے ہی وہ اٹھا اور دبے قدموں جائل کی طرف بڑھا جو جیسی پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے جیسی کے بال پکڑ لیے تھے اور رقم کا پوچھ رہا تھا۔ مائیکل نے اس کے پاس پہنچ کر کہا۔ ”رقم یہ رہی۔“

جائل پھرتی سے گھوما لیکن اس سے زیادہ تیزی سے راڈ گھومی اور اس کے پستول والے ہاتھ کے شانے پر لگی۔ اس وار نے اس کا بازو بیکار کر دیا۔ جائل چلایا اور اس نے پستول بائیں ہاتھ میں تھامنے کی کوشش کی تو جیسی نے اس کی ٹانگوں میں ٹانگیں پھنسا کر اسے پیچھے کھینچا۔ جائل کا توازن بگڑا اور وہ گرنے لگا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے کوئی چیز تھامنے کی کوشش کی لیکن وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ الٹ کر دروازے سے باہر گیا اور اس کے ساتھ ہی جیسی بھی کھنچ کر جانے لگی کیونکہ اس کی ٹانگیں ابھی تک جائل کی ٹانگوں میں پھنسی تھیں۔ مائیکل نے آگے چھلانگ لگائی اور باہر جاتی جیسی کا ہاتھ تھام لیا۔ جائل سر کے بل پٹری پر گرا اور فوراً ہی ختم ہو گیا مگر اس کی ٹانگوں نے جیسی کو کچھ اس طرح سے جکڑ رکھا تھا کہ وہ خود کو چھڑا نہیں پا رہی تھی۔ مائیکل بھی گھسٹتا ہوا جا رہا تھا۔ اس نے دوسرا ہاتھ چلایا اور دروازہ پکڑ لیا... چلایا۔ ”ٹانگیں چھڑاؤ اپنی۔“

”میں نہیں چھڑا سکتی۔“ جیسی جواباً چلائی۔ یہاں بے پناہ شور تھا۔ مائیکل نے دروازے کی مدد سے خود کو روکا ہوا تھا لیکن جیسی اور اس کے ساتھ جائل کے وزن کی وجہ سے وہ جیسی کے ہاتھ پر اپنی گرفت برقرار نہیں رکھ پا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ رفتہ رفتہ پھسل رہا تھا۔ مائیکل پورا زور لگا کر بھی اسے روک نہیں پا رہا تھا۔ جیسی اپنی ٹانگیں آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن جلد اس نے محسوس کر لیا کہ یہ ممکن نہیں۔ اس نے جلدی میں جائل کو جو لیگ لاک لگایا تھا، اب وہی الٹا اس کے لیے پیغامِ اجل بننے والا تھا۔ اس نے مائیکل کی طرف دیکھا۔

”میں آزاد نہیں ہو سکتی، مجھے چھوڑ دو۔“

”نہیں۔“ مائیکل چلایا۔

جیسی کا بیگ اس کے شانے پر تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اسے تھام رکھا تھا کیونکہ اس میں وہ رسید تھی جو اسے آٹھ لاکھ ڈالرز دلاتی۔ اس نے گھما کر بیگ اندر پھینک دیا۔ جھٹکے کی وجہ سے اس کا ہاتھ مائیکل کی گرفت سے پھسلا اور پھر وہ چلائی۔ ”خدا حافظ۔“

اگلے ہی لمحے وہ پٹری پر گری اور لڑھکتی ہوئی مائیکل کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کی چیخ بہت تیز تھی۔ مائیکل بیٹھا ہانپتا رہا۔ جیسی نے اس کے احسان کا بدلہ اتار دیا تھا، اپنی جان دے کر۔ کچھ دیر بعد وہ تھکے ہوئے قدموں سے اٹھا۔ اس نے جیسی کا ہینڈ بیگ اٹھایا۔ اس میں سے کوریئر رسید نکالی اور بیگ کو کھلے دروازے سے باہر اچھال دیا۔ اس نے دروازہ بند کرنے کی غلطی نہیں کی۔ اب اس واقعے کو حادثہ سمجھا جاتا۔ اگر وہ دروازہ بند کر دیتا تو پولیس کا ذہن قاتل کی طرف جاتا۔ مائیکل نے لائٹ آن کر کے پستول تلاش کیا۔ اسے بھی ٹرین سے باہر اچھال دیا۔ اب کوئی ثبوت باقی نہیں رہا تھا۔ وہ واپس کیبن میں آ گیا۔ اگلے اسٹیشن پر وہ ٹرین سے اترا اور اس نے واپسی کی ٹرین پکڑی۔ جیسی کا ... کیس بھی اس نے راستے میں پھینک دیا تھا۔ ... جاتا اور اسٹیشن کے باہر کھڑی اپنی کار لے کر لاس اینجلس کی طرف روانہ ہو جاتا، جہاں آٹھ لاکھ ڈالرز اور ایک نئی زندگی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے جان کی بازی ... کر اس رقم کا حق دار ثابت کر دیا تھا۔

مرد، عورت اور بچہ کار میں تھے اور کار اس گھنے اور اونچے درختوں والے جنگل کے درمیان سے صاف اور ہموار سڑک پر تیرتی جا رہی تھی۔ تیز آواز میں میوزک بج رہا تھا اور مرد عورت آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بچہ عقب میں سیٹ پر بیٹھا کسی قدر بے چین لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے کوئی تکلیف ہو لیکن وہ ان سے کہتے ہوئے ڈر رہا ہو۔ آخر اس کا صبر جواب دے گیا اور اس نے منمنا کر کہا۔

”مام... مجھے پی آرہی ہے۔“

[illegible] جنون اور دیوانگی کی نذر ہو جانے والے لمحوں کی دل شکستہ و پُرملال داستان

وحشت و دیوانگی کی کوئی حد متعین نہیں... ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو رکتا نہیں... بس دراز ہوتا چلا جاتا ہے... ایک نسل نے اسے جوان ہوتے دیکھا... اور دوسری نسل کو وہ بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا... یوں جنوں اور دیوانگی کے حصار میں عمروں کی مسافتیں طے ہو رہی تھیں... نسل در نسل منتقل ہونے والے ورثے کی فکر انگیز کتھا... جس میں دکھ... رنج... اور ہجر کے موسموں کے محرم تو تھے مگر ہمسفر کوئی نہ تھا...

دورِ وحشت

سریم کے خان

تیز میوزک اور آپس کی باتوں میں عورت نے بچے کی آواز نہیں سنی یا سنی تو نظر انداز کر دی۔ بچہ کچھ دیر تو جواب کا منتظر رہا۔ پھر اس نے دوبارہ کہا۔ "مام! مجھے پی آرہی ہے۔"

اس بار عورت نے یقینی طور پر اس کی بات سن لی تھی کیونکہ اس نے ایک لمحے کے لیے پلٹ کر دیکھا تھا مگر جواب اس بار بھی نہیں دیا تھا۔ تیسری بار بچے نے نسبتاً زور سے کہا تھا۔ "مام..."

عورت نے پلٹ کر اسے تھپڑ مارا۔ "کیا مسئلہ ہے تمہیں؟"

بچے نے اپنے گال پر ہاتھ رکھا اور کچھ دیر اس عورت کو گھورتا رہا جو اس کی ماں تھی پھر اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "مجھے بہت زور سے پی آرہی ہے۔ کیا میں گاڑی میں کر دوں؟"

مرد ان دونوں کی گفتگو سے بے نیاز ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔ عورت کچھ دیر بچے کو گھورتی رہی پھر اس نے مرد سے کہا۔ "ڈیئر! گاڑی روک دو ورنہ یہ تنگ کرتا رہے گا۔"

مرد کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی لیکن اس نے گاڑی ذرا کنارے پر روک دی۔ بچہ دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ عورت نے اس کے ساتھ اترنے یا اسے سمجھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اسے بظاہر یہ فکر بھی نہیں تھی کہ یہ جنگل ہے اور یہاں جانور بھی ہو سکتے ہیں۔ بچہ جو تقریباً بارہ سال کا لڑکا تھا، اتر کر سڑک سے نیچے درختوں کے درمیان جھاڑیوں تک آیا۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک بورڈ لگا تھا جس میں علاقے کا نقشہ تھا اور سڑکوں کی وضاحت تھی۔ اس بورڈ کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی پتلون کی زپ کھولی۔

جنگل اندر سے تاریک تھا۔ موسم ویسے ہی ابر آلود تھا لیکن یہ جنگل اتنا گھنا تھا کہ اگر سورج نکلا ہوتا تب بھی اس کی روشنی نیچے تک نہیں آسکتی تھی۔ یہ جنگل ہمیشہ تاریک ہی رہتا تھا۔ امریکا کی انتہائی شمالی ریاست الاسکا کا بڑا حصہ جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہاں جنگل بہت گھنے اور اونچے درختوں والے ہوتے ہیں۔ ان جنگلوں میں ہرن، بارہ سنگھے، ریچھ اور بڑی نسل کی بلیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ تمام جانور ایک بارہ سال کے بچے کے لیے خطرناک ہو سکتے تھے لیکن عورت اور مرد کو اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔

وہ پی کر رہا تھا کہ اچانک اسے جنگل میں کسی چیز کی حرکت کا احساس ہوا۔ وہ ڈر گیا۔ یہ خاصی بڑی چیز تھی اور تیزی سے حرکت کر رہی تھی۔ جتنی دیر میں وہ اپنی پتلون کی زپ بند کرتا، وہ چیز اس کے دائیں طرف کوئی سو گز کی دوری سے [illegible] کر سڑک پر چلی گئی۔ بچے نے گھوم کر دیکھا۔ وہ حیران رہ گیا، جب اس نے ایک اپنے ہم عمر بچے کو سڑک پر دیکھا۔ اس کا سر گنجا تھا اور سر و چہرے پر جگہ جگہ کٹ اور جلائے جانے کے نشانات تھے۔ اس کی پشت اور کمر پر بھی ایسے ہی نشانات تھے۔ اس نے اس موسم میں بھی صرف ایک معمولی اور پھٹی ہوئی پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ سڑک پر آکر کار سے ذرا پیچھے رکا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے کسی سے بچ کر بھاگتا رہا ہو۔ بچہ باہر کی طرف آیا تھا کہ سڑک کی مخالف سمت سے ایک بڑا اور تیز رفتار ٹرک نمودار ہوا۔ گنجا لڑکا سڑک کے عین وسط میں تھا اور ٹرک اس سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ ٹرک ڈرائیور کے پاس بالکل موقع نہیں تھا کہ وہ بریک لگاتا۔ اس نے بے ساختہ اسٹیئرنگ گھمایا اور ٹرک لڑکے کے پاس سے ہوتا ہوا کار پر سے گزر گیا۔ ٹرک نے کار کا نصف حصہ بالکل پچکا دیا تھا اور اس کا ایندھن کا ٹینک پھٹا تو کار میں آگ بھڑک اٹھی۔ مرد اور عورت کو یقیناً نکلنے کا موقع نہیں ملا۔ ان کی لاشیں کار میں جل رہی تھیں۔ بچہ ساکت کھڑا دیکھ رہا تھا۔ گنجے لڑکے نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور عجیب سی آواز نکالتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔ بچہ ابھی تک ساکت کھڑا تھا۔

☆☆☆

وہ اس طویل اور سنسان ہائی وے پر ڈرائیو کرتا جا رہا تھا۔ یہ علاقہ الاسکا کے دارالحکومت اولمپیا کے مشرق میں کوئی دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ جاسکا نامی یہ چھوٹا سا قصبہ پہاڑوں اور جنگلوں کے عین وسط میں تھا اور یہاں دریاؤں اور ندی نالوں کی بہتات تھی۔ موسم سارا سال ہی ابر آلود رہتا اور بارش روزانہ ہوتی تھی۔ سبزے کی بہتات اور گھنے جنگلات کی وجہ سے یہ علاقہ سیاحوں میں بہت مقبول تھا۔ مگر سیزن بہت مختصر ہوتا تھا۔ مئی سے ستمبر کے آغاز تک، کیونکہ اس کے بعد برف باری شروع ہو جاتی جو اپریل کے آخر تک ہوتی رہتی۔ اس دوران میں لوگ سوائے گھروں میں بند ہو کر بیٹھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

وہ کیسٹ پر موزارٹ کی ایک دھن سنتے ہوئے بے دھیانی میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا [illegible] سامنے سے کوئی چیز بہت تیزی سے گزری ہے۔ اس نے بے ساختہ بریک لگائے اور پھر کار سے نیچے اتر آیا۔ اس نے سب سے پہلے [illegible] دیکھا لیکن [illegible] نہیں تھا [illegible] نے عقب میں دیکھا۔ سڑک بالکل صاف تھی اور [illegible] یقیناً اس کا وہم تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔ اچانک [illegible] کی نظر سڑک کے کنارے لگے بورڈ پر پڑی۔ اس پر [illegible] نقشہ اور سڑکوں کی وضاحت تھی۔ وہ بورڈ کے پاس آیا اور اس پر ہاتھ پھیرا۔ سالوں سے مسلسل بارش اور برف باری کی وجہ سے بورڈ زنگ آلود ہو گیا تھا اور نقشہ مدھم پڑ گیا تھا لیکن ابھی بھی اس سے مدد لی جا سکتی تھی۔ بورڈ کے مطابق جاسکا یہاں سے کوئی تین میل کے فاصلے پر تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور واپس کار میں بیٹھا۔ دس منٹ بعد وہ جاسکا میں داخل ہوا اور اس نے ایک ہوٹل کے سامنے روک دی۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ کار سے اتر کر اندر آیا۔ استقبالیہ پر ایک نوجوان موجود تھا۔ "یس سر! میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"مجھے ایک سنگل روم چاہیے۔"

نوجوان نے کی بورڈ اپنی طرف کھینچا اور بولا۔ "ڈرائیونگ لائسنس سر...؟"

"ولسن... ولسن اسمتھ۔" اس نے ڈرائیونگ لائسنس نوجوان کی طرف بڑھا دیا۔ نوجوان نے اس کا نام اور ڈرائیونگ لائسنس نمبر کمپیوٹر میں ڈالا اور پھر عقب میں بنے ریک کے خانوں میں سے ایک چابی اٹھائی اور ولسن اسمتھ کے سامنے رکھ دی۔ "اوپر راہداری میں دائیں طرف کمرا نمبر بارہ ہے۔ ادائیگی کس طرح کرنا پسند کریں گے؟"

ولسن اسمتھ نے کریڈٹ کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔ "مجھے دو دن رکنا ہے۔"

"میں دو دن کا کرایہ کاٹ رہا ہوں لیکن آپ پہلے جانا چاہیں تو بقیہ کرایہ واپس مل جائے گا۔ ایک دن کے سینتالیس ڈالرز چارج ہوں گے مع ٹیکس۔"

ولسن نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور کریڈٹ کارڈ لے لیا۔ اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ چابی لے کر اوپر آیا۔ ہوٹل بس دو منزلہ تھا۔ اس نے کمرا نمبر بارہ کا دروازہ کھولا اور اندر آکر روشنیاں جلائیں۔ یہ خوب صورت اور پُرآسائش کمرا تھا۔ ہوٹل سینٹرلی ایئر کنڈیشنڈ تھا اس لیے باہر کے مقابلے میں اندر سے خوشگوار حد تک گرم تھا۔ ولسن نے اپنا اوور کوٹ اتار کر ایک طرف کھونٹی پر لٹکا دیا اور واش روم میں آکر آئینے میں خود کو دیکھا۔ وہ تقریباً چالیس سال کا تنے ہوئے چہرے والا شخص تھا۔ ایسا شخص جس نے زندگی میں بہت ساری پریشانیاں جھیلی تھیں اور اسے خوشی اور سکون کے مواقع کم ملے تھے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گوشت لٹک گیا تھا اور یہ تنے سوچتے ہوئے تھے۔ اسے نیند بھی کم آتی تھی۔ اس نے منہ پر سرد پانی کے چھینٹے [illegible] اور باہر آگیا۔

اس کے کوٹ میں موبائل فون بج رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ "ولسن اسمتھ۔"

"کارینا کارٹر بات کر رہی ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "تم آگئے ہو؟"

"ابھی پہنچا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں ہوٹل اپیکس میں ٹھہرا ہوں۔"

"اچھا ہوٹل ہے۔ اس سے ایک بلاک آگے اسی لائن میں پولیس اسٹیشن ہے۔ اگر تمہیں کوئی کام نہیں ہے تو آجاؤ۔"

"میں آرہا ہوں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ کارینا کارٹر جاسکا پولیس میں تھی۔ ولسن نے اپنے بال درست کیے، اوور کوٹ پہنا اور باہر آگیا۔ چابی اس نے کاؤنٹر پر دے دی۔ "ممکن ہے میں ذرا دیر سے آؤں۔"

وہ باہر آیا تو بارش میں معمولی سی تیزی آگئی تھی۔ اس نے کار نکالی اور پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ پولیس اسٹیشن قریب ہی تھا۔ اس نے کار باہر کھڑی کی اور بھاگ کر اندر چلا آیا۔ اس نے نظر آنے والے پہلے پولیس مین سے کارینا کارٹر کا پوچھا۔ اس نے انگوٹھے سے ایک کونے میں میز پر بیٹھی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ رہی۔"

وہ میز تک آیا۔ "ولسن اسمتھ۔"

کارینا نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ "کارینا کارٹر۔"

کارینا تقریباً پینتیس برس کی دلکش اور صحت مند عورت تھی۔ اس نے اٹھ کر اپنے اور ولسن کے لیے کافی نکالی اور کپ ولسن کے سامنے رکھ دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں بُری خبر سنائی۔"

ولسن نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کی ڈیڈ باڈی کہاں ہے؟"

"جاسکا کے اسپتال میں ہے۔ تم جس سڑک سے آئے ہو، قصبے میں داخل ہوتے وقت اس کے دائیں طرف دیکھو تو اسپتال کی عمارت نظر آتی ہے۔"

"اگر میں اسے دیکھنا چاہوں تو...؟"

"اسپتال میں ڈاکٹر برائن انچارج ہے، وہ تمہیں ڈیڈ باڈی دکھا دے گا۔ لیکن اس سے پہلے میں تمہیں کچھ چیزیں دینا چاہوں گی۔"

کافی کے بعد کارینا اسے اسٹور روم میں لائی اور اس نے ایک گتے کا کارٹن اٹھا کر میز پر رکھا۔ سب سے پہلے اس نے ایک چابیوں کا گچھا نکالا۔ "یہ مکان کی چابیاں ہیں... اور یہ لفافہ ہے تمہارے نام... باقی اس کے جسم کے ساتھ ملنے والی چیزیں ہیں۔"

ولسن نے ڈبے میں جھانکا۔ اس میں [illegible] گھڑی تھی۔ اس نے چابی اور لفافہ لے لیا۔ "باقی چیزیں [illegible]

یہ سوچ کر اس نے کار کا رخ اس طرف کر دیا۔ مکان قصبے کے سب سے اونچے حصے میں تھا۔ یہ پہاڑ کی چوٹی تھی جہاں تک پہنچنے کے لیے سڑک خاص طور پر بنائی گئی تھی۔ اس نے کار مکان کے داخلی دروازے کے سامنے روکی۔ مسلسل بارش اور نمی سے لکڑی سے بنی بیرونی دیواریں سیاہ ہو رہی تھیں۔ [illegible] تاریکی تھی لیکن داخلی دروازے کے اوپر چھجے تلے بلب روشن تھا۔ وہ اتر کر دروازے تک آیا۔ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور غیر ارادی طور پر اس میں سے چابی چن لی۔ [illegible] کھل گیا۔

وہ اندر آیا تو مکان میں تاریکی تھی۔ اس نے ماسٹر سوئچ دبایا جو پورے گھر کی روشنیاں آن کر دیتا تھا لیکن اس سے پورا گھر روشن نہیں ہوا۔ کہیں کہیں تاریکی برقرار تھی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا، بیڈ روم اوپر ہی تھے۔ وہ اوپر آیا اور اس نے ہچکچاتے ہوئے وہ دروازہ کھولا جس سے اسے شدید نفرت تھی کیونکہ اس دروازے کے پیچھے وہ ہستی تھی جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتا تھا اور وہ اب لاش کی صورت میں چہاں کے بیڈ پر پڑی تھی۔

کمرے میں سوائے ایک بیڈ اور ایک دیوار گیر الماری کے کچھ نہیں تھا۔ بیڈ بے ترتیب تھا اور الماری کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ اس میں کپڑے اور دوسری چیزیں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ یہاں اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اوپری حصے میں دو بیڈ رومز تھے۔ نچلا حصہ لاؤنج، کچن اور ایک نشست گاہ پر مشتمل تھا۔ سب سے نیچے تہ خانہ تھا اور اس کی اصل دلچسپی وہی تھی۔ وہ نیچے آیا۔ تہ خانے کی ساری روشنیاں نہیں جلی تھیں اس لیے وہاں نیم تاریکی تھی۔ اچانک اسے لگا کہ تہ خانے میں کوئی چیز ٹک ٹک کر رہی ہے۔ وہ رک گیا اور پھر اس نے تہ خانے کا دروازہ کھولا تو ٹک ٹک کی آواز فوراً رک گئی۔ سیڑھیوں پر روشنی تھی اور سیڑھی کے آخری حصے میں ایک گول سی چیز نظر آئی۔ وہ سیڑھی اتر کر نیچے آیا۔ یہ ایک پلاسٹک کی گیند تھی۔ ایک عام سی گیند جس سے بچے کھیلتے ہیں۔ تہ خانے میں کوئی تھا جو اس گیند سے کھیل رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تہ خانے میں آگے جائے یا نہ جائے۔

تب [illegible] اوپر سے آہٹ سنائی دی اور وہ اوپر کی طرف آیا۔ یہاں جو بھی تھا، اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ داخلی دروازے میں باہر سے آتی ہلکی روشنی میں کسی کا سایہ نظر آ رہا تھا۔ نشست گاہ میں ہر طرف لکڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے ان میں سے ایک لکڑی اٹھا لی۔ لاؤنج میں موجود سایہ نشست گاہ کی طرف آ رہا تھا، اور جیسے ہی وہ اندر آیا، ولسن نے لکڑی بلند

"اے... یہ میں ہوں۔" آنے والی بولی۔ وہ کارینا کارٹر تھی۔

ولسن کا چہرہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ نیچے کیا اور مرتعش لہجے میں بولا۔ "میں ڈر گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے یہاں کوئی گھس آیا ہو۔ تم کب آئیں؟"

"میں نیچے سے گزر رہی تھی، اوپر مکان میں روشنی دیکھی تو اس طرف آ گئی۔" اس نے نشست گاہ کی حالت دیکھی۔

"پہلے بھی کوئی اس مکان میں گھستا رہا ہے۔"

لکڑی کا ایک پرانا سا تنا جس میں بے شمار نکیلی لکڑیاں نکلی تھیں، کھڑکی کے راستے اندر لانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن تنا بھاری ہونے کی وجہ سے راستے میں پھنس گیا۔ اس نے کھڑکی بھی توڑ دی تھی۔ ولسن باہر دیکھ رہا تھا۔ اچانک اسے لگا جیسے کوئی درختوں کے درمیان سے گزرا ہو۔ وہ بس ایک لمحے کو نظر آیا تھا۔ ولسن کی نظر سرخ رنگ کو دیکھ سکی تھی اور اگلے ہی لمحے وہاں کچھ نہیں تھا۔ وہ جو بھی تھا بہت تیز رفتار تھا۔ کارینا کی نظر اس طرف نہیں تھی۔

"پولیس نے کسی کو گرفتار کیا؟"

کارینا نے سر ہلایا۔ "نہیں... یہاں کوئی نہیں ملا۔ پھر بھی ہم دن میں ایک چکر لگاتے ہیں۔"

"کیا ٹریس پاسنگ کی تحقیقات ہو رہی ہیں؟"

کارینا نے سر ہلایا۔ "یہ کیس میرے سپرد ہے لیکن شاید اسے بند کرنا پڑے کیونکہ وہ جو بھی تھا، اس نے سوائے اس نقصان کے اور کچھ نہیں کیا اور نہ ہی مکان سے کوئی چیز غائب ہے۔ دو دن میں میرے آدمی اس کھڑکی کو سیل کر دیں گے۔"

ولسن اس کے ساتھ مکان سے باہر آیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور تاریکی چھا رہی تھی۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے، مکان کو ٹھیک کراؤ گے یا بیچ دو گے؟ ویسے یہ تمہارا آبائی مکان ہے۔"

"ابھی میں نے سوچا نہیں ہے۔ ویسے میں دو ہفتے کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ اس دوران میں سوچوں گا۔"

"وہ تمہاری آخری رشتے دار تھی۔"

"میں اس کا آخری رشتے دار ہوں۔" ولسن نے تصحیح کی۔

"مجھ پر یہ خاندان ختم ہو جائے گا۔"

"ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں بہت اچھا کھانا بناتی ہوں۔" کارینا نے اسے دعوت دی۔

وہ ہچکچایا۔ "تمہیں زحمت ہوگی۔"

"نہیں ہوگی۔"

وہ کارینا کے ساتھ اس کے گھر پہنچا۔ اس کی کار پیچھے تھی۔ کارینا کے پاس بڑا خوبصورت اپارٹمنٹ تھا۔ اندر پہنچ کر

دے دو یا پھینک دو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

کارینا نے ڈبا واپس رکھ دیا۔ "تمہاری مرضی۔"

وہ اس کے ساتھ واپس آئی اور اس سے ہاتھ ملایا۔ "اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کال کر دینا۔"

ولسن کو دو ہفتے پہلے اس کی کال آئی تھی۔ اس وقت وہ مشرق وسطیٰ میں تھا، وہاں سے چھٹی لے کر آنے میں اسے اتنا وقت لگ گیا تھا۔ کارینا نے اسے فون پر سب بتا دیا تھا۔ وہ پولیس اسٹیشن سے سیدھا اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر برائن اسے اپنے دفتر میں ملا۔ وہ مردہ خانے کا انچارج اور پولیس کا ڈاکٹر بھی تھا۔ اس نے نام سنتے ہی ولسن سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ "مجھے کارینا نے بتا دیا تھا۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"مجھے لاش دیکھنی ہے۔"

"آؤ میرے ساتھ لیکن وہ کچھ اچھا منظر نہیں ہوگا۔ اس کے مرنے کے ایک ہفتے بعد لاش کا پتا چلا تھا۔ خوش قسمتی سے کمرے کی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی ورنہ اتنے دن میں لاش بری طرح گل سڑ جاتی۔"

ولسن نے کوئی تاثر نہیں دیا۔ ڈاکٹر برائن اسے مردہ خانے کے ایک کمرے میں لایا جہاں لائن سے میزوں پر کئی لاشیں رکھی تھیں۔ ڈاکٹر نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ رہی۔"

ولسن نے اس کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گیا اور سر ہلاتا ہوا بولا۔ "اوکے، تم دیکھو میں باہر ہوں۔"

ڈاکٹر برائن کے جانے کے بعد وہ میز کی طرف بڑھا، کچھ دیر کھڑا ہچکچاتا رہا۔ ایک بار وہ پلٹ کے دروازے کی طرف بھی جانے لگا لیکن پھر لوٹ آیا۔ آخر اس نے ہمت کر کے لاش کے منہ پر سے کپڑا سرکا دیا۔ اس کا چہرہ نیلگوں ہو رہا تھا اور جلد جیسے کسی مصنوعی مادے کی بنی تھی۔ اس کے چہرے کی سختی مرنے کے بعد اور بھی بڑھ گئی تھی۔ زندگی میں وہ بہت سخت رہی تھی۔ ولسن نے اس کے سفید بال چھوئے۔ اس کا منہ دانتوں کی کمی سے پوپلا سا ہو گیا تھا۔ اس نے پلٹ کے دروازے کی طرف دیکھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی اندر نہیں آئے گا تو اس نے سینے پر بندھے اس کے ہاتھ کھولے اور اس کی اکڑ جانے والی انگلیاں سیدھی کیں۔

"مام مجھے یقین نہیں آ رہا ہے تم مر گئی ہو۔" اس نے سرگوشی میں [illegible] اس کی آنکھیں ٹٹول رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دینا۔" [illegible] ہاتھ کی درمیانی انگلی پیچھے کی طرف موڑ دی۔ کڑک کی ہلکی سی آواز آئی اور لاش کی انگلی ٹوٹ گئی۔ کچھ نہیں ہوا تھا۔ لاش اسی طرح پڑی رہی۔ ولسن نے جلدی سے اس کی انگلی سیدھی کر دی اور اس کے ہاتھ دوبارہ سینے پر باندھ دیے۔ پھر اس نے جھک کر اس کے ماتھے پر ہلکا سا پیار کیا۔ "اب مجھے یقین آ گیا ہے کہ تم مر چکی ہو اور دوبارہ کبھی زندہ نہیں ہو گی۔"

ولسن باہر آیا تو ڈاکٹر برائن ٹہل رہا تھا۔ "اسے کیا ہوا تھا؟"

"طبی زبان میں اس کی وضاحت بہت مشکل ہے لیکن میں تمہیں آسان الفاظ میں بتا دوں کہ اسے ہلکا سا ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور فوری طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے ہارٹ اٹیک برین ہیمرج میں تبدیل ہو گیا اور یہ تقریباً دو دن زندہ رہنے کے بعد انتقال کر گئی ہو گی۔"

"دو دن؟" ولسن اسمتھ کو حیرت ہوئی۔

"وہ بہت سخت جان تھی۔" ڈاکٹر برائن نے کہا۔ "کیا اب اسے کیئرٹیکر کے حوالے کر دیا جائے؟"

"اس نے اس سلسلے میں کوئی وصیت کی تھی؟"

"ہاں، اس نے وکیل سے کہہ دیا تھا۔ اس نے سارے انتظامات کر لیے تھے، بس تمہارا انتظار تھا۔ تم پورے پانچ سال بعد آئے ہو نا؟"

ولسن نے سر ہلایا اور منہ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ ڈاکٹر برائن سے ہاتھ ملا کر باہر آ گیا تھا۔ اب اسے ایڈمنڈ سے ملنا تھا جو وکیل تھا۔ وہ دفتر سے اٹھ رہا تھا کہ ولسن کو دیکھ کر رک گیا۔

"تم... مجھے تمہارے آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔"

ولسن اس کے اشارے پر سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "میں اس کی وصیت کے بارے میں معلوم کرنے آیا ہوں۔"

"مکان کے بارے میں اس نے کوئی وصیت نہیں کی ہے اس لیے وہ تمہیں ملے گا۔ باقی اس کا بینک اکاؤنٹ اور اس کی سرمایہ کاری ایک دماغی مریضوں کی دیکھ بھال کرنے والی این جی او کو دی جائے گی۔"

ولسن نے اس خبر پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ شاید دولت کی اس کے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ "پولیس آفیسر کارینا نے مجھے چابی دے دی۔ [illegible] میں مکان استعمال کر سکتا ہوں؟"

ایڈمنڈ نے شانے جھکائے۔ "ظاہر ہے، اب میں اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔"

ولسن ایڈمنڈ کے دفتر سے نکل آیا۔ ان کی گفتگو سے ظاہر تھا کہ وہ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ [illegible] ہو گئی۔ پہلے اس نے سوچا کہ مکان پر اب [illegible]

انہوں نے اپنے بھاری کوٹ اتار دیے۔ کارینا نے ڈرنک تیار کر کے رکھا ہوا تھا۔ وہ اس نے تیار ہونے کے لیے اوون میں رکھ دیا اور ولسن کے سامنے شیمپین اور گلاس رکھ کر بولی۔ "میں فریش ہو کر آتی ہوں۔"

ولسن نے بوتل اور گلاس کو نہیں چھوا۔ اسے شراب سے دلچسپی نہیں تھی۔ اسے رہ رہ کر اس ہیولے کا خیال آ رہا تھا جو اس نے مکان کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔ کارینا پندرہ منٹ بعد واپس آ گئی۔ کھانے کی تیاری کے دوران موضوع گفتگو غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے کی طرف مڑ گیا۔ کارینا کو جان کر حیرت ہوئی کہ ولسن نے نہ تو شادی کی اور نہ ہی اسے کسی عورت سے محبت ہوئی تھی۔ وہ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دس سال تک الاسکا کے تیل کے کنوؤں پر کام کرتا رہا تھا پھر اسے کویت سے اچھی پیش کش ہوئی تو وہ وہاں چلا گیا۔ پانچ سال سے وہ وہیں تھا۔

"پھر مجھے اس کے مرنے کی اطلاع ملی تو میں آیا ہوں۔" ولسن نے کہا اور پھر اس سے پوچھا۔ "تم نے شادی کی؟"

"دو بار۔" کارینا نے ٹھنڈی سانس لی۔ "دونوں بار یہ تجربہ ناکام رہا۔"

"کوئی اولاد ہے؟"

"نہیں، اتفاق سے میرے دونوں شوہر اولاد نہیں چاہتے تھے اور ایک سے تو طلاق بھی اسی وجہ سے لی تھی۔ تین سال سے میں اکیلی رہ رہی ہوں۔"

"مجھے افسوس ہوا۔"

کارینا نے ڈنر تیار کر لیا تھا۔ انہوں نے کھانا خاموشی سے کھایا۔ کھانے کے بعد کارینا نے گرین ٹی پیش کی۔ "تم نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ یہ نسل اب یہیں ختم ہو جائے۔"

کارینا ہچکچائی۔ "میں نے اس بارے میں سنا ہے۔ میں نے صرف کیٹ کو دیکھا ہے، وہ بھی اس کے مرنے سے چند سال پہلے۔"

"ہاں، تم نے اسے دماغی امراض کے اسپتال میں دیکھا ہوگا۔" ولسن کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "یہ مرض ہماری نسلوں میں شامل رہا ہے۔"

"لیکن ضروری نہیں ہے کہ تمہاری اگلی نسل میں بھی ہو۔ آج کل تو جینز تھراپی بھی ہو رہی ہے۔"

"درست ہے لیکن میں اس سلسلے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" ولسن کا لہجہ سرد ہو گیا۔ اس نے کپ میز پر رکھ دیا۔ "اتنے اچھے ڈنر اور گرین ٹی کا شکریہ۔ اب میں چلوں گا۔"

کارینا اسے باہر تک چھوڑنے آئی۔ وہ ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کارینا کا انداز ایک پولیس افسر کا نہیں بلکہ ایک عورت کا تھا۔ وہ غلط آدمی میں دلچسپی لے رہی تھی۔

☆☆☆

تدفین میں مشکل سے ایک درجن افراد تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق چرچ اور پولیس سے تھا۔ کارینا اور جاسکا کا شیرف پارشل بھی آیا تھا۔ تدفین کے فوراً بعد وہ سب چلے گئے سوائے کارینا کے، وہ رک گئی تھی۔ وکیل ایڈمنڈ بھی تدفین میں شریک تھا اور جانے سے پہلے اس نے ولسن سے کہا۔ "تم کل میرے دفتر آ جانا تاکہ مکان کی ملکیت کی منتقلی کی کارروائی کی جائے۔"

"میں وعدہ نہیں کرتا، کوشش کروں گا۔" ولسن نے کہا۔

"یہ تمہیں پسند نہیں کرتا ہے۔" کارینا نے ایڈمنڈ کے جانے کے بعد کہا۔

"ہاں، یہ کیٹ کے بہت قریب تھا اور جو اس کے قریب ہو، وہ مجھے کیسے پسند کر سکتا ہے۔"

"کیٹ تمہیں..."

"پلیز۔" ولسن نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "کوئی اور بات کرو۔ اب میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"اوکے۔" کارینا نے سر ہلایا۔ "آج تو نہیں کل میرے آدمی کام مکمل کر کے مکان کی کھڑکی سیل کر دیں گے یا اگر تم اس کی مرمت کرانا چاہو تو وہ بھی کرا سکتے ہو۔"

"فی الحال میں نے نہیں سوچا ہے۔ تم کھڑکی سیل کر دینا۔"

"اگر تم چاہو تو میں سرکاری عملہ بھیج کر مکان کی صفائی کرا دوں۔"

"نہیں ابھی اسی حالت میں رہنے دو۔" ولسن نے سوچتے ہوئے کہا۔ وہ ٹہلتے ہوئے قبرستان کے وسط میں بنی سڑک تک آ گئے تھے۔ قبرستان جاسکا کے آخر میں جنگل کے بالکل ساتھ تھا اور یہاں سے ولسن کے آبائی مکان [illegible] دس منٹ کا تھا۔ جنگل بھی مکان والی پہاڑی اور قبرستان کے درمیان تھا۔ ولسن اپنی کار میں بیٹھا تو اس نے جنگل کی طرف دیکھا اور اسی لمحے اسے درختوں کے درمیان [illegible] دکھائی دیا۔ وہ بہت تیزی سے [illegible] جا رہا تھا۔ ولسن [illegible] رنگ کی بجلی سی جھلک دیکھ سکا تھا۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ کیا یہ وہی تھا جو اسے مکان کی کھڑکی سے دکھائی دیا تھا؟

"اوکے بائے۔" کارینا نے کھڑکی پر جھک کر کہا تو وہ چونکا۔

"بائے۔" وہ زبردستی مسکرایا اور کار آگے بڑھا دی۔ تدفین شام کے وقت ہوئی تھی اور سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ قبرستان سے نکل کر ولسن نے کار ہوٹل کے بجائے اس کی مخالف سمت میں موڑ دی۔ اب وہ مکان کی طرف جا رہا تھا۔ ایسا کرنے سے پہلے اس نے اطمینان کر لیا تھا کہ کارینا کی پولیس کار اس کے پیچھے نہ آ رہی ہو۔ جب وہ پہاڑی کے اوپر پہنچا تو سورج غروب ہو چکا تھا اور تاریکی چھا رہی تھی۔ اس روز بھی آسمان پر بادل تھے اس لیے روشنی ویسے ہی کم تھی۔ اس نے کار مکان کے سامنے روکنے کے بجائے پہلو میں روکی۔ وہ نیچے آیا۔ اس نے داخلی دروازے کو چابی لگا کر کھولا اور اندر آیا، اور بٹن دبایا لیکن مکان تاریک رہا پھر اسے خیال آیا کہ مکان کے داخلی دروازے پر لگا بلب بھی نہیں جل رہا تھا۔ مکان کی بجلی میں کوئی مسئلہ تھا۔ وہ باہر آیا اور اس نے کار سے ٹارچ نکالی۔

اندر آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور تہ خانے کے دروازے تک آیا۔ اس کی اصل دلچسپی تہ خانے سے تھی اور وہ اندر جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اندر خاموشی تھی۔ بالآخر ہمت کر کے اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ وہ ٹارچ سے روشنی کرتا ہوا نیچے تک آیا۔ تہ خانے کے ابتدائی حصے میں سروس ایریا تھا۔ یہاں بھٹی لگی تھی اور کاٹھ کباڑ اور فالتو اشیا رکھنے کی جگہ بھی تھی۔ اس کے بعد اندر دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ وہ جھجکتا ہوا کمروں کی طرف بڑھا لیکن اسے جھٹکا لگا۔ اب وہاں کمروں کے بجائے ایک دیوار تھی جس میں شیلف بنے ہوئے تھے اور ان پر مختلف سامان رکھا ہوا تھا۔ کمرے کہاں گئے؟ اس نے ٹارچ گھما کر دیکھا لیکن پوری جگہ پر دیوار تھی۔ کمرے کہاں گئے؟ وہ دیوانہ وار تہ خانے میں چکرانے لگا۔ اچانک اسے لگا کہ وہ ان کمروں میں پہنچ گیا ہو۔ وہاں ہر طرف کپڑے سے بنی گڑیاں بکھری تھیں۔ ایسی بے شمار گڑیاں ایک طرف دیوار سے ٹنگی ہوئی تھیں اور پھر اس جگہ آگ بھڑک اٹھی۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

نینسی اور کورل آپس میں دوست تھے لیکن انہیں ملنے کے سلسلے میں بہت احتیاط کرنا پڑتی تھی۔ اس کا باپ اس پر نظر رکھتا تھا اور کورل کو وہ ویسے ہی ناپسند کرتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ نینسی ابھی اٹھارہ سال کی نہیں ہوئی تھی اس لیے انہیں ملنے کے لیے ایسی جگہوں کا انتخاب کرنا پڑتا تھا جو دوسروں کی نظر [illegible] کورل نے نینسی کو پکارا [illegible]

"میں نے ایک جگہ دیکھی ہے۔"

"کہاں؟" نینسی بے تاب ہو گئی۔

"تم نے پہاڑی پر اس پاگل عورت کا مکان دیکھا ہے جو دو ہفتے پہلے مر چکی ہے؟"

"ہاں... لیکن وہاں تو پولیس کی سیل ہے۔"

"نہیں ہے، میں دیکھ چکا ہوں۔ تو آج شام کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

نینسی فوراً آنے کو تیار ہو گئی۔ شام ہوتے ہی وہ چپکے سے گھر سے نکلی اور اس جگہ پہنچ گئی جہاں کورل نے اسے بلایا تھا۔ کورل کی کار مکان والی پہاڑی کے عین نیچے کھڑی تھی۔ اس نے نینسی سے کہا۔ "ہم پیدل اوپر جائیں گے۔"

نینسی اس ایڈونچر کے خیال سے پرجوش ہو رہی تھی۔ وہ پہاڑی پر چڑھنے لگے اور بیس منٹ بعد مکان کی پچھلی طرف ٹوٹی کھڑکی سے اندر داخل ہوئے۔ وہاں تاریکی تھی لیکن ان کو اس سے کوئی مسئلہ نہیں تھا بلکہ انہیں تو تاریکی ہی درکار تھی۔ نشست گاہ میں جا بجا لکڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے لاؤنج کا رخ کیا۔ لیکن ابھی انہوں نے محبت کے کھیل کا آغاز بھی نہیں کیا تھا کہ تہ خانے سے عجیب سی آواز آئی۔ کورل چونکا۔

"یہ آواز کیسی ہے؟"

نینسی ڈر گئی۔ "شاید کوئی نیچے ہے۔"

"میں دیکھ کر آتا ہوں۔" کورل بولا اور ٹارچ جلا کر تہ خانے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اترا اور پھر کوئی دس منٹ تک اس کی واپسی نہیں ہوئی۔ نینسی کچھ دیر تو انتظار کرتی رہی۔ پھر وہ تہ خانے کی طرف آئی۔ اس نے اوپر سے کورل کو آواز دی۔ اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے اپنے سیل فون کی ٹارچ آن کی اور سیڑھیوں سے نیچے دیکھا۔ وہاں تاریکی کا راج تھا۔ اس نے کورل کو آواز دی اور جب جواب نہیں ملا تو وہ نیچے اترنے لگی۔ وہ ڈری ہوئی تھی۔ نیچے آ کر اس نے تہ خانے میں ہر طرف روشنی کر کے دیکھی اور پھر قدم آگے بڑھایا تو اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ یہ ٹارچ تھی جو کورل کے پاس تھی اور اب بجھی ہوئی حالت میں فرش پر پڑی تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے سیل فون رکھ کر ٹارچ آن کی تھی اور اس کی تیز روشنی میں تہ خانے کا جائزہ لے رہی تھی۔ [illegible] پچھلی دیوار میں ایک دروازہ سا کھلا نظر آیا۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور اس نے کورل کو آواز دی۔ [illegible] لمحے دروازے سے کوئی [illegible] آیا۔ اس نے سرخ رنگ کا اپرن پہن رکھا تھا اور [illegible] اس کے سر پر تھا۔ نینسی ڈر کر پیچھے ہٹی۔ وہ [illegible] کی طرف آ رہا تھا۔

"کون ہو تم؟... کورل کہاں ہے؟"

اس نے سر اس طرح جھکا رکھا تھا کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ نینسی ٹارچ کی روشنی اس پر کیے ہوئے تھی۔ قریب آ کر اس نے اچانک سر اٹھایا تو نینسی کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

وہ پلٹ کر اندھا دھند اوپر کی طرف بھاگی۔ تہ خانے سے باہر آ کر وہ اسی طرح چیختی ہوئی مکان سے باہر آئی اور جیب سے سیل فون نکال کر لرزتے ہاتھوں سے پولیس کا نمبر ملانے لگی لیکن جیسے ہی کال ملی، وہی اپر پوش دروازے سے باہر آیا۔ نینسی پھر چیخ مار کر بھاگی۔ مکان کے دوسرے پہلو میں آ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر مکان کے نیچے خلا میں گھس کر لیٹ گئی۔ اس نے سیل فون تھام رکھا تھا اور بری طرح لرز رہی تھی۔ اچانک سیل فون کی بیل بجی تو اس نے جلدی سے اسے بند کیا لیکن آواز اپر پوش کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ وہ خلا تک آیا اور اس نے اچانک نیچے جھک کر نینسی کو باہر کھینچ لیا۔ اس کی چیخ سناٹے میں گونج کر رہ گئی۔

☆☆☆

ولسن کو ہوش آیا تو وہ اپنی کار میں تھا۔ اسے تعجب ہوا کہ وہ یہاں تک کیسے آیا؟ وہ تو تہ خانے میں تھا اور پھر وہاں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ لیکن نہیں وہ آگ نہیں تھی بلکہ اس کی سوچ تھی جو اسے ماضی میں لے گئی تھی۔ مکان بدستور تاریکی میں تھا اور ولسن اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ پھر اندر جائے۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے کار اسٹارٹ کی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہوٹل میں تھا۔ کمرے میں آ کر اس نے کوٹ اتار کر ایک طرف پھینکا اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ ذرا دیر بعد وہ سو چکا تھا۔

دوسری صبح اس کی آنکھ کھلی تو اسے کچھ دیر تک کچھ یاد نہیں آیا پھر اسے گزشتہ رات کے واقعات یاد آئے تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے جو دیکھا تھا، وہ یقیناً خواب تھا یا اس کا تخیل تھا؟ اس نے اٹھ کر کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو دور پہاڑی پر مکان ویسا ہی دکھ رہا تھا۔ لیکن اسے کار تک کس نے پہنچایا؟ وہ سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔ نہا کر اس نے روم سروس سے ناشتا منگوایا۔ آج اسے ایڈمنڈ کے دفتر جانا تھا۔ لیکن اس سے پہلے اس نے مکان کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ ناشتا کر کے وہ نیچے آیا اور مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن جیسے ہی وہ قبرستان سے آگے پہاڑی کی طرف جانے والی سڑک پر آیا، اسے پولیس نظر آئی۔ راستہ بند تھا۔ اس نے کار روک دی اور نیچے اتر آیا۔ ایک گنجا پولیس افسر وہاں موجود ایک آدمی سے بات کر رہا تھا۔

"معاف کرنا آفیسر۔" ولسن نے کہا۔ "راستہ کیوں بند ہے؟"

"تم کون ہو؟" گنجے پولیس افسر نے اس کا جائزہ لیا۔

"میں ولسن اسمتھ ہوں اور اوپر پہاڑی پر موجود گھر میرا ہے۔"

"خوب مسٹر اسمتھ... بات یہ ہے کہ کل رات یہاں ایک جوڑا غائب ہو گیا ہے اور پولیس کو ان کی تلاش ہے۔"

"غائب ہونے والوں میں میری بیٹی بھی ہے۔" دوسرے آدمی نے کہا اور ایک بڑے سائز کی تصویر ولسن کے سامنے کر دی۔ "تم نے اسے کہیں دیکھا ہے؟"

ولسن نے تصویر دیکھی۔ لڑکی دلکش تھی۔ اس نے کانوں میں گول بڑے بندے پہن رکھے تھے۔ "نہیں، میں نے اسے نہیں دیکھا۔ اس کے ساتھ کون تھا؟"

"اس کا بوائے فرینڈ۔" پولیس افسر نے بتایا۔ اس پر بوڑھے آدمی نے برا سا منہ بنایا۔

"راستہ کب تک کھلے گا؟"

"جوڑے کی تلاش جاری ہے، جب تک وہ مل نہیں جاتے راستہ بند رہے گا۔"

"لیکن مجھے اپنے گھر جانا ہے۔" ولسن نے احتجاج کیا۔

"مسٹر اسمتھ! میں جانتا ہوں تم وہاں مقیم نہیں ہو۔" پولیس افسر نے اسے گھورا۔ "پھر تم بار بار وہاں کیوں جا رہے ہو؟"

"وہ میرا مکان ہے اور جلد مجھے اس کی ملکیت مل جائے گی اس لیے جاتا ہوں۔"

"او کے! اگر تمہیں بہت ضروری کام ہے تو تم میرے آدمیوں کی نگرانی میں کچھ دیر کے لیے جا سکتے ہو۔"

ولسن کسی کی نگرانی میں وہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ "نہیں، میں بعد میں چلا جاؤں گا۔"

"پولیس تمہارے مکان کی تلاشی بھی لے گی۔" گنجے پولیس افسر نے گویا اسے خبردار کیا۔

"ضرور۔" ولسن نے تلخی سے کہا۔ "ویسے بھی وہ مکان ٹی ایس پولیس کی تحویل میں ہے۔"

"لیکن تمہیں چابی مل چکی ہے۔"

"چابی بھی مجھے پولیس نے دی ہے۔" ولسن نے جواب دیا اور اپنی کار میں لوٹ آیا۔ وہ اندر بیٹھا تھا کہ اس کے سیل فون کی بیل بجی۔ اس نے فون نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس نے جیب سے ہاتھ نکالا تو ساکت رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گول بندا تھا۔ ویسا ہی جیسا تصویر والی لڑکی نے پہن رکھا تھا۔ لیکن یہ اس کی جیب میں کہاں سے آیا؟ بیل پھر بجی تو وہ چونکا اور اس نے فون نکال کر ریسیو کی۔

"ایڈمنڈ بات کر رہا ہوں... تم آ رہے ہو؟ چند سائن لینے ہیں۔"

"میں آتا ہوں۔" اس نے کہا اور بندا جیب میں ڈال لیا جبکہ فون اس نے دوسری جیب میں رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایڈمنڈ کے دفتر میں تھا۔ کاغذی کارروائی میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ اسے بارہ دن بعد واپس جانا تھا اس لیے اسے ایڈمنڈ کو پاور آف اٹارنی بھی دینا تھی تاکہ وہ عدالت سے متعلق امور نمٹا سکے۔ اس نے تمام کام کرانے کے بعد ولسن سے کہا۔

"ان کاموں کے بعد میں تمہاری خدمت کرنے سے معذرت چاہوں گا۔ اگر تمہیں بدستور کسی وکیل کی ضرورت ہو تو تم کسی اور کو تلاش کر سکتے ہو۔"

"شکریہ... میرا بھی یہی خیال ہے۔" ولسن کا لہجہ سرد ہو گیا۔

وہ ایڈمنڈ کے دفتر سے نکلا تو اسے لنچ کا خیال آیا۔ ناشتے میں اس نے صرف دو توس لیے تھے۔ وہ سڑک کے کنارے واقع ایک ریسٹورنٹ میں چلا آیا۔ وہ اندر داخل ہوا تو اسے ایک میز پر کارینا نظر آئی۔ وہ بھی لنچ کے لیے آئی تھی۔ وہ اس کی طرف چلا آیا۔ "اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں؟"

کارینا نے چونک کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔ "کیوں نہیں۔"

"شکریہ۔" وہ کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ "تم بھی لنچ کرنے آئی ہو؟"

"ہاں، میں آرڈر کر چکی ہوں۔"

ولسن نے ویٹر کو بلو کر اپنے لیے آرڈر نوٹ کرایا اور اس کے جانے کے بعد بولا۔ "آج صبح میں مکان کی طرف جا رہا تھا لیکن پولیس نے روک دیا۔"

"ہاں، کل رات نینسی نامی لڑکی اور کورل نامی لڑکا پہاڑی کے پاس سے کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ لڑکے کی کار پہاڑی کے دامن میں ہے اور ایسا لگ رہا ہے کہ وہ اوپر کی طرف گئے تھے۔"

"ممکن ہے... کہیں اور نکل گئے ہوں اور پولیس کو گمراہ کرنے کے لیے کار وہاں کھڑی کر دی گئی ہو؟"

"ممکن ہے۔" کارینا نے سر ہلایا۔ "ٹی ایس تو پولیس [illegible] کے امکان کے ساتھ تلاش کر رہی ہے۔"

کچھ دیر میں لنچ آ گیا [illegible] دونوں کھانے میں لگ گئے [illegible] جانے کے بعد ولسن نے کارینا سے منع کرنے کے باوجود [illegible]

ولسن ہوٹل واپس آ گیا۔ اس نے کمرے میں آنے کے بعد ایک بار پھر بندے کا معائنہ کیا۔ اسے یہ بالکل ویسا ہی لگ رہا تھا جیسا کہ تصویر میں لڑکی نے پہن رکھا تھا۔ لیکن سوال وہی تھا کہ یہ اس کی جیب میں کہاں سے آیا؟ جب اس نے تہ خانے میں حواس کھو دیے تھے تو اس دوران میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اسے کس نے کار تک پہنچایا تھا؟ ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

خاصے غور کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اسے مکان میں دوبارہ جائے بغیر ان سوالوں کے جواب نہیں ملیں گے۔ اس کے ساتھ وہاں کچھ ہوا تھا اور پھر وہ تہ خانے کے بارے میں سوچتا تو اسے کچھ یاد آتا تھا لیکن یہ یاد واضح نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ اس مکان میں صرف اٹھارہ سال کی عمر تک رہا تھا اور خود مختار ہوتے ہی وہاں سے نکل آیا تھا۔ اس کے بعد وہ صرف چند بار وہاں گیا تھا اور پانچ سال پہلے وہ یہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کا ذہن آگ والے منظر میں الجھ رہا تھا۔ اسے پس منظر میں گڑیا سی جلتی نظر آئی تھیں لیکن اس کا کیا مطلب تھا؟ وہ نہیں جان پایا تھا۔ وہ اب اس معمے کی تہ تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔

رات ڈنر کے بعد وہ کمرے میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ مکان تک جائے۔ اس نے اٹھ کر کمرے کا ٹیرس میں کھلنے والا دروازہ کھولا۔ زمین ٹیرس سے صرف پانچ فٹ نیچے تھی۔ وہ آرام سے نیچے اتر گیا اور پھر پیدل ہی دور پہاڑی پر واقع مکان کی طرف جانے لگا۔ اس طرف سے مکان کا فاصلہ کم تھا لیکن اسے دو پہاڑیاں سر کرنا پڑتیں تب کہیں جا کر وہ وہاں پہنچتا۔ اس کے پاس وقت کی کمی نہیں تھی۔ ابھی پوری رات پڑی تھی اور آسمان صاف ہونے کے بعد چاند بھی نکل آیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک پہاڑی عبور کر کے اس کی دوسری طرف ڈھلان پر اتر رہا تھا۔ یہاں سے قصبے کی روشنیاں نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ جنگل گھنا ہونے کی وجہ سے چاند کی روشنی بھی صحیح سے نیچے نہیں آ رہی تھی۔ اسے سنبھل سنبھل کر اترنا پڑ رہا تھا۔ جلد وہ مکان والی پہاڑی کے نیچے آ گیا۔ یہ پہاڑی کا پچھلا حصہ تھا اور یہاں سے گزرنے والوں کو کم سے کم دو پہاڑی نالے عبور کرنا پڑتے تھے اس لیے اس طرف سے کوئی نہیں آتا تھا۔ اس نے ایسی جگہوں سے نالے عبور کیے جہاں پانی کم تھا۔ پھر بھی اس کی پتلون کے پائنچے بھیگ گئے [illegible] وہ اب مکان کے قریب تھا۔

چاند [illegible] آہستہ [illegible]

پاس دیکھا تو اسے ایک درخت کے ساتھ کھلی جگہ پر ایک اپر پوش دکھائی دیا۔ وہ ساکت کھڑا تھا۔ اس کا اپر سرخ رنگ کا تھا۔ ولسن کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتا رہا پھر وہ آہستہ سے اس کی طرف بڑھا۔ لیکن وہ کچھ دور تھا۔ اپر پوش ایک جھٹکے سے مڑا اور آگے چل پڑا۔

"اے رکو۔" ولسن بے ساختہ اس کے پیچھے لپکا لیکن وہ آگے بڑھتا رہا۔ درخت سے آگے جا کر وہ نظروں سے اوجھل ہوا مگر فوراً ہی ولسن نے اسے تلاش کر لیا۔ وہ مکان کی طرف جانے کے بجائے نیچے ڈھلان کی طرف جا رہا تھا۔ تاریکی کی پروا کیے بغیر ولسن اس کی طرف لپکا اور اسے جا لیا۔ اس نے اپر پوش کا بازو پکڑ لیا اور سرگوش آواز میں بولا۔ "کون ہو تم... یہاں کیوں گھوم رہے ہو؟"

اپر پوش نے کوئی جواب نہیں دیا تو ولسن نے ایک جھٹکے سے اسے اپنی طرف گھمایا۔ اس نے اس کا اپر اوپر اٹھایا اور پھر حیرت سے لڑکھڑا گیا۔ اپنے سامنے وہ خود تھا۔ اپر ہڈ کے نیچے اس کا اپنا چہرہ تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اسی لمحے اپر پوش کے ہاتھ نے حرکت کی اور ایک نکیلی لکڑی ولسن کے پیٹ میں گھس گئی۔ شدید تکلیف کے احساس کے ساتھ وہ پیچھے ہٹا اور ڈھلان پر گر گیا۔ اپر پوش پلٹ کر چل پڑا اور کچھ آگے جا کر اچانک ہی غائب ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے اسے زمین نے نگل لیا ہو۔ ولسن نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور پھر اسے ہوش نہیں رہا۔

اچانک وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ وہ ہوٹل کے کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنا پیٹ ٹٹولا اور گہری سانس لی۔ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ وہ تیار ہو کر نیچے پہنچا اور ناشتا ڈائننگ ہال میں کیا۔ ناشتے کے بعد وہ باہر آیا۔ سورج نکل آیا تھا لیکن پہاڑوں پر ہلکی سی دھند تھی۔ اس نے کار نکالی اور مکان کی طرف چل پڑا۔ جب وہ پہاڑ والی سڑک پر مڑا تو اسے پھر پولیس ناکا دکھائی دیا۔ گنجا پولیس افسر آج بھی موجود تھا۔ شاید اس کام کی نگرانی اس کے سپرد تھی۔ ولسن کار سے اتر آیا اور پولیس افسر نے ناگواری سے کہا۔

"یہ راستہ کب تک بند رہے گا؟"

"جب تک جو ڈال نہیں جاتا۔"

"اگر وہ کبھی نہیں ملا تو کیا میں کبھی اپنے مکان تک نہیں جا سکوں گا۔"

"نہیں، پولیس ایک دو دن میں کام مکمل کر لے گی۔ ابھی پہاڑی کا کچھ حصہ باقی ہے۔" گنجے پولیس افسر نے [illegible] کیا۔

"تم مجھے میرے مکان تک جانے سے نہیں روک سکتے۔ یہ میرے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔"

پولیس افسر نے اسے تمسخرانہ نظروں سے دیکھا۔ "تم جا سکتے ہو لیکن سڑک سے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس وقت ماہر سڑک پر کوئی نشان تلاش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے تمہارے جانے سے وہ نشان ضائع ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے، میں جنگل کی طرف سے چلا جاتا ہوں۔"

ولسن نے کہا اور پولیس افسر کی اجازت کا انتظار کیے بغیر سڑک سے اتر کر ڈھلان کے راستے اوپر جانے لگا۔ اس طرف بھی چند پولیس والے زمین پر نشانات تلاش کر رہے تھے۔ لگتا تھا پہاڑی والا علاقہ انہوں نے کلیئر کر دیا تھا۔ اب وہ نچلے حصے میں دیکھ رہے تھے۔ ولسن چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ یہاں دھند تھی۔ چند گز سے آگے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ ولسن نے اوپر مکان کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ وہی جگہ تھی جو اس نے رات خواب میں دیکھی تھی۔ اس نے آس پاس نظر دوڑائی۔ پھر وہ ساکت رہ گیا۔ ایک درخت تلے اسے وہی سرخ اپر والا نظر آیا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ ولسن کا جسم سنسنا اٹھا۔ کیا وہ پھر خواب دیکھ رہا تھا؟ اس نے اپنے بازو کو نوچا لیکن یہ خواب نہیں تھا۔

"اے۔" اس نے آہستہ سے کہا تو اپر پوش مڑ کر جانے لگا۔ وہ اس کے پیچھے لپکا لیکن جب وہ اس درخت سے آگے آیا تو اپر پوش غائب ہو چکا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا، وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ بالکل رات والا منظر تھا۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ اپر پوش نے اس کے پیٹ میں لکڑی نہیں گھسائی تھی۔ وہ بے تابی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ بری طرح بھڑک گیا۔ اس کے منہ سے خوف زدہ آواز نکل گئی۔

"آرام سے... یہ میں ہوں۔" کارینا بولی۔

اسے دیکھ کر ولسن نے سکون کا سانس لیا ورنہ وہ ڈر گیا تھا۔ "تم...؟"

"ہاں، مجھے جان نے بتایا کہ تم اوپر گئے ہو۔"

"جان کون؟"

"گنجا پولیس افسر۔" کارینا نے جواب دیا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں کل سے مکان کی طرف جانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن پولیس روک دیتی ہے۔" ولسن کے لہجے میں شکایت آ گئی۔

"مجبوری ہے۔ ... افراد کی گم شدگی کا معاملہ ہے۔ اگر یہاں لوگوں کو ... کی اجازت دے دی تو ... دیا ... نشان ضائع ہو جائے، اس وجہ سے پابندی لگائی ہوئی ہے۔"

"لیکن میرا تو گھر ہے۔"

"تم وہاں مقیم نہیں ہو۔" کارینا نے اسے یاد دلایا۔ "ویسے کیا تم نے گھر کے بارے میں کچھ سوچ لیا ہے؟"

"ہاں، میں سوچ رہا ہوں کہ اسے گرا کر نئے سرے سے تعمیر کراؤں گا۔" ولسن نے جواب دیا۔

"کیوں، یہ مضبوط اور خوب صورت گھر ہے۔ مرمت کر کے بھی اسے استعمال میں لایا جا سکتا ہے؟" کارینا کو تعجب ہوا۔

"بس مجھے یہ پسند نہیں ہے۔"

"تمہاری اس گھر سے خوش گوار یادیں وابستہ نہیں ہیں۔" کارینا نے کہا۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ "میں نے سنا ہے تم تو جوانی میں یہاں سے چلے گئے تھے؟"

"درست ہے... یہ گھر میرے لیے قید خانہ بن گیا تھا۔ اس سے میری اچھی یادیں وابستہ نہیں ہیں۔" ولسن کے لہجے میں اذیت آ گئی۔

کارینا نے موضوع بدل دیا۔ "کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میری گاڑی میں ہے۔"

شاید ولسن بھی موضوع بدلنا چاہتا تھا، وہ مان گیا۔ کارینا کی گاڑی نیچے تھی۔ نیچے آنے کے بعد ولسن کو یاد آیا کہ وہ مکان کی طرف جا رہا تھا اور کارینا کتنی چالاکی سے اسے نیچے لے آئی تھی۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ ولسن مکان کی طرف جائے۔ لیکن وہ ایسا کیوں چاہتی تھی؟ اس نے اپنے اور ولسن کے لیے کافی نکالی۔ "میں پرانا ریکارڈ دیکھ رہی تھی تو ایک حادثہ میری نظر سے گزرا۔ ایک ٹرک ایک کار کو کچل کر گزر گیا تھا اور کار یہاں سے کچھ ہی دور سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔"

ولسن کے ہاتھ سے کافی چھلک گئی۔ "تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

کارینا اسے دیکھتی رہی پھر اس نے نرمی سے کہا۔ "میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ بس اس حادثے کی رپورٹ میں تمہارا ... چونک گئی تھی۔"

ولسن نے اوپر پہاڑی کی طرف دیکھا۔ "کیا تم اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہو؟"

"اگر تم بتانا چاہو تو میں ضرور سنوں گی اور اس وقت میں ... نہیں ہوں۔"

"وہ ایک حادثہ تھا۔ ٹرک والے کی غلطی نہیں تھی، وہ ... بچانے کے لیے مڑا اور کار پر چڑھ گیا۔"

"وہ بچہ..."

"میں اس کے بارے میں نہیں جانتا۔" ولسن نے اس کی بات کاٹی۔

"میں بھی نہیں جانتی تھی لیکن جب میں نے رپورٹ دیکھی تو ایک عجیب بات سامنے آئی۔ تمہاری خالہ کیٹ کا ایک بیٹا بھی تھا۔"

"میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"حادثے کے بعد کیٹ نے پولیس سے رابطہ کر کے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ ایب نارمل تھا اور پھر گھر سے بھاگ گیا تھا۔ پولیس نے اس کی تلاش میں سارا علاقہ چھان لیا تھا لیکن وہ نہیں ملا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔"

"میں نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔" ولسن بولا۔ "جب مجھے کیٹ کے حوالے کیا گیا۔"

"اس حادثے میں تمہاری ماں اور سوتیلا باپ دونوں مر گئے تھے۔"

"لیکن اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا۔" ولسن کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "مجھے کیٹ کے حوالے کر دیا گیا اور وہ میری ماں سے بڑی نفسیاتی مریض تھی۔ تم دیکھو گی، اس نے میرا کیا حال کیا تھا؟" ولسن نے اپنا کوٹ اتار دیا اور آستین دائیں بازو سے اوپر کی۔ کلائی سے ذرا اوپر بازو تک اس کا ہاتھ جگہ جگہ سے جلا ہوا تھا۔ "ایسے ہی نشانات تمہیں میری پشت پر بھی ملیں گے اور یہ دیکھو۔" اس نے پینٹ سے قمیص کھینچ کر اوپر کی اور پیٹ کھول دیا۔ پیٹ پر ایسے جلنے کا نشان تھا جیسے کسی نے وہاں گرم استری رکھ دی ہو۔

"میرے خدا۔" کارینا لرز گئی۔ "تم نے پولیس یا کسی اور سے شکایت نہیں کی؟"

"کی تھی لیکن کیٹ نے الٹا مجھے نفسیاتی مریض ثابت کر دیا۔ وہ بہت چالاک عورت تھی۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے پھر اس کی شکایت کی تو وہ مجھے زندہ جلا کر مار دے گی۔"

"کہیں اس نے اپنے بیٹے کو بھی اسی طرح تو نہیں مار دیا۔"

"عین ممکن ہے، وہ بہت نفرت انگیز اور اذیت پسند عورت تھی۔"

"اسی وجہ سے تم اٹھارہ سال کے ہوتے ہی اس گھر سے نکل گئے تھے؟"

"تم نہیں جانتیں۔" ولسن نے قمیص ٹھیک کر کے کوٹ

پیتے ہوئے کہا۔ ’’وہ وقت میں نے کیسے گزارا تھا۔‘‘

’’چلو وہ وقت گزر گیا اور اب تم کسی بھی خوف سے آزاد ہو۔‘‘

’’ماضی کے بھوت اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں۔‘‘ ولسن نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں ایک پولیس ہیلی کاپٹر پرواز کر رہا تھا۔

’’ہم آسمان سے بھی ان کو تلاش کر رہے ہیں۔‘‘ کارینا نے کہا۔

’’راستہ کب تک کھلے گا؟‘‘

’’آج شام تک اور آج ہی ہم کھڑکی سیل کر کے مکان تمہارے حوالے کر دیں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے پھر میں شام کو آجاؤں گا۔‘‘

ولسن اپنی کار میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ شام تک کا وقت اس نے ہوٹل میں گزارا اور جس وقت وہ وہاں سے نکلنے والا تھا، کارینا کی کال آگئی۔ ’’تم مکان کی طرف تو نہیں جا رہے ہو؟‘‘

’’ہاں، نکلنے والا ہوں۔‘‘

’’آج مت جاؤ... جوڑے کی تلاش میں پولیس نے اپنا آپریشن صبح تک بڑھا دیا ہے۔ پولیس کو کچھ کلیو ملے ہیں۔‘‘

ولسن جھنجلا گیا پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ’’ٹھیک ہے، میں آج نہیں جا رہا۔‘‘

’’زحمت کے لیے معذرت لیکن کل تم یقیناً جا سکو گے۔‘‘

رات کے کھانے کے بعد وہ بستر پر لیٹا تو اسے اپنا گزشتہ رات والا خواب یاد آگیا۔ پھر اسے اس جوڑے کا خیال آیا جسے پولیس تلاش کر رہی تھی۔ وہ بھی اسی پہاڑی پر غائب ہوا تھا۔ وہاں پُراسرار ایریوش نظر آتا تھا۔ ولسن نے اسے اتنی بار دیکھا تھا کہ اب وہ اسے اپنی نظر کا دھوکا سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ان سب میں کیا چیز مشترک تھی؟ یہ پہاڑی اور اس پر بنا ہوا مکان؟ پولیس اسے وہاں جانے سے کیوں روک رہی تھی؟ کیا اسے مکان کے حوالے سے کوئی کلیو ملا تھا؟ پھر اسے بندا یاد آگیا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے نکال کر اسے دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے مکان تک جانا ہوگا اور آج ہی جانا ہوگا۔ ممکن ہے وہ آج نہ جا سکے تو یہ معما کبھی بھی حل نہ ہو یا ہو بھی تو اس کے علم میں نہ آسکے۔ بہت ساری انجانی باتیں ایسی تھیں جن کے لیے اس مکان تک جانا ضروری تھا۔ اس نے پردہ ہٹا کر کھڑکی سے دور نظر آنے والے مکان کو دیکھا۔ چاندرات کے پس منظر میں صرف اس کا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے سوچا اور ... کر کے ... میں نکل آیا۔

اس طرف پہاڑ کی ڈھلان تھی، اس وجہ سے ... صرف پانچ فٹ نیچے تھی۔ وہ آرام سے نیچے اتر گیا اور پھر ... نے ڈھلان پر چڑھنا شروع کیا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ مکان کے قریب تھا، تب اس نے وہاں پولیس کار دیکھی۔

☆☆☆

گنجا پولیس افسر جان اپنے ایک ساتھی ماتحت بوشرڈ کے ساتھ مکان کا معائنہ کر رہا تھا۔ پولیس کے محکمے نے نشست گاہ کی ٹوٹ جانے والی کھڑکی پر تختے لگا کر اسے بند کر دیا تھا۔ وہ اندر کے حصوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر جان نے کہا۔ ’’میرا خیال ہے اتنا کافی ہے۔‘‘

وہ باہر آئے۔ اچانک بوشرڈ رک گیا۔ اس نے جان سے کہا۔ ’’مجھے اندر سے کوئی آہٹ سنائی دی ہے۔‘‘

جان نے شانے اچکائے۔ ’’ممکن ہے... یہاں چوہے بھی بہت ہیں۔‘‘

بوشرڈ اندر چلا گیا۔ جان کار کے ساتھ ٹک کر سگریٹ جلانے لگا۔ آج سردی زیادہ تھی۔ اس نے اپنے کوٹ کے کالر اونچے کر لیے۔ بوشرڈ کو گئے ہوئے دس منٹ ہو گئے۔ اس نے زور سے آواز دی۔ ’’بوش! اب آجاؤ۔‘‘

جواب میں اوپری ایک کھڑکی سے روشنی لہرائی اور بوشرڈ نے اسے دیکھا۔ پھر روشنی نچلی منزل تک آگئی۔ مکان کی بجلی کسی وجہ سے منقطع تھی۔ پھر داخلی دروازے سے روشنی براہ راست جان کے منہ پر آئی۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ سامنے کیا۔ یہ بہت تیز سرچ لائٹ تھی۔ بوشرڈ ٹارچ سامنے رکھے ہوئے نیچے آیا۔ ’’بوش! یہ کیا حرکت ہے؟‘‘ جان نے خفگی سے کہا۔

لیکن جب وہ قریب آیا تو جان کو احساس ہوا کہ وہ بوشرڈ نہیں ہے۔ اس نے پر ... رکھا تھا اور اس سے پہلے کہ جان کوئی حرکت کرتا، روشنی کے عقب سے کوئی چیز ... کر اس کے چہرے پر لگی۔ جان کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر جا گرا اور چند لمحے ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھ میں ایک نکیلی لکڑی کئی انچ کی گہرائی میں گئی تھی اور اسے مرنے میں چند سیکنڈ ہی لگے تھے۔

☆☆☆

ولسن پولیس کار کے پاس سے گزر کر مکان میں ... ہوا۔ اس نے ٹارچ روشن کر لی تھی۔ پہلے اس نے اوپری ... کی طرف جانے کا سوچا ... طرف بڑھ گیا۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر تہ خانے ... کوئی یادداشت ابھر رہی تھی ...

... رہی تھی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ اس نے ٹارچ ... تہ خانے کا معائنہ کیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ ... کی طرف بڑھا جس پر ریک کے خانے بنے ہوئے ... نے ریکس دیکھے۔ پھر وہ ان پر ہاتھ مارنے لگا۔ ... وہ بجلی کے باکس کی طرف آیا۔ اس نے اس کے ... کھمبے پھر ایک لیور اوپر نیچے کیا۔ اسی لمحے اسے وہ بات ... اس نے لیور کو نیچے کیا اور پھر اس پورے ریک کو دھکا ... سے سرک گیا اور اس کے عقب میں ایک دو ... نمودار ہوا۔ لیکن اس طرف بھی دیوار تھی۔ پھر اس ... ریک میں لگا لوہے کا ایک ہینڈل نما راڈ کھینچا تو ... سرک کر اس خالی جگہ آگیا اور جس جگہ ریک تھا، وہاں ... دروازہ نمودار ہوا۔ اس نے دروازے کے باہر لگی چٹخنی ... دروازے کو دھکیلا۔

اندر ایک کمرا تھا اور یہی چیز مسلسل اس کے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ جب وہ یہاں آیا تو تہ خانے میں کمرے نہیں تھے لیکن پھر کیٹ نے یہ کمرے بنوائے اور ان کو اس طرح ریکس کے پیچھے چھپا دیا۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ ریکس ... گئے تھے لیکن ان کے پیچھے دو عدد کمرے تھے۔ ولسن ... کے بارے میں معلوم نہیں تھا لیکن اس نے ایک دن ... سے اسے اندر جاتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اسی طرح کمرے میں جانے والا راستہ کھولا تھا۔ بعد میں یہ چیز ولسن کے ذہن سے نکل گئی تھی اور جب اس نے تہ خانہ دیکھا تو ... یاد آنے لگا۔

دروازہ کھول کر وہ اندر آیا تو ایک لمحے کو ساکت رہ گیا۔ وہاں ہر طرف کپڑے سے بنی گڑیاں پھیلی تھیں۔ ایک طرف کی پوری دیوار گڑیوں سے بھری تھی۔ وہاں ایک ... اور کچھ فرنیچر تھا۔ کمرے میں ایک طرف دروازہ تھا۔ اس ... دروازہ کھولا تو برابر میں واش روم تھا۔ یہ دوسرا کمرا تھا ... واش روم کی صورت دے دی گئی تھی۔ یہاں ایک طرف ... کے پیچھے ٹب تک موجود تھا۔ ولسن نے ٹب کا پردہ ہٹایا ... ساکت رہ گیا۔ ٹب میں ایک لڑکی اور ایک لڑکے کی لاشیں ...

☆☆☆

کارینا مسلسل جان کو وائرلیس پر کال کر رہی تھی لیکن ... طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ تنگ آ کر اس نے ... کا فیصلہ کیا۔ ... جان سے معلوم کرنا تھا کہ وہ کب ... مکان کلیئر کر دے گا۔ دفتر میں جان اور کارینا کی ... ہوئی تھی۔ جان نے محسوس کیا تھا کہ کارینا ولسن میں دلچسپی لے رہی ہے اس لیے وہ اب جان بوجھ کر اس کام میں تاخیر کر رہا تھا۔ پھر اس نے اور اس کے آدمیوں نے ولسن کے مکان میں خاصی توڑ پھوڑ بھی کی تھی۔ اس پر کارینا اور جان کی جھڑپ بھی ہو گئی تھی۔ جان نے اسے خبردار کیا تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے اور اس کے معاملات میں مداخلت نہ کرے۔

کارینا دفتر سے نکلی تو رات گہری ہو رہی تھی۔ آج اس کی مستقل دوسری ڈیوٹی لگ چکی تھی اور اب اسے سولہ گھنٹے بعد گھر جانا نصیب ہوتا۔ وہ پہاڑی تک پہنچی تو اسے مکان کے سامنے پولیس کار نظر آئی۔ جان یہاں موجود تھا اور جان بوجھ کر اس کی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنی کار روکی اور نیچے آگئی۔ جان یا بوشرڈ کار میں نہیں تھے۔ وہ یقیناً مکان کے اندر یا آس پاس تھے۔ کارینا نے ان کو آواز دی۔ ’’جان... بوشرڈ! تم کہاں ہو؟‘‘

جب اسے جواب نہیں ملا تو وہ ٹارچ نکالتے ہوئے اندر کی طرف بڑھی۔ اس نے روشنی میں پہلے لاؤنج میں جھانکا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر اس نے نشست گاہ میں دیکھا، وہ بھی خالی تھی۔ اس کے بعد وہ اوپری منزل کی طرف بڑھی۔ جیسے ہی اس نے کیٹ والے بیڈروم کا دروازہ کھولا، اسے جان اور بوشرڈ نظر آگئے تھے۔ وہ کیٹ کے بستر پر ایک دوسرے کے اوپر لیٹے تھے۔ روشنی میں کارینا کو ان کے جسم پر خون نظر آگیا تھا، اس نے تیزی سے پستول نکالا اور پہلے کمرے میں دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر اس نے جان اور بوشرڈ کی گردنوں پر نبض چیک کی اور اس کا دل یہ جان کر ڈوب سا گیا کہ دونوں ہی مر چکے ہیں۔ کچھ بھی سہی، وہ اس کے ساتھی تھے۔ کارینا نے بیلٹ سے لگے وائرلیس سیٹ پر پولیس اسٹیشن آپریٹر کو کال کی۔

’’یہاں کچھ ہو رہا ہے۔ جان اور بوشرڈ کی لاشیں پہاڑی والے مکان میں موجود ہیں۔ جلدی مدد بھیجو۔‘‘

پیغام بھیج کر اس نے بہت محتاط ہو کر باقی کمروں اور ٹیرس کا جائزہ لیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ قاتل اپنا کام کر کے جا چکا تھا۔ اچانک کارینا کو تہ خانے کا خیال آیا اور وہ نیچے آئی۔ تہ خانے میں قدم رکھتے ہی اسے تبدیلی کا احساس ہو گیا۔ تہ خانے کے آخری حصے میں ایک دروازہ سا کھلا تھا جو پہلے کارینا نے نہیں دیکھا تھا اور اس سے روشنی جھلک رہی تھی۔ وہ دبے قدموں دروازے تک آئی اور اس نے اندر جھانکا تو اسے ولسن ایک بستر پر بیٹھا نظر آیا۔ کمرے میں ہر طرف کپڑے سے بنی گڑیاں موجود تھیں۔ وہ اندر آئی تو ولسن

چونک گیا۔

"کارینا تم؟"

"ولسن! یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"میں خود بھی نہیں جانتا۔" اس نے جواب دیا اور واش روم کی طرف اشارہ کیا۔ "خود جا کر دیکھ لو۔"

کارینا اس پر نظر رکھتے ہوئے واش روم میں آئی اور اس نے ہٹے ہوئے پردے سے نینسی اور کورل کی لاشیں دیکھیں۔ ان کو چیک کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یقینی طور پر کم سے کم اڑتالیس گھنٹے پہلے مر چکے تھے۔ کارینا تیزی سے واپس آئی۔ "ولسن! یہ تم نے کیا ہے؟"

ولسن چونک گیا۔ "میں نے...؟" اس کے لہجے میں تعجب تھا۔ "نہیں، میں ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔"

"پھر یہ کس کا کام ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"تم اندر کیسے آئے؟"

"مجھے یاد آیا تھا کہ کیٹ نے کبھی یہاں کمرے بنوائے تھے۔ میں تصدیق کرنے آیا تھا۔"

کارینا نے سوچا اگر ولسن ٹھیک کہہ رہا ہے تو اس کا مطلب تھا کہ قاتل کوئی اور تھا اور آس پاس ہی تھا۔ لیکن وہ ولسن کو ایسے ہی چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے پستول کا رخ ولسن کی طرف کر دیا۔ "جب تک مزید پولیس نہیں آ جاتی، تم یہیں رکو۔"

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

"میں باہر دیکھوں گی۔"

"نہیں، باہر خطرہ ہے۔"

"میں ایک پولیس افسر ہوں اور میرا کام دوسروں کو تحفظ دینا ہے، خطروں سے بچنا نہیں ہے۔" کارینا کہتے ہوئے پیچھے آئی اور اس نے اچانک کھینچ کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اس کی چٹخنی بہت مضبوط تھی۔ ولسن اندر سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ولسن کچھ دیر دروازہ پیٹتا رہا پھر اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ وہ کارینا کی زندگی خطرے میں محسوس کر رہا تھا۔ جو قاتل اس جوڑے کو قتل کر سکتا تھا وہ کارینا کو بھی مار سکتا تھا۔ اس نے واش روم میں آ کر دیکھا۔ پھر دوبارہ کمرے میں آیا۔ اس نے اس دیوار کی طرف دیکھا جس پر [illegible] تھیں۔

ولسن کو یاد آنے لگا یہ گڑیاں اس کے بچپن کی یادوں کا ایک حصہ تھیں۔ اسی گھر میں اس نے گڑیاں دیکھی تھیں۔ لیکن [illegible] نہیں آ رہا تھا۔ [illegible] معلوم کہ کون ان

گڑیوں کو بناتا تھا کیونکہ ان چھ سالوں کے دوران میں [illegible] اس گھر میں رہا اس نے اپنی خالہ کیٹ کو ایک بار بھی اس [illegible] کوئی گڑیا بناتے نہیں دیکھا تھا۔ اور یہاں موجود تمام گڑ[یاں] ہاتھ سے بنی ہوئی تھیں۔ کپڑے کی دھجیاں بھر کر [illegible] ہاتھ پیر اور جسم کا روپ دے کر گڑیا میں تبدیل کر دیا جاتا [illegible] دھاگے سے کاڑھ کر ان کے منہ، آنکھ اور ناک بنا دیے [illegible] تھے۔ اگر کیٹ یہ کام نہیں کرتی تھی تو پھر کون کرتا تھا؟

اسمتھ خاندان گزشتہ سو سال سے اس علاقے میں [illegible] اور اس کی کئی نسلوں نے یہیں پرورش پائی اور مر کر یہیں [illegible] گئیں۔ اس سے پہلے وہ آئرلینڈ میں تھا۔ وہاں وہ پاگلوں [کا] خاندان مشہور ہو گیا تھا۔ صدیوں تک اس خاندان کے [illegible] آپس میں شادیاں کرتے رہے تھے۔ اس کے نتیجے میں [illegible] اور جسمانی طور پر ناقص بچے پیدا ہونے لگے تھے۔ [illegible] لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ لیکن اب خاندان سے [illegible] کوئی ان سے رشتہ کرنے کو تیار نہیں تھا اس لیے مجبوراً وہ [illegible] میں شادیاں کرتے رہے اور ان کی تعداد کم ہوتی گئی۔ سو سال پہلے وہ سب ترک وطن کر کے الاسکا میں آ کر آباد ہو گئے جو اس وقت امریکا نے روس سے خرید لیا تھا۔ یہاں اسمتھ خاندان [کو] زمین مل گئی اور وہ آباد ہو گئے لیکن ان کی تعداد مسلسل گھٹتی [رہی] اور ان میں پیدا ہونے والا ہر دوسرا بچہ ذہنی طور پر منتشر [یا] تقریباً پاگل ہوتا تھا۔ آخر میں صرف چار افراد بچے تھے کیٹ اور اس کی بہن فیورین، ان کے دو کزن تھے اور انہوں نے آپس میں شادی کر لی۔ انہوں نے عہد کیا کہ وہ بچے پیدا نہیں کریں گے لیکن فیورین کے ہاں ولسن پیدا ہو گیا اور کیٹ کا بھی بچہ ہوا۔ کیٹ کا شوہر اتنا دل برداشتہ ہوا کہ بچے کی پیدائش پر اس نے خودکشی کر لی۔ جبکہ ولسن کا باپ [illegible] کی ماں کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ کیٹ نے آبائی مکان میں روپوشی کی زندگی گزارنا شروع کر دی اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا جبکہ فیورین نئی زندگی نئے سرے سے شروع کرنا چاہتی تھی۔ اس نے دوسرا شوہر تلاش کر لیا۔ وہ بھی ولسن سے بیزار تھی [illegible] کی پرورش کر رہی تھی۔ جب کار کے [illegible] ہوا تو ولسن کیٹ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے چھ سال پاگل خالہ کے ساتھ نہایت اذیت میں گزارے۔ [illegible] سے نفرت کرتا تھا لیکن انہیں بھول نہیں سکتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا اور اس کے ذہن میں بار بار [illegible] منظر آ رہا تھا جو اس [illegible] تھا۔ اچانک وہ اچھل پڑا۔ جب کیٹ [illegible]

کمرے بنوائے تھے، اس کے دو یا تین سال بعد تہ خانے میں آگ لگ گئی تھی۔ شور سن کر ولسن نیچے آیا تھا اور اس نے کھلے [دروازے] سے کمرے میں آگ بھڑکتی دیکھی تھی۔ گڑیاں اور [دوسری] چیزیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں اور کیٹ پاگلوں کی طرح [ان] پر پانی لا لا کر ڈال رہی تھی۔ ولسن ڈر کے مارے اوپر [بھاگ گیا]۔ اسے نہیں معلوم کہ کیٹ نے آگ پر کس طرح قابو [پایا۔ پھر] آگ پھیلی نہیں تھی۔

یہاں کوئی تھا جس کی غلطی سے آگ لگی تھی یا اس نے [illegible] لگائی تھی۔ ولسن کھڑا ہو گیا۔ اس نے کمرے میں موجود فرنیچر سرکا کر دیکھا پھر اس نے دیوار پر موجود گڑیاں [ہٹا]نا شروع کر دیں۔ ایک جگہ سے اس نے گڑیاں ہٹائیں تو [اس] کے پیچھے لکڑی کا تختہ نکل آیا۔ اس نے تختہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ جانے کیسے بند تھا، اس سے کھلا ہی نہیں۔ وہ واش روم میں آیا اور اس نے دیوار میں نصب واش بیسن اکھاڑنے کی کوشش شروع کی چند زوردار جھٹکوں نے اسے ڈھیلا کر دیا اور پھر وہ دیوار سے نکل آیا۔ ولسن نے اس واش بیسن کی مدد سے تختہ توڑنے کی کوشش کی۔ تختہ سخت تھا لیکن وہ واش بیسن کا مقابلہ نہ کر سکا اور بالآخر وہ ٹوٹ کر دوسری طرف گر گیا۔ اسی [وقت ولس]ن کو کمرے کے باہر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ شاید پولیس آ گئی تھی۔ اس نے تیزی سے بقیہ رہ جانے والا تختہ [ہٹایا تو] دوسری طرف ایک کچی سرنگ نما راستہ نظر آیا۔ وہ اس میں گھس گیا اور تیزی سے رینگتا ہوا آگے جانے لگا۔ کچھ دیر بعد عقب سے کارینا کے پکارنے کی آواز آئی لیکن وہ رکا نہیں۔ آخرکار یہ راستہ جا کر ایک جگہ ختم ہوا اور ولسن نے وہاں [ہاتھ مارا] تو اس کا ہاتھ ایک نم اور نرم ڈھیر سے باہر ہوا میں نکل [گیا]۔ وہ خود بھی زور لگا کر باہر نکل گیا۔ وہ ایک گھنے اور اونچے [درخ]ت کے نیچے پتوں کے ڈھیر سے برآمد ہوا تھا۔ یہ ایک [نشیبی] جگہ تھی اور چاروں طرف سے خشک پتے آ کر اس [illegible] جمع ہو جاتے تھے اس لیے یہاں موجود سرنگ کا [دہانہ چھپا ہوا] تھا۔

[illegible] طرف دیکھا۔ وہ اندھیرے میں تھا [illegible] صاف نظر آ رہا تھا۔ پھر [illegible] کی آواز سنائی دی تو اسے خطرے کا احساس ہوا [وہ] تیزی سے ڈھلان کی طرف بڑھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ [illegible] کس قدر مشتعل تھے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار [illegible] تھے اور اس کی تلاش میں تھے۔ [illegible]

الحال وہ گرفتاری سے بچنا چاہتا تھا تاکہ اس اپر پوش کو تلاش کر سکے۔ اسے یقین تھا کہ یہ قتل اپر پوش نے کیے ہیں۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اپر پوش کون تھا اور اس کے مکان میں رہتے ہوئے اس نے یہ قتل کیوں کیے تھے؟ اس کے لیے ضروری تھا کہ فی الحال وہ پولیس سے بچے۔

پولیس والے چاروں طرف پھیل کر اسے تلاش کر رہے تھے اس لیے وہ ایک جھاڑی میں دبک گیا۔ چاروں طرف تیز روشنیاں لہرا رہی تھیں اور ان سے بچنا بہت ضروری تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس وقت تک یہاں سے نہیں نکلے گا جب تک پولیس والے نہیں چلے جاتے۔ اوپر اس کا مکان پولیس والوں سے بھرا ہوا تھا اور شیرف خود آ گیا تھا۔ دو پولیس والوں کا قتل معمولی بات نہیں تھی۔

کارینا شیرف کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ولسن یہ کام نہیں کر سکتا۔ لیکن شیرف اور دوسرے پولیس افسران اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھے کیونکہ اس جگہ ولسن کے سوا کوئی نہیں آتا تھا اور نہ ہی یہاں کسی اور کی موجودگی کے آثار ملے تھے۔ وہ بپھرے ہوئے تھے۔ کارینا نے کوشش کر کے اس ٹیم میں شمولیت اختیار کر لی جو ولسن کو تلاش کرنے جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ کئی گھنٹے سے اس جگہ چھپا ہوا تھا اور پولیس والے اس جگہ سے ہو کر آگے جا چکے تھے۔ جب اس نے محسوس کیا کہ آس پاس کوئی نہیں ہے تو وہ جھاڑی سے نکل آیا۔ صبح ہونے میں کچھ دیر تھی۔ گرمیوں میں صبح بہت جلد ہو جاتی تھی۔ وہ جنگل میں گھومنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اپر پوش کہیں آس پاس ہی ہو گا۔ وہ آہستہ آہستہ پہاڑی کے دائیں طرف والی ڈھلان کی طرف جانے لگا۔ اس سے آگے ایسا گھنا جنگل تھا جس میں جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور وہاں سوائے شکاریوں کے کوئی نہیں جاتا تھا۔ جس جگہ اس جنگل کی ڈھلان ختم ہوتی تھی، وہاں ایک تند و تیز دریا بہتا تھا اور اس پر ذرا پیچھے ایک بہت بڑی آبشار تھی۔

ولسن اس آبشار کی طرف بڑھنے لگا کیونکہ وہاں جھاڑیاں تھیں اور وہاں چھپنے کی بے شمار جگہیں تھیں۔ اگر کوئی وہاں جا کر چھپ جاتا تو اسے تلاش کرنے کے لیے پوری فوج بھی ناکافی ثابت ہوتی۔ ولسن کو خیال آیا کہ شاید اپر پوش وہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔ وہ درختوں کے درمیان سے ہوتا ہوا وہاں تک پہنچا۔ آبشار کے [illegible] ایک [illegible] سطح تھی جس کے درمیان تنگ سے درے سے گزر کر آبشار کئی سو فٹ نشیب میں گر رہی تھی اور یہاں اس کا شور بہت زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ مشرق کی طرف سے دن کی سرخی نمودار ہو رہی تھی۔

ولسن جھاڑیوں کے درمیان .... بھٹکنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپر پوش اسے دیکھ لے اور اس کے سامنے آجائے۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔ ایک بار وہ آبشار کے سامنے والے کنارے کی طرف نکلا تو وہیں بیٹھ گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہیں لیٹ جائے اور سو جائے۔ وہ دونوں گھٹنوں میں سر رکھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ ہڑبڑا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کوئی پولیس والا ہوگا لیکن اس کے بالکل پاس اپر پوش سر جھکائے کھڑا تھا۔ ولسن کھڑا ہوا تو وہ اس کے عین سامنے تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک لمبی اور نکیلی لکڑی تھی ویسی ہی لکڑی جس سے لڑکا اور لڑکی کو ہلاک کیا گیا تھا۔

"تم..." ولسن نے کہنا چاہا۔

"ہوں۔" اپر پوش غرایا۔ وہ چونک کر پیچھے ہٹا۔

"نہیں ڈرو نہیں... میں تمہارا بھائی ہوں... بھائی۔"

"ہوں۔" اس بار وہ غرایا نہیں۔

ولسن آہستگی سے اس کے قریب آنے لگا۔ "دیکھو ڈرو مت ہم ایک ہیں... تم میرے بھائی ہونا؟"

"ہوں۔" اپر پوش نے سر ہلایا۔

ولسن نے بہت آہستہ سے اس کا اپر ہڈ اس کے سر سے سرکایا۔ اس نے معمولی سی مزاحمت کی لیکن پھر ساکت ہو گیا۔ جیسے ہی ولسن نے ہڈ ہٹایا، اس کا چہرہ سامنے آ گیا۔ ولسن لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے سامنے ایک بھیانک انسانی چہرہ تھا۔ اس کا بایاں نصف بری طرح جلا ہوا تھا۔ سر کی کھال جلنے سے سکڑ گئی تھی اور سر کے اس حصے میں بال غائب تھے۔ آنکھ اور کان کے حصے بری طرح متاثر تھے۔ جلا گوشت اس کی بائیں آنکھ پر جھکا ہوا تھا اور نظر آنے والی دائیں آنکھ سے بے پناہ وحشت جھانک رہی تھی۔ ولسن کا دل پگھلنے لگا اور اس کے قطرے اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ اس نے بہت نرمی سے اس کے چہرے کے جلے حصے کو چھوا تو وہ پھر غرایا۔

"نہیں... نہیں، ڈرو مت... میں تمہارا بھائی ہوں۔"

ولسن کو بہت پہلے کی وہ رات یاد آ گئی جب تہ خانے میں آگ لگی تھی۔ کیٹ نے وہاں کمرے بنوائے تھے۔ اب وہ جان گیا تھا کہ کیٹ نے کمرے کیوں بنوائے تھے اور وہاں آگ کیسے لگی تھی اور کیٹ کا اکلوتا بیٹا کہاں غائب ہو گیا تھا۔ وہ غائب نہیں ہوا تھا بلکہ کیٹ نے اس ذہنی معذور بچے کو دنیا کی نظروں سے چھپا کر تہ خانے میں رکھا تھا جہاں سے نکل کر وہ جنگل میں گھومتا تھا۔ پھر کیٹ نے اسے قید کر دیا۔ ولسن کو تیس برس پہلے کا وہ وقت یاد آ گیا جب وہ پی کرنے کے لیے کار سے اترا تھا اور جنگل کی طرف سے نکلنے والے لڑکے کو بچانے کے لیے ٹرک اس کی ماں کی کار پر چڑھ گیا تھا۔ وہ آج اس کے سامنے تھا۔

"میرے بھائی۔" ولسن نے اسے نرمی سے سینے سے لگا لیا۔ وہ شاید اس کی بات سمجھ رہا تھا اور اسے قبول بھی کر رہا تھا۔ وہ خود اس کے سینے سے سمٹ کر لگ گیا جیسے اس کی پناہ میں آ گیا ہو۔ "مجھے پتا ہے تم مظلوم ہو... جیسے میں مظلوم ہوں۔ یہ دنیا ہمارے لیے نہیں ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟ ہم اس دنیا میں مس فٹ ہیں۔"

اس نے سر اٹھا کر ولسن کی طرف دیکھا اور سر ہلا دیا جیسے اس کی بات سے متفق ہو۔ ولسن نے اسے ذرا پیچھے کیا۔ در محبت سے دیکھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "میرے بھائی... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کے نصف جلے ہونٹوں پر شاید پہلی بار مسکراہٹ آئی کیونکہ ان میں پڑنے والا کھنچاؤ بالکل اجنبی تھا۔ وہ ہونٹ مسکراہٹ سے نا آشنا تھے۔ ولسن نے آہستہ سے اس کے سینے پر دباؤ ڈالا اور وہ آبشار کے کنارے سے نیچے گرتا چلا گیا۔ دو سیکنڈ بعد وہاں کچھ نہیں تھا۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ مشرق سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ کارینا تھی۔ وہ اسے تلاش کرتی ہوئی یہاں آ گئی تھی۔ اسی لیے آبشار کی طرف سے پولیس ہیلی کاپٹر نمودار ہوا جس سے اسنائپر کی رائفل جھانک رہی تھی۔ ولسن نے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر لیے۔ کارینا نے اسنائپر کی طرف دیکھا اور گولی نہ چلانے کا اشارہ کیا پھر وہ ہتھکڑی لیے ولسن کی طرف بڑھی۔ اس کا چہرہ اب بھی آنسوؤں سے تر تھا۔ کارینا نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور پھر اسے سینے سے لگا لیا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟"

ولسن نے آبشار کی طرف دیکھا۔ اس کا اب نام و نشان نہیں تھا۔ "میں نہیں جانتا۔" اس نے جواب دیا اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس نے کچھ نہیں کیا ہے، جو کیا ہے ولسن نے کیا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ ہیلی کاپٹر میں جا رہے تھے۔ نیچے مکان دکھائی دیا۔ ولسن نے [illegible] دیکھا۔ "کیا تم میری ایک خواہش پوری کر سکتی ہو؟"

"کہو۔"

"اس مکان کو آگ لگا دینا۔"

کارینا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بالآخر دورِ دہشت ختم ہو گیا۔

کامیابی کی آخری سیڑھی پر قدم رکھنے والے جوڑے کا چونکا دینے والا انجام... ایک مختصر کہانی

کامیابی کے لیے خوش قسمتی لازمی ہوتی ہے... ورنہ آدمی ساحل پر بھی تشنہ رہ جاتا ہے... ڈکیتی کی ایک ایسی ہی واردات کا ماجرا... جس نے انہیں کامیابی سے ہمکنار تو کر دیا تھا مگر...

فرار

انجم فاروق ساحلی

کیونکہ یہ چھٹی کے دن تھے اس لیے کلیٹن آبشار بے حد سنسان تھی۔ یہ آبشار ایک چھوٹے سے قصبے میں [illegible] روز قصبے کے پارکنگ ایریا میں کھڑی ہوئی کاروں [illegible] ایک بھی کسی سیاح کی نہیں تھی۔ یہ تمام کاریں ان [illegible] کی تھیں جن کا کاروبار سامنے والی تین عمارتوں [illegible] واقع تھا۔ ان تین عمارتوں کے بعد رہائشی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ رہائشی علاقے کے ساتھ ہی پیٹرول پمپ واقع تھا اور دوسرے کونے میں قصبے کا واحد ہوٹل۔

قصبے کا کانسٹیبل جم پیٹرسن بیزاری سے دکان داروں سے گفتگو کر رہا تھا جو دکانوں کو دھوپ سے بچانے کے لیے ان کے آگے سائبان کھڑے کرنے میں مصروف تھے۔ وہ عموماً یہ کام سورج نکلنے سے پہلے مکمل رکھا کرتے تھے تاکہ کاروبار کی [illegible]

اوقات میں انہیں کوئی دشواری نہ ہو۔

سڑک کے پار کھڑے مارک نے جم کو دیکھ کر ہاتھ لہرایا۔ مارک قصبے کے واحد پریس کا مالک تھا۔ جم ٹہلتا ہوا چوراہے کے قریب پہنچا تو اس نے بینک کے سامنے پرانے ماڈل کی ایک لمبی سی کار کھڑی دیکھی۔ کار کا انجن اسٹارٹ تھا اور ایک نوجوان ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بے پروائی سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔

بینک اب کھلنے ہی والا تھا۔ جم نے سوچا شاید یہ نوجوان بینک کے کھلنے کا منتظر ہے لیکن اچانک ہی بینک کا دروازہ کھلا۔ ایک نوجوان ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور سنبھالے دوڑتا ہوا باہر آیا۔ بینک شاید اب ذرا جلدی کھلنے لگا تھا۔ جم پیٹرسن نے ابھی اپنا ریوالور سنبھالا بھی نہیں تھا کہ ایک انگارہ سا اس کے جسم میں اتر گیا اور جم کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

دونوں نوجوان تیزی سے عمارتوں کے قریب سے گزرے اور کار کی رفتار بڑھا دی تاکہ جلد ہی قصبے کی حدود سے باہر نکل سکیں۔ بریف کیس سنبھالے ہوئے نوجوان نے اپنا ہیٹ اتار کر عقبی سیٹ پر پھینک دیا۔ بالوں سے کچھ پنیں نکالیں اور پھر اس کے سنہری بال شانوں پر پھیل گئے۔ یہ نوجوان دراصل ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ ایک منٹ بعد لڑکی نے ٹائی بھی اتار کر پھینک دی اور کالر کے قریب لگی ہوئی زپ کو کھول دیا۔ اس نے وہ لبادہ بھی اتار پھینکا جس کے باعث وہ لڑکا لگ رہی تھی۔ اب وہ صرف سوئمنگ کاسٹیوم میں تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چند منٹ بعد ہم طے شدہ راستے پر پہنچ جائیں گے۔“

”اب تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا ہے۔“ لڑکی نے بینک سے لوٹی ہوئی رقم ایک بیگ میں منتقل کرتے ہوئے کہا اور پھر اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ایک لیڈیز سوٹ کیس کھول لیا۔ اس نے اس چھوٹے سے سوٹ کیس میں سے جینز اور سفید بلاؤز نکال لیا۔ ایک ہی لمحے بعد وہ لڑکے کو فراموش کر کے سوئمنگ کاسٹیوم اتار رہی تھی۔ اس نے پھرتی سے جینز چڑھائی، بلاؤز پہنا اور پھر موٹر سائیکل سواروں کے خاص جوتے پہننے لگی۔ اتارے ہوئے کپڑے سوٹ کیس میں رکھ دیے۔ ان کی کار اب جنگل کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ دائیں طرف کے درختوں کی طویل قطار میں ایک جگہ درختوں سے خالی تھی۔ وہ اس مقام پر رک گئے۔ لڑکے نے پھرتی سے سوٹ کیس اٹھایا اور دوڑنے لگا۔ تقریباً بیس گز دور جا کر وہ رکا اور اس نے جھیل کے نیلے پانی میں سوٹ کیس اچھال دیا۔ وہ گاڑی کی طرف واپس آیا۔ [illegible] ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکی تھی۔ وہ اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا اور لڑکی نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

”پانچ منٹ چالیس سیکنڈ ہو چکے ہیں۔“ لڑکے نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”گویا ہمیں تین منٹ کے اندر اندر موٹر سائیکلوں تک پہنچنا ہے۔“ یہ کہہ کر لڑکی نے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ اس نے اس موڑ کی بھی پروا نہیں کی جہاں رفتار کم رکھنے کی ہدایت کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

نوجوان نے مڑ کر عقبی نشست کے نیچے ہاتھ ڈالا، چمڑے کی ایک سیاہ جیکٹ نکالی اور اسے پہن لیا۔

”دیکھو! میں کیسا لگتا ہوں؟ بالکل کسی فلمی ہیرو کی طرح۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“ یہ کہہ کر لڑکا اپنی بات پر خود ہی مسکرا دیا۔

”ابھی ہم خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلے ہیں۔“ لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں مگر تین منٹ بعد ہی ہم موٹر سائیکلوں پر ہائی وے کے راستے اپنی منزل کی طرف اڑے جا رہے ہوں گے۔“ لڑکے نے اسے تسلی دی۔ ”اور کوئی بھی موٹر سائیکل پر سوار جوڑے کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ ہم تم موٹر سائیکل ترک کر دیں گے۔ یہ جعلی کاغذات، فرضی لائسنس سب ضائع کر دیں گے۔ تمہیں اب کس بات کا خوف ہے؟ یہ منصوبہ تو تمہارا ہی بنایا ہوا ہے اور بہت شان دار منصوبہ تھا۔“

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا مگر وہ سوچ رہی تھی کہ میں نے منصوبہ تو بہت ہی شان دار بنایا ہے، تم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ میں نے منصوبے میں کیا راز رکھا ہے۔

اس نے فصل کے ایک گٹھر کے قریب کار روک دی۔ دونوں گاڑی سے اتر کر تازہ کٹی ہوئی فصل کے اس ڈھیر میں چھپی اپنی اپنی موٹر سائیکلیں نکالنے لگے۔ بالکل نئی موٹر سائیکلیں دھوپ میں خوب چمک رہی تھیں۔ لڑکی نے وہ بیگ [illegible] رکھا جس میں لوٹی ہوئی رقم تھی۔ نوجوان نے لڑکی کی [illegible] پر احتجاج کرنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش رہا۔ [illegible] بعد ان کی موٹر سائیکلیں ہائی وے پر دوڑ رہی تھیں۔ پھر چڑھائی شروع ہو گئی۔ وہ رفتار میں مزید اضافہ کرتے ہوئے چڑھائی طے کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ اس [illegible] ہائی وے سے ہزاروں فٹ بلندی پر تھی۔ بلندی سے [illegible] انداز میں دائیں طرف مڑ گئی۔ اس کے بعد اچانک خطرناک [illegible] تھی لیکن لڑکی نے اس خطرناک موڑ کی بھی کوئی پروا نہیں [illegible] کی دونوں جانب ہزاروں فٹ گہری کھائیاں تھیں۔ اسے موٹر سائیکل کے بریک کی بھی فکر نہیں تھی۔ اب تک سب کچھ اس کے منصوبے کے مطابق ہی ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پچاس ہزار ڈالرز کی خطیر رقم اس کی ہے، صرف اسی کی...

وہ رفتار برقرار رکھتے ہوئے رواں دواں تھے۔ اب ڈھلوان شروع ہو گئی تھی۔ دونوں کو اندازہ تھا کہ یہ ایک خطرناک ڈھلوان ہے۔ کم از کم تین چار سو فٹ کی ڈھلوان کے بعد ایک بہت ہی خطرناک موڑ آتا ہے جہاں ذرا سی غلطی بھی انسان کو موت کے منہ میں پہنچا سکتی ہے۔ اب وہ موڑ کافی قریب تھا۔ موٹر سائیکلوں کی رفتار کم کرنے کا وقت آ چکا تھا۔ دونوں نے رفتار کم کرنے کے لیے گیئر بدلے مگر لڑکی نے ساتھ ہی ساتھ اپنے بریک بھی لگانے کی کوشش کی۔

”کیا؟“ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پیڈل آسانی سے دب گیا لیکن بریک نے کام نہیں کیا۔ لڑکی نے مضطرب انداز میں پھر بریک دبایا لیکن موٹر سائیکل کی رفتار ذرا بھی کم نہ ہوئی...

’کیا میں نے غلطی سے اس کی موٹر سائیکل لے لی ہے؟‘ وہ سوچ رہی تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے لڑکے کی موٹر سائیکل پر چاک سے جو نشان لگایا تھا، وہ اب بھی چمک رہا تھا۔ لڑکی نے نوجوان کی طرف دیکھا، اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ لڑکی کو اپنی موت یقینی نظر آنے لگی۔ منصوبے کا خفیہ حصہ ناکام ہو گیا تھا اور موت منہ کھولے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

نوجوان بے حد مسرور نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے لڑکی کی موٹر سائیکل کو تیزی سے خطرناک موڑ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا اور ہنس پڑا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے لڑکی کی بائیک کے بریک خراب کر دیے تھے۔

’اب ساری دولت میری ہو گی۔‘ اس نے سوچا اور اطمینان سے بریک پر پاؤں کا دباؤ ڈالا۔ پیڈل آسانی سے دبتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی نوجوان کے چہرے پر [illegible] کے آثار نمودار ہوئے۔ لڑکی کے موٹر سائیکل کے بریک ناکارہ کرتے وقت ایک لمحے کے لیے بھی اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ لڑکی بھی اس کی موٹر سائیکل کے بریک ناکارہ کر سکتی ہے۔

دونوں موٹر سائیکلیں طوفانی رفتار سے دوڑتی ہوئی خطرناک موڑ تک پہنچیں اور یکے بعد دیگرے دو دلدوز چیخیں ابھریں۔ دونوں موٹر سائیکل سوار سیکڑوں فٹ نیچے گہری کھائی میں گرتے چلے گئے۔

دونوں کا منصوبہ کامیابی کے ساتھ ناکام ہو گیا...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

ملتان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے رعب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت شروع ہو جاتی ہے۔ چودھری کی مخاصمت پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جو ... ہوتا ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ چودھری آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے جو ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس ... میں تھی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد ... ہے۔ شہریار کو پتا چلتا ہے کہ اس کی جاسوسی کی جا رہی ہے۔ وہ اپنے گھر میں جاسوسی کے لیے استعمال ہونے والی ... پکڑ لیتا ہے۔ شہریار کو ماریا پر شبہ ہوتا ہے۔ ماریا لاہور جانے کے لیے نکلتی ہے تو شہریار مشاہرم خان کو اس کا پیچھا کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ ادھر شہریار کو ماہ بانو کے نکاح کے سلسلے میں خود بھی لاہور جانا پڑتا ہے۔ اسلم اور

اسماقادری

قسط 44

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سے قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

ہے۔ اس لیے تم اپنی سہولت کے حساب سے جو چاہے کہہ کر بلا سکتے ہو۔"

"تھینک یو۔" اس نے اپنے اکھڑ انداز میں شکریہ ادا کیا لیکن لہجے میں انکساری کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ باقی کا راستہ انہوں نے خاموشی سے طے کیا۔ گاؤں کی حدود شروع ہوئیں تو وہ دونوں زیادہ محتاط ہو گئے۔ کچھ دیر قبل زوردار فائرنگ ہوئی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود رات کے سناٹے میں آواز گاؤں میں بھی سنی گئی ہو۔ ایسی صورت میں گاؤں والوں کے جاگتے ہوئے ملنے کا امکان تھا۔ چنانچہ ان کی کوشش تھی کہ وہ فوراً ہی اندر داخل نہ ہو جائیں بلکہ پہلے دور سے حالات کا جائزہ لیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے باہر سے ہی گاؤں کے گرد چکر لگایا۔ یہ بہت زیادہ آبادی والا گاؤں نہیں تھا اور ان کے اندازے کے مطابق یہاں مشکل سے پچاس سے ساٹھ گھر موجود تھے۔ ان گھروں میں سے زیادہ تر نیم پختہ اور کچے تھے جیسا کہ عموماً گاؤں دیہاتوں میں ہوتے ہیں۔ ابھی وہ اندر داخل نہیں ہوئے تھے لیکن انہیں اندازہ تھا کہ یہاں ایک آدھ گھر ایسا بھی ہوگا جو دیگر گھروں کے مقابلے میں مضبوط اور پکا ہوگا اور وہاں گاؤں کا سردار اور اہلِ خانہ مقیم ہوں گے۔ انہیں سردار سے تو خیر کیا لینا دینا تھا، بس اپنے لیے ایک پناہ گاہ کی تلاش تھی جہاں وہ محفوظ رہ پاتے۔

شہریار کا خیال تھا کہ اگر وہ کسی مسلمان کے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ انہیں زیادہ آسانی سے پناہ دے دے گا لیکن باہر سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس گھر میں مسلمان مقیم ہیں... سکھ یا ہندو۔ اپنے دور دور سے لیے گئے جائزے کے دوران البتہ وہ یہ اندازہ ضرور لگا چکے تھے کہ فائرنگ کے نتیجے میں گاؤں کا کوئی شخص بیدار نہیں ہوا ہے اگر ہوا بھی ہے تو اس نے گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ شاید سرحد سے قریبی گاؤں ہونے کی وجہ سے وہ اس طرح کی فائرنگ وغیرہ سننے کے عادی تھے۔

اطمینان کر لینے کے بعد وہ دونوں آبادی کے اندر داخل ہو گئے۔ اب مسئلہ اس انتخاب کا تھا کہ کس گھر میں داخل ہوا جائے۔ عام گھروں کی چند فٹ اونچی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو جانا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی اور شہریار جائزہ لے رہا تھا کہ ان میں سے کس کا انتخاب کیا جائے۔

"ہمیں ان دو تین پکے مکانوں میں سے کسی میں پناہ لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔" اس کے خیال کے بالکل برعکس سلو نے سرگوشی میں اپنی رائے دی۔

"یہ تو سرداروں وغیرہ کے مکان ہوں گے۔ [illegible] سے کسی کے مکان میں گھسنا اور مکینوں کو قابو کرنا تھوڑا مشکل [illegible] گا۔ ان گھروں میں افرادِ خانہ کے علاوہ ملازمین وغیرہ کی موجودگی کا بھی پورا پورا امکان ہے۔" اس نے سلو کی [illegible] کے جواب میں درپیش خطرات کا اظہار کیا۔

"یہ سب اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن اگر ایک بار ہم [illegible] گھس کر سچویشن اپنے کنٹرول میں کرنے میں کامیاب ہو [illegible] تو آگے کی ساری مشکل آسان ہو جائے گی۔ ان سرداروں [illegible] بڑی پہنچ ہوتی ہے۔ اگر کوئی ہمیں تلاش کرتا ہوا یہاں [illegible] سردار کے گھر کی تلاشی لینے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔" سلو [illegible] نہایت ایک اہم نکتہ بیان کیا جس کے بعد اسے اس کی تجویز قبول کرنی ہی تھی۔ ویسے بھی اسے اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتبار تھا اور جانتا تھا کہ سردار کے گھر میں اگر مسلح ملازمین موجود بھی ہوئے تو ان کے لیے انہیں سنبھالنا بڑی بات نہیں ہوگی۔ وہ جس تربیت کے بل بوتے پر را اور دیگر بھارتی ایجنسیوں سے نبرد آزما ہونے کا عزم دل میں لے کر یہاں آیا تھا، اس کے سامنے بھلا کسی چھوٹے سے گاؤں کے سردار کے ملازمین اور اسلحہ کیا حیثیت رکھتے تھے۔

شہریار کھلے دل سے اس کی تجویز قبول کرتے ہوئے اس پختہ مکان کی طرف پیش قدمی کرنے لگا جو پورے گاؤں میں سب سے بڑا اور شاندار تھا۔ مکان پر خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اندازہ یہی تھا کہ مکین رات کے اس پہر گہری نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ پہل سلو نے کی اور بیک جھپکتے میں احاطے کی پانچ فٹ اونچی دیوار پار کر کے اندر کود گیا۔ شہریار نے بھی اس کی پیروی کی لیکن ابھی وہ دیوار پر پہنچ کر دوسری طرف کودا نہیں تھا کہ اسے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی اور پھر تاریکی میں اس کا ہیولا نظر آنے لگا۔ وہ خاصا جسیم تھا اور جس دلیری سے سامنے آیا تھا، اس سے ظاہر تھا کہ مقابل کو چیر پھاڑ کر رکھ دینے میں کمال رکھتا ہوگا۔ اگر اس وقت اس کے پاس سائلنسر لگا ہوا پسٹل موجود ہوتا تو وہ بے فائر کر کے کتے کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیتا لیکن [illegible] سے اس کا بیگ سلو نے تھام رکھا تھا اور وہ [illegible] تھا۔ لیکن نہیں... ایسا نہیں تھا۔ اس کے پاس پنڈلی سے بندھا ایک خطرناک خنجر بھی تو تھا۔ اس نے فوراً اسے [illegible] پنڈلی پر سے اتارا اور کتے کی طرف اچھال دیا لیکن [illegible] مچل کر خنجر اپنے ہدف تک پہنچا، کتا بری طرح چیخا [illegible] سے آ کر زمین پر گر گیا۔ کتے کے گرتے ہی [illegible] چھلانگ لگا دی۔ سلو [illegible] دوران مردہ کتے تک پہنچ چکا تھا کے سینے میں اترا ہوا اپنا خنجر باہر نکال رہا تھا۔

"تم بھارتی کتوں سے نمٹنے کے لیے یہاں آئے ہو تو [illegible] کام کا آغاز ہو گیا۔" خون آلود خنجر کو کتے کے لیے [illegible] سے صاف کرتے ہوئے اس نے شہریار کی طرف [illegible] مخصوص مسخرے پن سے کہا۔

شہریار اس کے ریمارکس پر کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر [illegible] زمین پر جھک کر اپنا خنجر تلاش کرنے کے بعد [illegible] اس کی جگہ پر باندھ لیا۔ کتے کے بھونکنے کا کہیں [illegible] ردعمل ظاہر نہیں ہوا تھا اس لیے انہوں نے مزید پیش [illegible] کا فیصلہ کیا۔ بے چارے کتے کی لاش وہیں ایک ڈھیر کی [illegible] میں پڑی رہی۔

اب وہ گھوم پھر کے احاطے میں موجود مکان کا جائزہ [illegible] رہے تھے۔ مکان صرف ایک منزلہ ہی تھا لیکن اس کے [illegible] دروازے اور کھڑکیاں بہت مضبوط تھے اور سب کے [illegible] اندر سے بند بھی اس لیے ان دونوں ذریعے سے وہ اندر [illegible] نہیں ہو سکتے تھے۔ اب دوسرا طریقہ یہی رہ جاتا تھا کہ [illegible] مکان کی چھت پر پہنچ جائیں اور وہاں سے اندر داخل [illegible] امکانات کا جائزہ لیں۔ ایک منزلہ مکان کی چھت [illegible] جانا ان دونوں کے لیے ہی مشکل نہیں تھا چنانچہ لحہ بھر [illegible] اوپر تھے۔ شہریار کو البتہ اپنے زخمی بازو کی وجہ سے ذرا [illegible] سے گزرنا پڑا تھا۔ گاؤں میں داخل ہونے کے بعد [illegible] نے بازو کو ہلا جلا کر اپنی تسلی کر لی تھی۔ بازو کو زیادہ نقصان [illegible] پہنچا تھا اور گولی ذرا سا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ [illegible] خون کا رساؤ بہرحال جاری تھا جس نے اس کی آستین [illegible] تھا۔ یہ اور بات کہ رات کی تاریکی کی وجہ سے [illegible] سے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔

"[illegible] آیا نوں، میں ادھر کھڑی تہاڈا ہی انتظار کر رہی [illegible]" ابھی وہ دونوں چھت پر پہنچے ہی تھے کہ ایک نسوانی [illegible] سنائی دی۔ دونوں ہی نے بُری طرح بھڑک کر آواز کی [illegible] دیکھا۔ اندھیرے کے باعث منظر زیادہ واضح نہیں تھا [illegible] وہ سیڑھیوں کے قریب کھڑی عورت کا ہیولا دیکھ [illegible] تھے۔ وہ جس طرح تن کر کھڑی تھی، اس سے یہی اندازہ [illegible] ہوتا تھا کہ قد کاٹھ کی جوان العمر عورت ہے۔ آواز سے [illegible] جوانی ہی محسوس ہوئی تھی۔ سلو نے پھرتی دکھاتے [illegible] نکال کر اس کا رخ عورت کی طرف کر دیا۔

[illegible] بغیر آواز کے چلتی ہے۔ اگر تو نے ذرا سی بھی شور مچایا [illegible] سینے میں گولی اتار دوں گا اور تو کسی کو معلوم ہوئے [illegible] پہنچ جائے گی۔" اس نے دھیمی آواز میں غرّاتے ہوئے عورت کو دھمکی دی۔

"یہ تو کوئی گل نہ ہوئی جی! میں تہاڈا سواگت کر رہی ہوں اور تم مینوں مارنے دی دھمکی دے رہے ہو۔" اس نے بڑے معصومانہ انداز میں شکوہ کیا اور پھر مزید بولی۔ "اگر مینوں شور ہی کرنا تھا تو اس ویلے کرتی جب تم نے میرے کتے کو مارا تھا۔ کتنا سوہنا جناور تھا پر چھڈو اساں تہانوں معاف کیا۔" وہ عجیب وغریب کردار کی صورت میں اچانک ان کے سامنے آئی تھی اور کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ اس سے کس طرح نمٹا جائے۔ اگر وہ ان کے مقابلے پر کھڑی انہیں نقصان پہنچا رہی ہوتی تو اسے آرام سے زیر کر لیا جاتا لیکن وہ تو ایسے باتیں بگھار رہی تھی جیسے ان کے استقبال کے لیے ہی وہاں کھڑی ہو۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار بھی موجود نہیں ہے اور وہ دونوں ہاتھ سامنے کیے بالکل نہتی کھڑی ہے۔ اندازِ نڈر ہونے کے باوجود لہجہ دھیما تھا جیسے وہ خود بھی نہ چاہتی ہو کہ کوئی اس کی آواز سن سکے۔

"اب کیا کھڑے کھڑے میرا منہ ہی تکتے رہو گے؟ یہاں تک آئے ہو تو میرے ساتھ نیچے بھی چلو پر ذرا دھیان سے۔ نیچے گھر میں بہت لوگ ہیں۔ کوئی آواز سن کر جاگ بھی سکدا ہے۔" وہ اس انداز سے مڑی جیسے پورا یقین ہو کہ وہ دونوں ضرور اس کے پیچھے آئیں گے۔

ہوا بھی یہی لیکن کچھ اس طرح کہ سلو نے عورت کے عین پیچھے پوزیشن لے کر گن کی نال اس کی گردن سے لگا دی اور دھمکی دی۔ "اگر تم نے ہمارے ساتھ کوئی چال چلنے کی کوشش کی تو سب سے پہلے تم اپنی جان سے جاؤ گی۔" اسے اندیشہ تھا کہ عورت کے ذریعے انہیں ٹریپ کرنے کی کوشش نہ کی جا رہی ہو اور جب وہ نیچے پہنچیں تو مسلح افراد ان کے استقبال کے لیے موجود ہوں۔

"فکر نہ کرو بھائیاں جی، میں تہاڈے ساتھ کوئی چال نہیں چل رہی ہوں۔ میں تو بس تہاڈی مدد کر رہی ہوں۔ تم بس بالکل چپ چاپ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" اب عورت کی آواز پہلے کے مقابلے میں مزید دبی ہوئی تھی اور وہ اتنی احتیاط سے قدم اٹھا رہی تھی کہ واضح لگتا تھا کہ وہ شدت سے اس بات کی متمنی ہو کہ اہلِ خانہ میں سے کوئی آہٹ سن کر جاگنے نہ پائے۔

سیڑھیاں اترنے کے بعد وہ [illegible] کی طرف مڑی۔ یہاں ایک قطار میں تین دروازے نظر آ رہے تھے۔ تینوں ہی دروازے بند تھے۔ عورت پہلے دروازے پر رکی اور اسے ہاتھ سے ہلکا سا دھکا دے کر کھولا۔ عورت کے

پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ دونوں ذرا سا جھجکے کہ کہیں اس کمرے کی صورت چوہے دان میں نہ پھنس جائیں لیکن اہم بات یہ تھی کہ عورت ان سے پہلے کمرے میں داخل ہوئی اور اگر وہ کمرا ان کے لیے چوہے دان ہوتا تو وہ خود بھی ان کے ساتھ پھنس جاتی جبکہ اس کے انداز میں ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اگر وہ کسی کے کہنے پر انہیں پھنسانے کی کوشش کر بھی رہی تھی تو اس کو یہ خوف تو ہونا چاہیے تھا کہ اس کی جان مشکل میں پھنس جائے گی لیکن اس کے انداز میں ایسا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

عورت کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر پلنگ پر سوئے ہوئے مرد پر پڑی۔ سو تو پہلے ہی عورت کو کور کیے ہوئے تھا، شہریار جھپٹ کر مرد کے قریب پہنچا اور پنڈلی پر بندھا خنجر کھینچ کر باہر نکال لیا۔

"اس کی چنتا نہ کرو۔ یہ بہت گہری نیند سو رہا ہے، ہور اگر اس کے سر پر ڈھول بھی بجاؤ گے تو نہیں جاگے گا۔" عورت نے نہایت اطمینان سے انہیں مطلع کیا۔ اب تک وہ اندھیرے میں اس کا ہیولا ہی دیکھتے رہے تھے لیکن کمرے میں جلتی لالٹین کی روشنی میں اسے واضح طور پر دیکھنے کا موقع ملا تو دم بخود رہ گئے۔ وہ مشکل سے بیس سال کی انتہائی خوب صورت لڑکی تھی جس کے کٹیلے نین اور رس بھری جیسے ہونٹ سادگی میں بھی دیکھنے والوں کو متوجہ کرتے ہوں گے لیکن اس وقت تو وہ سولہ سنگھار کیے غضب ڈھا رہی تھی۔ سرخ ریشمی کام دار کرتہ، ہم رنگ دھوتی، چنا ہوا چمک دار دوپٹا، ناک، کان، گلے اور ماتھے پر سجا زیور، آنکھوں میں پڑے کاجل کے بڑے بڑے ڈورے اور ہونٹوں پر لگی سرخی کے ساتھ بانہوں میں چھنکتی چوڑیاں... سب مل کر اعلان کر رہی تھیں کہ وہ نئی نویلی دلہن ہے لیکن عجیب بات تھی کہ اتنی طرح دار عورت کا شوہر پلنگ پر لیٹا مدہوشی کی نیند سو رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" سو نے جو اپنے پیچھے دروازے کو پہلے ہی بند کر چکا تھا، اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے عورت سے پوچھا۔

"یہ میرا پتی سربجیت سنگھ ہے۔ میں امرت کور ہوں۔ ہمارا ابھی چار روز پہلے ہی ویواہ ہوا ہے۔" اس نے جواب دیا تو اس کی آنکھیں اندرونی تپش کے تحت دہک رہی تھیں اور لہجے میں شدید تلخی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ تم ہمیں کھل کر اپنے بارے میں سب کچھ بتا دو اور یہ بھی کہ تم ہمیں اپنے ساتھ یہاں کیوں لائی ہو؟" یہ احساس ہو جانے کے بعد کہ یہاں فی الحال ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے، وہ دونوں ہی ذرا ریلیکس ہو گئے تھے اور ایک موڑھے پر ٹکتے ہوئے شہریار نے اس سے سوال کیا تھا۔

"اپنا نام تو میں نے تمہیں بتا ہی دیا ہے، باقی بھی بتا دیتی ہوں۔" وہ پلنگ پر اپنے پتی کی پائنتی تک گئی اور پھر کھوئے کھوئے لہجے میں بتانے لگی۔

"میرے ماتا پتا کا میرے بچپن میں ہی دیہانت ہو گیا تھا اور میں یہیں اسی گھر میں پلی بڑھی ہوں۔ یہ میرے تاؤ جگجیت سنگھ کا گھر ہے۔ میرے تاؤ کی دو دو پتنیاں ہیں، وڈی سے تین ہور چھوٹی سے چار اولادیں ہیں۔ وڈی تائی کی اولادیں عمر میں مجھ سے کافی بڑی تھیں اس لیے میری ان سے زیادہ چھوٹی تائی کے بچوں سے بنتی تھی۔ خاص طور دل جیت سنگھ اور آشا کور میرے پکے سنگی تھے۔ بچپن [illegible] کھیلتے اور روتے کب بیتا کچھ پتا ہی نہیں لگا۔ تاؤ اور چھوٹی تائی کا سلوک میرے ساتھ چنگا تھا، پر وڈی تائی تنک چڑھی تھی اور آنے بہانے سب بچوں کو ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی تھی۔ میں نے تو کئی واری اپنی چھوٹی چھوٹی شرارتوں پر اس کے ہاتھوں بری طرح مار بھی کھائی۔ تاؤ کو میرے پٹنے کا دکھ بھی ہوتا تھا پر وہ وڈی تائی کو زیادہ کچھ اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ اس کا میکا وڈا مضبوط تھا، ہور اس کے پیو اور بھرا ذرا ذرا سی گل پر لڑنے مرنے کے لیے پہنچ جاتے تھے۔ وڈی تائی جیسی [illegible] ویسے ہی اس کے بچے بھی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ہمارے ساتھ گھلتا ملتا نہیں تھا لیکن رعب سب جماتے تھے۔ خاص طور پہ یہ سربجیت تو بہت ہی لڑاکو اور غصیلا تھا۔ جب دل [illegible] ہی کبھی میری چوٹی پکڑ کر کھینچ لیتا تو کبھی بانہہ مروڑ دیتا۔ میں تکلیف سے روتی تو یہ ہنسنے لگتا۔ دل جیت سے میرا رونا دیکھا جاتا ہور وہ میری خاطر اس سے لڑنے کھڑا ہو جاتا لیکن وہ وچارہ عمر ہور قد کاٹھ میں سربجیت سے بہت کم تھا [illegible] برداری بری طرح مار کھاتا ہور ہار جاتا۔

"میں نے یہ حال دیکھ تو دل جیت کو بچانے کے لیے سربجیت کی زیادتیوں کو چپ چاپ سہنا شروع کر دیا لیکن اپنے من میں پلتے دو جذبوں کو بڑھنے سے نہ روک سکی [illegible] میں ایک جذبہ سربجیت سے سخت نفرت کا تھا [illegible] سے گہری محبت کا۔ دل جیت بھی میری ہی طرح مجھ سے پریم کرتا تھا ہور ہم سوچتے تھے کہ جب بڑوں نے ہمارے ویواہ کی بات [illegible] تو سب ٹھیک ہو جائے گا [illegible] ہمارے پریم کی [illegible] اور خوش ہوتی تھی [illegible] دلہن بن کر ہمیشہ اسی گھر میں [illegible] گی۔ وہ [illegible] چھیڑ چھاڑ بھی کرتی رہتی تھی۔ مجھے دل جیت کا پریم ہور آشا کی چھیڑ چھاڑ دونوں ہی سے بڑا سرور آتا تھا ہور میں دن گنتی رہتی تھی کہ کب وہ دن آئے گا جب ہمارے سپنے سچ ہوں گے۔ لیکن قسمت کی مار کہ وہ دن کبھی نہیں آیا ہور مجھے بالکل اچانک یہ خبر سننے کو ملی کہ وڈی تائی نے سربجیت کے لیے میرا رشتہ مانگ لیا ہے ہور اب میرا ویاہ اس سے ہو گا۔

"میں بڑی روئی تڑپی۔ دل جیت ہور آشا بھی پریشان ہو گئے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آشا نے چھوٹی تائی جی یعنی ماتا سے گل کر کے انہیں یہ راز بتایا کہ میں ہور دل جیت ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں ہور میں دل جیت کے سوا کسی کی استری بننے کو تیار نہیں ہوں۔ یہ سن کر وہ گھبرا گئی ہور ایک دن اکیلے میں مجھے اپنے کمرے میں بلا کر اپنی چنری میرے قدموں میں ڈال کر بولی۔ دیکھ امرت! دل جیت میرا ایک ہی پتر اور اپنی تین بہنوں کا اکیلا سہارا ہے۔ اگر یہ گل کسی کو علوم ہو گئی کہ تو ہور دل جیت ایک دوجے سے پریم کرتے ہیں تو سربجیت میرے پتر کی جان کے پیچھے پڑ جائے گا۔ تو جانتی ہے کہ وہ مزاج کا کتنا ہٹیلا اور خودسر ہے۔ اس سے ذرا برداشت نہیں ہو گا کہ تو اس کا رشتہ ٹھکرا کر دل جیت کا ہو لے۔ وہ تجھے اور دل جیت دونوں کو زندہ زمین میں گاڑ دے گا۔ اب تو خود سوچ کر فیصلہ کر لے کہ چپ چاپ سربجیت سے ویاہ کر کے اس طوفان کو ٹال دیتی ہے یا فیر اپنی اور دل جیت کی جان گنواتی ہے؟

"مجھے اپنی جان کی پروا نہیں تھی لیکن دل جیت کو کانٹا بھی چبھے، یہ گوارا نہیں تھا اس لیے جیسے بچپن میں دل جیت کو بچانے کے لیے سربجیت کی زیادتیوں کو خاموشی سے برداشت کرتی تھی، ویسے ہی اس بار بھی چپ ہو گئی۔ دل جیت نے بہت کوشش کی کہ مجھ سے گل کر سکے۔ آشا کی زبانی اس نے مجھے کئی پیغام بھیجے لیکن میں نے یہی جواب دیا کہ میں بڑوں کے فیصلے پر خوش ہوں۔ یوں میں نے اپنے پریمی کو بچانے [illegible] اپنے پریم کو بھینٹ چڑھا دیا اور سربجیت کی دھرم پتنی بننا منظور کر لیا۔ ویاہ کے ویلے میرے من میں یہی تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح من پر جبر کر کے یہ رشتہ نبھا لوں گی لیکن [illegible] نے پہلی ہی رات یہ واضح کر دیا کہ وہ اس لائق نہیں [illegible] اس سے وفا کی جا سکے۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ چنگی طرح جانتا ہے کہ میں ہور دل جیت ایک دوجے سے پریم کرتے تھے [illegible] اس نے مجھ سے ویاہ کیا ہے [illegible] تاؤ نے دوجا ویاہ کر کے اس کی ماں کو تکلیف [illegible] اس لیے اس نے مجھ سے ویاہ کر کے چھوٹی تائی ہور اس کی اولاد کو تکلیف دی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میں چونکہ بچپن سے ہی چھوٹی تائی کے بچوں سے قریب تھی اور ہر وقت ان میں کھیلتی کودتی رہتی تھی اس لیے وہ ان لوگوں کی طرح مجھ سے بھی سخت نفرت کرتا تھا ہور اسی نفرت کے کارن اس نے مجھ سے ویاہ کیا ہے۔ تھوڑی دیر میں اس نے اپنی نفرت ثابت بھی کر دی ہور میرے سارے پنڈے کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اے دیکھو!" اس نے ایک جھٹکے سے اپنی دونوں آستینیں اوپر کیں تو انہوں نے دیکھا کہ اس کے بھرے بھرے گورے بازوؤں پر جابجا زخم کے نشان ہیں۔ یہ نشان ایسے تھے جیسے کسی نے اسے دانتوں سے کاٹا اور ناخنوں سے نوچا ہو۔

"ایسے بہت سارے نشان میرے پورے پنڈے وچ موجود ہیں ہور میں ان نشانوں کو ریشمیں خوب صورت کپڑوں کے نیچے چھپا کر پھر رہی ہوں کہ کہیں دل جیت کو اس کی خبر نہ ہو جائے۔ اگر اسے علوم پڑ گیا کہ سربجیت نے میتوں اس بری طرح مارا اے تو فیر کسی گل دی پروا کیے بغیر اس سے الجھ جائے گا ہور میں ایسا نہیں چاہتی۔ اسے سربجیت بے تا، اے موقع دی تلاش میں ہے۔ دل جیت اگر ذرا بھی الجھا تو اے اس دی جان لے لے گا۔" اس نے ایک نفرت بھری نظر پلنگ پر بے خبر سوئے اپنے پتی پر ڈالی اور سسکنے لگی۔ ان دونوں ہی نے امرت کور کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کی۔ وہ اتنی پیاری اور نرم گداز سی دوشیزہ حقیقتاً اس سلوک کی مستحق نہیں تھی جو اس کے شوہر نے اس کے ساتھ روا رکھا تھا۔ وہ یقیناً نہایت جاہل اور وحشی آدمی تھا جس نے ایک معصوم لڑکی کو ایک ایسی بات کے لیے نفرت کا نشانہ بنا رکھا تھا جس میں اس کا سرے سے کوئی قصور ہی نہیں تھا۔

جگجیت سنگھ کی دو شادیوں میں امرت کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ یہ تو گاؤں، دیہاتوں کا ایک عمومی رواج تھا کہ صاحبِ حیثیت و صاحبِ اختیار لوگ ایک سے زیادہ شادیاں کر لیتے تھے۔ امرت کور کی زبانی انہیں معلوم ہوا تھا کہ سربجیت کے ننھیال والے بڑے ڈھڈے لوگ تھے اور بہن کی حمایت میں بہنوئی کے سامنے کھڑے ہونے میں دیر نہیں لگاتے تھے لیکن انہوں نے بھی یقیناً اس رواج کو سمجھتے ہوئے بہنوئی کی دوسری شادی کی راہ میں رکاوٹ نہیں کھڑی کی تھی ورنہ جگجیت سنگھ جو گھریلو معاملات میں بیوی سے دبتا تھا، دوسرا بیاہ ہرگز نہ کر پاتا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کی دوسری شادی کچھ خاص حالات میں ہوئی ہو، اس لیے بھی [illegible] کوئی دلچسپی نہیں تھی [illegible] وہ صرف یہ جاننا چاہتے تھے۔ امرت

کور نے انہیں اپنے کمرے میں کیوں پناہ دی ہے اور وہ یہ ساری کہانی سنا کر ان سے کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہے؟

''اے سربجیت ہے نا، اے کتنا کمینہ ہے... تساں اس گل دا اندازہ کر سکدے ہو کہ اس نے جان بوجھ کر بیاہ سے پہلے ای کمرا اپنے لیے لیا کہ اس دے برابر والا کمرا دل جیت دا ہے ہور یہ چاہندا ہے کہ دل جیت اس تصور نال راتاں تڑپ تڑپ کے گزارے کہ اس دی محبوبہ برابر والے کمرے وچ کسی ہور دی بانہاں میں سو رہی ہے۔ اس نے مینوں یہ بھی دسا ہے کہ وہ چار دریاں لوں مجھ پر سوت لے آئے گا تے فیر اس دا انتقام پورا ہو جائے گا۔'' اس نے ان پر مزید حقائق عیاں کیے۔

''ہمیں تمہارے حالات جان کر بہت افسوس ہوا بی بی لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم یہ سب ہمیں کیوں بتا رہی ہو اور ہم سے کیا چاہتی ہو؟'' اس رات کی صبح بھی ہونی تھی اور یقیناً صبح ہونے کے بعد ان کی امرت کور کے کمرے میں موجودگی چھپی نہیں رہ سکتی تھی اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے تحفظ کے بارے میں سوچے بغیر ساری رات اس کی داستانِ غم سنتے ہوئے گزار دیں۔ اسی لیے شہریار نے اس کی گفتگو میں دخل دیتے ہوئے براہِ راست سوال کیا۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم اسے قتل کر دو۔'' اس نے اپنے پتی پر ایک نفرت بھری نظر ڈالتے ہوئے اپنی خواہش بیان کی۔ اس پل اس کے خوب صورت نقوش والے معصوم چہرے پر بڑی سفاکی چھا گئی تھی۔ اس کی خواہش جان کر شہریار تو بالکل بھونچکا ہی رہ گیا البتہ سلو نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''اس کام کے بدلے ہمیں تم سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''تینوں پہلے ہی مجھ سے فیدہ ہو رہا ہے۔ جب تساں نو چار دیواری پھلانگی تھی ہور کتا بھونکا تھا تو مینوں اپنی اکھاں وچ سب دیکھ سی پر شور نہ کیتا ورنہ اس ویلے تم اتنے آرام نال نہ بیٹھے ہوتے۔ جس کتے نوں تم نے گولی ماری ہے نا، وہ مینو پالتو کتا تھا۔ مینوں اس وچ وڈا پریم تھا پر مینوں مجبوری ہے۔ اس منحوس آدمی وچ پچھا چھڑان دے مینوں کی موقع میں ہے جسے میں ضائع نئیں کر سکدی ہوں۔ تسی دسو... تہاں سودا منظور ہے؟ تسی اینوں ٹھکانے لگا دو میں تسی گاؤں وچ باہر نکال دوں گی۔'' اس نے بلی تھیلے سے باہر نکال دی۔

''تم تو دیکھ رہے ہو اتنی گہری نیند کیسے سو رہا ہے کہ ہم اس کے سر پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں پھر بھی اس کی آنکھ نہیں کھل رہی ہے؟'' وہ بڑی جوب تک نہیں منظور ہو رہی

تھی، اپنے شوہر کو قتل کروانے کی سازش کرتے دیکھ کر چالاک لگنے لگی اس لیے وہ ہر زاویے سے اس پر شک کرنے میں حق بجانب تھے۔

''اینوں شراب دی عادت ہے۔ تین راتاں سے اسے شراب پی کر مجھ پر ظلم کر رہا تھا۔ آج میں نے اس کو شراب نال افیم ملا کر پلا دی ہے اس لیے یہ مُردوں کی طرح پڑا سو رہا ہے۔ مینوں اس نال اتنی نفرت ہے کہ میں اس دی جان بھی لے سکدی ہوں پر فیدہ کی ہوگا۔ اس دے قتل دے الزام میں پھنس کر میری زندگی بھی خراب ہو جائے گی پر اگر تسی اس کو قتل کر دو تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ودھوا ہونے کے بعد یا تو میرا دل جیت سے ویاہ ہو جائے گا یا میں ساری حیاتی ایسے ہی ادھر پڑی رہوں گی۔ مینوں دونوں ہی گل منظور ہے پر اس دے سنگ رہنا وڈا مشکل ہے۔'' وہ سربجیت سے واقعی بڑی شدت سے نفرت کرتی تھی اس لیے اسے یہ بھی منظور تھا کہ چاہے وہ بعد میں اپنے محبوب کو نہ پا سکے لیکن کسی طرح اس آدمی سے جان چھوٹ جائے۔ اس کی پُرکشش پیشکش کے باوجود شہریار تذبذب کا شکار تھا۔ سربجیت کتنا ہی ظالم اور کمینہ صفت سہی لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا اور نہ ہی ان کے مقابل آیا تھا اس لیے ایک غیر متعلقہ آدمی کو قتل کر دینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وطن دشمنوں کو انجام تک پہنچانا دوسری بات تھی لیکن اس کے پاس کسی کو باقاعدہ سازش کر کے قتل کر دینے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ بھی ایسے شخص کو جو ان کے سامنے ہوش و حواس سے بیگانہ بالکل بے دست و پا پڑا تھا۔

''ہم تمہارا یہ کام کر دیں گے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم ہمیں گاؤں سے باہر کیسے نکالو گی؟ کیا اس کام کے لیے دل جیت ہمارے ساتھ جائے گا؟'' شہریار کے برعکس سلو مفادات کو ترجیح دینے والا تھا کیونکہ اس کی تربیت ہی انہی خطوط پر ہوئی تھی۔ اس نے فوراً ہی امرت کور کی پیشکش قبول کر لی اور اپنے اندازے کی بنیاد پر اس سے ایک اہم سوال کیا۔

''اونہوں۔'' امرت کور نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔ ''دل جیت دا اس معاملے وچ کوئی تعلق نہیں ہے۔ [illegible] خود تمہیں ادھر سے نکالوں گی۔ تم دونوں اس کو اٹھا [illegible] چھت تے لے جاؤ ہور کتے کی طرح اس دے سر وچ گولی مار دو۔ میں تیار ہو کر بھی آتی ہوں۔'' اس نے [illegible] پورا پروگرام بتا دیا۔

''تم نے ہمیں پاگل سمجھا ہوا ہے کہ ہم اس طرح تمہاری بات مان لیں گے؟ تم جیسی عورت کا کیا بھروسہ ہے؟

جو عورت اپنے شوہر کو قتل کروانے کی سازش کر سکتی ہے وہ ہمارے ساتھ کیا رعایت کرے گی۔ پتا چلا کہ ادھر ہم نے اوپر چھت پر تمہارے پتی کا کام تمام کیا اور ادھر تم نے شور مچا کر پورے گھر کو جگا ڈالا۔ اس طرح تم خود تو بچ جاؤ گی لیکن ہم پھنس جائیں گے۔''

''فیر تسی خود دسو کہ کیا چاہتے ہو۔ ویسے میرا تمہیں دھوکا دینے دا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تم چاہے مجھے برا سمجھو پر جو آگ میرے تن من کو لگی ہے اسے میں ہی جاندی ہوں، ورنہ میں کوئی بری عورت نہیں ہوں۔'' سلو کی سخت بات کا جواب دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے لیکن وہ ذرا متاثر نہیں ہوا اور اسی لہجے میں بولا۔

''تمہارے پتی کو چھت پر لے جا کر ٹھکانے لگانے کا کام میں اکیلا کروں گا اور میرا ساتھی تمہارے ساتھ اسی کمرے میں رہے گا تاکہ اگر تم کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرو تو یہ تم سے نمٹ سکے۔''

''مینوں منظور ہے۔'' وہ فوراً راضی ہو گئی۔ اس کی رضامندی ملتے ہی سلو نے لمبے چوڑے سربجیت کو پلنگ سے اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈالا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ سربجیت کے قد و قامت کو دیکھ کر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی تھی کہ وہ خاصا وزنی رہا ہوگا جبکہ سلو اس کے مقابلے میں ذرا کم نظر آتا تھا لیکن اس نے جتنے آرام سے سربجیت کو اٹھا رکھا تھا، اسے دیکھتے ہوئے بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ سے کہیں زیادہ وزنی بندے کو اٹھائے ہوئے ہے۔

''تسی زخمی ہو۔ لاؤ میں مرہم پٹی کر دیتی ہوں۔'' سلو کے باہر نکلنے کے بعد وہ شہریار کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے زخمی بازو کو دیکھتے ہوئے پیشکش کی۔ شہریار کا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن پھر بھی خاصا خون بہہ گیا تھا اس لیے بہتر تھا کہ اگر مرہم پٹی کا موقع مل رہا ہے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا لے۔ اس نے امرت کور کی پیشکش قبول کر لی۔ اس کی طرف سے رضامندی ظاہر ہوتے ہی وہ فوراً حرکت میں آ گئی اور اس کی آستین ہٹا کر جگ میں رکھے سادے پانی میں کپڑا بھگو کر اس کے زخم اور ارد گرد کے حصے سے خون صاف کیا۔

''ابھی میں پانی گرم کرنے رسوئی میں نئیں جا سکدی ہوں اس لیے اسی پانی سے کام چلانا ہوگا۔'' اپنا کام جاری رکھتے ہوئے اس نے شہریار سے کہا۔

''کوئی بات نہیں، اتنا بھی کافی ہے۔'' اس نے رسان سے جواب دیا۔

''چنگی گل یہ ہے کہ گولی اندر نہیں گھسی ہے۔ بس

گوشت کو تھوڑا نقصان پہنچا کر نکل گئی ہے ورنہ وڈی مشکل ہو جاتی۔'' اب وہ اس کے زخم کو ڈیٹول سے صاف کرنے کے بعد اس پر کوئی مرہم لگا رہی تھی۔ شہریار کو حیرت ہوئی کہ اس نے زخم دیکھ کر کیسے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ زخم گولی لگنے کا نتیجہ ہے ورنہ عموماً گھریلو عورتوں کو اس قسم کی شد بد نہیں ہوتی۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ گولی کا زخم ہے؟'' اس نے اپنی حیرت کو سوال کا روپ دے ڈالا جس پر امرت کور بہت دھیمی آواز میں ہنسی۔ اس کی ہنسی میں ایک ردھم تھا اور بالکل یوں لگتا تھا کہ کہیں دور گھنٹیاں سی بج رہی ہوں۔

''اس گھر دے جو مرد ہیں نا، ہتھیار ان کے لیے کھلونوں کی طرح ہیں ہور کھیل میں چوٹیں تو لگدی ہیں۔ میں ایسی چوٹاں تو دیکھ دیکھ کر ہی جوان ہوئی ہوں اس لیے چنگی طرح پہچانتی ہوں کہ یہ گولی کا ہی زخم ہے بلکہ میں تو یہ بھی جاندی ہوں کہ تم سرحد پار سے آئے ہو ہور سرحد پار کرتے ویلے ہی اسے زخم لگا ہے۔'' وہ اتنی پُریقین تھی کہ شہریار اسے جھٹلا نہیں سکا اور خاموش بیٹھا رہا۔ امرت کور نے بھی اسے نہیں چھیڑا اور خاموشی سے پٹی باندھنے کا کام مکمل کرنے لگی۔ ''اب تسی منہ دوسری طرف پھیر لو۔ مینو کپڑے وی بدلنے ہیں۔'' پٹی باندھنے کے کام سے فارغ ہو کر اس نے شہریار سے کہا تو اسے اس کی بات پر عمل کرنا پڑا لیکن منہ دوسری طرف پھیر لینے کے باوجود وہ عقب سے پوری طرح ہوشیار تھا کہ مبادا وہ اس پر پیچھے سے وار نہ کر دے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور صرف کپڑوں کی سرسراہٹیں سنائی دیتی رہیں۔

''میں نے کپڑے بدل لیے ہیں۔'' ایک آدھ منٹ میں ہی اس نے اطلاع دی تو شہریار نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا ریشمی سرخ جوڑا اتار کر اس کی جگہ مردانہ کپڑے پہن چکی تھی جو یقیناً اس کے پتی سربجیت کے تھے۔ اچھے قد کاٹھ کی ہونے کے باوجود یہ کپڑے اس کے جسم پر ڈھیلے ہو رہے تھے۔ کپڑوں کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے سارے زیور، گہنے وغیرہ بھی اتار دیے تھے اور اب رگڑ رگڑ کر ہونٹوں پر موجود سرخی کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے لمبے بالوں کی چوٹی کو بل دے کر جوڑے کی شکل میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اسی لمحے سلو بھی واپس آ گیا۔ اس کی آمد سے بے نیاز امرت کور نے جوڑا بنانے کا کام مکمل کیا اور پھر پھرتی سے اپنے سر پر پگڑی باندھنے لگی۔ جیسے کی اتنی تبدیلی سے وہ کچھ کچھ مرد لگنے لگی۔ عورت کے ندھیرے میں [illegible] شخص

اسے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ کوئی نو عمر لڑکا ہے۔ سلو نے اس کا یہ حلیہ دیکھ کر سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکیڑے لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔

"تم دونوں بھی اگر اس شہری لباس کی جگہ دھوتی باندھ لو تو چنگا ہوگا۔" اس نے ایک اچھا مشورہ دیا اور ان کی طرف سے رضامندی ملتے ہی انہیں بھی دھوتی کرتے پر مشتمل ایک ایک جوڑا فراہم کر دیا۔ سلو اور شہر یار دونوں نے ہی اپنے کپڑے اتارے بغیر اوپر سے ہی دھوتی کرتہ پہن لیا۔ اب وہ روانگی کے لیے تیار تھے اور اپنے پاس موجود بیگ شانوں پر لٹکا لیے تھے۔ اس موقع پر شہر یار نے بھی اپنی گن اوپر نکال لی تھی کہ اگر ضرورت پڑے تو فوری طور پر اسے استعمال کیا جا سکے۔

"تم چاہو تو اوپر چھت پر جا کر اپنے پتی کی لاش دیکھ سکتی ہو۔" نکلنے سے قبل سلو نے امرت کور کو پیشکش کی۔

"اس دی لوڑ نہیں ہے۔ میں نے جو جوا کھیلنا تھا کھیل چکی۔ اگے میری قسمت۔" اس نے جواب دیا اور انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ بہت سنبھل کر چل رہی تھی اور اس کے چلنے سے معمولی سی بھی آہٹ پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ یہ احتیاط وقت کا تقاضا تھی۔ ذرا بھی بد احتیاطی کی صورت میں گھر کا کوئی فرد جاگ سکتا تھا۔ نتیجے میں ان دونوں کے ساتھ وہ بھی پھنس جاتی۔

دروازے کی کنڈی بے آواز کھول کر وہ تینوں باہر احاطے میں نکل آئے۔ امرت نے اپنے پیچھے دروازے کو آہستہ سے بھیڑ دیا اور آگے بڑھی۔ پھاٹک کے قریب تین چار گھوڑے کھڑے تھے اور امرت کا رخ انہی کی طرف تھا۔ جب وہ دونوں دیوار پھلانگ کر اندر آئے تھے اور گھر کے اندر جانے کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے تو انہوں نے بھی ان گھوڑوں کو دیکھا تھا لیکن زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اس وقت ان کے ذہنوں میں یہاں سے فرار کے بجائے پناہ لینے کا خیال بسا ہوا تھا اس لیے گھوڑے ناقابلِ توجہ ٹھہرے تھے۔ ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ گھوڑے جیسے پالتو اور وفادار جانور پر بنی مرضی سے سواری کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ذلیل گھوڑے تو بڑے سے ماہر سوار کو بھی مرضی نہ ہونے کی صورت میں لمحہ بھر کے اندر اپنی پشت سے نیچے ڈال دیتے ہیں لیکن اب صورتِ حال مختلف تھی۔ ان کے خدشات کے برخلاف سرحد کی محافظ [illegible] نے گاؤں میں داخل ہو کر انہیں تلاش کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ [illegible] معلوم نہیں کہ وہ ان کے فرار ہو کر [illegible] طرف [illegible] سے باخبر نہیں ہو سکے تھے یا پھر جتنوں کو چڑ [illegible]

تھا، انہیں ہی کارکردگی دکھانے کے لیے کافی سمجھا تھا۔ [illegible] اتنے تواتر سے غیر قانونی طور پر سرحد کے آر پار آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا تو کہیں تو کوئی سقم یا غفلت کا عنصر کارفرما تھا۔ دونوں طرف کے اسمگلرز اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھے۔

گھوڑوں کے قریب پہنچ کر امرت کور نے ان میں سے ایک مشکی گھوڑے کے جسم پر ہاتھ رکھ کر اسے سہلایا تو وہ یوں ہنہنایا جیسے اسے پہچان لیا ہو۔

"رکھو! تجھے ان دونوں پروہنوں کو اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ لے جائے گا نا؟ دیکھ کوئی شرارت نہیں کرنا ورنہ دل جیت تیرے سے ناراض ہو جائے گا۔" وہ گھوڑے کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیمی آواز میں اس سے سرگوشیاں بھی کر رہی تھی۔ اس کی سرگوشیوں کو سن کر گھوڑے نے یوں سر ہلایا جیسے اس کی ساری بات سمجھ گیا ہو۔

"اب تسی اس دے اوپر سواری کر سکدے ہو۔ یہ دل جیت دا گھوڑا ہے۔ ہور میری ہر گل سنتا ہے۔" اس نے عجیب سے فخر کے ساتھ بتایا۔ یقیناً محبوب کے گھوڑے کا اپنا وفادار ہونا اس کے لیے باعثِ خوشی تھا۔

ان دونوں نے اس کی پیشکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً گھوڑے پر سوار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ان علاقوں میں پیدل بھٹکنے کے بجائے ایک سواری کا میسر آ جانا نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ پہلے امرت کور سوار ہوئی۔ اس کے بعد وہ دونوں بھی گھوڑے کی پشت پر بیٹھ گئے۔ وہ بڑی اچھی نسل کا طاقتور گھوڑا تھا جس نے آسانی سے ان تینوں کا وزن سہار لیا اور امرت کے اشارے پر یک رفتاری سے آگے بڑھا۔ گھوڑے پر سوار ہونے سے قبل امرت نے احاطے کا پھاٹک کھول دیا تھا چنانچہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے۔ گھوڑے کی باگیں فی الحال امرت کے ہاتھوں میں تھیں اور وہ بڑی مہارت اور تیزی سے اسے آگے بڑھا رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ گھوڑا اس سے یونہی مانوس نہیں ہے بلکہ وہ باقاعدگی سے اس کی پشت پر سواری کرتی رہی ہے۔

گھوڑے پر شہر یار عین اس کے پیچھے بیٹھا تھا [illegible] اس کے گداز جسم کی گرمی اسے اچھی طرح محسوس ہو [illegible] امرت کور بڑی بھرپور عورت تھی۔ اسے سربجیت کی [illegible] افسوس ہوا کہ اگر وہ زور زبردستی سے اس کو اپنا بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا تو اسے اپنی غرت کا نشانہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ سوتیلی ماں اور بھائی سے مقدم بیٹے [illegible] اتنا بھی کافی تھا کہ امرت کور ان کی نظروں کے سامنے [illegible] [illegible] لیکن وہ عقل کا اندھا [illegible] اپنی انا [illegible]

کے ساتھ تو انسان کا بچہ بن کر رہتا۔ اس نے بڑی [illegible] کی کہ وہ انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے اس بے قصور کو [illegible] کرنا شروع کر دیا۔ پاؤں تلے دبائے جانے پر تو [illegible] بھی احتجاج کرتی ہے۔ امرت کور جیسی نڈر لڑکی کیسے یہ ظلم [illegible]۔ اس نے موقع دیکھتے ہی اپنی جان چھڑا لینے کا [illegible] فیصلہ کر لیا اور یہ سربجیت کی بدقسمتی تھی کہ شادی کے [illegible] چار دن بعد ہی اسے یہ موقع مل گیا تھا اور وہ دل [illegible] امرت کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بھی نہیں بنا سکا تھا۔

"یہاں سے تسی سیدھے چلے جانا فیروز آنے پر الٹے [illegible] ہاتھ مڑ جانا فیر اس دے اگے..." اپنی سوچوں میں گم اسے [illegible] ہی نہیں چلا اور امرت گھوڑے کو گاؤں سے باہر جانے والے راستے تک لے آئی۔ اس جگہ گھوڑا روک کر وہ ان دونوں کو راستہ سمجھانے لگی۔

"اب میں تو ادھر سے واپس جانا ہوگا۔ تہاڈے سنگ [illegible] دور گئی تو پیدل واپس گھر جانے میں مشکل ہو گی۔ بہت [illegible] بیت گیا ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں سب لوگ جاگنا شروع ہو جائیں گے۔" اپنی مجبوری بتاتے ہوئے وہ گھوڑے سے نیچے اتر گئی۔ اس بار انہوں نے اس سے کوئی [illegible] نہیں کیا۔ اس کا کہنا صحیح تھا کہ مزید ان کے ساتھ آگے جانے کی صورت میں وہ مشکل میں پڑ سکتی تھی۔ اسے کسی کے [illegible] سے پہلے گھر پہنچنا ضروری تھا۔ صبح جب سب جاگ جاتے تو اسے ان کے سامنے ایک ایسی پریشان بیوی کا کردار ادا کرنا تھا جس کا شوہر آدھی رات کو نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ جب گھر کی چھت پر سربجیت کی لاش دریافت ہوتی تو وہ [illegible] سے رو دھو کر سب کو یہ یقین دلا سکتی تھی کہ سربجیت [illegible] شراب نوشی کی لت پوری کرنے اوپر چھت پر گیا تھا اور [illegible] کیسے اور کس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ گھر کے کھلے [illegible] اور مشکی گھوڑے کا غیاب یہ یقین دلانے کے لیے [illegible] تھا کہ کوئی نامعلوم فرد یا افراد چھت کے راستے گھر میں [illegible] ہوئے تھے اور سربجیت کو ٹھکانے لگا کر اپنی راہ پر ہو [illegible]۔ [illegible] سرحد پر ہونے والی فائرنگ اور گرفتاریوں کی [illegible] بتا دیتیں کہ یہ ساری کارروائی کرنے [illegible] کون ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں امرت کور پر [illegible] کے شک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں [illegible] کے لوگ سربجیت کے قاتل سے انتقام لینے کے [illegible] سکتے تھے اور کیا نہیں، یہ بالکل الگ معاملہ تھا۔ لیکن [illegible] تو طے تھی کہ امرت نے بہت کامیابی سے اپنے ظالم [illegible] سے پیچھا چھڑا لیا ہے اور جب ممکن تھا کہ وہ اپنے محبوب

کو پانے میں بھی کامیابی حاصل کر لیتی۔

"اب تسی جاؤ، واہگرو خیر کرے گا۔" گھوڑے سے اتر کر اس نے پہلے اسے دو چار تسلی آمیز تھپکیاں دیں پھر ان دونوں سے کہتی ہوئی خود واپس پلٹ گئی۔ اس کے قدم تیز اور مضبوط تھے۔ وہ دونوں کچھ دیر وہیں کھڑے اس نڈر عورت کو دیکھتے رہے جو اندھیرے اور تنہائی سے بے نیاز بڑی بے خوفی سے واپسی کے سفر پر گامزن تھی۔ اس کی مضبوطی کو دیکھتے ہوئے اس بات پر یقین کیا جا سکتا تھا کہ قسمت نے اگر اسے اپنے محبوب دل جیت کا ساتھ عطا نہیں کیا تو اپنے دعوے کے مطابق وہ تنہا بھی زندگی کا سفر طے کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔

بہرحال، ان کے لیے تو وہ راستے میں ملنے والی ایک ایسی داستان کی طرح تھی جسے وہ زیادہ عرصے اپنی یادداشت میں محفوظ بھی نہ رکھ پاتے چنانچہ اس کے لیے مزید ٹھہرنا بیکار تھا۔ شہر یار نے اس کے نظروں سے اوجھل ہونے سے قبل ہی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کی ٹاپوں سے اٹھنے والی دھول میں کہیں گم ہو جانے والی امرت کور کو فراموش کر کے وہ دونوں ہوا ہو گئے۔ کامیابی تک پہنچنے کے لیے ابھی انہیں بہت منزلیں طے کرنی تھیں۔

☆☆☆

"صورتِ حال بہت خراب ہے سنتھیا!"

"میں جانتی ہوں سر! ہمیں ہر طرف سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔ حالات نے ایسی کروٹ لی ہے کہ ایک طرف ریاض انور جیسا اہم مہرہ ہاتھ سے نکل گیا ہے تو دوسری طرف سلو کے بارے میں کوئی حتمی خبر نہیں ہے۔ پولیس نے موقف اختیار کیا ہے کہ وہ جیل سے فرار ہونے کی کوشش میں مارا گیا ہے اور اس کی لاش ورثا کے حوالے کر دی گئی ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے ماں باپ اپنے گھر سے غائب ہیں اور ہم کسی طور یہ تصدیق نہیں کر سکے کہ آیا واقعی سلو کی لاش ان کے حوالے کی گئی تھی یا نہیں۔ البتہ ان کے غائب ہونے سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پولیس والے غلط کہہ رہے ہیں۔ سلو مرا نہیں بلکہ اب بھی انہی کی تحویل میں ہے اور شاید پولیس اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے اس کے والدین کو استعمال کر رہی ہے۔ دوسری طرف ریاض انور کی موت بھی مشکوک ہے۔ اس کے جس ملازم نے اسے آخری بار زندہ دیکھا تھا، اس کا بیان ہے کہ ریاض صاحب اسے بہت پریشان نظر آ رہے تھے اور [illegible] کثرت سے شراب پی رہے تھے۔ ان کے [illegible] سے [illegible] ملازم نے انہیں شراب نوشی سے پرہیز [illegible]

نصیحت بھی کی تھی لیکن انہوں نے اسے بری طرح جھڑک کر رکھ دیا تھا۔ ملازم کے اس بیان کو سامنے رکھا جائے تو بظاہر یہی لگتا ہے کہ ذہنی دباؤ اور کثرتِ شراب نوشی کے باعث اچانک اس کی حرکت قلب بند ہو گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے۔ ریاض کے معدے میں کثیر تعداد میں شراب کی موجودگی کا بھی پتا چلا ہے لیکن پھر بھی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا۔ میرا اپنا بھی یہی اندازہ ہے اور ریاض کی بیوی اور بیٹی نے بھی یہی بیان دیا ہے کہ وہ بہت مضبوط اعصاب کا آدمی تھا اور اس بات پر یقین کرنا مشکل ہے کہ کسی پریشانی کی وجہ سے وہ اس حد تک ذہنی دباؤ کا شکار ہو گیا ہوگا کہ اس کی حرکتِ قلب ہی بند ہو گئی۔ میں اس معاملے کو اپنی نظر سے دیکھتی ہوں تو مجھے ریاض انور کی موت بڑی مشکوک اور پُراسرار لگتی ہے۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ ریاض انور جب اپنے اغوا کے بعد واپس آیا تھا تو ایک نوجوان محسن کی حیثیت سے اس کے ساتھ چپک کر آیا تھا اور آخر وقت تک وہ اس کے ساتھ ایسے چپکا رہا تھا کہ ریاض نے ایک پل بھی اس کے بغیر نہیں گزارا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ نوجوان ریاض کی موت سے تھوڑی دیر قبل اپنے گھر والوں سے ملاقات کے بہانے وہاں سے چلا گیا تھا اور پھر نہ تو وہ واپس لوٹ کر آیا اور نہ ہی اس کا کوئی اتا پتا ملا۔ جو ڈرائیور اسے چھوڑنے گیا تھا، اس کا کہنا ہے کہ وہ کئی گھنٹوں تک اس کی واپسی کے انتظار میں اس تنگ گلی کے کونے پر کھڑا رہا جس میں گاڑی کو لے جانا ممکن نہیں تھا۔ جب بہت دیر ہو گئی اور نوجوان واپس نہیں آیا تو ڈرائیور نے بیزار ہو کر سوچا کہ اس سے مل کر معلوم کر لے کہ اسے اور کتنی دیر لگے گی۔ نوجوان کس گھر میں گیا ہے، یہ تو وہ دیکھ نہیں سکا تھا چنانچہ اس کے نام اور حلیے کی بنیاد پر گلی میں آتے جاتے لوگوں سے پوچھتا رہا لیکن کسی نے بھی اس کے بتائے ہوئے نام اور حلیے کے شخص سے واقفیت کا اظہار نہیں کیا۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد ڈرائیور مایوس ہو کر واپس لوٹ گیا اور واپس کوٹھی پہنچ کر اسے پتا چلا کہ اس کا مالک اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔

"حالات دو، تھے ت جس طرح ہمارے سامنے آئے ہیں، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نوجوان کسی خفیہ ادارے کا ایجنٹ تھا اور ریاض کے اغوا کے پیچھے بھی کسی خفیہ ادارے کا ہاتھ تھا جس نے اپنے ایجنٹ کو ریاض کے ساتھ نتھی کر کے اس کی رہائش گاہ پہنچا دیا۔ اس نوجوان نے اپنے قیام کے دوران کیا معلومات حاصل کیں، یہ کہنا تو مشکل ہے البتہ میں یقین سے اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ ریاض کی موت کا ذمے دار وہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایسے کیمیکلز اور ادویات کا وجود ہے جنہیں کسی مشروب یا غذا میں ملا دیا جائے تو انہیں استعمال کرنے والے کو علم ہی نہیں ہو پاتا اور وہ دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ ایسے کیمیکلز میڈیکل سائنس کو بھی دھوکا دے جاتے ہیں اور پوسٹ مارٹم کرنے والا ڈاکٹر بھی یہ اندازہ نہیں لگا پاتا کہ موت طبعی نہیں ہے، جیسا کہ ریاض انور کے کیس میں ہوا ہے اور اس کی موت کی وجہ ہارٹ فیل بیان کی گئی ہے۔ اس رپورٹ کی وجہ سے پولیس نے اس مشکوک نوجوان کی تلاش میں بھی زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی ہے اور ریاض انور کی موت کو طبعی قرار دے کر اس کی فائل بند کر دی گئی ہے۔" سنتھیا تو جیسے بھری بیٹھی تھی۔ ایک جملے کے جواب میں بولنا شروع ہوئی تو بولتی چلی گئی۔

"اٹس او کے ڈیئر! ریاض انور کی موت یا سوہا کا غیاب ہمارے مسائل نہیں ہیں۔ ان مہروں کو دا والوں نے بساط پر کھڑا کیا تھا اس لیے ان کے ہٹ جانے پر تشویش میں بھی انہی کو مبتلا ہونا چاہیے۔ تم اطمینان رکھو۔ وہ ان کی جگہ دوسرے افراد کو لے آئیں گے اور ہمارا کام چلتا رہے گا۔ تم ہمیشہ کی طرح بس پوری دلجمعی سے اپنے حصے کا کام کرتی رہو۔ رہی حالات کی خرابی کی بات تو میں کچھ دوسرے معاملات کی وجہ سے پریشان ہوں۔ بلتستان میں ہمارا قائم کردہ سیٹ اپ تقریباً تباہ ہو کر رہ گیا ہے اور بہت کم مدت میں ہم نے وہاں دوسرا بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ وہاں کے پہاڑوں میں موجود ہمارے خفیہ تربیتی کیمپ کی تباہی تو ایک ناقابلِ تلافی نقصان تھی ہی لیکن اب ایک اور بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ گلگت میں ہمارا ایک بندہ بشیر اکبر کے نام سے برسوں سے اپنے مشن پر کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنے مقاصد میں خاصی کامیابی حاصل کر لی تھی اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی مٹھی میں کر چکا تھا۔ اس کے بعض ساتھی تو اس پر یوں اپنی جان چھڑکتے تھے کہ اس کے حکم پر بلا تامل اندھے کنوئیں میں بھی چھلانگ لگا سکتے تھے۔ لیکن اچانک ہی بشیر اکبر غائب ہو گیا ہے اور حالات بتاتے ہیں کہ اب اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ کسی خفیہ ایجنسی کے ہاتھ لگ گیا ہے۔" وہ سنتھیا کو تفصیل سے ساری صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

"ویری بیڈ، یہ تو واقعی بہت بڑا نقصان ہو گیا لیکن اس میں تھوڑی غلطی ہمارے پلاننگ کرنے والوں کی بھی ہے۔ تاہم اسیٹ اب صرف ایک شخص کے بل پر چلا رہا تھا اور اب اس کا نتیجہ ہے کہ اس شخص کے نہ ہونے سے سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا ہے۔" سنتھیا کے لہجے میں افسوس کے ساتھ ساتھ ملامت بھی تھی۔

"ہمیں اس کمزوری کا احساس تھا لیکن ہم اس شخص کی ضد کی وجہ سے مجبور ہو گئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ ساری کامیابی اس نے تن تنہا حاصل کی ہے۔ وہ اپنی ذہانت اور صلاحیت کے بل بوتے پر اس مقام پر پہنچا ہے کہ اب سب کچھ اس کی مٹھی میں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ تنہا ایک سیٹ اپ بنا سکتا ہے تو اسے چلا بھی سکتا ہے اور واقعی وہ چلا رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بعد کوئی اور نہیں بلکہ اس کا بیٹا اس کی جگہ لے۔ ہم اس کی ہر خواہش ماننے پر مجبور تھے کیونکہ ایک تو اس کا خاندان بہت اثر رسوخ والا ہے اور اس کے خاندان کی عظیم اسرائیل کے لیے بے پناہ قربانیاں اور خدمات ہیں۔ دوسرے وہ خود بھی اپنا آپ منوا چکا تھا اور اس کی بات سے انحراف کا مطلب اس پر بد اعتمادی تصور کی جاتی لیکن اب ہم بہت بڑی مشکل میں ہیں کہ کس طرح اس کا کھوج لگائیں کیونکہ اس کی تمام تر حسن نیتوں کے باوجود اس کے خاندان کا اصرار ہے کہ ہمیں اس کے اس طرح غائب ہونے کی ذمے داری قبول کرتے ہوئے اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔" اس نے سنتھیا کو اپنا مسئلہ بتایا۔

"میرے خیال میں تو اس سلسلے میں اس کے نائب سے ہی کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ وہی تو ہے جو اس کے بعد سیاہ و سفید کا مالک بنا بیٹھا ہے اور جس نے لوگوں کو باور کروایا ہے کہ بشیر اکبر اپنی مرضی سے ترکِ دنیا کر کے کہیں روپوش ہو کر عبادتِ الٰہی میں مشغول ہے۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں کسی کی طرف سے سپورٹ ملے بغیر اس نائب کی یہ ہمت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ بشیر کی جگہ لے سکتا۔ اسے کہیں نہ کہیں سے مدد ضرور مل رہا ہے۔ شاید ان خفیہ اداروں کی طرف سے جنہوں نے کسی طرح بشیر اکبر تک رسائی حاصل کر کے اسے اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔" سنتھیا بہت تجربہ کار ایجنٹ تھی۔ اسرائیل کے مفادات کی خاطر اس نے اپنی پوری زندگی وقف کر رکھی تھی۔ اس کی دی ہوئی قربانیوں میں ترکِ وطن، ایک شہری سے شادی، را میں شمولیت کے علاوہ اپنی اکلوتی بیٹی کا عرف ماریا سے محرومی سرفہرست تھی۔ گلارا نے ڈاکٹر کے روپ میں شہریار جیسے شخص کو ایک عرصے تک خوب بیوقوف بنایا تھا۔ یہاں تک کہ ایک سازش کے نتیجے میں شہریار کی بیوی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی لیکن پھر شہریار کی ... سے اس کا ... فاش ہو گیا اور وہ کرنل توحید و ... موت کے گھاٹ اتارنے کے چکر میں خود ماری گئی۔ سنتھیا کو اپنی اکلوتی بیٹی کے مرنے کا بہت دکھ تھا اور وہ تنظیم کے بڑوں کی طرف سے تل ابیب واپس چلے جانے کی پُرکشش پیشکش کے باوجود صرف بیٹی کی موت کا انتقام لینے کے لیے یہاں رکی ہوئی تھی۔ اس جیسی منجھی ہوئی ایجنٹ نے اگر حالات جان کر چند درست اندازے لگا لیے تھے تو یہ اتنے زیادہ تعجب کی بات نہیں تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہم بھی انہی خطوط پر سوچ رہے ہیں لیکن فی الحال اپنے کسی بندے کو اس کے پیچھے نہیں لگا سکتے۔ ہمیں شک بلکہ یقین ہے کہ اس بندے کی خفیہ نگرانی کی جا رہی ہوگی اس لیے ہم اپنے کسی آدمی کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔" ڈیوڈ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی۔

"اس کے لیے میری خدمات حاصل ہیں نا... جو زہر سے نہ مارا جا سکے، اسے گڑ سے مارنے کا انتظام میرے پاس ہوتا ہے۔ عورت... خوب صورت عورت دنیا کا ایسا خطرناک ہتھیار ہے جسے جہاں چاہو چلا سکتے ہیں۔ میرے پاس چند بڑی اچھی تربیت یافتہ لڑکیاں ہیں۔ ان لڑکیوں میں سے کسی ایک کو میں اس نائب کے بچے کے پیچھے لگا دوں گی پھر دیکھنا کمال کہ کیسے ساری معلومات حاصل ہوتی ہیں۔" اس نے نہایت یقین سے دعویٰ کیا۔

"تھینک یو سوچ سنتھیا! اگر ایسا ہو گیا تو سمجھو یہ بہت بڑا کام ہوگا۔" جذبات میں ڈیوڈ نے فون پر ہی اسے چوم لیا۔ وہ اس حرکت پر زور سے ہنسی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "یہاں حالات میں جو خرابی ہو رہی ہے، اس کے پیچھے کسی ایک خفیہ ایجنسی کا ہاتھ لگتا ہے جس کے وجود سے ہم واقف نہیں ہیں۔ البتہ مجھے شک ہے کہ کرنل توحید کا اس ایجنسی سے گہرا تعلق ہے۔ پہلے تو میں انتقام لینے کے چکر میں اس شخص کو بھسم کر دینا چاہتی تھی لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ اسے زندہ پکڑ کر اس سے اہم معلومات کا حصول ضروری ہے۔ تم کسی طرح یہ پتا لگانے کی کوشش کرو کہ وہ کہاں ہے پھر میں اس کا بھی کوئی علاج سوچتی ہوں۔"

"او کے، میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم جب تک اپنی پلاننگ پر توجہ دو۔" ڈیوڈ نے اسے جواب دے کر فون بند کر دیا تو اس نے بھی ریسیور واپس رکھ دیا لیکن کچھ ایسے انداز میں کہ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور وہ چشمِ تصور سے اپنی بیٹی کے قاتلوں کو ان کے انجام تک پہنچتے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

"عرس کی تیاریاں کیسی چل رہی ہیں اللہ رکھا؟" اپنے پسندیدہ تخت پر گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھے چودھری نے حقے کی نے منہ سے ہٹاتے ہوئے منشی سے پوچھا۔

"سب کام تسلی بخش طریقے سے ہو رہے ہیں سرکار! مزار میں جو چند چھوٹے موٹے مرمت کے کام تھے، وہ ہو چکے ہیں۔ صفائی ستھرائی بھی خوب ہو رہی ہے اور سجاوٹ کا سارا سامان بھی آ گیا ہے۔ اس بار میں نے شہر سے خصوصی لائٹیں بھی منگوائی ہیں۔ ان لائٹوں کو مرکزی ہال میں لگایا جائے گا۔ آپ دیکھیے گا کہ ان لائٹوں کو لگانے سے ہال کا ماحول کتنا پُراثر اور نورانی سا لگنے لگے گا۔ باقی عطر اور دیگر خوشبویات عرس سے ایک دن پہلے ہی سارے مزار پر چھڑکی جائیں گی تاکہ عرس والے دن ان کا اثر باقی رہے۔ میں نے اس بار ایک خصوصی انتظام یہ بھی کیا ہے کہ جس پانی سے پیر صاحب کی قبر مبارک کو غسل دیا جائے گا، اس میں بھی کچھ خوشبوئیں ملا دی جائیں گی تاکہ جب بعد میں عقیدت مندوں میں اس پانی کو تبرک کے طور پر بانٹا جائے تو ان پر دھاک بیٹھ سکے۔ قبر پر چڑھائی جانے والی چادر کے سلسلے میں تو پہلے ہی اللہ آباد کے چودھری سے معاملہ طے ہو گیا تھا۔ چڑھاوے کی چادر اس کی طرف سے آئے گی۔" منشی نے فوراً اسے تفصیلی رپورٹ دی جس میں چودھری کے لیے سب سے اطمینان بخش اطلاع چڑھاوے کی چادر کے حوالے سے ہی تھی۔ قبر پر ہر سال چڑھائی جانے والی یہ چادر بہت خاص ہوتی تھی۔ اس کے لیے سبز رنگ کا نہایت قیمتی کپڑا استعمال کیا جاتا تھا اور اس کپڑے پر سونے کے تاروں سے مختلف آیات اور کلمات لکھے جاتے تھے۔ جب سے عرس کا سلسلہ شروع ہوا تھا، یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ چڑھاوے کی یہ چادر مختلف گاؤں دیہاتوں سے بطور تحفہ لائی جاتی تھی۔ بعض جگہ سے اسے واقعی عقیدتاً لایا جاتا تھا اور بعض کو چودھری کے اثر و رسوخ سے مجبور ہو کر لانا پڑتی تھی۔ بظاہر یہ چادر کسی بھی گاؤں کے چودھری یا سردار کی طرف سے تحفے میں آتی تھی لیکن ایک سچ یہ بھی تھا کہ عموماً کوئی بھی چودھری یا سردار اسے اپنے ذاتی خرچ پر تیار نہیں کرواتا تھا بلکہ اس کے لیے اپنی رعایا پر بوجھ ڈال کر ان سے زبردستی کے چندے کرتا تھا۔ چودھری انتظار اس حقیقت سے آگاہ تھا لیکن اس کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسے بس چڑھاوے کی چادر سے غرض تھی، چاہے کوئی سردار اسے اپنے ذاتی خرچ پر بنواتا یا اس کے لیے اپنے مزارعوں اور کسیوں کا خون چوستا۔ ہر سال موصول ہونے والی اس چادر کی وجہ سے ایک طرف عرس کی شان بڑھ جاتی تو دوسری طرف بھاری مالی منفعت بھی ہوتی۔ عرس پر عقیدت مندوں کی طرف سے نذرانے کے طور پر دی جانے والی رقوم اور سونے چاندی کے زیورات کا حصہ الگ تھا۔ عرس پر ہونے والے بھاری اخراجات نکال کر بھی ان چڑھاووں سے اسے ٹھیک ٹھاک مالی فائدہ ہوتا تھا۔ اس موقع پر مختلف علاقوں سے بلائے گئے اعلیٰ عہدے داروں اور با حیثیت مہمانوں کی موجودگی ایک اور ضمنی فائدہ تھا۔ وہ لوگ جہاں چودھری کی شان دیکھ کر اس سے متاثر ہوتے تھے، وہیں چودھری کو اعلیٰ حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے میں مدد ملتی تھی۔ یعنی عرس ہر طرح سے اس کے لیے ایک اہم موقع ہوتا تھا اس لیے وہ اپنی تمام تر الجھنوں اور مصروفیات کے باوجود اس پر خصوصی توجہ دیتا تھا اور سب سے زیادہ شامت منشی کی آتی تھی جسے وقتاً فوقتاً اس طرح کی رپورٹس پیش کرنی پڑتی تھیں جیسی اس نے ابھی پیش کی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ تُو جو مناسب سمجھ کرتا رہ۔ میں نے تجھے سب سیاہ سفید کا مالک بنا دیا ہے، پر کہیں کمی رہ گئی تو جان لے کہ میں کھال بھی تیری ہی کھینچوں گا۔" منشی کے انتظامات کو سن کر خاصا اطمینان محسوس کرنے کے باوجود وہ اس کو دھمکانا نہیں بھولا تھا۔

"کوئی کوتاہی ہوگی تو میں سزا پانے میں اُف بھی نہیں کروں گا لیکن آپ اطمینان رکھیں کہ میں کہیں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔" منشی نے فوراً ہاتھ جوڑ کر عاجزی و انکساری کا اظہار کیا۔ اس کا چودھری سے برسوں کا ساتھ تھا اس لیے وہ اس کے مزاج کو خوب سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ اسے کس موقع پر کس طرح ہینڈل کرنا ہے۔

"چل ٹھیک ہے، اب تُو ایسا کر کہ ڈرائیور سے کہہ جیپ تیار کر دے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر آج میرا جنگل کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔ بہت دن ہوئے ادھر کا چکر لگا کر کام کا جائزہ نہیں لیا۔" اس نے ایک نیا حکم جاری کیا اور دوبارہ کش لگانے لگا۔ دنیا کی بیش قیمت شرابیں، سگار اور پائپ وغیرہ استعمال کرنے کے باوجود اس ... اہمیت بھی کم نہیں ہوئی تھی اور وہ جب بھی حویلی میں موجود ہوتا تھا، صبح نہار منہ حقے کے چند کش ضرور لیتا تھا۔

"جو حکم سرکار! میں ابھی جیپ ... تیار ... ہوں پر، ... یاد دلا دوں کہ آج آپ کے حکم سے ... ... کی ... ... کے کھانے کی دعوت ... ... منشی نے ... اسے یاد دلایا۔

"وہ ٹھیک ہے یار! میں نے کون سا باورچی خانے میں کھڑے ہو کر اپنی نگرانی میں اس کے لیے کھانے بنوانے ہیں۔ شام سے پہلے واپس آ جاؤں گا تو فیر رات میں اس کے ساتھ وہ بھی کھا لوں گا بلکہ اگر جنگل میں کوئی ہرن شرن ہاتھ آ گیا تو وہ بھی اسے سی کی دعوت میں اس کے سامنے رکھ دیں گے۔" چودھری نے بے پروائی سے جواب دیا تو منشی ... تائید کرتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ چودھری ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد جب تیار ہو کر باہر نکلا تو حسبِ توقع جیپ تیار تھی۔ جیپ کے ساتھ ڈرائیور کے علاوہ دو مسلح بندے مزید تیار تھے جو فی الحال اس کے باڈی گارڈز کے فرائض انجام دیتے۔ البتہ اگر اس کا شکار کا موڈ بن جاتا تو یہ دونوں اس میں بھی اس کا بھرپور ساتھ دے سکتے تھے۔ بہرحال، اس وقت وہ چونکہ باقاعدہ شکار کے لیے نہیں جا رہا تھا اس لیے اس کے ساتھ زیادہ ساز و سامان اور بکھیڑ بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے طور پر بس افیون کے کھیتوں کا ایک جائزہ لینا چاہتا تھا تاکہ خود بھی حالات سے باخبر رہے اور اگر اوپر والوں میں سے کوئی رپورٹ طلب کرے تو اسے بھی قابلِ اطمینان جواب دے سکے۔ ڈرائیور اس کی منزل سے واقف تھا چنانچہ جنگل میں داخل ہونے کے بعد اسے چودھری سے سوال کرنے کی ضرورت پڑی اور نہ ہی وہ خود اِدھر اُدھر بھٹکا اور سیدھا جنگل کے اس حصے کی طرف جیپ بڑھاتا چلا گیا جس طرف افیون کے کھیت تھے۔

یہ کھیت جنگل کے ایسے حصے میں بنائے گئے تھے جہاں جنگل بہت گھنا اور تاریک ہو جاتا تھا اور عام لوگ اس طرف کا رخ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ گھنے درختوں اور پودوں کے بیچ سے گزرنے کے بعد انہیں کیسی انہونی دنیا دیکھنے کو ملے گی۔ افیون کے یہ کھیت اتنی ہوشیاری سے تیار کیے گئے تھے کہ فضائی جائزہ لینے پر بھی نظر میں نہیں آ سکتے تھے۔ یہاں کام کرنے والے لوگ بھی مخصوص تھے اور ان میں سے کسی کو بھی اب تک چھٹی نہیں دی گئی تھی۔ خود اپنی مرضی سے کسی کے کہیں جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ کڑی نگرانی کا انتظام تھا اور چھپ کر وہاں سے نکلنے کی خواہش رکھنے والا دوسری دنیا تو جا سکتا تھا، اپنے گھر نہیں۔

"اپنی جیپ وہیں روک لو ورنہ اسے تباہ کر دیا جائے گا۔" مخصوص راستے پر بڑی احتیاط سے چلتی جیپ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی کہ کسی نے بلند آواز میں انہیں تنبیہ کی۔ اس آواز کو سن کر وہ سب چونک گئے اور ڈرائیور نے

غیر ارادی طور پر بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ جیپ کے رکتے ہی چودھری کے دونوں مسلح نمک خوار اچھل کر جیپ سے اترے اور اپنی رائفلز کو سنبھال کر اپنے اردگرد کا جائزہ لینے لگے جیسے بولنے والے کے نظر میں آتے ہی اسے گولی سے اڑا دیں گے۔ لیکن وہاں کوئی ہوتا تو دکھائی دیتا۔ وہ بس ادھر اُدھر نظر گھما کر ہی رہ گئے۔

"تم لوگ اور تمہاری جیپ ہمارے نشانے پر ہے۔ اگر تم نے حکم کی تعمیل نہیں کی تو نتائج کی ذمے داری تمہارے اپنے اوپر ہو گی۔" وہی نامعلوم سمت سے سنائی دیتی آواز ایک بار پھر گونجی۔ چودھری اور اس کے نمک خوار حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ جنگل کے اس حصے میں وہ ہمیشہ آزادانہ آتے جاتے رہے تھے۔ یہاں درختوں میں چھپے ہوئے پہرے دار ضرور موجود ہوتے تھے لیکن وہ سب چودھری کے اپنے آدمی تھے اور اس کی جیپ اور آدمیوں کو بخوبی پہچانتے تھے۔ پھر یہ کون پیدا ہو گیا تھا جو ان کی راہ میں رکاوٹ ڈال رہا تھا؟ حیرانی اور غصے میں جلتا چودھری کو یکایک یاد آیا کہ لنڈا نے اس سے جنگل کے اس حصے میں خصوصی سیکیورٹی کے انتظامات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہاں کوئی جدید تکنیک استعمال کی گئی ہے اور یقیناً یہ اس سسٹم کی نگرانی کرنے والا بندہ تھا جو اسکرین پر ان لوگوں کو دیکھ کر احکامات جاری کر رہا تھا۔ اس شخص کے لیے چودھری، اس کی جیپ اور آدمی سب اجنبی رہے ہوں گے اسی لیے اس نے انہیں روکنے کی جسارت کی تھی۔

"اس کو بتاؤ کہ تم چودھری افتخار عالم شاہ کے کارندے ہو اور چودھری صاحب خود جیپ میں موجود ہیں۔" خیال ذہن میں آتے ہی چودھری نے ڈرائیور سے کہا تو وہ لپک کر جیپ سے اترا اور بلند آواز میں چودھری کے الفاظ دہرائے۔

"اس کے باوجود میں تمہیں آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جو نئے رولز بنائے گئے ہیں اس کے مطابق چودھری صاحب کو بھی یہاں آنے سے پہلے اوپر سے اجازت لینی ہو گی۔ اگر اوپر والے پیشگی مجھے چودھری صاحب کے آنے کی اطلاع دیں گے تو میں انہیں آنے کی اجازت دوں گا، ورنہ انہیں مایوس لوٹنا پڑے گا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں ڈرائیور کی بات کا جواب دیا تو چودھری کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ بلند آواز میں اپنے آدمیوں سے بولا۔

"تم تینوں جیپ میں آ کر بیٹھو اور آگے چلو۔ میں دیکھتا ہوں کہ کون [illegible] ہمارا راستہ روکتا ہے؟" اس کا حکم سنتے ہی ڈرائیور سمیت اس کے دونوں کارندے جھپٹ کر جیپ میں سوار ہو گئے۔ جیپ کا انجن ایک غراہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہوا لیکن اس سے قبل کہ جیپ آگے بڑھتی، فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ چند گولیاں جیپ کی باڈی پر بھی آ کر لگیں۔ چودھری کے کارندوں نے فوراً اپنی رائفلیں سیدھی کر لیں لیکن وہ فائر کرتے تو کس پر؟ وہاں نہ بولنے والا نظر آتا تھا اور نہ ہی فائر کرنے والا۔ جواباً بس وہ ہوائی فائرنگ ہی کر سکے۔

"فضول میں اپنی گولیاں ضائع نہ کرو۔ تم ہوا میں فائر کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے جبکہ تم میں سے ہر ایک میرے نشانے پر ہے۔ میں چاہوں تو اپنی انگلی کی معمولی سی جنبش سے جیپ میں موجود ہر شخص کی کھوپڑی اڑا سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ چودھری صاحب ہمارے دشمن نہیں بلکہ ہمارے ساتھی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک ساتھی کی حیثیت سے وہ تنظیم کے اصول و قواعد کی پابندی کریں گے۔ ان کی طرح میں بھی تنظیم کا ایک کارکن ہوں اور جو ذمے داریاں مجھے سونپی گئی ہیں، ان پر عمل کرنے کا پابند۔ ابھی آپ لوگ اجازت کے بغیر آئے ہیں اس لیے میں آپ کو خوش آمدید نہیں کہہ سکتا۔ اگلی بار اجازت لے کر آئیے تو دیکھیے گا آپ کا یہاں کیسے استقبال ہوتا ہے۔ میں خود آپ سے اپنے آج کے رویے کے لیے معافی مانگوں گا۔ امید ہے کہ میری مجبوری آپ کی سمجھ میں آ گئی ہو گی اور اب آپ لوگ بغیر کسی مزاحمت کے یہاں سے واپس چلے جائیں گے۔"

فائرنگ کی آواز بند ہوئی تو فضا میں ایک بار پھر اس نادیدہ شخص کی آواز گونج رہی تھی۔ ابتدا میں اس کا لہجہ جارحانہ تھا لیکن پھر بتدریج اس کے انداز میں نرمی آتی چلی گئی۔ چودھری جو غصے سے کھول رہا تھا، اس کی باتیں سن کر سمجھ گیا کہ وہ کسی صورت اسے اپنی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گا اور اگر اس نے زبردستی ضد کی تو نتیجے میں ناکامی اور رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اندر ہی اندر شدید ذلت محسوس کرتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو جیپ واپس موڑنے کا حکم دیا۔ یہاں آنے سے قبل اس کا موڈ تھا کہ وہ یہیں کچھ وقت شکار میں بھی گزارے گا لیکن موجودہ [illegible] نے اس کے موڈ کا بیڑا غرق کر دیا تھا اس لیے وہ [illegible] جنگل سے نکل گئے۔

واپسی کے سفر میں وہ بدلے ہوئے حالات پر غور [illegible] رہا۔ یہ ٹھیک تھا کہ [illegible] لوگوں کے ساتھ شمولیت اختیار [illegible] کے بعد اسے بہت سے فائدے حاصل ہو رہے تھے لیکن یہ بات بھی حقیقت تھی کہ [illegible] ہی وہ لوگ اس کے ساتھ زبردستی سے کام لے رہے تھے۔ وہ جو منوانا چاہتے تھے، کسی بھی طور منوا لیتے تھے اور اس جیسے گھمنڈی کو اس کے بے بس ہونے کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، وہ اس گفتگو کا ردعمل ہے جو اس نے لنڈا سے فون پر کی تھی۔ لنڈا نے اسے پوری طرح بتا دیا تھا کہ یہ اس کی غلط فہمی ہے کہ جنگل میں موجود پوست کے خفیہ کھیتوں پر اس کے آدمیوں کے کام کرنے کی وجہ سے اسے وہاں کل اختیارات حاصل ہیں اور وہ جب چاہے تنظیم کو مال کی سپلائی روک سکتا ہے۔ آج اسے اس کی بے اختیاری کا عملی تجربہ بھی کروا دیا گیا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ سارے انتظامات اس عرصے میں کیے گئے ہیں جب وہ پیرس، بادشاہی دور نیو یارک اور پھر دبئی میں موجیں کرتا پھر رہا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ یہ سب کچھ القا کی ایما پر کیا گیا ہو گا کیونکہ ماضی میں اس کی القا سے براہِ راست بھی ایک دو جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ القا تنظیم کا بااختیار عہدے دار تھا۔ اس نے یہ بھانپ لیا ہو گا کہ چودھری بغاوت پر اتر آیا تو ان کے لیے سب سے بڑی مشکل یہی کھڑی کرے گا کہ ان کے کثیر سرمائے سے تیار کردہ افیون کے کھیتوں تک ان کی رسائی نہ ہونے دے۔ چنانچہ اس نے ایسے انتظامات کر دیے کہ کھیتوں میں کام اور پہرے داری بے شک چودھری کے کارندے کرتے رہیں لیکن کنٹرول اس کے اپنے بھروسے کے آدمیوں کا ہو۔ وہ جدید ٹیکنالوجی سے لیس تنظیم کا کرتا دھرتا تھا چنانچہ اس کے لیے کچھ مشکل نہیں رہا ہو گا کہ نگرانی کے لیے آلات اور کمپیوٹرائزڈ ہتھیار کھیتوں کے اردگرد کے علاقے میں نصب کر دے۔ اس کام کے لیے زیادہ افرادی قوت کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ بس دو آدمی کافی ہوتے جو وقت کی تقسیم کر کے باری باری ڈیوٹی دے سکتے تھے۔ ان آدمیوں کو کچھ خاص محنت بھی نہیں کرنی پڑتی ہو [illegible] مانیٹر پر نظر ٹکائے جنگل کے مختلف ویوز دیکھتے رہتے [illegible] جیسے کہ آج انہیں دیکھ لیا گیا تھا اور پھر حساس [illegible] کی حدود میں داخل ہونے سے قبل ہی رک جانے کی [illegible]۔ ان پر جس گن سے گولیاں برسائی [illegible] گئی تھیں، وہ یقیناً کسی مناسب مقام پر پوشیدہ تھی جسے مانیٹر [illegible] اسکرین پر دیکھتا شخص ایک آدھ بٹن دبا کر اپنی مرضی سے [illegible] چلانے پر قادر ہو گا۔ عملی مظاہرہ اس نے چودھری اور [illegible] کے کارندوں کو کر کے دکھا دیا تھا۔ چودھری سکی کے [illegible] شدید احساس کے ساتھ حویلی پہنچا اور پہنچتے ہی منشی اللہ [illegible]

"تجھے معلوم ہے منشی کے جنگل میں ہمارے پہرے دار کارندوں کے علاوہ کوئی اور بھی سیکیورٹی سسٹم کام کر رہا ہے؟" اس کا لہجہ غضب ناک تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"معلوم ہے سرکار! آپ کے حکم سے میں نے ہی تو سسٹم لگانے والوں کی پوری پوری مدد کی تھی۔" منشی اس کے غصے کی وجہ نہیں سمجھ پا رہا تھا تاہم بے حد احتیاط اور احترام سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"کیا بکواس کر رہا ہے؟ میں نے کب تجھے ایسا کوئی حکم دیا تھا؟" چودھری دہاڑا۔

"میرے پاس ثبوت ہے سرکار! جو لوگ کام کے لیے آئے تھے انہوں نے مجھے آپ کا لکھا خط دیا تھا۔" منشی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے عاجزی سے جواب دیا۔

"میں نے تجھے ایسا کوئی خط نہیں لکھا۔ جا مجھے وہ خط لا کر دکھا۔" اب چودھری خود بھی الجھ گیا تھا اس لیے پہلے سے ذرا کم والیوم میں دہاڑ کر حکم دیا۔ منشی تعمیل حکم کے لیے فوراً دوڑا اور چند منٹوں میں ہی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ خط اسے لا تھمایا۔ چودھری نے لفافہ کھول کر اندر موجود تہ شدہ کاغذ نکالا اور لمحہ بھر کے لیے خود بھی حق دق رہ گیا۔ کاغذ پر جو تحریر موجود تھی وہ سو فیصد اس کی ہینڈ رائٹنگ میں تھی اور آخر میں اس کے دستخط بھی موجود تھے۔ ہینڈ رائٹنگ اور دستخط کی اتنی کامل نقل کی گئی تھی کہ کچھ دیر کے لیے اسے بھی یہی شک گزرا کہ شاید خود اسی نے منشی کو یہ خط لکھا ہے۔ حیرت اور بے یقینی کے عالم میں وہ اس خط کو پڑھنے لگا۔ اس خط میں واقعی منشی کو یہ احکامات دیے گئے تھے کہ وہ آنے والی ٹیم سے بھرپور تعاون کرے اور انہیں کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دے۔ آخر میں اسے یہ بھی تنبیہ کی گئی تھی کہ اس سارے معاملے کو فون پر ڈسکس نہ کرے کیونکہ فون کال ٹریس ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ منشی بے چارہ واقعی بے قصور تھا اور اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ اس کا حکم سمجھ کر کیا تھا۔

"ٹھیک ہے، تیرا معاملہ تو مجھے سمجھ آ گیا پر یہ بتا کہ [illegible] انتظامیہ کیسے بے خبر رہی؟ سسٹم لگانے کے لیے اچھے خاصے بندے اور آلات یہاں تک [illegible] گئے ہوں گے تو کیا کسی نے [illegible] کچھ نہیں پوچھا؟"

"پوچھتے کیسے سرکار! سارا مال اور بندے اس کنٹینر میں آئے تھے جو پھل لے کر لاہور گیا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ واپس آنے والے ٹرکوں اور کنٹینروں کی اس طرح چیکنگ

نہیں ہوتی جیسی یہاں سے جاتے وقت کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اسے ہی شہریار کے حادثے کا شکار ہونے کے بعد کئی دنوں تک ضلع کا کوئی پرسان حال ہی نہیں تھا۔ شہریار کی سختی کی وجہ سے اس کا عملہ اور پولیس والے چوکس رہتے تھے۔ وہ نہیں تھا تو سب کو چھوٹ ملی ہوئی تھی اس لیے بھی کام بہت آرام سے ہو گیا۔'' منشی نے اسے جواب دیا اور پھر کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے سرکار؟ آپ کے انداز سے تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے آپ اس سارے معاملے سے لاعلم ہوں۔''

''تم ٹھیک سمجھے منشی!'' منشی کے سامنے اس نے اعتراف کیا۔ ''یہ سارا گیم بہت اوپر سے کھیلا گیا ہے۔ میں نے جن لوگوں کے ساتھ یہ نیا بزنس شروع کیا ہے، وہ بلا کے خطرناک اور چالاک ہیں۔ انہوں نے کب میری تحریر کا نمونہ حاصل کیا اور کیسے میرے دستخط ان تک پہنچے، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ تم ان کی ہوشیاری کا اندازہ اس بات سے لگالو کہ انہوں نے وقت سے بہت پہلے ہی اپنا سارا ہوم ورک مکمل کر رکھا تھا اور جیسے ہی انہیں لگا کہ یہ کام کر گزرنے کے لیے مناسب وقت آ گیا ہے، وہ اپنا کام دکھا گئے۔ شہریار کے ہی کرسی پر موجود ہونے کی صورت میں وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی شریک راز بنانا گوارا نہیں کیا کہ کہیں علاقے کے حکمراں کی حیثیت سے میں ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا نہ شروع کر دوں۔ بہت بڑا دھوکا دیا ہے ان خبیثوں نے مجھے... لیکن تم دیکھنا، ایک دن میں انہیں اس کا جواب دے کر رہوں گا۔'' وہ غصے کا اظہار کر رہا تھا لیکن چہرے پر ایسی بے بسی تھی جو پہلے کبھی منشی نے نہیں دیکھی تھی۔ اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے وہ یہ پوچھنے کی جسارت بھی نہیں کر سکا تھا کہ آخر ماجرا کیا پیش آیا تھا۔

''آپ زیادہ ٹینشن نہ لیں سرکار! آپ کا ساتھ دینے کے لیے ہم موجود ہیں نا۔ وقت پڑنے پر آپ ذرا سا اشارہ کر کے دیکھیے گا، آپ کے جاں نثار آپ کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔'' جو کچھ پیش آیا اس کی سن گن وہ ان آدمیوں سے بھی لے سکتا تھا جو چودھری کے ساتھ جنگل گئے تھے۔ فی الحال اسے سمجھانا اور سنبھالنا زیادہ ضروری تھا۔

''مجھے میری بلڈ پریشر کی دوا دو۔ میں دوا کھا کر کچھ دیر آرام کروں گا۔'' چودھری نے مزید اس موضوع پر گفتگو کرنے کے بجائے دھیمی آواز میں منشی کو حکم دیا جس کی اس نے فوراً تعمیل کی اور دوا کے ساتھ پانی کا بھرا ہوا گلاس اس کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے [illegible] والے انداز میں بولا۔ ''یہ بہت اچھا ہوگا کہ ابھی آپ آرام کریں۔ رات کے کھانے پر میں نے آپ کی طرف سے تھانے کے نئے آفیسر عمیر آفندی کو مدعو کر رکھا ہے۔ آپ آرام کر کے شام تک اس کے آنے سے پہلے تازہ دم ہو جائیں گے۔'' چودھری نے اس کی بات سنی اور خاموشی سے گولی منہ میں رکھ کر پانی کی مدد سے نگل لی۔ منشی کا مشورہ صائب تھا۔ نئے اے ایس پی سے ملاقات اہم تھی اس لیے اس کا دماغی طور پر فٹ ہونا ضروری تھا۔

دوا کھا کر وہ جو سویا تو پھر شام کی ہی خبر لایا۔ منشی نے رکھا اس دوران اس کے ساتھ جنگل جانے والے ملازمین سے معلومات حاصل کر چکا تھا چنانچہ پوری احتیاط رکھی کہ اس کی نیند میں ذرا بھی خلل پیدا نہ ہو۔ اس کے بگڑے ہوئے مزاج کے پیش نظر وہ پورا دن ایک ٹانگ پر کھڑا رہا اور عمیر کے استقبال کے انتظامات کے ساتھ ساتھ رات ہونے والی عمیر آفندی کی دعوت کے اہتمام پر بھی بذات خود نظر رکھی کہ کہیں کوئی کمی پیچھے ہی سے برہم چودھری کو مزید برافروختہ نہ کر دے۔ یہاں تک کہ اس نے اتنی احتیاط رکھی کہ جب عمیر حویلی پہنچا تو اس پر بہت زیادہ اپنائیت جتاتے ہوئے چپکے سے اس کے کان میں بھی یہ بات پھونک دی کہ آج چودھری صاحب کا مزاج کسی وجہ سے معمول پر نہیں ہے اس لیے ان سے گفتگو کرتے وقت ذرا احتیاط برتی جائے۔

عمیر اس مشورے کو سن کر اندر ہی اندر تھوڑا ضرور [illegible] لیکن تاثرات سے ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے یہ مشورہ ناگوار گزرا ہے۔ اصل میں تو اس کے لیے چودھری سے ملاقات ہی ایک ناخوشگوار عمل تھا لیکن وہ چونکہ شروع سے اس حکمت عملی پر عمل پیرا تھا کہ بے شک چلے گا اپنی راہ پر لیکن چودھری اور اس جیسے دوسرے لوگوں سے بھی بیر نہ لے گا۔ جنگل میں اپنے کزن اظفر اور اس کے ساتھیوں کی مشکوک موت کے بعد اس کے لیے اگرچہ اس بات پر عمل کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا لیکن پھر بھی اس نے بہترین نتائج کے حصول کے لیے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اسے اس ضلع میں تعینات کروانے والوں کا بھی یہی مشورہ تھا کہ کوئی واضح بات سامنے آنے سے پہلے جذبات میں آ کر کوئی قدم اٹھانے سے [illegible] کرے۔ اظفر اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ [illegible] ہونے والے فاریسٹ ڈپارٹمنٹ کے ملازم خالقو نے اپنے آخری لمحات میں جو چند الفاظ ادا کیے تھے، ان میں چودھری افیون کے الفاظ بہت واضح تھے جس سے وہ اور اس کے ساتھ دوسروں نے یہ نتیجہ تو ضرور اخذ کر لیا تھا کہ اظفر اور [illegible] کی ٹیم کی ہلاکت میں چودھری کی کسی سازش کا عمل دخل [illegible]

اور شاید منشیات کے مکروہ دھندے میں ملوث چودھری نے جنگل میں افیون کی کوئی ذخیرہ گاہ وغیرہ بنا رکھی ہے کہ وہ پہلے بھی جنگل کو اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتا رہا تھا۔ لیکن بہرحال وہ کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکال سکے تھے۔ کرنل توحید کے جس نمائندے سے اس کی اس سلسلے میں بات چیت ہوئی تھی، اس نے اسے بتایا تھا کہ آج کل وہ لوگ دیگر معاملات میں بہت زیادہ الجھے ہوئے ہیں اس لیے فوری طور پر اس معاملے پر توجہ دینے سے قاصر ہیں لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ اس معاملے کو فراموش کر سکتے ہیں کیونکہ عمیر کی اظفر سے رشتے داری اپنی جگہ لیکن اظفر اور اس کے ساتھی انہیں اس سے کہیں بڑھ کر عزیز تھے اور وہ اپنے ساتھیوں کا قتل کسی صورت معاف نہیں کر سکتے تھے۔ بے شک کچھ تاخیر ہو جائے لیکن انہیں اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو کیفرِ کردار تک ضرور پہنچانا تھا۔

اس سے یہ سب کہنے والے کے لہجے میں اتنی سچائی تھی کہ وہ اس کے بیان کو قطعی طور پر سیاسی بیان قرار نہیں دے سکا تھا اور اسے پورا یقین تھا کہ اس سے جو کہا گیا ہے، اس پر عمل بھی کیا جائے گا۔ دوسرے وہ مشابرم خان کے غیر حاضر ہونے کی وجہ سے بھی بے دست و پا تھا۔ بطور اے سی تو اسے اپنی ذمے داریاں نبھانے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں تھا کہ دفتری معاملات میں عبدالمنان جیسا مخلص اور تجربہ کار پی اے راہنمائی اور معاونت دونوں فرائض بخوبی انجام دے رہا تھا لیکن وہ جو اپنی ملازمت کے ساتھ ایک سائڈ مشن دیکھ رہا تھا، اس کے لیے مشابرم خان کی موجودگی بہت ضروری تھی۔ اسے علم تھا کہ شہریار کے ساتھ ساتھ رہنے کی وجہ سے مشابرم خان بہت سے حالات و واقعات سے نہ صرف یہ کہ بخوبی واقف ہے بلکہ مشکل حالات میں ساتھ دینے کے لیے ایک بہترین ساتھی بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے اس کا شدت سے انتظار تھا لیکن وہ بھی آ کر نہیں دے رہا تھا۔ اس کے بارے میں البتہ اسے اتنی اطلاع ضرور فراہم کر دی گئی تھی کہ ایک اہم معاملے میں الجھنے کی وجہ سے مشابرم خان مضروب ہے اور مکمل صحت یابی تک نامعلوم مدت کے لیے ڈیوٹی سے غیر حاضر رہے گا۔ اتنے سارے الجھے ہوئے معاملات کے ساتھ اس نے چودھری کی دعوت بہت بے دلی سے اور صرف مصلحتاً قبول کی تھی اور یہاں آتے ہی اسے بتایا جا رہا تھا کہ قبلہ چودھری صاحب کا مزاج ذرا برہم ہے اس لیے گفتگو میں احتیاط برتی جائے۔ اس مشورے پر اسے غصہ تو بہت آیا لیکن پھر ضبط کر گیا۔

ادھر چودھری نے منشی کے اندازے کے برخلاف خود کو کافی سنبھال لیا تھا۔ بھرپور نیند لے کر اٹھنے کے بعد اس نے سارے معاملے پر بہت ٹھنڈے دماغ سے غور کیا۔ پہلے تو اس کا خیال تھا کہ لنڈا کو فون کر کے اپنی اس بے عزتی کے لیے اس سے شکوہ کرے لیکن پھر خود ہی ارادہ تبدیل کر دیا۔ حالات نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ لنڈا اس سے محبت کے کتنے ہی دعوے کرے لیکن حقیقت میں وہ تنظیم کی وفادار تھی اور تنظیم کے مفادات کے برخلاف اسے کوئی فیور نہیں دے سکتی تھی اس لیے بہتری اسی میں تھی کہ اس بے عزتی کو خاموشی سے پی لیا جائے اور ہوشیاری سے حالات پر نظر رکھی جائے۔ یہ سچ تھا کہ وسیع اختیارات و وسائل رکھنے والی منشیات فروشوں کی اس تنظیم نے اسے وقتی طور پر زیر کر لیا تھا لیکن کوئی لمحہ ایسا بھی آ سکتا تھا جب اس کا داؤ چل جائے۔ خصوصاً افغانی بلا کو تو وہ موقع ملتے ہی موت کے گھاٹ اتار دینے کا ارادہ رکھتا تھا، البتہ اس موقع کی تلاش میں اسے ذرا صبر کرنا پڑتا۔ صبر اور انتظار کا یہ دورانیہ اس حساب سے اس کے لیے مشکل نہیں تھا کہ مالی فوائد تو اسے اب بھی حاصل تھے اور کوئی خاص محنت کیے بغیر اس کے فارن اکاؤنٹس میں کثیر سرمائے کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے دل و دماغ کو اس نکتے پر متفق کر لینے کے بعد اس کے لیے کچھ مشکل نہیں رہا کہ وہ نئے اے سی عمیر آفندی سے خوشگوار موڈ میں ملاقات کرے چنانچہ حسبِ معمول بڑے کروفر کی تیاری کے ساتھ اس نے عمیر کا بہت خوش دلی سے استقبال کیا۔ عمیر بھی جواباً اس سے گرم جوشی سے ملا اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

"کیسے مزاج ہیں چودھری صاحب! منشی نے بتایا کہ آج آپ کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ اگر ایسا تھا تو آپ آج کا ڈنر کینسل کر سکتے تھے۔ ہم کسی اور دن اکٹھے ہو جاتے۔ ویسے بھی اب عرس کے موقع پر تو مجھے یہاں آنا ہی تھا۔"

"ارے نہیں اے سی صاحب! یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہم خود دعوت دے کر اسے کینسل کر دیتے۔ ویسے بھی میری طبیعت زیادہ خراب نہیں تھی، بس ذرا بی پی ہائی ہو گیا تھا۔ دوا کھا کر آرام کیا تو سیٹ ہو گیا۔ منشی نے [illegible] ایویں اس بات کا ذکر کیا۔ اللہ کے کرم سے میں بالکل ٹھیک ہوں اور کھلے دل سے آپ کو اس حویلی میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ رہی عرس کے موقع پر آنے کی گل تو وہ تو خیر تاں آپ [illegible] آنا ہی ہے، پر اس دعوت اور اس دعوت میں فرق ہے۔ [illegible] پر بہت مہمان آئیں گے لیکن آج کی دعوت تو خاص [illegible] آپ [illegible] ہے۔" مصافحے کے بعد عمیر کا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے وہ بڑی اپنائیت سے اسے تھامے ہوئے حویلی کے شاندار ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ عرس میں شرکت کے لیے آنے والے عام لوگ ہوں گے۔" عمیر کا خوامخواہ ہی دل چاہا کہ اس سے چھیڑ خانی کرے چنانچہ ایک ایسی بات کہہ دی کہ چودھری بوکھلا گیا۔

"نہ نہ اے سی صاحب! ایسی کوئی گل نہیں ہے۔ عرس میں جنہیں دعوت دے کر بلایا جاتا ہے، وہ سب میرے خاص دوست اور عزیز ہی ہوتے ہیں لیکن آپ کی گل الگ ہے۔ آپ اس ضلع کے کرتا دھرتا ہو اور ہم اس کے خدمت گار۔ اسی لیے ہمارا آپ کا واسطہ پڑتا رہے گا۔ یہی سوچ کر ہم نے مناسب سمجھا کہ تنہائی میں آپ سے ایک ملاقات کر لی جائے تاکہ ہم ایک دوسرے کو چنگی طرح سمجھ سکیں۔ عرس پر رش اور مصروفیات میں کھل کر ملاقات کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔"

"یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں چودھری صاحب! بس ایسے ہی ازراہِ مذاق ایک بات کہہ دی تھی۔" اس کی وضاحتیں سن کر عمیر نے اسے تسلی دی اور چودھری کو کھولنے کی خاطر بڑے دوستانہ انداز میں بولا۔

"آپ نے ہمارے اور اپنے تعلق کے حوالے سے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ ہمارا ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا رہے گا۔ بس اتنا یاد رکھیے گا کہ خدمت گار آپ نہیں ہم ہیں۔ حکومت نے ہمیں آپ لوگوں کی خدمت کے لیے ہی تو تعینات کیا ہے۔ اس لیے پلیز اگر آپ کو کہیں کوئی بھی مسئلہ ہو، مجھے ضرور بتائیے گا۔ مجھے آپ کی خدمت کر کے دلی خوشی ہو گی۔" چودھری کو بانس پر چڑھانے کے لیے وہ بھرپور عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس کے اسی رویے کے باعث چودھری کی باچھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے ہمارے بارے میں کچھ کیا تو جواب میں آپ کو بھی ہماری طرف سے مایوسی نہیں ہو گی۔" وہ اتنا پُرجوش ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر دبانے لگا۔

"ٹھیک ہے چودھری صاحب! آپ کے اس رویے کو بھی آزما کر دیکھیں گے لیکن فی الحال تو ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے، آپ اس سلسلے میں کرم فرما دیں تو آپ کی بڑی [illegible] ہو گی۔ میں آپ کو اس سلسلے میں تکلیف تو نہیں دینا [illegible] مجبوری ہے کہ مجھے بھی اوپر والوں کو رپورٹ دینی [illegible] ہے۔"

"آپ مسئلہ بتائیں کہ کیا ہے۔ میرا وعدہ ہے کہ چٹکی بجاتے میں حل کر دوں گا۔" اس کے رویے کا چودھری پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ اس سے ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار نظر آنے لگا۔

"مسئلہ گاؤں کے اسکول اور مرکزِ صحت میں لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی کا ہے۔ اسکول میں ٹیچرز نہیں ہیں اس لیے وہاں خاک اڑ رہی ہے اور مرکزِ صحت میں لیڈی ڈاکٹر نہ ہونے کی وجہ سے خواتین کی صحت کے مسائل بڑی تعداد میں سامنے آ رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ہی دو خواتین کوالیفائڈ لیڈی ڈاکٹر نہ ہونے کے باعث ڈلیوری کے دوران موت کا شکار ہوئی ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس سلسلے میں آپ کی طرف سے کچھ رکاوٹیں ہیں۔ اس لیے اسٹاف نہیں آ رہا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ یہ میڈیا کا دور ہے۔ اب بھی اے اے منشا نامی ایک کالمسٹ نے ان دونوں ایشوز کو لے کر مجھ پر خاصی لعن طعن کی ہے کہ بطور اے سی میرا فرض بنتا ہے کہ میں ان دونوں مسائل کو فوری طور پر حل کروں۔" وہ بڑی خوب صورتی سے چودھری کو گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بات سن کر چودھری ظاہری طور پر اشتعال میں آ گیا اور بولا۔

"یہ خوامخواہ مجھے بدنام کرنے کی سازش ہے۔ میں بھلا کیوں نہ چاہوں گا کہ میرے پنڈ میں تعلیم اور صحت کے مسائل حل ہوں؟ لیکن کوئی ڈھنگ سے کام کرنے والا تو ہو۔ آپ سے پہلے والے اے سی نے کہیں سے فنڈز حاصل کر کے اسکول اور مرکزِ صحت کے لیے عمارتیں تو بے شک بنوا دی تھیں لیکن افسوس کہ وہ ڈھنگ کا اسٹاف نہیں رکھ سکا۔ اسکول میں پڑھانے کے لیے وہ جانے کن اوباش لونڈے لپاڑوں کو لے آیا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ لڑکے پڑھانے سے زیادہ گاؤں کی عورتوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اپنی بہو بیٹیوں پر بری نظر کون برداشت کرتا ہے بھلا؟ مجھے صحیح سے نہیں معلوم پر سننے میں آیا تھا کہ ان چھڑے چھانٹ ٹیچروں نے کسی لڑکی کے ساتھ زیادتی کی تھی اور اس کے گھر والوں نے انتقاماً چپکے سے اس گھر میں آگ لگا دی جس میں وہ لوگ رہتے تھے۔ دونوں ہی جرائم چونکہ ثابت شدہ نہیں ہیں، اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ۔ البتہ پچھلے اے سی نے اس کیس میں خوامخواہ میری گردن پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اپنی کوشش میں تو خیر وہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور بعد میں اس نے مجھ سے مصالحت کر لی تھی۔ میں نے بھی چپ [illegible] دو۔ آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ بعد میں اے سی صاحب کی اپنی [illegible] صاحبہ اسکول میں پڑھاتی رہیں [illegible] کی بیگم مرحومہ

صحت میں لیڈی ڈاکٹر رہی۔ بعد میں جانے کیا ہوا کہ اے سی کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی یہاں سے غائب ہو گئیں۔ ان کے غائب ہونے کے بعد مجھے پتا چلا کہ وہ عیسائی ماں بیٹی میرے پنڈ کی عورتوں اور بچوں کو خراب کر رہی تھیں۔ ماں استانی بن کر مسلمان بچوں کو نہ جانے کون کون سی تعلیمات دے رہی تھی اور بیٹی ڈاکٹرنی کے روپ میں عورتوں کو الٹے سیدھے مشورے دے کر انہیں بچے پیدا کرنے سے روک رہی تھی۔

''میں اس گاؤں کا جاگیردار بھی ہوں اور روحانی پیشوا بھی۔ یہاں کچھ ہوتا ہے تو لوگ میرے پاس ہی فریاد لے کر آتے ہیں۔ گاؤں کے مردوں نے یہ معاملات میرے سامنے رکھے تو میں نے ان کے جذبات کا احساس کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کر دیا کہ اب اسکول اور مرکز صحت میں بغیر چھان پھٹک کے اسٹاف نہیں رکھا جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو ہماری طرف سے شدید مزاحمت ہو گی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اس میں غلط کیا ہے؟ کیا ہم اپنے بچوں کو تعلیم کے نتیجے میں لامذہب ہوتے اور اپنی عورتوں کو مسلمانوں کی نسل کشی میں حصہ دار بنتے دیکھتے رہیں۔ اس گاؤں کا کوئی بھی فرد اس قیمت پر تعلیم اور صحت نہیں چاہتا ہے اور میں صرف ان کی ترجمانی کرتا رہا ہوں۔'' وہ بولنے پر آیا تو جھوٹ کے انبار پر انبار لگاتے ہوئے اپنے حق میں کہانی بناتا چلا گیا جس سے عمیر متاثر تو خیر کیا ہوتا لیکن مصلحت کے تحت نرمی سے بولا۔

''آپ کا موقف بالکل ٹھیک ہے چودھری صاحب اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے علاقے کے لیے ٹیچنگ اسٹاف اور لیڈی ڈاکٹر کا تقرر کرتے ہوئے پوری احتیاط برتوں گا بلکہ آپ چاہیں تو خود بھی ان لوگوں سے مل کر اپنی تسلی کر سکتے ہیں۔ بس میری اتنی گزارش ہے کہ یہ دونوں کام ہو جانے چاہئیں کیونکہ نہ ہونے کی صورت میں میرے کیریئر پر بہت برا اثر پڑے گا۔'' اس نے جان بوجھ کر اپنے لہجے میں خوشامد کا عنصر بھی پیدا کر لیا جس نے چودھری کو خوش کر دیا۔

''ٹھیک ہے اے سی صاحب! ہم نے آپ کی یہ فرمائش پوری کی۔ اب ہم آپ کا کیریئر تو خراب نہیں کر سکتے نا پر یاد رکھیے گا کہ ہماری طرح آپ کا بھی ضرورت کے وقت ہمارے کام آنے کا وعدہ ہے۔'' فوری طور پر منظوری دیتے ہوئے اس نے اپنی رضامندی دے دی۔

''اپنی تائم چودھری صاحب! مجھے آپ کی خدمت کر کے دلی خوشی ہو گی۔'' عمیر نے خوش دلی سے جواب دیا

پھر ان کے درمیان دوسرے عمومی معاملات پر گفتگو ہونے لگی۔ اس دوران میں کھانا لگنے کی اطلاع دے دی گئی۔ بے شمار لوازمات سے سجی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر یہ دوستانہ فضا مزید رنگ جمانے لگی اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ ان کی پہلی ملاقات نہیں بلکہ وہ عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

''پرانے اے سی کے ساتھ اس کا ایک بہت چہیتا ڈرائیور ہوا کرتا تھا... کیا نام تھا اس کا؟'' گفتگو کے دوران چودھری نے اپنی مرضی کا ایک موضوع چھیڑا اور یوں بات کو ادھورا چھوڑ دیا جیسے کوشش کے باوجود نام یاد نہ آ رہا ہو۔

''مشابرم خان۔'' عمیر نے اس کی یادداشت کی بحالی کے لیے خود نام بتایا۔

''ہاں ہاں، بالکل یہی مشابرم خان۔ کیا وہ اب بھی موجود ہے؟'' چودھری بہترین اداکاری کر رہا تھا۔

''جی ہاں، ظاہر ہے۔ پرانے اے سی کے نہ ہونے سے وہ اپنی گورنمنٹ جاب چھوڑ کر تو نہیں جا سکتا تھا۔ کام کر رہا ہے وہ محکمے میں۔ البتہ آج کل چھٹیوں پر اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔ اس کی والدہ کی ڈیتھ ہو گئی تھی اس سلسلے میں۔ آپ فرمائیں آپ کو اس کی یاد کیسے آ گئی؟'' بظاہر کھانے میں مگن بے نیازی سے چودھری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے عمیر کن انکھیوں سے اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''بس بڑا ہی بدتمیز قسم کا آدمی تھا۔ شہریار عادل نے اسے ضرورت سے زیادہ سر چڑھا رکھا تھا اس لیے وہ خود کو اے سی کے ڈرائیور کے بجائے اے سی سمجھنے لگا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے میرے ملازمین سے بھی الجھنے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال! میرا اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ بس آپ کو مشورہ دینا چاہتا تھا کہ ایسے بدتمیز آدمی کو زیادہ سر نہ چڑھائیں۔ سننے میں آیا تھا کہ آپ نے بھی اسے پرائیویٹ ڈرائیور برقرار رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مناسب نہیں ہو گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ اپنے لیے کوئی دوسرا ڈرائیور منتخب کر کے اسے محکمے میں کہیں اور کھپا دیں ورنہ کل کلاں کو وہ آپ کے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ آپ تو سمجھ ہی سکتے ہیں کہ کسی چھوٹے آدمی کو ایک بار اختیار کا نشہ ہو جائے تو پھر... حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ شہریار عادل کے دور میں وہ صاحب اختیار ہو گیا تھا۔ اب بھی اس کا یہ رویہ برقرار رہ سکتا ہے۔''

وہ بڑے مناسب انداز میں عمیر کو مشابرم خان کی طرف سے بھڑکانے کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ عمیر نے کسی ... اختلاف مناسب نہ سمجھا اور ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ...

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ میں نے بھی ... مواقع پر محسوس کیا تھا کہ وہ کسی معاملے میں میری ... بننے سے قبل خود ہی عملی اقدامات اٹھا لیتا ہے لیکن ... انداز کر گیا۔ اب آپ نے توجہ دلائی ہے تو اس کی ... سے ہوشیار رہوں گا اور جہاں کہیں اسے اس کی حدود ... کرتے دیکھا، گوشمالی ضرور کروں گا۔'' عمیر نے ... ب سے یہ عندیہ تو نہیں دیا تھا کہ وہ مشابرم خان کو ... سے ہٹا دے گا لیکن اس نے جس قسم کے جذبات کا ... تھا، وہ بھی تسلی بخش تھے۔ چودھری نے فی الحال اس ... کرنا ہی مناسب سمجھا اور عمیر سے دوستانہ تعلقات کو ... کرنے کے لیے مزید گرم جوشی سے اس کی خاطر ... کرنے لگا۔

☆☆☆

جاوید علی بہت اداس تھا۔ پچھلے دنوں اس نے بہت ... دوڑ کی تھی۔ اس کے کریڈٹ پر ایک نہیں کئی کارنامے ... پہلا کارنامہ اس نے یہ انجام دیا تھا کہ خواجہ سراؤں ... دو افراد کی کج روی کے شکار نواب نوازش علی کی کوٹھی ... پر قبضہ جمائے بیٹھے را کے کئی ایجنٹوں کو نہایت کامیابی سے ... کر دیا تھا۔ اس کے اس کارنامے کی وجہ سے را والے ... کئی ایجنٹوں کے ساتھ ساتھ اس ٹھکانے سے بھی محروم ہو ... گئے جہاں وہ بڑی مقدار میں اسلحہ ذخیرہ کیا کرتے ... تھے۔ ... جاوید علی اپنی زندگی کے سب سے انوکھے اور ... خوب صورت جذبے سے بھی روشناس ہوا تھا۔ اس کے مشن ... کی انجام دہی میں مدد دینے والی نواب نوازش علی کی بیٹی ... اور وہ محبت کے رشتے میں بندھ گئے تھے اور مختصر ... مدت میں ہی اس جذبے نے انہیں بڑی شدت سے گرفت ... میں لیا تھا لیکن شومئی قسمت کہ انہیں ایک دوسرے کے ... ساتھ وقت گزارنے کی مہلت نہیں ملی اور اس سے قبل ہی ... جاوید علی کو تلاش کرتے را کے غنڈوں کے ہاتھ شازمین لگ ... گئی۔ انہوں نے اس سے جاوید علی کے بارے میں حقائق ... اگلوانے کے لیے، تنا برا سلوک کیا کہ وہ نازک کلی سی لڑکی مسل ... گئی۔ شازمین کی موت جاوید علی کے لیے بہت بڑا ... صدمہ تھا اور اس صدمے کے زیر اثر وہ انتقاماً را کے ایک ... ایک کو قتل ڈالنے کی خواہش رکھتا تھا۔ یہ شاید اس کے ... دل کی گہرائی تھی کہ اس کے مواقع بھی میسر آ گئے۔ پہلے ... اسے ... سپیشل ایجنٹ عادل خان کے ... ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور انہوں نے بھارت کے ... دہشت گرد نسیم عرف سلو سے بڑی خوبی سے دو دو ہاتھ کیے۔ سلو کا قصہ ختم ہونے کے بعد عادل خان تو واپس چلا گیا لیکن وہ ریاض انور کی راہ پر لگ گیا۔ نیک نام سمجھا جانے والا یہ سیاسی لیڈر درحقیقت را کا نمک خوار تھا۔ جاوید علی نے اپنے تدبر اور حکمت عملی سے اسے بھی انجام تک پہنچا دیا لیکن کوشش کے باوجود وہ ریاض انور سے را کے مزید ایجنٹوں یا ٹھکانوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکا تھا اور اس طرح آگے کوئی راہ نظر نہ آنے کی وجہ سے آج کل بے دست و پا بیٹھا تھا۔

یہ بیکاری اور بے عملی ہی تھی جس نے بیک وقت اسے جھنجلاہٹ اور اداسی میں مبتلا کر دیا تھا۔ جب تک وہ حرکت میں تھا، اسے لگتا تھا شازمین کے قاتلوں کو انجام تک پہنچا رہا ہے۔ اب کرنے کو کچھ نہیں رہا تھا تو اس کی جدائی کا غم اور اذیت ناک موت کا خیال زیادہ ستانے لگا تھا۔ اگرچہ اسے اس کے محکمے کی طرف سے بہت سراہا گیا تھا اور کراچی سے لاہور واپس بلا کر کچھ دن کی چھٹیاں بھی دے دی گئی تھیں کہ وہ اپنی والدہ کے ساتھ کچھ وقت گزار لے۔ ماں سے وہ سنگل پیرنٹ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ہی بہت قریب رہا تھا اور اگر عام حالات میں اسے یہ چھٹیاں ملی ہوتیں تو وہ انہیں ماں کے ساتھ بہت انجوائے کرتا لیکن اب تو دل و دماغ کی یہ حالت تھی کہ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کی ماں کو اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں معلوم تھا۔ اس نے خود انہیں سب کچھ بتایا تھا اور بچوں کی طرح ان کے سینے سے لگ کر رویا بھی تھا۔ وہ خود جوانی میں بیوہ ہوئی تھیں اس لیے اس دکھ سے واقف تھیں جوان کا بیٹا جھیل رہا تھا۔ انہوں نے اس سے اس کے کسی رویے کا شکوہ نہیں کیا تھا اور اپنے طور پر اس کا دل بہلانے اور دھیان بٹانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں لیکن وہ کیا کرتا کہ اس کے دل و دماغ ایسی کسی کوشش سے بہلتے ہی نہیں تھے۔ اسے شازمین کی موت کے بعد اگر کبھی سکون محسوس ہوا تھا تو صرف ان لمحوں میں جب وہ ملک دشمنوں کے خلاف برسر پیکار رہا تھا۔ اب بھی اسے احساس ہو گیا کہ اگر وہ آرام کے نام پر ملنے والی چھٹیوں میں اس طرح گھر بیٹھا رہا تو سوچ سوچ کر پاگل ہو جائے گا۔ چنانچہ اگلے ہی لمحے اس نے سامان پیک کیا اور ماں کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ جلد وہ لاہور میں قائم سی ایف پی کے ہیڈ کوارٹر میں ذیشان کے سامنے تھا۔

''اتنی جلدی کیوں آ گئے جوان! تم نے بہت کام کیا تھا دوران چھٹیوں پر تمہارا حق تھا۔'' ذیشان نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے جتنا آرام کرنا تھا، میں نے کرلیا سر! میں نہیں سمجھتا کہ مجھے مزید آرام کی ضرورت ہے اس لیے میں واپس آگیا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں ذیشان کی بات کا جواب دیا۔

"گڈ... یہ بہت اچھی بات ہے کہ تم کام سے دل چرانے والوں میں سے نہیں ہو۔ ٹھیک ہے ڈیوٹی جوائن کرلو۔ پھر جہاں کام نکلا، تمہیں اس طرف لگا دیں گے۔" ذیشان کو بھی اس کے ساتھ پیش آنے والے حالات سے واقفیت تھی اس لیے زیادہ بحث میں پڑے بغیر اسے جوائننگ کی اجازت دے دی۔

"کام میں خود سوچ کر آیا ہوں سر! بس آغاز کے لیے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔" اس نے جمی نظروں سے اپنا مدعا بیان کیا۔

"کیسا کام...؟" ذیشان چونکا اور اسے مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"پچھلے دنوں ایک ہندو دکان دار رائے چند ہماری نظروں میں آیا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے اسپتال سے شہریار عادل کے فنگر پرنٹس اور خون وغیرہ کے نمونے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے اس شخص کی نگرانی بھی کروائی تھی لیکن یہ معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے کہ اس سے وہ نمونے کس نے حاصل کیے۔ اس وقت فیصلہ کیا گیا تھا کہ رائے چند کی نگرانی جاری رکھی جائے گی۔ میں آپ سے جاننا چاہتا ہوں کہ اس نگرانی کے کیا نتائج نکلے اور اگر آپ اجازت دیں تو میں اس بندے پر مزید کام کرکے را کے مزید ایجنٹوں کا پتا لگا سکتا ہوں۔" اس نے ذیشان کے سامنے وہ بات رکھی جو گھر سے ہی سوچ کر یہاں آیا تھا۔

"رائے چند کی نگرانی اب بھی جاری ہے لیکن یہ کام ہمارا کوئی منجھا ہوا ساتھی نہیں کررہا بلکہ سیکیورٹی ایجنسی کے مختلف اہلکاروں کو یہ ڈیوٹی سونپی جاتی ہے۔ اصل میں ابتدائی نگرانی سے کوئی خاص نتائج حاصل نہیں ہوئے تھے اس لیے بہتر یہی سمجھا گیا کہ کسی خاص بندے کو اس کام میں الجھانے کے بجائے عمومی نظر رکھی جائے جس کے لیے سیکیورٹی گارڈز سے کام چلایا جارہا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے پاس بہت زیادہ نفری نہیں ہے اس لیے ہمیں کبھی کبھی ثانوی نوعیت کے معاملات میں اس طرح بھی کام چلانا پڑتا ہے۔ ہمارے سیکیورٹی گارڈز بظاہر رائے چند کے اسٹور کے سامنے والے ریسٹورنٹ پر فرائض انجام دے رہے ہیں لیکن انہیں ہدایت ہے کہ اگر رائے چند کی دکان پر کوئی غیر معمولی بات نظر آئے تو اطلاع دیں۔ تم یہ سمجھ لو کہ فی الحال رائے چند کی اس حد تک نگرانی ہورہی ہے کہ کہیں وہ منظر سے غائب تو نہیں ہو... باقی فی الحال وہ آزاد ہی ہے۔"

ذیشان نے اسے تفصیل سے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اصل میں اب تک یہی سمجھا گیا تھا کہ رائے چند کوئی خاص ایجنٹ نہیں ہے بلکہ اسے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے درمیانی آدمی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اس لیے اس پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی جارہی تھی۔

"ٹھیک ہے تو بس آپ مجھے اجازت دے دیں۔ فی الحال ہم بالکل اندھیرے میں ہیں اس لیے کہیں نہ کہیں سے کام شروع کرنے کے لیے رائے چند بری چوائس نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسے کس حد تک نچوڑا جا سکتا ہے۔" جاوید علی کا لہجہ حتمی تھا۔ ذیشان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر اجازت دے دی۔

"اوکے ینگ مین! تم جو چاہو لیکن خیال رکھنا کہ جوش میں ہوش نہ کھونے پاؤ۔" جاوید علی کے اندر جو لاوا ابل رہا تھا، اسے بہنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ملنا ہی چاہیے تھا اس لیے اسے اجازت دینے میں ہی بہتری تھی۔ البتہ وہ ایک افسر کے طور پر اسے تنبیہ کرنا نہیں بھولا تھا۔

"ڈونٹ یو وری سر! میں خیال رکھوں گا۔" جاوید علی نے اسے یقین دلایا البتہ اس کی آنکھیں اس شکاری کی طرح چمک رہی تھیں جسے شکار کا پرمٹ مل گیا ہو۔

☆☆☆

امرت کور کے دیے گھوڑے نے ان کے لیے سفر کو آسان بنا دیا تھا۔ گھوڑا صحت مند اور پھرتیلا تھا اس لیے وہ آسانی سے بغیر رکے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس سفر کے لیے امرت کور کے دیے ہوئے مشوروں پر صرف اس حد تک عمل کیا تھا کہ اس کے گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر چلے تھے لیکن اس کے بعد انہوں نے اپنی مرضی سے سفر کے راستے کا انتخاب کیا تھا۔ راستے کی تفصیل اور اردگرد کے نقشے کے بارے میں بہت سی باتیں ان کے اپنے ذہنوں میں بھی موجود تھیں کیونکہ یہاں آنے سے پہلے انہوں نے اس سلسلے میں اچھا خاصا ہوم ورک کیا تھا۔ ... تیاری کے ساتھ آئے تھے کہ اجنبی ملک میں ... باعث پریشانی میں مبتلا نہ ہوں۔ وہ چونکہ ایک ... آئے تھے اور امید تھی کہ اس مشن کی تکمیل کے دوران خاصی الجھن پیش آئے گی اس لیے کسی قانونی راستے سے بھارت میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اس صورت میں وہ ... قانون نافذ کرنے والے اداروں کی نظر میں ...

... کی پولیس انکوائری ان کا ناک میں دم کیے رہتی۔ ... بھی ان کے لیے خطرات تو تھے۔ اگر کہیں کوئی ... نہیں گھیر لیتا تو وہ اس کی پوچھ تاچھ کے جواب میں ... کے شناختی کاغذات پیش نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ وہ ... مطلوبہ مقام تک پہنچ جاتے تو یہ مشکل حل ہوجاتی۔ آگے ... میں ایک ایسا بندہ مل جاتا جو ان کے لیے ضروری ... تیار کروا دیتا جن کی موجودگی میں ان کے لیے وقتی ... ثابت کرنا مشکل نہیں ہوتا کہ وہ بھارتی شہری ہیں ... بعد کی بات تھی۔ فی الحال تو خطرے میں ہی تھے اس ... کوشش کررہے تھے کہ سورج نکلنے سے قبل زیادہ سے ... فاصلہ طے کرلیں۔ امرت کور کے مشوروں پر بھی انہوں نے ... احتیاط کے پیشِ نظر عمل نہیں کیا تھا کہ اگر وہ کسی وجہ ... پکڑی جائے اور ان کے بارے میں سب کچھ اگل دے تو ... کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں ان کا تعاقب نہ کیا جا ... سکے۔ ان کی یہ کوشش خاصی حد تک کامیاب رہی اور سورج ... تک وہ ایک قصبے میں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔

چھوٹے علاقوں کی روایت کے مطابق وہاں صبح ... سے ہی معمولات زندگی کا آغاز ہوگیا تھا اور بازار ... وغیرہ کھلی نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے ایک چھوٹے ... سے چائے خانے کے سامنے گھوڑا روک لیا۔ دیہاتی وضع قطع ... کے جو ان کے جسم پر چونکہ سربجیت کے قیمتی کپڑے تھے ... اس لیے دیکھنے والوں کو ان کے بارے میں یہی اندازہ ہوتا ... کہ وہ کسی قریبی دیہات کے صاحب حیثیت جوان ہیں اور ... کسی خاص مقصد کے تحت اس قصبے تک آئے ہیں۔ انہوں ... نے جیسے ہی گھوڑا روک کر چائے خانے کی طرف قدم ... بڑھائے، ایک دبلا پتلا سا لڑکا فوراً الرٹ ہوگیا اور اپنے ... کندھے پر پڑے میلے سے کپڑے سے جلدی جلدی کرسیاں ... صاف کرتے ہوئے ہانک لگائی۔

"ادھر بیٹھیں صاحب جی۔" وہ دونوں خاموشی سے ... کرسیوں پر براجمان ہوگئے۔

"حکم صاحب!" لڑکا سرپرست ان کے سامنے کھڑا ہوگیا۔
"... پراٹھے، انڈے، ایک پلیٹ حلوہ اور دو دودھ ... والی چائے۔" تیمور نے مشورہ کیے بغیر آرڈر دیا۔ چائے ... خانے کے سامنے ہی دو افراد بڑے بڑے تووں پر ... پراٹھے تیار کررہے تھے اور وہیں بیٹھ کر ناشتا کرنے والوں ... کے علاوہ لوگ لفافوں میں بھی یہ اشیا خرید کرلے جارہے ... تھے۔ چائے خانے کے بالکل سامنے اس طرح کا انتظام ... تھا۔ اس طرح لوگوں کو چائے کے ساتھ ساتھ بھرپور ...

ناشتے کی بھی سہولت حاصل ہو جاتی لیکن شہریار، سلو کے آرڈر پر کچھ گھبرا سا گیا۔ اسے اس قسم کا بھاری بھرکم ناشتا کرنے کی قطعی عادت نہیں تھی اور اس کا خیال تھا کہ اس کے لیے یہ سب کھانا اوّل تو مشکل ہو گا لیکن اگر کسی طرح کھا بھی لیا تو شاید ہضم نہ کر پائے۔

"ہم جس گیٹ اپ اور جیسے علاقے میں ہیں اس کے مطابق ہی ناشتا کیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی شدید بھوک لگ رہی ہے۔ بھاگ دوڑ میں رات کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اب موقع ملا ہے تو بہتر ہے جی بھر کر کھا لیں۔" اس کے چہرے سے اس کی اندرونی کیفیات کو بھانپتے ہوئے سلو نے سرگوشی میں کہا۔ ناچار شہریار کو بھی قائل ہونا پڑا اور جب ان کی میز پر گرماگرم ناشتا چنا گیا تو اس کی خوشبو ہی اتنی اشتہا انگیز تھی کہ دل میں اس قسم کے بھاری ناشتے کے لیے ناپسندیدگی محسوس کرنے والا شہریار اپنا ہاتھ نہیں روک سکا اور ایک بار ہاتھ بڑھا تو اس نے اس وقت تک سلو کا ساتھ دیا جب تک جملہ لوازمات ختم نہ ہو گئے۔ یہ شدید بھوک کے ساتھ ساتھ ناشتے کی لذت کا بھی کمال تھا کہ وہ برسوں سے کاربند اصولوں پر سے ہٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اب وہ پہلے والا شہریار عادل کب رہا تھا۔ اس شہریار عادل کو تو اس نے خود اپنی مرضی سے ہزاروں نقابوں میں چھپا دیا تھا اور آنے والے وقت میں جانے کون کون سے اور کتنے ناموں سے اپنا تعارف کروانے والا تھا۔

"مزہ آ گیا نا ناشتا کر کے؟" سلو نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

"ہاں یار! زبردست ناشتا تھا۔" اس نے اعتراف کیا۔ ذرا دیر میں ہی سلو کے اشارے پر ان کی میز پر سے خالی برتن ہٹا کر دودھ پتی کے بڑے بڑے پیالے رکھ دیے گئے۔ ناشتے کے تجربے کے بعد شہریار کے پاس اب اعتراض کی گنجائش ہی نہیں تھی اس لیے اس نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر پیالہ تھام لیا۔ اسی وقت قریبی میز سے ایک جوان العمر شخص اٹھ کر ان کی میز کے قریب آیا اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کرنے کے بعد ساتھ بیٹھنے کی اجازت چاہی جو انہیں دینی پڑی۔

"میرا نام جگدیش ہے۔ ادھر ہی کا رہنے والا ہوں۔ قصبے کے سارے لوگ مجھے ہور میں ان کو جاندا ہوں، پر آپ لوگوں کی شکلیں میرے لیے نئی ہیں۔ کدھر سے آئے ہو آپ؟" اس کا لہجہ اگرچہ مہذبانہ تھا لیکن آنکھوں میں ایک خاص قسم کی کھوج تھی اور اس کھوجی تاثر کی وجہ سے ہی وہ اچھی خاصی شکل وصورت کا مالک ہونے کے باوجود بدمعاش طرز کا بندہ لگ رہا تھا۔

"تم نے ٹھیک پہچانا بھرا۔ ہم ادھر کے رہنے والے نہیں ہیں۔ تارا پنڈ سے آئے ہیں۔ میرا نام رمیش ہے اور یہ میرا نکا بھرا اور بندر ہے۔ ہے تو یہ میرے چاچے دا پتر پر سگا ہی سمجھو۔ آنے والے مہینے میں اس کا ویاہ ہونے والا ہے اور اپنے نکے بھرا کا ویاہ ہو اور اس میں کوئی شوشا نہ ہو، ایسے کیسے ہو سکدا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ چل تجھے دلی لے کر چلتا ہوں۔ ادھر سے ساری خریداری کرواؤں گا۔ بہت لمبا سفر ہے ہمارے پنڈ سے شہر کا۔ ہم لوگ پوری رات ہی سفر کرتے رہے ہیں۔ یہاں رکے تھے کہ بھوجن کر کے تھوڑی دیر کہیں کسی سرائے میں آرام کریں گے فیر آگے جائیں گے۔" جواب دینے کی ذمے داری شہریار نے نبھائی۔ سلو اس سے عمر میں چھوٹا تھا اس حساب سے یہ کہانی مناسب بھی لگ رہی تھی۔

"کدھر جاؤ گے خریداری کے لیے؟ اگر ہریانہ جانا ہے تو بتاؤ۔ میرا ایک یار اپنی دکان کے لیے سامان لینے ادھر جانے والا ہے۔ میں تمہیں اس کے ساتھ کر دوں گا۔" جگدیش نامی جوان کی آنکھیں اس کی بات سن کر چمکنے لگیں اور اس نے بڑی فراخ دلی سے پیشکش کی۔

"دھنیواد بھرا... پر ہمیں ہریانہ نہیں جانا۔ ہم دلی جا کر خریداری کریں گے۔ سنا ہے وہاں وڈا بڑھیا مال ملتا ہے۔" شہریار نے اس کی پیشکش رد کر دی۔ اب تک وہی اس نووارد سے گفتگو کر رہا تھا اور سلو بیچ ایسے کسی دیہاتی نوجوان کی طرح خاموش اور شرمایا ہوا بیٹھا تھا جس کی عنقریب شادی ہونے والی ہو اور وہ بڑے بھائی کی موجودگی میں اس موضوع پر گفتگو میں حصہ لینے سے ہچکچا رہا ہو۔

"کیا اس گھوڑے پر بیٹھ کر ہی دلی تک جانے کا ارادہ ہے؟ اگر ایسا خیال ہے تو سوچ لو کہ ویاہ تک مشکل سے ہی تم اپنے پنڈ واپس پہنچو گے۔" جگدیش نے تمسخرانہ لہجے میں ان کے پاس موجود سواری کی بے بضاعتی کا احساس دلایا۔

"نہ بھرا جی! دلی تک اس گھوڑے پر کیوں جائیں گے۔ ہم نے سوچا ہے کہ گھوڑا کسی بھلے آدمی کے پاس رکھوا دیں گے ہور یہاں سے لاری میں دلی تک جائیں گے۔ ادھر سے خریداری کر کے واپس آئیں گے پہلے ادھر رک کر اپنا گھوڑا لیں گے ہور فیر واپس پنڈ کو چلے جائیں گے۔"

اس کے تمسخرانہ انداز کو نظرانداز کر کے شہریار نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ... بے حد سادہ ... ہونے والا شخص پوری طرح یقین کر لے کہ وہ واقعی سادہ لوح دیہاتی ہیں جو پہلی بار اپنے پنڈ سے باہر نکلے ہیں اور انہیں زمانے کی چالبازی کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اپنی کوشش میں اسے کامیابی ہوئی اور جگدیش کی آنکھیں پہلے سے زیادہ چمکنے لگیں۔

"تم دونوں میں سے کوئی پہلے کبھی دلی گیا ہے یا نہیں؟" بظاہر اس نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

"نہ۔" شہریار نے جواب دینے کے ساتھ ساتھ زور سے نفی میں سر ہلایا اور مزید بولا۔ "اسیں پہلی واری ادھر آئے ہیں۔ اصل میں اپنے ویاہ میں تو بندے کو کوئی ہوش نہیں ہوتی۔ جو کچھ اپنے بڑوں نے کیا، اس پر صبر شکر کر لیا پر اب اپنا بھرا ہے نا۔ اس کے ویاہ میں دل کے سارے ارمان نکالنے ہیں۔" اپنی بات کے اختتام پر وہ بے ڈھنگے پن سے کسی ایسے ناآسودہ آدمی کی طرح ہنسا جسے اپنی شادی پر خاطرخواہ دھوم دھام ہونے کا قلق ہو لیکن ادب وآداب کے تقاضوں اور بڑوں کے لحاظ نے اظہار کا موقع نہ دیا ہو۔

"یہ تو وڈی چنگی گل ہے۔ لگتا ہے تم اپنے اس بھرا سے بڑا پریم کرتے ہو۔ پر بھائیوں جی! میں تم کو ایک گل صاف بتا دوں۔ ادھر دلی میں نئے آدمی کے لیے وڈی مشکل ہوتی ہے۔ دکان دار، آٹو رکشہ والے، ٹیکسی والے، ہوٹل والے سب مل کر نئے آدمی کو خوب لوٹتے ہیں۔ ادھر ویسے بھی بڑی مہنگائی ہے۔ وہاں کے بازاروں میں خریداری کے لیے تھوڑی بہت رقم سے گزارہ نہیں ہوتا۔ ٹھیک ٹھاک رقم ہو بندے کے پاس تو ادھر کا رخ کرے ورنہ جانا بیکار ہے۔"

"رقم دی کوئی گل نہیں ہے۔ یہ اپنا بھرا ہے نا اس کے ویاہ پر میں اپنی ساری کمائی لٹانے کو تیار ہوں۔" شہریار اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ چالاک آدمی اس کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اسے بے وقوف بنا کر فائدہ اٹھا سکے چنانچہ بے حد سادگی سے جواب دیا۔

"چلو ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی ورنہ میں نے تو سوچا تھا ... میں تمہارے ساتھ دلی چلوں گا۔ میرا ادھر ... جانا ہوا ہے۔ ہور میں خیال تو ں چاندنی چوک ... کو چنگی طرح جاندا ہوں پر جب تمہیں اپنے لٹنے کی ... تو میں اپنا کام دھندا چھوڑ کر کیوں تمہارے ساتھ جاؤں۔ ہاں پر اگر تم چاہو تو اپنا گھوڑا میرے پاس چھوڑ ... ہو۔ رام کی سوگند! اچھے سے چنگی حالت میں ہی پاؤ گے۔"

... ایک اور جال پھینکا۔

"دھنیواد بھرا! تم جیسے بھلے آدمی کے پاس گھوڑا چھوڑ کر ہم شانتی سے خریداری کے لیے دلی جا سکتے ہیں۔" اس نے جگدیش کے پاس اپنا گھوڑا چھوڑنے کا عندیہ دے کر اسے خوش کر دیا البتہ دلی ساتھ لے جانے کے لیے حامی نہ بھری کہ مبادا وہ شخص ان کے ساتھ چپک ہی نہ جائے اور انہیں اس سے جان چھڑانے میں اپنا وقت برباد کرنا پڑے۔ گھوڑے کی حد تک تو معاملہ اس لیے ٹھیک تھا کہ انہیں خود بھی اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی اور یہاں سے آگے جانے سے پہلے انہیں اس سے جان چھڑانی ہی تھی۔

"او کملے! یہ کیا، تو کڑیوں کی طرح بیٹھا بس شرمائے جا رہا ہے۔ چل ذرا وڈے بھرا کے لیے ملائی مار کر ایک پیالہ دودھ پتی تو منگوا۔" جگدیش کو اپنے جواب سے خوش کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے سلو کو بھی کسی پیار کرنے والے بڑے بھائی کی طرح جھڑکنے کا فریضہ انجام دیا اور اس نے بھی پوری سعادت مندی سے حکم کی تعمیل کی۔ چائے پی کر وہ جگدیش کے ساتھ اس سرائے کی طرف روانہ ہو گئے جو اس کے مطابق اس علاقے کی واحد ڈھنگ کی سرائے تھی۔

☆☆☆

وہ بہت حسین لڑکی تھی۔ اس کے متناسب جسم کے اوپر جو چہرہ سجا تھا، اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ چودھویں کا چاند بھی شرما جائے گا۔ بڑی بڑی سیاہ مخمور آنکھیں، ستواں ناک، رس بھرے سرخ ہونٹ، دودھ میں گلال گھلی رنگت والی بے داغ جلد اور سیاہ ناگن سی زلفیں جو دیکھنے والے کو خود میں الجھا ڈالیں، سو وہ الجھ ہی گیا تھا۔ اس کا نام منیر تھا اور کچھ دن قبل وہ بشیر اکبر کے نائب کے عہدے پر فائز تھا لیکن وہاں جو انقلاب آیا، اس کے نتیجے میں وہ نائب سے آقا کے عہدے پر جا پہنچا۔ نئی نئی ملی اس سرداری نے اسے فی الحال اتنا الجھایا ہوا تھا کہ کسی تفریح کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

بشیر اکبر کے اچانک غیاب کے حوالے سے اس نے شروع سے جو موقف اختیار کیا تھا، اگرچہ اب تک اس پر سختی سے قائم تھا لیکن پھر بھی بہت سے ایسے لوگ تھے جن سے اسے وقتاً فوقتاً نمٹنا پڑتا تھا۔ ان لوگوں کی ہی وجہ سے وہ فی الحال بہت محتاط بھی تھا اور اس کی کوشش تھی کہ کسی کو خود پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ دے۔ اس کوشش کے باعث وہ سب سے بڑی تفریح، عورت سے بھی دور رہ رہا تھا ورنہ یہ وہ چیز تھی جو بشیر اکبر کے دورِ اقتدار میں اسے کثرت سے میسر تھی۔ اس سلسلے میں بشیر اکبر نے اپنے کسی ساتھی پر کبھی پابندی نہیں لگائی تھی اور اس آزادی کا فائدہ منیر جیسے لوگ خوب اٹھاتے

تھے کیونکہ وہ اپنی برسوں پرانی بیویوں سے اوب چکے تھے۔
منیر کی شادی کو پندرہ سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا اور اس عرصے میں اس کی کبھی خوب صورت کہلانے والی بیوی چھ عدد بچوں کی پیدائش کے بعد پھول کر اتنی کپا ہو چکی تھی کہ اس مٹاپے میں اس کے نقش ونگار دب جانے کے ساتھ ساتھ جلد کی رنگت اور تازگی کو بھی زوال آ گیا تھا۔ اس زوال شدہ حسن والی عورت کو اپنے چھ عدد بچوں کی پرورش پر لگا کر منیر خود دل بھر کر عیاشی کرتا پھرتا تھا اور اس عیاشی کے لیے اسے ایسی آزادی تھی کہ کبھی پکڑ میں بھی نہیں آیا تھا۔ وہ ایسا عیار تھا کہ تنظیم کا کرتا دھرتا بن جانے کے بعد خود تو بشیر اکبر کی رہائش گاہ پر منتقل ہو گیا تھا لیکن بیوی بچوں کو پہلے والے گھر میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ تنظیم کے سربراہ کی ذمے داری بہت بڑی ہے اور یکسوئی سے یہ ذمے داری نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ گھریلو زندگی کے جھمیلوں سے دور رہے۔ مثال کے طور پر پیش کرنے کے لیے بشیر اکبر کا طرزِ زندگی موجود تھا جس نے اپنے مشن کی خاطر کبھی شادی نہیں کی تھی۔ منیر چونکہ پہلے سے شادی شدہ تھا اس لیے یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ بیوی بچوں کو مکمل طور پر چھوڑ دیتا۔ اس لیے اس نے یہ بندوبست کر دیا تھا کہ مستقل قیام تو بشیر اکبر والی رہائش گاہ پر رکھے گا لیکن وقتاً فوقتاً بشرطِ ضرورت بیوی بچوں سے ملنے بھی جاتا رہے گا۔ بیوی جو عرصے سے اس کی بے رخی اور بے اعتنائی سہہ رہی تھی، اس بات کو مانتی نہ تو کیا کرتی۔ ویسے بھی اب اس کی زندگی جس نہج پر آ گئی تھی اس میں اس کے لیے یہی کافی تھا کہ اسے اپنے اور بچوں کے لیے خرچہ پانی ملتا رہے اور ظاہر ہے منیر کے نائب سے سربراہ بننے کے بعد آمدنی میں اضافہ ہونا ہی ہونا تھا چنانچہ وہ صبر شکر کر کے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور منیر صاحب کوچ کر کے بشیر اکبر کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے جہاں اسے بیک وقت بہت سے مسائل سے نمٹنا پڑ رہا تھا اور وہ بخوشی نمٹ رہا تھا کہ ہر تکلیف کے بعد راحت ملنے کی امید ہوتی ہے۔ اور اب سامنے جو لڑکی موجود تھی، اسے دیکھ کر اسے لگ رہا تھا کہ راحت مل ہی گئی ہے۔

لڑکی کو ایک ایسا شخص اپنے ساتھ لے کر آیا تھا جو برسوں سے تحریک کے ساتھ وابستہ تھا۔ اور اس نے اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کے باعث اتنی جگہ بنا رکھی تھی کہ وہ جب چاہتا اسے بشیر اکبر سے ملاقات کی اجازت مل جاتی تھی۔ چنانچہ منیر کو بھی یہ اجازت دینی پڑی اور جب وہ اس کے سامنے آیا تو وہ اس سے آمد کا مقصد پوچھنا بھول کر اس کے ساتھ موجود حسنِ مجسم میں الجھ کر رہ گیا۔ وہ حسینہ ایسی قیامت تھی کہ سنگھار کے نام پر اس کی آنکھوں میں موجود کاجل کی دھار اور ٹھوڑی پر قریب قریب لگائے گئے تین نکتوں کے علاوہ کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ حقیقت میں اس کا حسن اتنا کامل تھا کہ اسے کسی مصنوعی سنگھار کی ضرورت تھی بھی نہیں۔ لڑکی کو ساتھ لے کر آنے والے شخص نے منیر کی بے خودی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور گلا کھنکھارتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

"یہ گل جاناں ہے سرکار! کشمیر کی رہنے والی ہے اور کل ہی میرے گھر پہنچی ہے۔ اس کا بھائی طالب علمی کے زمانے میں میرا دوست ہوا کرتا تھا۔ ہم ساتھ گریجویشن کر رہے تھے اور ہماری اتنی گہری دوستی ہو گئی تھی کہ ہم نے ایک دوسرے سے وعدہ کر رکھا تھا کہ زندگی میں کبھی بھی دونوں میں سے کسی کو مدد کی ضرورت پڑی تو دوسرا ہر حال میں دوستی کے رشتے کو نبھاتے ہوئے اس کا ساتھ دے گا۔ اتفاق یہ ہوا کہ میرا دوست اپنے والد کی موت کی خبر سن کر تعلیم مکمل کیے بغیر ہی کشمیر واپس چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔ میں بھی تعلیم مکمل کر کے واپس یہاں آ گیا اور اپنی زندگی میں مگن ہو گیا لیکن کل جب گل جاناں ایک خط کے ساتھ میرے گھر پہنچی تو مجھے یاد آیا کہ میرا ایک دوست ہوا کرتا تھا جو زمانے کی گردشوں میں مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ گل جاناں نے مجھے جو خط دیا وہ میرے دوست نے میرے نام لکھا تھا لیکن اس وقت کے لیے جب وہ زندہ نہ رہے۔ اس خط میں اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں دنیا میں تنہا رہ جانے والی اس کی عزیز بہن کو سہارا دوں۔ خط میں موجود تحریر اور گل جاناں کی زبانی سنائے جانے والے حالات کے مطابق جو تفصیل میرے سامنے آئی، وہ یہ تھی کہ میرا دوست کشمیر واپس جانے کے بعد حریت پسندوں کی ایک تنظیم میں شامل ہو گیا تھا اور ان کے ساتھ رہ کر جو شب و روز گزار رہا تھا اس میں یہ لازمی تھا کہ اس کی زندگی کا چراغ کسی بھی لمحے گل ہو جائے گا۔ اسے زندگی کی چاہ نہیں تھی۔ وہ بس اپنے وطن کو آزاد دیکھنا چاہتا تھا اور خواہش مند تھا کہ اپنے باپ کے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکے۔ اس خواہش نے اس سے تعلیم کے علاوہ ماں، بہن اور بھائی سب کو چھڑوا دیا تھا لیکن یہ نہیں تھا کہ وہ ان سے دور رہ کر ان کی محبت کو بھی [illegible] ہو۔ چاہے مہینوں ملاقات نہ ہو سکے لیکن وہ کوشش کرتا تھا کہ رہ کر بھی ان کی خبر گیری کرتا رہے۔ گھر میں جوان [illegible] موجودگی کے باعث اسے تسلی تھی کہ [illegible] بہن کا خیال [illegible] ہے اس کے سوا کوئی اور موجود ہے لیکن اس کا یہ [illegible] ایک [illegible] ختم ہو گیا اور اس کے بھائی کو بیک [illegible] کا [illegible] جرم میں سیدوری سے ہلاک کر دیا گیا۔ [illegible]

شدت سے احساس ہوا کہ ماں اور بہن کو کسی مرد کے سہارے کی ضرورت ہے لیکن وہ جو لاکھوں بہنوں کے تحفظ کے لیے جدوجہد کر رہا تھا، ایک اپنی ماں اور بہن کی خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کیسے گھر بیٹھ سکتا تھا۔ ویسے بھی عملاً اس کا اپنے گھر میں ان لوگوں کے ساتھ رہنا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ جو اس کے خون کے پیاسے تھے اور جنہوں نے اس سے دشمنی میں اس کے بھائی کو ہلاک کر ڈالا تھا، بھلا اسے گھر میں سکون سے کب رہنے دیتے۔ وہ دل پر پتھر رکھ کر تحریک کی ذمے داریوں میں مصروف ہو گیا لیکن شاید اسے احساس تھا کہ جلد وہ بھی بہت سوں کی طرح جام شہادت نوش کرے گا۔ اس لیے اس نے ماں بہن کے تحفظ کے لیے اتنا کیا کہ میرے نام ایک خط لکھ کر محفوظ کر دیا اور میرا پتا اپنی بہن کو دے کر اسے سمجھایا کہ اگر کبھی اسے لگے کہ اب حالات اس کے لیے بہت سنگین ہو چکے ہیں تو وہ ماں کو لے کر اس خط سمیت میرے پاس پہنچ جائے۔ اسے یقین تھا کہ میں طالب علمی کے زمانے میں اس سے کیا گیا عہد اب بھی نہیں بھولا ہوں گا۔

''بہن یعنی گل جاناں نے اس کی بات کو اپنے پلو سے باندھ لیا اور جب بھائی کی شہادت کی اطلاع ملنے کے ساتھ ہی اس کی ماں نے صدمے سے دم توڑ دیا تو اس نے سمجھ لیا کہ اب وہ وقت آ چکا ہے جب اسے اپنی بقا کے لیے کشمیر چھوڑنا ہوگا۔ یہ بھائی کی تحریک کے ایک ساتھی کے ساتھ مشکل سفر کر کے میرے گھر پہنچ گئی اور مجھے اس کا خط دیا۔ مجھے اپنا دوست بھی یاد تھا اور اس سے کیا گیا وعدہ بھی اس لیے میں اسے پناہ دینے سے انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے میری بیوی راضی نہیں ہوئی اور اس نے ایک رات میں ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ اسے گھر سے نکالو۔''

''لیکن کیوں؟'' گل جاناں کو دزدیدہ نظروں سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ پوری توجہ سے پورا قصہ سنتے منیر نے سوال کیا۔

''وجہ بالکل واضح ہے سرکار! آپ گل جاناں کو غور سے تو دیکھیں، یہ کتنی حسین لڑکی ہے۔'' اس نے دعوتِ نظارہ دی جبکہ منیر تو یہ کام پہلے ہی کر چکا تھا اور اسے اعتراف تھا کہ لڑکی کا حسن اتنا خطرناک ہے کہ بڑے بڑے عابدوں اور زاہدوں کو بھی امتحان میں مبتلا کر دے۔ اس حسن بے مثال کی وجہ بھی اب اس کے سامنے آ گئی تھی کہ وہ اس خطے سے تعلق رکھتی تھی جسے جنت نظیر کہا جاتا تھا اور جنت میں تو حوریں ہی بستی ہیں اور گل جاناں تو شاید ان حوروں میں بھی سب سے الگ ہی چمک دمک رکھتی تھی۔ اس کے جسم پر موجود کشمیری لباس بھی اس پر خوب سج رہا تھا۔ یہ اور بات کہ منیر نے پہلے لباس پر توجہ نہیں دی تھی اور اس کے پیچھے چھپے خزانے کو ہی نظروں سے کھوجنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

''اس کے حسن سے ڈر کر میری بیوی نے شور مچا دیا کہ میں ہرگز ہرگز ایسے فتنے کو اپنے گھر میں نہیں رکھوں گی جس کی وجہ سے مجھے اپنے شوہر کے بھٹکنے کا ڈر ہو۔ اب آپ ہی سوچیں کہ میں کیا کر سکتا تھا۔ شادی نہ ہوئی ہوتی تو خود اس کا ہاتھ تھام کر سہارا دے دیتا لیکن اب تو بیوی ہی کی سنی ہے کہ وہ میرے بچوں کی ماں اور دکھ درد کی ساتھی ہے۔ لیکن میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ میں اتنے مان سے یہاں پہنچی اپنے دوست کی بہن کو بے آسرا چھوڑ دوں اس لیے اس مشکل کے حل کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ میری مدد کریں۔'' اس نے اپنا اصل مدعا بیان کیا۔

''اسے کشمیر سے یہاں لانے والا شخص کہاں ہے؟'' منیر نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ تو کل ہی اسے چھوڑ کر دروازے سے ہی واپس لوٹ گیا تھا۔ آپ ایسے لوگوں کو جانتے ہی ہوں گے کہ اپنے وجود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے کتنی رازداری سے کام لیتے ہیں۔ اس نے مجھ سے اپنا تعارف کروانا یا میرے گھر کچھ دیر رکنا بھی گوارا نہیں کیا اور الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ اس لیے میں مکمل مجبور ہوں کہ اس لڑکی کی ذمے داری کو خود اٹھا دوں، ورحالات کی وجہ سے اٹھا بھی نہیں پا رہا۔'' اس کا انداز بڑا بے بس تھا۔ اس کے ساتھ موجود گل جاناں نے دورانِ گفتگو ذرا بھی لب کشائی نہیں کی تھی اور لبالب آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ یوں سر جھکا کر بیٹھی تھی کہ جیسے اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کی منتظر ہو۔ اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتے اس نمکین پانی نے منیر کے دل کی دنیا کو مزید تہ و بالا کر ڈالا اور وہ شدت سے خواہش کرنے لگا کہ یہ لڑکی کسی طرح اسے مل جائے تو وہ اس کے سارے دکھ خود سمیٹ لے لیکن وہ جس مقام پر تھا، وہاں زبان سے ایسی خواہش کا اظہار ممکن نہیں تھا چنانچہ صبر سے کام لیتے ہوئے نہایت مدبرانہ لہجے میں مدعی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تم بتاؤ کہ تمہاری کیا خواہش ہے؟ اگر [illegible] میں اس کے لیے رہائش کا بندوبست کر دیا جائے اور جیسے ہی کوئی مناسب لڑکا ملے اس سے اس کی شادی کر دی جائے؟''

''یہ تو ذرا لمبا پروسس ہو جائے گا سرکار۔ شادی کے لیے مناسب لڑکا ملنے تک یہ تنہا کسی جگہ کیسے رہ سکے گی۔ نوجوان ہے اور اس پر سے حد خوب صورت بھی۔ لوگ تو اس کا جینا محال کر دیں گے۔'' اس نے فوراً اعتراض کیا۔

''پھر تم ہی بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں اس مسئلے کا کیا حل ہے؟'' منیر نے اس سے پوچھا۔

''میری درخواست تو یہ تھی کہ آپ گھریلو کام کاج کے لیے اسے اپنی رہائش گاہ پر ملازمہ رکھ لیں۔ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ بشیر اکبر صاحب کے دور میں جو ملازمہ گھریلو کام کاج کرتی تھی، وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر مر چکی ہے اس لیے امید ہے کہ آپ کو ایک ملازمہ کی ضرورت ہوئی۔ گل جاناں کو رکھنے سے آپ کی ضرورت پوری ہو جائے گی اور مجھے بھی اطمینان رہے گا کہ یہ محفوظ ٹھکانے پر ہے۔'' اس نے ایسی بات کی جسے سن کر منیر کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ دل سے وہ خود آرزومند تھا کہ کسی طرح گل جاناں کو اپنے قریب رکھ سکے لیکن مروتاً اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔ اب بھی اگرچہ اس کی خوشی اس کے چہرے سے جھلکی پڑ رہی تھی لیکن وہ لہجے کو مدبرانہ رکھتے ہوئے بولا۔

''تم ہمارے بڑے اچھے دوست ہو اور ہمیں ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا ہے کہ اپنے لوگوں کی مشکلات اور پریشانیوں کو حل کر سکیں۔ اگر اس لڑکی کو ہمارے ہاں ملازمہ رکھنے سے تمہارا مسئلہ حل ہوتا ہے تو ہمیں تمہاری درخواست ماننے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم پورے اطمینان سے اسے یہاں چھوڑ کر جا سکتے ہو۔'' بشیر اکبر کی گرفتاری کے بعد اس نے جو چھان بین کی تھی، اس کے نتیجے میں اس کے سامنے یہ بات بھی آ گئی تھی کہ اس رات عبادت گاہ کے وسیع احاطے میں قائم اسپتال میں مشابرم خان نامی مشکوک مریض کے علاوہ بشیر اکبر کی گھریلو ملازمہ بھی موجود تھی۔ اسپتال کا بڑا ڈاکٹر اور ڈیوٹی پر موجود سینئر نرس اس وقت اس عورت کو [illegible] کے لیے راضی کر رہے تھے تاکہ اس کی کوکھ میں پلتی ناجائز اولاد کو دنیا میں آنے سے روکا جا سکے۔ عورت کسی سند یافتہ اور تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر کی غیر موجودگی میں ابارشن کروانے کے لیے راضی نہیں تھی اور اس سے نمٹنے میں ڈاکٹر [illegible] کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کب مشابرم خان اسپتال سے [illegible] بعد میں انہوں نے عورت کو زبردستی کسی نہ کسی طرح [illegible] کے لیے راضی کر لیا تھا لیکن عورت کے اندیشوں کے [illegible] وہ اس معاشے کو سنبھال نہیں پائے اور وہ اپنی جان سے چلی گئی۔ ڈاکٹر نے مشہور کر دیا کہ بشیر اکبر کی یہ ملازمہ کل [illegible] میں صفائی کرتے ہوئے ایک اونچے اسٹول سے گر گئی تھی [illegible] نتیجے میں اس کے [illegible] چوٹ آئی تھی اور بہت [illegible] خون کے اخراج سے اس کی جان چلی گئی تھی۔ عورت کی [illegible]

میں بند کر کے ورثا کے حوالے کر دینا ڈاکٹر کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بیوی کی موت کی اطلاع سن کر دوسرے شہر سے دوڑ کر آنے والا اس کا شوہر تابوت کو دفنانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ ویسے بھی اس کے آنے تک بشیر اکبر کے غیاب اور اس کے ہی نفوں کی پراسرار ہلاکت کا غلغلہ اتنا بلند ہو چکا تھا کہ اگر وہ کسی قسم کے شک کی بنیاد پر دہائی دینے کی کوشش کرتا بھی تو اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی۔ اس مرنے والی ملازمہ کا قصہ جو بھی تھا، منیر کی ساری دلچسپی اس بات میں تھی کہ وہ گل جاناں کو اپنی رہائش گاہ پر ملازمہ رکھنے کی صورت میں مزے سے دل کے سارے ارمان پورے کر سکتا ہے۔

''بہت بہت شکریہ سرکار! آپ نے میری درخواست قبول کر کے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا۔'' منیر اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ مدعی نے عاجزی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے حال کے منظر میں واپس کھینچا۔

''بس اب تم جاؤ۔ ہمارا جو فرض تھا، ہم نے وہ ادا کیا۔ تمہیں اتنا احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' گل جاناں جیسا دریاب گھر بیٹھے ہاتھ آ جانے سے منیر کا لہجہ خود بخود ہی شاہانہ ہو گیا تھا۔

''جیسا آپ کا حکم۔'' وہ شخص فوراً کھڑا ہو گیا اور پھر براہِ راست گل جاناں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہمارے سرکار ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک ان کا حکم ہر حال میں پورا کرتا ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں ان کے قریب رہنے کا موقع مل رہا ہے۔ خیال رکھنا کہ انہیں تم سے کوئی شکایت نہ ہونے پائے اور یہ تمہیں جو بھی حکم دیں تم بلا حیل و حجت بجا لاؤ۔''

گل جاناں نے اس کی ہدایت سن کر معصومانہ انداز میں زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ بغیر زبان ہلائے صرف سر کی جنبش سے رضامندی کا اشارہ دینے والی اس ادا نے منیر کا پہلے ہی لوٹ پوٹ دل اور بھی موہ لیا۔ اس نے بمشکل مدعی کے وہاں سے رخصت ہونے کا انتظار کیا اور جیسے ہی تنہائی ملی، گل جاناں کی طرف حریصانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بڑے دلار سے بولا۔

''جاناں! ذرا ایک گلاس پانی تو پلا دو۔'' پانی کا جگ اور گلاس اس کے بالکل سامنے میز پر رکھے تھے اور وہ چاہتا تو ہاتھ بڑھا کر خود بھی آرام سے پانی پی سکتا تھا لیکن چونکہ اس نے گل جاناں سے فرمائش کی تھی چنانچہ وہ نہایت سعادت مندی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور گلاس میں پانی انڈیل کر بڑی نزاکت کے ساتھ اسے پیش کیا۔ پانی پیش [illegible]

اس کا مخروطی انگلیوں والا گلابی ہاتھ اتنا دلکش تھا کہ اس کے سامنے نفیس شیشے کا بیش قیمت گلاس معمولی لگ رہا تھا۔ منیر نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے جان بوجھ کر اپنی انگلیوں کو اس کے ہاتھ سے مس کیا اور سارے وجود میں برق سی دوڑتی محسوس کی۔ ادھر گل جاناں کا انداز ایسا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ باقی پورا دن بھی منیر اسے چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے پکارتا رہا اور بہانے بہانے سے اس کے جسم کے مختلف حصوں کو بھی چھوتا رہا۔ گل جاناں نے ایک بار بھی تعرض نہیں کیا اور نہ ہی عام لڑکیوں کی طرح گھبرائی اور پریشان نظر آئی۔ اس کے رویے سے یوں لگ رہا تھا کہ اس نے خود کو کی کئی اس ...... نصیحت کو گرہ سے باندھ لیا ہے اور واقعی منیر کی ہر طرح کی خدمت بجالانے کو تیار ہے۔

منیر جو اسے یہاں رکھتے وقت سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے بیڈروم تک لانے کے لیے کچھ صبر کرنا پڑے گا اور شاید زور زبردستی سے بھی کام لینا پڑے گا، رات آنے تک اس کے رویے سے یقین کر چکا تھا کہ وہ آج ہی اسے اپنی خواب گاہ کی زینت بنا سکتا ہے۔ اس کا یہ یقین غلط بھی نہیں نکلا اور جب اس نے گل جاناں کو اپنے لیے جام تیار کرنے کے بعد اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بڑے اطمینان سے بیٹھ گئی۔ یہ کامیابی بہت بڑی تھی۔ منیر کی باچھیں کھل گئیں۔

''تم بہت پیاری لڑکی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم میرے ساتھ اس گھر میں بہت عیش و آرام سے رہو گی۔'' گل جاناں سے جام لینے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مخمور لہجے میں وعدہ کرنے لگا۔ اس کے لہجے اور حرکات وسکنات سے جھلکتا سرور بتا رہا تھا کہ وہ پینے سے پہلے ہی بہک چکا ہے اور یہ تھا بھی سچ۔ وہ شراب سے پہلے شباب کے نشے میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''میں خوش ہوں کہ میرے بھائی کے دوست کی بیوی مجھے اپنے گھر رکھنے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس کے انکار کی وجہ سے ہی میں آپ تک پہنچی ہوں۔ آپ کا گھر مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ یہاں سہولت کی ہر چیز موجود ہے۔ فریج میں اتنے مزے مزے کی کھانے کی چیزیں رکھی ہیں۔ وہاں کشمیر میں تو ہم بڑی مشکل میں رہتے تھے۔ جب تک بابا زندہ تھے پھر بھی حالات ٹھیک تھے۔ ان کے مرنے کے بعد تو ہم پر زندگی تنگ ہو گئی۔ مشکل سے روکھی سوکھی کھانے کو ملتی تھی اور کبھی کبھی تو فاقہ ہی کرنا پڑتا تھا۔ میں تنگ آ گئی تھی اس زندگی سے۔ اللہ نے میری قسمت کھول دی کہ اتنی تکلیفوں کے بعد یہاں پہنچا دیا۔ آپ کا مجھ پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ آپ مجھے اپنے پاس رکھنے کے لیے راضی ہو گئے۔ میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ آپ کی اتنی خدمت کروں گی کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔'' پہلے سے سرور میں آئے منیر کو اس کے الفاظ نے اور بھی خوش کر دیا اور وہ اس کے ہاتھ کو جوش سے دباتے ہوئے بولا۔

''بھول جاؤ اپنی پچھلی ساری تکلیفوں اور دکھوں کو۔ میرے گھر میں تم رانی بن کر رہو گی۔ یاد رکھنا کہ میں نے یہاں تمہیں صرف اپنی ذاتی خدمت کے لیے رکھا ہے۔ جھاڑو، برتن، کھانا پکانا یہ سارے کام وہ عورت کرے گی جو پہلے سے یہاں یہ کام کر رہی ہے۔ تم بس میرے کمرے میں رہ کر اسے ترتیب میں رکھنا اور مجھے وقت پر کھانا، پانی چائے، کافی وغیرہ دیتی رہنا۔ تم زیادہ سے زیادہ میرے سامنے رہو، میرے لیے بس یہ خدمت ہی کافی ہے۔ تم جیسی کھلتی کلی سی لڑکی کو گھر کے سخت کاموں میں جھونکنا تمہارے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی اور مجھ جیسا ہمدرد دل رکھنے والا آدمی یہ ظلم کبھی نہیں کر سکتا۔''

''ویری نائس، آپ تو بہت ہی قدردان نکلے۔'' اس کی باتیں سن کر گل جاناں نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا اور پھر جوش میں آ کر اس سے نہ صرف لپٹ گئی بلکہ چٹاخ سے چوم بھی لیا۔ اس کی اس جسارت پر منیر پہلے تو ہکا بکا رہ گیا پھر اس خیال سے جوش میں آ گیا کہ لڑکی خود پکے ہوئے آم کی طرح اس کی جھولی میں گرنے کے لیے تیار ہے۔ اس سنہری موقع سے فائدہ نہ اٹھانا اس کے خیال میں غیر دانش مندی تھی لیکن حقیقت میں اسے یاد نہیں رہا تھا کہ جوش میں اکثر انسان اپنا ہوش کھو دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔

☆☆☆

''بڑا چالو بندہ تھا۔ میرا تو بڑا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے ذرا دو دو ہاتھ کر لوں پر آپ نے اسٹوری ہی ایسی بنائی تھی کہ شرمیلے دولہا کا رول پلے کرتے ہوئے بیٹھ پڑا۔ ورنہ اس سالے کو پتا چل جاتا کہ وہ میر ہے تو ہم سوا میر۔'' جگدیش، سلو اور شہریار کو سرائے میں چھوڑ کر رخصت ہوا تو تنہائی میسر آتے ہی سلو کی زبان چل پڑی۔

''میں بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ دو نمبر آدمی ہے۔ ... لوگوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر انہیں ٹھگنے کا کام خوب ... ہوگا لیکن میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اسے احساس نہ ہونے دوں کہ ہم اسے سمجھ گئے ہیں۔ ہم یہاں اجنبی ہیں اور ہمارے لیے یہی مناسب ہے کہ غیر متعلق لوگوں سے الجھے بغیر اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہیں۔ اس قصبے میں ہم صرف اس لیے رکے ہیں کہ پیٹ بھرنے کے ساتھ ساتھ چند گھنٹے

نرم تر کے تازہ دم ہو جائیں۔ باقی ہمارا کسی سے لینا دینا نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جگدیش ہم سے وہ گھوڑا اینٹھ سکتا ہے جو ہمیں امرت کور نے دیا تھا تو وہ اسے لینے دو۔ ہم نے کون سا اسے خریدا تھا۔ ویسے بھی آگے سفر کے لیے ہمیں گھوڑے کو یہیں چھوڑنا ہوگا تو کیا برا ہے کہ جگدیش اسے لے لے۔'' شہریار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''واہ واہ، ایسے ہی جگدیش کو گھوڑا ٹھگ کر کیوں لے جانے دیں۔ میں تو اس گھوڑے کی رقم کھری کروں گا۔ تم دیکھنا کہ میں اسے کتنے اچھے داموں بیچتا ہوں۔ دیوی امرت کور کا گھوڑا کسی ٹھگ کے ہاتھوں لگ جائے، یہ مجھے منظور نہیں۔'' اس کی نصیحت کو خاطر میں لائے بغیر سلو نے چہک کر اپنے عزائم کا اظہار کیا۔

''ٹھیک ہے جو جی چاہے کرنا، ویسے بھی تمہیں سودے بازی کرنا خوب آتی ہے۔ امرت کور سے بھی تم نے اچھا سودا کیا تھا۔ کم از کم میں اکیلا ایسا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔'' خشک لہجے میں بولتے شہریار کا اشارہ سربجیت کے قتل کی طرف تھا۔ امرت کور کی خواہش پر اسے قتل کر کے یہاں تک کے سفر کی سہولت حاصل کرنا سلو ہی کا کارنامہ تھا۔

''ہاہاہا...'' سلو اس کی بات سن کر زور سے ہنسا۔ ''سودے بازی کا نتیجہ تو سویرا ہونے پر امرت کور کے سامنے آیا ہوگا اور بے چاری بیٹھی ہمیں گالیاں اور کوسنے دے رہی ہوگی۔''

''کیا مطلب؟'' قمیص اتار کر اپنے بازو کے زخم کا جائزہ لیتے ہوئے شہریار نے چونک کر پوچھا۔

''مطلب یہ کہ میں نے اس کے پتی سربجیت کو قتل نہیں کیا تھا اور صرف چھت پر لٹا کر نیچے آ گیا تھا۔'' اس نے دیدے گھماتے ہوئے مکاری سے جواب دیا۔

''یہ تو وعدہ خلافی ہے۔'' شہریار اگرچہ سربجیت کے قتل پر دل سے راضی نہیں تھا لیکن سلو کی زبانی سچ سن کر چونک گیا۔

''ایسے معاملات میں ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ اس شخص نے جو داستان سنائی تھی، اس میں کتنا سچ تھا۔ ... ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بے چارہ سربجیت مظلوم ہو اور امرت کور تریا چلتر سے کام لے کر اپنے عاشق کی خاطر اسے قتل کروانا چاہتی ہو۔ ہم بیکار میں اپنے سر قتل کا الزام لیتے اور کسی مشکل میں پھنس جاتے۔ تم خود سوچو سربجیت قتل ہو جاتا اور کسی وجہ سے امرت کور پکڑی جاتی تو ... نے تو سارا سچ اگل دینا تھا۔ پھر اس کے سسرال والے ... کے ساتھ تو جو سلوک کرتے سو کرتے لیکن انہوں نے ہمیں بھی نہیں چھوڑنا تھا۔ امرت کور سے ہمارے جلیے پوچھ کر وہ ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوتے اور ہم خوامخواہ مشکل میں پھنس سکتے تھے۔ تم خود سوچو تو میں نے جو کچھ کیا تمہیں ٹھیک لگے گا۔ سربجیت کی صبح آنکھ کھلی ہوگی تو وہ خود کو چھت پر پا کر تھوڑا حیران ہوا ہوگا اور اگر نشے کا عادی تھا تو یہی سوچا ہو گا کہ ٹھرک میں اوپر چڑھ کر کب سو گیا، پتا نہیں چلا۔ بہت سے بہت وہ بیوی پر چیخے چلائے گا کہ اس نے اس کا خیال نہیں کیا اور رات بھر چھت پر ہی پڑا رہنے دیا۔ اس چال باز عورت کے پاس بولنے کے لیے کیا ہوگا؟ وہ دل میں ہمیں گالیاں ضرور دے گی لیکن ہمارے خلاف کچھ کر نہیں سکے گی۔ یوں راوی ہمارے لیے چین ہی چین لکھے گا۔'' وہ اپنی کارروائی سے پوری طرح مطمئن تھا۔

''مجھے وہ لڑکی سچی لگی تھی۔'' شہریار نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور لیٹنے کے لیے تکیہ درست کرنے لگا۔ وہ دونوں ہی بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے چند گھنٹوں کی نیند لینے کی اشد ضرورت تھی۔ سونے سے قبل شہریار نے اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا کیونکہ عادت نہ ہونے کی وجہ سے وہ سربجیت کے ریشمی دھوتی اور کرتے میں الجھن محسوس کر رہا تھا۔

''یہ مرد کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اسے دنیا کی ہر خوب صورت لڑکی سچی لگتی ہے اور اس طرح وہ خود کو مصیبت میں پھنسا لیتا ہے۔'' سلو نے اس کی رائے پر فلسفیانہ لہجے میں تبصرہ کیا تو اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔ شہریار نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا اور سینے تک جسم پر چادر پھیلا کر اوڑھتے ہوئے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

''بہتر ہے کہ تم اپنے شیطانی چرخے جیسے دماغ کو ضرورت سے زیادہ چلانے کے بجائے اب خاموشی سے سو جاؤ۔ ہمیں دہلی جانے والی بس پر آج ہی وقت پر سوار ہونا ہوگا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ٹھیک ٹائم پر جاگ جائیں۔ میں نے سرائے کے مالک کو بتایا ہے کہ اسے ہمیں کب اٹھانا ہے۔ تمہیں بھی میرے ساتھ ہی اٹھنا ہوگا۔ اس وقت شکایت مت کرنا کہ تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی۔''

''او کے باس، نہیں کروں گا شکایت لیکن ابھی میں سو نہیں سکتا۔ ابھی مجھے گھوڑے کا سودا بھی کرنا ہے۔ میرے خیال میں اس کام کے لیے سرائے کے مالک سے مدد لینی چاہیے۔'' سلو فیصلہ کن لہجے میں کہتا ہوا کھڑا ہو گیا تو اس نے شانے اچکاتے ہوئے کروٹ بدل لی۔ ... اندازہ تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے، اس پر عمل بھی کرے گا اور شاید یہی کام کرنا باقی تھا جب ہی سلو نے اس کی طرح دھوتی کرتے سے چھٹکارا

حاصل نہیں کیا تھا۔ سلو مسکراتا ہوا باہر نکل گیا اور اس کمرے کا رخ کیا جہاں ان کی سرائے کے مالک سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ کوئی بہت بڑی سرائے نہیں تھی۔ چھوٹے چھوٹے بس دو تین ہی کمرے بنے ہوئے تھے اور عمارت کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں بہت کم لوگ ہی ٹھہرتے ہوں گے۔ اس چھوٹے سے قصبے میں زیادہ آتا بھی کون ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا ہوگا کہ دور دیہاتوں سے کسی قسم کی خرید و فروخت کے لیے آنے والوں کو اگر رات ہو جاتی ہوگی تو وہ رات کے وقت سفر کرنے کے بجائے رات بھر کے لیے سرائے میں قیام کر کے صبح روانہ ہو جاتے ہوں گے۔

"کون...؟" وہ دفتر نما کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو سرائے کے مالک نے بڑبڑاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ دراصل وہ دونوں پیر میز پر جمائے کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور کھٹکا پیدا ہونے پر چونک گیا۔

"میں ہوں ویر جی۔ تمہارے سرائے کا پروہنا۔" سلو نے اس کے سامنے موجود کرسی پر ٹکتے ہوئے جواب دیا۔ وہ جس کرسی پر بیٹھا تھا، اس کی حالت کافی خستہ تھی اور لگتا تھا کہ اگر زیادہ بوجھ پڑا تو زمین بوس ہونے میں دیر نہیں لگائے گی اس لیے وہ بہت احتیاط سے اس پر بیٹھا بلکہ ٹکا تھا۔

"او اچھا پتر، کچھ کام تھا کیا؟" بوڑھے نے میز پر سے ٹٹول کر اپنی عینک اٹھا کر آنکھوں پر لگائی تو اسے احساس ہوا کہ بوڑھے کی بینائی بہت کمزور ہے اور وہ عینک کے بغیر شاید ہی کچھ دیکھ پاتا ہو۔

"کام تو تھا چاچا، میں چاہتا ہوں کہ اپنا گھوڑا کسی کو بیچ دیں۔ اگر تمہاری جان پہچان کے کسی بندے کو گھوڑا خریدنا ہو تو بتاؤ۔" وہ فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔ چھوٹی عمر کے بڑے تجربے نے اسے بتایا تھا کہ بوڑھا ایماندار آدمی ہے جس سے دھوکے کا خطرہ نہیں۔

"اے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں پتر! میرے وڈے پتر کو اک گھوڑے کی لوڑ ہے۔ میں اسے بلا کر گھوڑا دکھا دیتا ہوں اگر اسے سمجھ آیا تو وہ خرید لے گا۔" اس کا مدعا سن کر بوڑھا جوش میں آ گیا اور فوراً باہر نکل کر کسی کو آواز دینے لگا۔ آواز سن کر آنے والے کو اس نے ہدایت کی کہ وہ بازار سے اس کے بڑے بیٹے کو بلا لائے اور خود واپس دفتر میں آ کر بیٹھ گیا۔

"بس ابھی آ جاتا ہے منڈا۔ میرا بلاوا سن کر فوراً دوڑا آئے گا۔ وڈی چنگی اولاد دی ہے بھگوان نے مجھے۔ ایک آواز پر میری گل سنتے ہیں سارے۔ بھگوان نے بڑی ان پر وڈی کرپا کی ہے۔ کام دھندا چنگا چلتا ہے۔ یہ میرے تو بس میں خود کو مصروف رکھنے کے لیے چلاتا ہوں ورنہ کوئی لوڑ نہیں ہے، اس بڈھے ویلے کام دھندا کرنے کی۔" بوڑھا واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھا تو خود ہی اسے بتانے لگا۔ اس کے دعوے کے مطابق اس کے بیٹے نے وہاں پہنچنے میں واقعی بالکل دیر نہیں لگائی اور فوراً ہی پہنچ گیا۔

"کی گل ہے پتاجی! منڈا بول رہا تھا تسی مینوں بلا رہے سی۔" اس نے سلو کو ایک نظر دیکھا اور باپ سے پوچھنے لگا۔

"آہو پتر! میں تینوں اس بندے نال ملانے واسطے بلا رہا تھا۔ اے اپنا گھوڑا بیچنا چاہندا ہے تو میں نے کہا تو دیکھ لے تجھے اپنے کم کے لیے گھوڑے کی لوڑ تھی نا۔" بوڑھے نے بیٹے کو بتایا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"گھوڑا میں نے دیکھا ہے۔ وہی ہے نا جو ادھر دروازے کے پاس بندھا ہے؟" اس نے تصدیق چاہی اور اثبات میں جواب ملنے پر پوری طرح سلو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تھوڑی سی گفت و شنید کے بعد جلد ہی دونوں میں سودا طے پا گیا۔

"تسی تھوڑی دیر ادھر بیٹھو، میں ابھی روپے لاتا ہوں۔" مناسب قیمت پر سودا ہو جانے پر اس نے سلو سے کہا۔ اصل میں امرت کور کا عنایت کردہ وہ گھوڑا واقعی اتنا زبردست تھا کہ جو پاتا خوش ہی ہوتا۔

"ٹھیک ہے بھرا، پر خیال رکھنا کہ سودے کی گل باہر نہ نکلے۔ ادھر قصبے کا ایک بندہ ہے جگدیش اس کی بھی نظر تھی گھوڑے پر۔ پر اپنے کو وہ کچھ ٹھیک بندہ نہیں لگا اس لیے اس سے سودا نہیں کیا۔" سرائے کے مالک کا بیٹا وہاں سے جانے لگا تو سلو نے اسے ہدایت کی۔

"جگدیش... وہ تو بدمعاش بندہ ہے۔ چنگا ہی ہو کہ تسی اس کی باتوں میں نہیں آئے ورنہ نقصان اٹھاتے۔" وہ فوراً ہی بولا تو سلو اپنے اندازے کی تصدیق پر مسکرا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس کی جیب میں ایک معقول رقم پہنچ چکی تھی۔ رقم لے کر جیب تھپتھپاتا ہوا وہ کمرے میں آیا تو شیر سو چکا تھا۔ وہ بھی کپڑے بدل کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ کامیابی کی خوشی اور تھکن نے مل کر یہ کام دکھایا کہ جب وہ بستر پر لیٹا تو ایسی ٹوٹ کر نیند آئی کہ کچھ ہوش نہیں رہا یہاں تک کہ اسے ان دو افراد کی آمد کی بھی خبر نہ ہو سکی جو ... روشنی میں بھی نیم تاریک پڑے کمرے میں کسی ... طرح داخل ہوئے تھے۔

یہ پرسچ و سسپنس سے بھرپور داستان جاری ہے
بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

مشکل حکایت... گہرائی... اور مشاہدے کو آشکار کرتی ایک دل دہلا دینے والی کہانی...

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ... مگر کبھی کبھی یہ وجود ایسی مشکلات کے گرداب میں الجھا دیتا ہے جس سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے... ایسے ہی ناممکنات کا شکار ہونے والی پری پیکروں کا دل گداز فسانہ...

فیمیل سائن

سلیم انور

یہ ویک اینڈ کی ایک خوش گوار صبح تھی۔ لیفٹیننٹ نازش نیند سے بیدار ہو چکی تھی۔ البتہ ہفتے بھر کی تھکن اتارنے کی خاطر بیڈ پر یونہی کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ دن میں کہیں لمبی ڈرائیو پر نکل جائے گی تاکہ وہ فریش ہو جائے اور ذہن کو کچھ سکون بھی مل جائے۔

اتنے میں فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔

وہ فون کال کیپٹن جنید کی تھی۔ نازش کا منہ بن گیا۔ وہ ویک اینڈ پر کسی بھی فون کال کے آنے سے چڑ جاتی تھی اور

خاص طور پر جب فون کال کیپٹن جنید کی ہو۔ اس پر بدمزاجی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے بیزاری کے ساتھ فون اٹھایا اور خاموشی سے سنتی رہی۔

کیپٹن جنید اپنے مخصوص روکھے لہجے میں اسے بتانے لگا کہ اس نے فون کیوں کیا ہے۔ وہ کبھی وضاحت سے گفتگو کرنے کا عادی نہیں تھا اور بے حد مختصر بات کرتا تھا جو بمشکل ایک آدھ جملے یا چند لفظوں پر مشتمل ہوتی تھی۔

اس نے بلاتمہید لیفٹیننٹ نازش کو پیغام دیا۔ ''فوراً ہیڈ کوارٹر پہنچ جاؤ۔''

نازش نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا سیل فون بند کر کے کاؤچ پر اچھال دیا۔ اس کے ویک اینڈ پر آرام کرنے کا منصوبہ خاک میں مل چکا تھا اور ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔ گزشتہ تین ہفتوں سے اسے کسی بھی ویک اینڈ پر آرام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور یہ چوتھا ویک اینڈ تھا۔

نازش کیپٹن جنید کو کوستی ہوئی ہیڈ کوارٹر کی جانب روانہ ہوگئی۔ سڑکوں پر ٹریفک کا رش تھا لیکن وہ تیز رفتاری سے ہیڈ کوارٹر کی جانب رواں تھی۔ ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی کہ اگر راستے میں اس کو کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے تو اس کا ذمے دار کیپٹن جنید کو ٹھہرائے گی تاکہ اسے اس کا ویک اینڈ برباد کرنے کا سبق مل جائے۔

بہر حال وہ کسی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گئی۔ وہ کار سے اتر کر سیدھی کیپٹن جنید کے کمرے میں گئی۔

لیفٹیننٹ نازش کے کمرے میں قدم رکھتے ہی کیپٹن جنید بولا۔ ''یونیورسٹی چلی جاؤ!'' اس نے نازش کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

''یونیورسٹی تو ایک بہت بڑی جگہ ہے، چیف! کیا آپ مزید وضاحت کریں گے؟'' لیفٹیننٹ نازش نے پوچھا۔

''سائنس بلڈنگ!''

''وہاں مجھے کس سے ملنا ہوگا؟'' نازش نے سوال کیا۔

''کامران سے۔''

''اور کیوں؟''

''قتل!'' کیپٹن جنید نے غراتے ہوئے ہاتھ لہرا دیا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کے سوال کا جواب دیا جا چکا ہے اور اب وہ مزید کوئی سوال نہ کرے۔

لیفٹیننٹ نازش نے یہ پوچھنا بہتر نہیں سمجھا کہ مقتول کون ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کیپٹن جنید کو یہ معلوم نہ ہو... اگر معلوم ہوا تب بھی شاید وہ اسے بتانا پسند نہ کرے۔ گفتگو کرنا اس کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ وہ تنہا تھا اور غالباً دنیا میں اس کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں تھا۔ اس نے اپنی زندگی پولیس کے کاموں کے لیے وقف کر رکھی تھی۔

لیفٹیننٹ نازش کیپٹن جنید کے کام کے اصولوں کی معترف تھی اور اسے دل سے سراہتی تھی لیکن اس نے کبھی کیپٹن سے قریب ہونے یا اس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☆☆☆

لیفٹیننٹ نازش نے اپنی کار یونیورسٹی کی پارکنگ لاٹ میں داخل کر دی اور کار سے اتر کر دو رویہ اونچے درختوں کے درمیان بنی پختہ روش پر چلتے ہوئے سائنس بلڈنگ کی جانب بڑھنے لگی۔

گو موسم بہار کا آغاز ہو چکا تھا لیکن گزرے ہوئے سرد موسم کی ہلکی سی خنکی اب بھی فضا میں موجود تھی۔

جب وہ سائنس بلڈنگ کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئی تو اپنے اسسٹنٹ سارجنٹ کامران کو اپنا منتظر پایا۔ کامران نے نازش کو سیلیوٹ کیا اور اسے عمارت کے اندرونی حصے کی جانب چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ ہال سے گزرتے ہوئے اس کلاس روم کے سامنے پہنچ گئے جو سب سے آخر میں واقع تھا۔

کامران نے کلاس روم کے دروازے پر لگے زرد ٹیپ کو اوپر اٹھا دیا۔ نازش ٹیپ کے نیچے سے جھک کر کلاس روم میں داخل ہوگئی۔ کامران بھی اس کے پیچھے اندر آگیا۔

کامران کو وہاں موجود پا کر نازش نے خود کو دلاسا دیا کہ صرف اس کا ویک اینڈ ہی غارت نہیں ہوا بلکہ کامران بھی اس کا شکار ہوا ہے۔ اس احساس سے وہ خود کو قدرے بہتر محسوس کرنے لگی۔

''مقتول کون ہے؟'' نازش نے کامران سے پوچھا۔

''اس کا نام سارہ بخاری ہے۔ وہ سائنس کی پروفیسر ہے... بلکہ تھی۔ اس کی لاش چند طلبا نے لگ بھگ ایک گھنٹہ قبل دریافت کی ہے۔ میں خود ابھی یہاں پہنچا ہوں۔'' کامران نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

سارہ بخاری کی لاش یونیورسٹی کے اس کلاس روم کے فرش پر پڑی ہوئی تھی جہاں وہ بیالوجی اور اناٹومی پڑھاتی تھی۔ اس کی پشت میں ایک قینچی گھسی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کارڈ بورڈ سائن تھا جس پر عورت کا سمبل بنا ہوا تھا۔

ایک دائرہ اور اس کے نیچے ایک کراس کا نشان۔

اپنے مرنے کے آخری لمحات میں سارہ بخاری نے اس نشان کو اپنی میز کی پچھلی دیوار سے اتار لیا تھا جہاں وہ مرد کے سمبل کے ساتھ دیوار پر آویزاں تھا۔ مرد کا سمبل بدستور دیوار پر لگا ہوا تھا۔

نازش نے تیزی سے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ خون کی ایک لکیر کمرے کی دوسری جانب ایک کھڑکی کے پاس سے لاش تک چلی آئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ جب سارہ کو قینچی گھونپی گئی تو اس وقت وہ کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ وہ گھسٹتی ہوئی دیوار کے پاس پہنچی تھی اور اس نے دیوار سے عورت کے سمبل کا کارڈ بورڈ اتارا تھا جو اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور پھر اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔

نازش سوچنے لگی کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ وہ سائن بہت پر دھیان نہیں دے رہی تھی۔

سفید بالوں والا ایک پستہ قد شخص کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ وہ نروس دکھائی دے رہا تھا اور بار بار اپنے ہاتھوں کو مسل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف اور افسردگی کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔

اس شخص نے ایک اچٹتی نگاہ نازش پر ڈالی اور پھر پلٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کی محتاط نگاہیں فرش پر موجود لاش سے چشم پوشی کر رہی تھیں۔

''یہ کون ہے؟'' نازش نے سر کی جنبش سے اس شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کامران سے پوچھا۔

اس سے پیشتر کہ کامران جواب دیتا، وہ شخص کھڑکی کے پاس سے چلتا ہوا نازش کے پاس آگیا اور اسے سلام کرنے کے بعد بولا۔ ''میرا نام پروفیسر ترمذی ہے اور میں ہیڈ آف دی سائنس ڈپارٹمنٹ ہوں۔''

''لیفٹیننٹ نازش!'' نازش نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ پھر پروفیسر کی ہلکی نیلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے فرش پر موجود لاش کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔ ''پروفیسر! آپ مجھے اس کے بارے میں کیا بتا سکتے ہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں جو اس معاملے میں آپ کی کوئی مدد کر سکے۔'' پروفیسر نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''میں خود بھی یہاں آدھ گھنٹے سے چند منٹ پہلے یہاں پہنچا ہوں۔''

''آپ کو اس کی اطلاع کس نے دی تھی؟''

''سیکیورٹی والوں نے۔'' پروفیسر ترمذی نے بتایا۔ ''مجھے آدھ گھنٹے قبل گارڈ نے فون پر خبر دی تھی۔ میں نے فوراً پولیس کو فون کر دیا اور خود جتنی تیزی سے ہو سکتا تھا، ادھر چلا آیا۔'' اس نے ایک بار پھر ایسا منہ بنایا کہ اس کے چہرے کی جھریاں اور بھی نمایاں ہوگئیں۔ ''یہاں لاش کی موجودگی کا واقعہ اس سے پہلے یہاں کبھی پیش نہیں آیا۔''

نازش نے ہمدردانہ انداز میں سر ہلا دیا اور پروفیسر ترمذی کو اس کی ذہنی الجھن میں مبتلا چھوڑ کر اپنے اسسٹنٹ کی جانب گھوم گئی۔ ''تم اس کا کیا مطلب نکالتے ہو؟'' اس نے لاش کے ہاتھ میں دبے ہوئے عورت کے سمبل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کامران سے پوچھا۔

''معلوم نہیں کہ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟'' کامران نے جواب دیا۔ ''کیا یہ ہمیں بتانا چاہتی تھی کہ اس کی قاتل ایک عورت ہے؟''

''اگر یہ بات ہے تو اس نے مشتبہ افراد کو نصف آبادی تک محدود کر دیا ہے۔'' نازش نے کہا۔

کامران اس جواب پر جھینپ سا گیا۔

پھر نازش نے بھویں اچکاتے ہوئے پروفیسر ترمذی کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔

''افسوس کہ میں اس بارے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔'' پروفیسر ترمذی نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ اس سمبل کا مطلب 'عورت' ہے لیکن مجھے کوئی آئیڈیا نہیں کہ پروفیسر سارہ بخاری کیا پیغام دینے کی کوشش کر رہی تھی۔''

نازش کے حلق سے ایک غراہٹ کی سی آواز بلند ہوئی اور وہ اپنے نوٹ پیڈ پر کچھ لکھنے لگی۔

پھر وہ چلتے ہوئے لاش کے نزدیک پہنچی اور گھٹنوں کے بل جھک کر عورت کے علامتی نشان کا غور سے جائزہ لینے لگی۔

یہ ایک پیشہ ورانہ پرنٹڈ سائن تھا۔ سفید ہیوی پیج کے کارڈ بورڈ پر سیاہ رنگ کا پرنٹ۔ اس کے نیچے بائیں جانب کونے میں ''میڈ ان چائنا'' چھوٹے حروف میں چھپا ہوا تھا۔ برسوں کے استعمال سے یہ میلا ہو چکا تھا اور کئی جگہ سے پھٹ بھی رہا تھا۔ اس کا مطلب واضح تھا۔ بیالوجی میں یہ علامت 'عورت' کی ترجمانی کرتی ہے۔

نازش نے دوسرے سائن بورڈ کی طرف دیکھا۔ وہ ''مرد'' کا علامتی نشان تھا .... ایک دائرہ اور اس میں سے نکلتا ہوا ایک تیر... یہ نشان عورت کے علامتی نشان سے مشابہ تھا۔ نازش سوچ میں پڑ گئی۔ آخر پروفیسر سارہ بخاری اسے کیا پیغام دینا چاہ رہی تھی؟

''کیا سیکیورٹی گارڈ نے کسی مشتبہ شخص کو ادھر آتے ہوئے یا کوئی مشتبہ حرکت دیکھی تھی؟'' کامران نے پوچھا۔

''مجھے علم نہیں۔'' پروفیسر ترمذی نے کہا۔ ''البتہ وہ اپنے آفس میں موجود ہے۔ اگر آپ اس سے بات کرنا چاہیں اور یہ سوال اس سے پوچھیں تو بہتر ہوگا۔''

"ہاں۔" نازش نے کہا۔ "دیکھیں وہ ہمیں کیا بتاتا ہے۔"

"میں آپ کو وہاں لیے چلتا ہوں۔" پروفیسر ترمذی نے قدرے مطمئن لہجے میں کہا جیسے اس لرزہ خیز ماحول سے نجات حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو۔

نازش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پروفیسر ترمذی تیز تیز قدموں سے کلاس سے نکل کر ہال کی جانب چل دیا۔ پھر سائنس بلڈنگ کے باہر ایک چھوٹے سے بند کمرے کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی جس پر سیکیورٹی آفس کی تختی لگی ہوئی تھی۔

اندر سے جواب ملنے پر اس نے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ افضل خان مضبوط جسم کا مالک تھا جس کی عمر پچاس برس سے کچھ اوپر ہی ہوگی۔

پروفیسر ترمذی نے نازش اور کامران کا تعارف افضل خان سے کرایا۔

افضل خان نے لیفٹیننٹ نازش کے سوال کرنے سے پہلے ہی خود بولنا شروع کر دیا۔ "مجھے ایک اسٹوڈنٹ بلا کر سائنس بلڈنگ لے گیا تھا۔" اس نے کہا۔ "وہ خاصا ہیجانی ہو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ انہوں نے ایک لاش دیکھی ہے۔"

اس بات پر نازش نے استفہامیہ نظر افضل خان پر ڈالی اور بولی۔ "تو تم اس وقت اپنے دفتر میں موجود نہیں تھے؟"

"اصل میں ہر بلڈنگ کے باہر ایک سیکیورٹی آفس بنا ہوا ہے۔ میں اس وقت بلڈنگ کے باہر کینٹین میں ناشتا کرنے گیا ہوا تھا۔" افضل خان نے اپنے ہلکے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں نے سوچا کہ کچھ دیر کے لیے ادھر آجاؤں اور یہیں رکا رہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ پولیس مجھ سے بات کرنا چاہے گی۔"

"تم نے ابھی بتایا کہ 'انہوں' نے ایک لاش دریافت کی ہے۔ کیا ان اسٹوڈنٹس کی تعداد ایک سے زیادہ تھی؟" نازش نے پوچھا۔

افضل خان نے اپنی انگلیاں اٹھا دیں۔ "ان کی تعداد چار ہے جنہوں نے لاش دریافت کی تھی۔"

"کیا مجھے ان کے نام مل سکتے ہیں؟"

افضل خان نے جواب دیا۔ "ان کے نام پروفیسر صاحب کے پاس موجود ہیں۔"

تب پروفیسر ترمذی گویا ہوا۔ "وہ نام یہ ہیں۔" اس نے کاغذ کی ایک شیٹ نازش کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ویک اینڈ پر یہ اسٹوڈنٹس یونیورسٹی میں کیا کر رہے تھے جبکہ کلاسز بھی آف ہیں؟" نازش نے پوچھا۔

"یونیورسٹی کی ایک روایت ہے کہ ہر سال موسم بہار کی تعطیلات سے پہلے سائنس اسٹوڈنٹس کا ایک گروپ یہ ڈراما پیش کرتا ہے... ایک میلو ڈراما! یہ مزاح پر مبنی تمثیل ہوتی ہے۔ اس طرح یہ ڈرامے کی ہدایت کار پروفیسر سارہ بخاری تھی اور یہ چاروں اسٹوڈنٹس اس ڈرامے کے اداکار تھے۔ آج پروگرام کے مطابق اس ڈرامے کی ریہرسل تھی اور چونکہ یہ ویک اینڈ ہے، اس لیے کیمپس میں خاصی ویرانی ہے۔ میری توقع کے مطابق عمارت میں ان چاروں کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔" پروفیسر ترمذی نے افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

نازش کاغذ پر لکھے ہوئے ناموں کا جائزہ لینے لگی پھر پوچھا۔ "یہ مجھے اس وقت کہاں ملیں گے؟"

"وہ اس وقت تھیٹر میں موجود ہیں۔ تھیٹر ہال کے آخری سرے پر واقع ہے۔" پروفیسر ترمذی نے اشارے سے بتایا۔

جب نازش اور کامران تھیٹر میں داخل ہوئے تو چاروں اسٹوڈنٹس ایک ساتھ بیٹھے دھیمے لہجے میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

تھیٹر درحقیقت ایک بہت بڑے سائز کا کلاس روم تھا جس سے لیکچر ہال کا کام لیا جاتا تھا۔ اس بڑے سے کلاس روم کے ایک سرے پر ایک چھوٹا سا اسٹیج بنا ہوا تھا جس پر اداکاروں کی ایک مختصر ٹولی اگر اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتی تو اسے بطور تھیٹر بھی استعمال میں لایا جا سکتا تھا۔ البتہ ایک ہی وقت میں اس اسٹیج پر چھ سے زیادہ افراد کے لیے اداکاری کا مظاہرہ کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔

اتنے میں اس گروپ کا لیڈر آگے بڑھا۔ وہ ایک دراز قامت دبلا پتلا اسٹوڈنٹ تھا جس کے بالوں اور آنکھوں کی رنگت براؤن تھی۔ اس نے گرم جوشی کے ساتھ مسکراتے ہوئے سر کی جنبش سے نازش کو سلام کیا اور مصافحے کے لیے کامران کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

"میرا نام جمشید جعفری ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نازش نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کامران کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔ "میں لیفٹیننٹ نازش ہوں۔ یہ سارجنٹ کامران ہیں۔ ہم پولیس کے سراغ رساں ہیں۔"

جمشید جعفری نے بقیہ کاسٹ کا تعارف کرایا۔

نازش نے اپنی توجہ جمشید جعفری کی جانب مرکوز کر دی۔ "لاش کس نے دریافت کی تھی؟" نازش نے پوچھا۔

"ہم سب نے دریافت کی تھی۔" جمشید نے بتایا۔ "ہم اکٹھے یہاں آئے تھے۔ ہم کیمپس میں رہتے ہیں اس لیے عام طور پر ریہرسل کے دن ناشتا اکٹھے کرتے ہیں۔ آج بھی ناشتے کے بعد ہم ایک ساتھ یہاں آگئے تھے۔" اس نے شانے اچکا دیے۔ "جب پروفیسر سارہ تھیٹر میں نہیں آئیں تو ہم انہیں دیکھنے کے لیے لیبارٹری چلے گئے۔"

"تم نے کسی اور کو یہاں نہیں دیکھا؟"

جمشید جعفری نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تم میں سے کسی نے کسی چیز کو چھوا تو نہیں؟" کامران نے پوچھا۔

چاروں نے جواب میں ایک ساتھ انکار میں سر ہلا دیے۔

"کیا تم میں سے کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ مرنے سے پہلے پروفیسر نے وہ کارڈ اپنی گرفت میں کیوں لے لیا تھا جس پر 'عورت' کے سمبل کا نشان بنا ہوا ہے؟"

اس مرتبہ بھی ان چاروں نے نفی میں سر ہلا دیے۔

"ڈاکٹر سارہ اپنے لیکچرز کے دوران میں اکثر ان علامتی نشانات کو استعمال میں لاتی تھیں۔" گروپ کے دوسرے اسٹوڈنٹ آصف قریشی نے کہا۔ "لیکن مجھے کوئی آئیڈیا نہیں کہ انہوں نے اس نشان کا انتخاب کیوں کیا۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہ ایک اتفاق ہو۔" گروپ کی ایک اور اسٹوڈنٹ نازلی رفیق نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ "وہ چونکہ آخری سانسیں لے رہی تھیں، اس لیے انہوں نے ہاتھ پیر چلائے ہوں گے اور وہ علامتی نشان ان کے ہاتھ میں آگیا ہوگا۔"

"میرے خیال میں یہ بات نہیں ہے۔" نازش نے کہا۔ "انہیں پشت میں قینچی گھونپی گئی ہے۔ وہ علامتی نشانات وہاں سے تھوڑی دور دوسری جانب دیوار پر آویزاں تھے۔ وہاں سے نشانات والی دیوار تک خون کی ایک لکیر موجود ہے۔ یہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ان کے پاس اس نشان کو اپنی گرفت میں لینے کا ایک عمدہ جواز تھا۔"

"کیا تم لوگوں کے خیال میں کسی کے پاس ان کو قتل کرنے کا کوئی جواز ہو سکتا ہے؟" کامران نے پوچھا۔

اس مرتبہ بھی چاروں اسٹوڈنٹس نے ایک ساتھ ہی نفی میں سر ہلا دیے۔ اچانک گوہر بقیہ لوگوں سے علیحدہ کھڑی ہوئی تھی

وجہ تعاقب

براؤن کار میں اپنی بیوی کے ساتھ سسرال جا رہا تھا۔ ان دونوں کے پیچھے ایک خاتون ڈرائیو کر رہی تھیں۔ انہوں نے اوورٹیک کرنے کے لیے ہارن بجایا اور براؤن نے بڑی سعادت مندی سے انہیں راستہ دے دیا۔ وہ خاتون آگے نکل گئیں۔

لیکن آگے جاتے ہی خاتون نے اس حد تک اپنی کار ہلکی کر لی کہ مجبوراً براؤن کو آگے نکلنا پڑا۔ خاتون نے دوبارہ براؤن کو اوورٹیک کیا۔

یہ کھیل دیر تک چلتا رہا۔ پہلے وہ خاتون براؤن کو اوورٹیک کرتیں، پھر کار ہلکی کر کے اسے اوورٹیک کرنے کا موقع دیتیں۔ وہ انہیں اوورٹیک کر لیتا تو ایک بار پھر ان پر اوورٹیک کا بھوت سوار ہو جاتا۔

کئی میل کے اس کھیل کے بعد کسی حادثے کے باعث آگے ٹریفک جام تھا۔ خاتون اور براؤن کو اپنی اپنی کاریں روکنا پڑیں۔

کار سے اتر کر براؤن ان خاتون کے پاس گیا اور بڑے ادب سے کہا۔ "محترمہ! میں سمجھتا ہوں کہ میری ڈرائیونگ میں ایسی کوئی خامی نہیں تھی جس کی وجہ سے آپ کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو مسلسل اوورٹیک کیوں کرتے رہے ہیں؟"

"اوہ۔" خاتون نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں اس سویٹر کا نمونہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو تمہاری بیوی نے پہن رکھا ہے... اور اس کی ایک ہی صورت تھی کہ تمہیں اوورٹیک کر کے سویٹر دیکھوں اور دوبارہ اپنے آپ کو اوورٹیک کرا کے سویٹر پر نظر ڈالوں۔"

(کوٹری سے حمیرا اقبال کا شگوفہ)

ملزم

ملزم کو دو ہفتے حوالات میں رکھنے کے بعد پولیس نے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا تو اس کا بیان سننے کے بعد مجسٹریٹ نے اسے رہا کر دیا۔ اس نے عدالت سے درخواست کی۔ "جناب والا! مجھے دو ہفتے قید میں رکھا گیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو اس کے عوض کوئی چھوٹا موٹا جرم کر لوں؟"

(حیدرآباد سے فرحان شیخ کا استفسار)

اور نروس زدہ انداز میں بار بار پہلو بدل رہی تھی۔

"کیا ہمیں کسی وکیل کی ضرورت ہوگی؟" اس نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

نازش نے شانے اچکا دیے۔ "یہ تم لوگوں پر منحصر ہے۔" اس نے کہا۔ "اس لمحے تو میں صرف معلومات حاصل کر رہی ہوں۔"

"ویل۔" انجا گویا ہوئی۔ "جمشید نے غلط کہا ہے کہ کوئی اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

جمشید نے کچھ کہنا چاہا لیکن انجا نے اسے بولنے سے روک دیا اور کہنے لگی۔ "کم آن جمشید! ہم میں سے کوئی بھی انہیں پسند نہیں کرتا تھا۔ اس حقیقت کا سامنا کرنے سے گریز مت کرو۔ وہ ایک کینہ پرور عورت تھی۔ اس کی وجہ سے ہم اس شو کو موقوف کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن وجہ یہ ہوئی کہ ہم نہ صرف اپنا اتنا قیمتی وقت صرف کر چکے تھے بلکہ ہم نے دل و جان سے محنت بھی کی تھی۔ اسی بنا پر ہم اب تک اس سے وابستہ تھے۔" انجا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور تمام باتوں کے علاوہ یہ ایک مزاحیہ شو ہے جو ہم دوسروں کی دل بستگی کے لیے کرنے جا رہے تھے۔"

"اور ہمیں اس کام کے عوض ایکسٹرا کریڈٹ ملنے کی توقع ہے۔" آصف نے کہا۔ "خدا بہتر جانتا ہے کہ اب ہمیں ملے گا یا نہیں۔"

جمشید نے آصف کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

نازش ان سب سے مخاطب ہو کر بولی۔ "فی الوقت ہم جو نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ سارہ بخاری کی موت کو لگ بھگ تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔ کیا اس وقت تم سب ایک ساتھ تھے؟ میرا مطلب تین گھنٹے قبل کے وقت سے ہے۔"

جمشید نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ "اس لحاظ سے اس وقت صبح کے چھ بجے ہوں گے یا یہی وقت رہا ہوگا۔ نہیں، ہم ناشتا سات بجے کرتے ہیں۔ چھ بجے تو میں اپنے کیمپس کی لانڈری میں اپنے کپڑے دھو رہا تھا۔"

"کیا وہاں اور کوئی بھی موجود تھا؟" نازش نے پوچھا۔

جمشید نے شانے اچکا دیے۔ "نہیں، میرے خیال سے وہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ ندامت کے انداز میں مسکرا دیا۔ "سو میں گمان کروں کہ میں بھی مشتبہ ہوں؟"

نازش، نازلی کی جانب گھوم گئی۔ "تم اس وقت کہاں تھیں؟" اس نے پوچھا۔

نازلی سوچ میں پڑ گئی اور اس کی پیشانی کی لکیریں ابھر آئیں۔ "چھ بجے..." اس نے قدرے توقف کیا جیسے اپنی یادداشت پر زور دے رہی ہو۔ "چھ بجے... ہاں، اس وقت میں اپنے کمرے میں اپنی لائنیں یاد کر رہی تھی۔"

"تنہا؟"

"ہاں۔" اس نے اپنی پیشانی پر آئے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے دھکیلتے ہوئے جواب دیا۔ "درحقیقت اس وقت کسی نے میرے دروازے پر دستک بھی دی تھی لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں ڈسٹرب نہیں ہونا چاہتی تھی۔" اس کا چہرہ اس کے نروس پن کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ "لہٰذا جس کسی نے بھی میرے دروازے پر دستک دی تھی وہ آپ کو یہی بتائے گا کہ میں اپنے کمرے میں موجود نہیں تھی۔ یہ بُرا ہوگا، ہے نا؟"

نازش نے جواب میں صرف شانے اچکا دیے اور اپنے پیڈ پر کچھ نوٹ کرنے لگی۔

پھر وہ آصف کی جانب متوجہ ہوگئی اور بھویں اچکاتے ہوئے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس نے زبان سے کوئی سوال نہیں کیا۔

"میں اس وقت جمنازیم میں ورزش کر رہا تھا۔" آصف نے نازش کے سوال کرنے سے قبل ہی خود سے جواب دے دیا۔ پھر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ایک آدھ اور اسٹوڈنٹ بھی اس وقت وہاں موجود تھے لیکن وہ دوسرے کمرے میں تھے۔ مجھے نہیں لگتا کہ انہوں نے مجھے دیکھا ہوگا اور اگر دیکھا بھی ہوگا تو غالباً انہیں یاد نہیں آئے گا۔"

"کیا تم ان کے نام جانتے ہو؟"

آصف ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ "نہیں، گو میں نے انہیں پہلے بھی وہاں دیکھا ہے اور میں آپ کے لیے انہیں شناخت بھی کر سکتا ہوں لیکن جیسا کہ میں نے کہا، میں نہیں سمجھتا کہ وہ کوئی مدد کر سکیں گے۔"

نازش اب انجا کی جانب متوجہ ہوگئی۔

انجا نروس زدہ انداز میں اپنی زلفوں سے کھیل رہی تھی۔ "میں یہیں پر تھی۔" اس نے نازش کی استفہامیہ نظروں کے جواب میں کہا۔

"تم کیا کر رہی تھیں؟"

"میں ڈریسنگ روم میں اپنے ڈرامے کے کاسٹیوم کو رفو کر رہی تھی۔"

اس بات پر نازش کا دھیان اس قینچی پر چلا گیا جو پروفیسر سارہ بخاری کی پشت میں گھونپی گئی تھی۔ یہ قینچی ڈریسنگ روم سے اٹھائی گئی ہوگی، وہ سوچنے لگی۔

"مجھے ڈر ہے کہ یہ میری جائے واردات سے عدم موجودگی کا کوئی ٹھوس عذر نہیں ہے۔ اس لیے کہ ڈریسنگ روم، لیبارٹری سے بہت زیادہ قریب ہے۔" انجا نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ خوف اس کی نگاہوں سے عیاں تھا۔

"اور میرے خیال سے تمہاری اس داستان کی تصدیق کرنے والا کوئی بھی نہیں ہوگا۔" نازش نے کہا۔

انجا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میں یہاں تنہا تھی۔ میں نے نہ ہی کسی کو دیکھا اور نہ ہی کچھ سنا... اور جہاں تک میرے علم میں ہے، مجھے بھی یہاں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔"

"اوکے!" نازش نے اپنا نوٹ پیڈ بند کرتے ہوئے کہا۔ پھر نوٹ پیڈ اپنے شولڈر بیگ میں رکھتے ہوئے ان چاروں اسٹوڈنٹس سے مخاطب ہوئی۔ "اب تم لوگ جا سکتے ہو لیکن اپنے نام و پتے چھوڑ جانا جہاں تم سے رابطہ کیا جا سکے۔ مجھے شاید تم لوگوں سے مزید سوالات کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔"

چاروں اسٹوڈنٹس آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے سے باہر کی جانب چل دیے۔ اس دوران انہوں نے نہ تو آپس میں کوئی بات کی اور نہ ہی نازش سے مخاطب ہوئے۔ پھر وہ خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد نازش، کامران کی جانب گھوم گئی۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے اپنے اسسٹنٹ سے پوچھا۔

کامران نے شانے اچکا دیے۔ "ان میں سے کسی کے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا کوئی ٹھوس جواز نہیں ہے اور اس کے باوجود جیسا کہ جمشید نے کہا کہ کوئی بھی پروفیسر سارہ کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا، یہ بات بھی نمایاں ہے کہ پروفیسر سارہ ان چاروں کی اس فہرست میں شامل نہیں تھی جنہیں تہواروں پر تہنیتی کارڈ ارسال کیے جاتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ڈرامے کی کاسٹ کے ان چاروں ممبروں کے علاوہ دیگر بھی ہیں جن کے احساسات بھی یقیناً وہی ہوں گے جو ان چاروں کے ہیں۔" نازش نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال سے وہ کیس زیادہ مشتبہ ہوتا ہے جہاں قاتل رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے۔"

منطقی چور اور باغ کا مالی

ایک چور ایک باغ میں گھس کر آموں کے ایک پیڑ پر چڑھ گیا۔ اس نے اس کی شاخوں کو اس قدر جھنجھوڑا کہ تمام آم نیچے آ پڑے۔ اتفاقاً باغبان بھی آ گیا اور چور کو دیکھ کر کہنے لگا۔ "کچھ خدا کا بھی خوف کرنا چاہیے۔ تجھے آخر مرنا اور پھر حساب کتاب کے لیے قیامت کے دن اٹھنا ہے۔ خدا کو کیا منہ دکھائے گا؟"

چور بولا۔ "تم کون ہو؟ یہ باغ خدا کا ہے اور میں کھاتا ہوں۔ اس کے حکم کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہلتا۔ تمہاری بات میں بڑی جہالت ہے، عقل نام کو بھی نہیں۔" باغبان نے سن کر دل میں کہا چور بڑا منطقی ہے۔ میں اسی کی منطق میں ایسا باصواب جواب دوں گا کہ عمر بھر بھی نہ بھولے گا۔

باغبان بولا۔ "حضرت نیچے آئیے۔ ہم پر کرم فرمائیے، آپ کی صحبت غنیمت ہے۔ مدت کے بعد آپ جیسا بزرگ ملا ہے جس نے توحید کا نکتہ حل کر دیا ہے۔ پیر و مرشد تشریف لائیے اور ہمیں راہ نجات دکھائیے۔" چور نیچے اتر آیا۔ باغبان نے وہیں پکڑ لیا اور آم کے درخت سے باندھ کر پہلے مکوں سے اس کی تواضع کی جب تھک گیا تو لاٹھی سے اس کی خوب مرمت کی۔ چور فریاد کرنے لگا کہ اے ظالم، خدا سے ڈر میں نے تیرا کیا نقصان کیا ہے کہ بے گناہ کو یوں بیدردی سے پیٹ رہا ہے۔ باغبان نے ہنس کر جواب دیا۔ "حضرت، اتنی جلدی اپنا دعویٰ بھول گئے۔ کیا اس لاٹھی کو خدا نے پیدا نہیں کیا؟ کیا مارنے والا ہاتھ اور مار کھانے والا جسم خدا کا ہی پیدا کردہ نہیں ہے؟ آپ کیوں ناحق گلہ کرتے ہیں۔ اس میں آپ کا کیا نقصان ہے۔ اس کے حکم کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ یہ آپ کی فریاد جاہلانہ ہے۔"

چور نے کہا۔ "میں نے جھک ماری مجھے اس کی اب چھوڑ دے۔ آئندہ میں کبھی ایسی بات منہ سے نہ نکالوں گا۔"

مرسلہ: طیب شاہین، کھیالہ شیخاں

اس بات پر کامران نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "اور ایسا کیس بور کردینے والا بھی ہوتا ہے۔"

"میں اس قسم کے بور کردینے والے کیسز کے باوجود بھی زندہ تو رہ سکتی ہوں۔" نازش کے لہجے سے بیزاری عیاں تھی۔

پھر اس نے اپنے شولڈر بیگ میں سے نوٹ پیڈ نکالا اور اسے کھول کر چند منٹ تک اس کا بہ غور مطالعہ کرتی رہی۔

"پروفیسر سارہ بخاری ایک پستہ قد عورت تھی اور ڈرامے کی کاسٹ کے تمام ممبروں کے قد عمدہ سائز کے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی پروفیسر کو بہ آسانی قتل کرسکتا تھا۔" نازش نے کہا۔

کامران نے سر ہلا دیا۔ "آلۂ قتل کے انتخاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کی یہ واردات کسی منصوبے کے تحت نہیں کی گئی بلکہ یہ ایک برمحل اقدام تھا۔ ورنہ آلۂ قتل کے طور پر چاقو ایک بہتر انتخاب ہوتا۔" اس نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" نازش نے کہا۔ "لیکن قاتل یہ نہیں چاہتا ہوگا کہ چاقو جیسا ہتھیار لے کر عمارت میں داخل ہو۔ وہ سیکیورٹی کے عملے یا کسی اور کی نگاہوں میں آنے کا رسک نہیں لینا چاہتا ہوگا۔"

کامران نے کہا۔ "سو اب کیا، کیا جائے؟"

نازش نے شانے اچکا دیے۔ "وہی معمول کا طریقہ کار۔ تم جانتے ہو کہ ہماری روٹین کیا ہوتی ہے؟"

کامران نے اپنی جیب میں سے ایک ٹوتھ پک نکالی اور اسے منہ میں دبا کر چباتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ "چیف نے حسب عادت جلدی جواب طلب کرنا ہے۔ مقتولہ کوئی ناپسندیدہ یا عام شخصیت نہیں تھی۔ وہ ایک معروف یونیورسٹی کی ایک قابلِ احترام پروفیسر تھی۔"

"جیسے ہی ہمیں جواب ملے گا، ہم چیف کو بھی باخبر کردیں گے۔" نازش نے جواب دیا۔ "میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہتی۔"

کامران نے نازش کے جواب پر کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ ان دونوں کو ایک ساتھ کام کرتے ہوئے اتنا عرصہ ہوگیا تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ دوسرا کیا محسوس کرتا ہے اور ان کے احساسات ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہوتے تھے۔

☆☆☆

"کیا رہا؟" چیف کیپٹن جنید نے نازش اور کامران کے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"فی الوقت ہمارے پاس چار امکانی مشتبہ افراد ہیں۔" نازش نے بتایا۔ "لیکن ان کے بارے میں کسی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قاتل ان چاروں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔"

"تمہارے پاس ثبوت کیا ہے؟" جنید نے پوچھا۔

نازش نے شانے اچکا دیے۔ "نہایت معمولی سا ثبوت ہے... ایک قینچی، ایک سائن۔ ہم دیکھیں گے کہ آیا ہمیں اس قینچی پر سے کوئی کام کی چیز مل سکتی ہے لیکن میں اس بارے میں زیادہ پُرامید نہیں ہوں۔ ہم نے انگلیوں کے نشانات حاصل کرنے کے لیے قینچی پر پاؤڈر چھڑکا تھا لیکن اس سے کوئی مدد نہیں ملی۔ یونیورسٹی میں ہر کسی کا لیبارٹری میں آنا جانا رہتا ہے۔"

چیف خاموشی سے نازش کی بات سن رہا تھا۔

نازش قدرے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔

"صرف ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ پروفیسر سارہ کی میز اور فائلنگ کیبنٹ کو اس طرح بالکل صاف کیا گیا ہے کہ ان پر کسی کے بھی انگلیوں کے نشانات موجود نہیں ہیں... حتیٰ کہ پروفیسر سارہ کے بھی نہیں۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ قاتل نے اپنی انگلیوں کے نشانات مٹانے کی مذموم حرکت کی ہے۔"

کیپٹن جنید نے تیوریاں چڑھالیں اور پوچھا۔ "تم کس قسم کے سائن کی بات کررہی تھیں؟"

جواب میں نازش نے ایک پیڈ پر وہ نشان بنایا اور چیف کے سامنے رکھ دیا۔ "وہ ایک سائن تھا جو ہوتے بھی جو کہ عورت کی علامت ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نشان تھامنے کا اس کا کوئی مقصد تھا۔ لیکن مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ وہ ہمیں کیا بتانا چاہ رہی تھی۔"

اس بات پر کیپٹن جنید کی پیشانی کے بل اور گہرے ہوگئے اور وہ نازش کے بنائے ہوئے نشان کا بغور جائزہ لینے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد اس کے حلق سے ایک غراہٹ سی بلند ہوئی اور وہ اپنی میز کی جانب گھوم گیا۔ "جب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوجاتے، کسی دن بھی چھٹی نہیں ہوگی۔" چیف نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

پھر چیف نے اپنا بال پین اٹھایا اور کچھ لکھنا شروع کردیا۔

نازش اپنے تجربے کی بنا پر چیف کا شارہ سمجھ گئی۔ کہ یہ میٹنگ اب برخاست سمجھی جائے۔ نازش نے [illegible]

[illegible] کامران کو آنکھ ماری اور وہ دونوں چیف کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

"جانتے ہو، گزشتہ شب وہاں متعدد طالب علم موجود تھے۔" نازش نے کامران سے کہا۔ "ان میں سے کوئی بھی لیبارٹری میں گیا ہوگا اور اس نے پروفیسر سارہ کو قتل کردیا ہو۔ ہم پر کام کا بہت بھاری بوجھ آن پڑا ہے۔" نازش نے ایک آہ بھری۔

"ہاں۔" کامران نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے پاس جو واحد حقیقی کلیو ہے، وہ کارڈ بورڈ سائن ہے اور وہ مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا۔"

"میں بھی تم سے متفق ہوں۔" نازش نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے خیالات میں اتنی کھوئی ہوئی تھی کہ غیر حاضر دماغی کی بنا پر فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی ہوئی اپنی کار کے پاس سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی۔

جب وہ کار سے خاصے فاصلے پر پہنچی تو کامران نے بلند آواز سے پکارا۔ "کیا گھر پیدل جانے کا ارادہ ہے؟"

تب نازش جھینپ گئی اور مسکراتے ہوئے اپنی کار کی جانب پلٹ آئی۔

☆☆☆

پروفیسر ترمذی کے ساتھ نازش کا انٹرویو کچھ خاص کارآمد ثابت نہیں ہوا۔

"ہاں۔" پروفیسر نے نازش کے سوال کے جواب میں کہا۔ "جہاں تک لوگوں کے ساتھ تعلقات کی بات ہے تو اس معاملے میں پروفیسر سارہ بخاری کو کچھ پرابلم تھا۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، اس کا فیکلٹی میں کوئی دوست، کوئی سہیلی نہیں تھی۔" یہ کہتے ہوئے پروفیسر ترمذی نے بے چینی سے اپنی کرسی پر پہلو بدلا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن یقینی طور پر اس سے کوئی نفرت بھی نہیں کرتا تھا۔ کم از کم اس حد تک نہیں کہ اسے قتل کردے۔" اس نے یہ جملہ بڑی تیزی سے ادا کیا۔

اس جملے پر نازش نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "اس نے خود اپ کو قتل نہیں کیا ہے، پروفیسر۔" نازش نے کہا۔ "لہٰذا کسی نہ کسی نے... فیکلٹی یا اسٹوڈنٹ نے لازمی اسے قتل کیا ہے۔ اگر ہمیں یہ پتا چل جائے کہ کسی کے پاس اس بات کی [illegible] تھی کہ وہ پروفیسر سارہ بخاری کو مردہ دیکھنا چاہتا تھا تو [illegible] ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔"

پستہ قد پروفیسر ترمذی نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ خاموش رہا۔

نازش صبر و سکون کے ساتھ اس کے بولنے کی منتظر تھی۔

بالآخر کافی دیر کی خاموشی کے بعد پروفیسر آگے کی جانب جھکا اور گویا ہوا۔ "جیسا کہ میں نے کہا، فیکلٹی کے دیگر ممبرز پروفیسر سارہ بخاری کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن وہ ان میں سے کسی کے لیے خطرہ بھی نہیں تھی۔ اور میرے خیال میں اس کا کوئی سبب بھی نہیں کہ ان میں سے کوئی بھی اسے قتل کرکے اپنے کیریئر یا زندگی کا رسک لے سکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہلکے سے مسکرادیا۔ "اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں کسی ایک اسٹوڈنٹ پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا۔"

پھر وہ اپنی میز پر رکھے ہوئے کاغذات الٹ پلٹ کرنے لگا۔ اس نے ان میں سے ایک کاغذ کا انتخاب کیا اور اس پر ایک سرسری نگاہ دوڑانے کے بعد بولا۔ "جمشید سائنس کا طالب علم ہے اور پروفیسر سارہ بخاری کی دو کلاسیں اٹینڈ کرتا تھا۔ ایک مضمون کی کلاس میں اس کی کارکردگی عمدہ تھی لیکن دوسرے مضمون میں وہ کمزور جا رہا تھا اور عمدہ کارکردگی کی جدوجہد کررہا تھا۔ البتہ مجھے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ پروفیسر سارہ بخاری کو قتل کردے۔ کم از کم کوئی تعلیمی یا درسی وجہ نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی ذاتی تعلق ہو جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہ ہو۔"

نازش نے اس بات پر تیوریاں چڑھالیں۔ "ذاتی تعلق... کس حد تک ذاتی؟"

نازش کے چونکنے پر پروفیسر ترمذی نے ہاتھ لہراتے ہوئے اس کے خاموش خیال کی تردید کردی۔ "میں ایک ٹیچر، اسٹوڈنٹ تعلقات کے علاوہ کسی اور جانب اشارہ نہیں کررہا ہوں۔ سارہ بخاری نے ایک مثالی زندگی گزاری ہے۔ اس نے کبھی کسی اسٹوڈنٹ کے ساتھ ذاتی تعلقات استوار نہیں کیے... خاص طور پر کسی مرد طالب علم کے ساتھ۔"

"کیا وہ شادی شدہ تھی؟"

"نہیں، اس نے خود کو اپنے کیریئر کے لیے وقف کر رکھا تھا اور بقول اس کے شادی یا کسی سے تعلقات ایک تکلیف دہ امر ہے جس کی مجھے قطعی ضرورت نہیں۔ وہ اکثر یہی کہا کرتی تھی۔" پروفیسر ترمذی نے بتایا۔

"سو میں جنس یا حسد کو قتل کی ترغیب کے طور پر خارج قرار دے سکتی ہوں؟" نازش نے پوچھا۔

"میرا تو اس بات پر یقین ہے۔" پروفیسر ترمذی نے کہا پھر ایک لمبا سانس لیتے ہوئے بولا۔ "میں یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ میں سارہ بخاری کو اس بہتر حد تک جانتا تھا لیکن مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں کردار کی شناخت کے معاملے

میں خاصا عمدہ جج ثابت ہوا ہوں۔'' پروفیسر ترمذی کے ہونٹوں پر ایک بار پھر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''یقیناً انسانی کیفیت کو مدِنظر رکھا جائے تو کچھ بھی ممکن ہے۔''

''دیگر کے بارے میں کیا کہیں گے؟'' نازش نے پوچھا۔

پروفیسر نے اپنی توجہ اپنے سامنے موجود کاغذ پر کرتے ہوئے کچھ توقف کیا پھر بولا۔ ''نازلی یہاں اسکالرشپ پر آئی ہوئی ہے۔ اگر وہ اپنی یہ اسکالرشپ برقرار رکھنا چاہتی ہے تو گریڈز اس کے لیے نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔''

پھر پروفیسر نے کاغذات کے ڈھیر میں سے ایک اور کاغذ نکالا اور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد گویا ہوا۔ ''بیالوجی کے مڈٹرم میں اس کا گریڈ ''سی'' تھا۔ اسے اپنا گریڈ کم از کم ''بی'' تک لانے کی ازحد ضرورت تھی۔ اور نئی ٹرم کی نصف مدت گزرنے کے باوجود وہ اب بھی اس لیول تک نہیں پہنچی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے پروفیسر ترمذی نے شانے اچکا دیے۔

''یہ ترغیب کی وجہ ہو سکتی ہے؟ شاید... لیکن نازلی اس ٹائپ کی لڑکی نہیں لگتی۔''

نازش کے حلق سے غراہٹ سی بلند ہوئی۔ ''پروفیسر ترمذی مجھے اس پیشے سے وابستہ ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے اور میں جانتی ہوں کہ ''ٹائپ'' قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میرا یقین تو یہ ہے کہ ہم سب ہی صلاحیت رکھتے ہیں اور اگر ہمیں ایک خاصا مضبوط سبب میسر آجائے تو ہم قتل کے مرتکب ہونے کی صلاحیت بھی آزما سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان طالب علموں میں سے کسی کے پاس بھی ایسا مضبوط سبب ہو سکتا ہے کہ وہ اس قتل کا ارتکاب کر بیٹھے؟''

پروفیسر نے شانے اچکا دیے۔ ''کچھ نہیں۔ وہ ایک عام سی اسٹوڈنٹ ہے۔ اس کا تعلق اندرونِ سندھ سے ہے اور وہ یہاں جزوی اسکالرشپ پر آئی ہوئی ہے۔ وہ بزنس پڑھ رہی ہے اور پروفیسر سارہ بخاری کی اسٹوڈنٹ ہے۔''

نازش نے غیر متاثر انداز میں شانے اچکا دیے۔ ''انیتا نے مجھے بتایا ہے کہ ہر کوئی پروفیسر سارہ بخاری سے نفرت کرتا تھا۔ ڈرامے کے تمام ممبرز پروفیسر سارہ کی وجہ سے اس ڈرامے سے تقریباً خیر باد کہہ چکے تھے۔ یہ کسی وفادار مداح کے خیالات یقینی طور پر نہیں ہو سکتے۔''

اس پر پروفیسر ترمذی نے تیزی سے پلکیں جھپکانا شروع کر دیں۔ پھر اس نے اپنی عینک اتاری اور اپنے رومال سے اس کے شیشے چمکانے لگا۔ پھر عینک دوبارہ پہننے کے بعد بولا۔ ''جیسا کہ میں نے کہا پروفیسر سارہ بخاری ایک پسندیدہ فرد کی طرح نہیں تھی۔ میں بھی اس کی کوئی خاص پروا نہیں کرتا تھا لیکن وہ ایک عمدہ ٹیچر تھی۔ میں یہ بات ضرور کہوں گا۔ وہ اپنے مضمون کی اپنے شاگردوں کو بہت اچھی تیاری کراتی تھی اور اپنی معلومات، اپنا علم اپنے شاگردوں تک منتقل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔''

''اس کے باوجود بھی کوئی نہ کوئی ایسا تھا... جو چابی سے اندر داخل ہوا جسے کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ پروفیسر سارہ بخاری سے اس حد تک نفرت کرتا تھا کہ اس نے اسے قتل کر دیا۔ یہ نفرت کی انتہا اس قتل کا محرک ہو سکتی ہے۔'' نازش نے کہا۔

''میں اس بات سے اختلاف نہیں کر سکتا۔'' پروفیسر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''آصف کے بارے میں کیا کہیں گے؟'' نازش نے فہرست پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

پروفیسر ترمذی کے حلق سے ایک غراہٹ سی بلند ہوئی اور اس نے ایک بار پھر اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ پھر گویا ہوا۔ ''وہ ایک اسپورٹس مین ہے اور فٹ بال کھیلتا ہے۔ وہ یہاں جزوی ایتھلیٹک اسکالرشپ پر آیا ہوا ہے۔''

''کیا گریڈ اس کے لیے اہمیت رکھتے ہیں؟'' نازش نے قدرے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''میرا جواب ہاں اور نہیں دونوں میں ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''تکنیکی طور پر ایتھلیٹک اسکالرشپ کے لیے بھی گریڈ اسی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جیسے کہ تدریس میں اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اسپورٹس پر خصوصی اہمیت کی وجہ سے بہت سے پروفیسرز پر کوچز کا دباؤ یا مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ ان ایتھلیٹس کو پاسنگ گریڈ دے دیں چاہے وہ اس کے مستحق ہوں یا نہ ہوں۔'' پروفیسر نے افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے بتایا۔

''اگر بیالوجی میں آصف فیل ہو جاتا ہے تو اس کی بدولت وہ اسکالرشپ سے محروم ہو جائے گا۔ کیا یہ ... مضبوط جواز نہیں جو قتل کا محرک بن جائے؟'' نازش نے سوال کیا۔

''میں اس بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔'' پروفیسر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مسئلہ تو یہی ہے۔ آصف بیالوجی میں 'سی پلس' گریڈ کا حامل ہے۔''

اس پر نازش کے منہ سے ایک آہ نکل گئی اور وہ

پرچے پر کچھ نوٹ کرنے لگی۔ پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تمہارا بہت وقت لے لیا۔ میں تمہارے تعاون کی مشکور ہوں، پروفیسر!''

''کاش میں تمہارے لیے اس سے زیادہ مددگار ثابت ہو سکتا۔'' پروفیسر نے کہا۔

☆☆☆

پروفیسر سارہ بخاری کے بارے میں انیتا کا بیان اب بھی وہی تھا جو اس نے پہلے دیا تھا۔ البتہ اس نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس کے احساسات اتنے شدید بھی نہیں تھے کہ وہ اس جیسے جرم کا ارتکاب کر بیٹھتی۔

''کیا پروفیسر سارہ بخاری کے بارے میں اپنے احساسات سے متعلق تم نے دیگر اسٹوڈنٹس سے کوئی اظہارِ خیال کیا تھا؟'' نازش نے پوچھا۔

انیتا نے انکار میں گردن ہلا دی۔ ''یہ کبھی بھی ہماری گفتگو کا موضوع نہیں رہا۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

انیتا نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر قدرے ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''وہ ایک... میں کیا بتاؤں... وضاحت کرنا مشکل ہے۔''

''پھر بھی؟''

''وہ سرد مزاج، متکبر عورت تھی۔ اس کی کلاس میں اگر آپ کو کوئی پرابلم درپیش ہوتا تھا تو اس کے بارے میں اس سے بات کرنا ناممکن تھا۔''

''اور کچھ؟''

''اس میں حسِ مزاح بھی نہیں تھی۔''

''لیکن وہ اپنے اوقاتِ کار کے علاوہ اس مزاحیہ ڈرامے کی ہدایت کاری کے فرائض بھی سرانجام دے رہی تھی جس میں تم بھی ایک کردار ادا کر رہی ہو۔'' نازش نے کہا۔

''جی ہاں۔''

''اس بات سے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے اپنے عملی تدریس کے حلقے سے باہر اس کے اندر مزاح کی ستائش کا جذبہ موجود تھا۔ جب ہی تو وہ اس مزاحیہ تمثیل کی ہدایات دے رہی تھی۔''

اس بات پر انیتا نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''وہ کیوں؟''

''یہ ایک سالانہ ایونٹ ہے... یوں کہنا چاہیے کہ بس روایت... اور فیکلٹی باری باری آنے کی … ڈراموں کی

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

ہدایات دیتی ہے۔ اس سال باری ڈاکٹر سارہ بخاری کی تھی۔ وہ اپنی رضامندی سے ہدایت کاری کے فرائض سرانجام نہیں دے رہی تھی۔''

''اوکے۔'' نازش نے کہا۔ ''تمہارے تعاون کا بے حد شکریہ۔''

انیتا جواباً دھیرے سے مسکرا دی اور وہاں سے چلی گئی۔

پھر آصف، جمشید اور نازلی سے پروفیسر سارہ بخاری کی موت اور گرد و پیش کے حالات کے بارے میں جو کچھ بات چیت ہوئی، وہ تقریباً وہی تھی جو انیتا نے کی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی اس بارے میں مزید روشنی نہیں ڈال سکا۔

نازش کو ان چاروں سے گفتگو کے بعد اس کیس کے بارے میں مزید کوئی مدد نہیں مل سکی۔

☆☆☆

نازش دفتر واپس جاتے ہوئے راستے میں فارنسک لیبارٹری پر رک گئی۔

''تم مجھے اس قینچی کے بارے میں کیا معلومات فراہم کر سکتے ہو جو پروفیسر سارہ بخاری کے قتل میں استعمال ہوئی تھی؟'' نازش نے احمر جلیسی سے پوچھا۔

وہ بکھرے بالوں والا اور جلدی بولنے والا شخص تھا۔

''نازش، میری جان! مجھے امید تھی کہ تم یہ بات ضرور پوچھو گی۔''

''مطلب کی بات کرو، احمر!''

''تم بھی مطلب کی بات کرو۔'' احمر نے شرارتی لہجے میں کہا اور زبان چڑا دی۔

''میں نے مطلب ہی کی بات کی ہے۔''

''تو پھر تم مجھ سے کب شادی کر رہی ہو؟''

''جب تمہیں شیو بنانے کی تمیز آجائے گی۔'' نازش نے کہا۔ ''اس دوران میں مجھے ایک کیس حل کرنا ہے۔ کیا تم مدد کرسکتے ہو؟''

تب احمر بھی سنجیدہ ہوگیا۔ ''مشکل ہے۔'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''وہ ایک عام سی قینچی ہے اور اس پر کسی کے فنگر پرنٹس نہیں ہیں۔'' احمر نے بتایا۔

''کیا انہیں رگڑ کر صاف کردیا گیا تھا؟''

''نہیں لیکن جس کسی نے بھی اسے استعمال کیا، اس نے قینچی کو اس طریقے سے پکڑا تھا کہ اس نے کسی قسم کے کارآمد نشانات باقی نہیں چھوڑے۔''

''کیا یہ قینچی لیبارٹری کے آلات میں شامل تھی یا قاتل اسے اپنے ہمراہ لیبارٹری میں لایا تھا؟'' نازش نے پوچھا۔

''اوہ، وہ قینچی لیبارٹری کے آلات میں شامل تھی۔ اس بارے میں کسی قسم کی شک وشبہے کی گنجائش نہیں۔ اس پر بہت سی چیزوں کے بقایا ذرات پائے گئے ہیں جیسے ٹشو، کھال۔ اسے مینڈکوں اور ان جیسی دیگر چیزوں کی چیر پھاڑ کے لیے استعمال میں لایا جاتا تھا۔'' احمر نے وضاحت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اوکے!'' نازش نے کہا۔ ''کیا تمہارے پاس مزید کوئی کارآمد معلومات ہیں؟''

''مثال کے طور پر؟''

''جیسے کہ ڈی این اے وغیرہ۔''

احمر نے نفی میں سرہلا دیا۔ ''نہیں۔ قاتل کا مقتولہ سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی ان کے درمیان کسی قسم کی جدوجہد ہوئی تھی۔ بظاہر مقتولہ کی پیٹھ قاتل کی جانب تھی جب اسے قینچی گھونپی گئی۔ مقتولہ کے جسم پر کسی قسم کی خراش نہیں اور نہ ہی لباس کہیں سے پھٹا ہوا ہے۔ حملے کے وقت وہ شاید قاتل کی آمد سے قطعی بے خبر تھی۔ قاتل نے اس پر دبے پاؤں وار کیا تھا۔ فی الحال تو یہی باتیں عیاں ہوئی ہیں۔''

نازش یہ سن کر بولی۔

''شکریہ احمر! تم بے حد مددگار ثابت ہو رہے ہو۔ جب میں یہ کیس حل کرلوں گی تو میں تمہاری تمام مدد کا پورا کریڈٹ تم ہی کو دوں گی۔'' نازش نے کہا۔

یہ سن کر احمر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

☆☆☆

پولیس ہیڈکوارٹر واپس پہنچ کر نازش نے اپنے چیف کیپٹن جنید سے بچ کر گزرنے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ کیپٹن جنید نے اسے گزرتے ہوئے دیکھ لیا۔

اس نے وہیں سے آواز لگائی۔ ''پروفیسر سارہ بخاری کے کیس میں کہاں تک پیش رفت ہوئی ہے؟''

نازش کو بادل ناخواستہ چیف کے روبرو حاضر ہونا پڑا۔

''کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی ہے، چیف۔ اس ابھی یونیورسٹی سے ہی آرہی ہوں۔'' نازش نے بتایا۔

''لعنت ہو۔'' کیپٹن جنید غرایا۔ ''یہ ایک بڑا کیس ہے۔ پبلک جواب مانگ رہی ہے۔''

''میں اس کیس کو حل کرنے کی بھرپور کوشش کررہی ہوں چیف...'' نازش نے اپنی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

کیپٹن جنید نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا میگزین نازش کی جانب لہرایا اور بولا۔ ''تمہیں تنخواہ اسی کام کی...''

لیکن نازش نے اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے اسے اپنا جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ وہ کیپٹن کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''آپ کیا پڑھ رہے ہیں، چیف؟'' نازش نے میگزین کے ٹائٹل پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

اس سوال پر کیپٹن جنید کی پیشانی کے بل مزید گہرے ہوگئے۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

لیکن نازش کی نظریں بدستور میگزین کے ٹائٹل کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ''سائنٹیفک امریکن!'' اس نے کہا۔

''ہاں۔''

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ایسی چیزوں میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں جن کا پولیس کے کام سے کوئی تعلق نہیں۔''

''حقیقت تو یہ ہے کہ اس میں فارنسک سائنس میں جدید ترین ڈیولپمنٹ سے متعلق ایک آرٹیکل شائع ہوا ہے۔'' کیپٹن جنید نے وضاحت کی لیکن پھر اس کا روکھا پن عود کر آیا۔ وہ غراتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں کیا پڑھتا ہوں، تمہیں اسے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔''

''اس میگزین کی ٹائٹل اسٹوری ہمارے نظام شمسی کے ارتقاء کے بارے میں ہے۔ یہ سرخی میگزین کے ٹائٹل پر جلی حروف میں چھپی ہوئی ہے۔'' نازش نے میگزین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس پر کیپٹن جنید نے میگزین اپنی میز پر اچھال دیا اور غصے سے بولا۔ ''نازش! تمہیں اپنی تمام تر توجہ پروفیسر سارہ بخاری کے کیس پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ تمہیں ہمارے نظام شمسی کے بارے میں فکرمند ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔''

لیکن نازش نے اس کی بات ان سنی کردی اور قدرے پُرجوش لہجے میں بولی۔ ''تو یہ بات ہے، چیف! اس سے پہلے اس جانب کسی کا دھیان کیوں نہیں گیا؟''

''کیا اول فول کہہ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں چیف۔'' نازش نے پُرجوش لہجے میں کہا اور دروازے کی جانب لپکی۔

''تمہیں اچانک کیا ہوگیا ہے؟'' اس نے قدرے اونچی آواز سے کہا۔ ''تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟''

لیکن نازش اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کمرے سے نکل چکی تھی۔

☆☆☆

نازلی پولیس ہیڈکوارٹر کے تفتیشی کمرے میں موجود کرسی پر دھب سے بیٹھ گئی۔ اس نے ڈائٹ کوک کا کین کھولا اور دھیرے دھیرے اس کے گھونٹ بھرنے لگی۔

گفتگو کا آغاز نازش نے کیا۔

''اگر تم اس کا اعتراف کرلو تو میں تمہاری مدد کرسکتی ہوں، نازلی۔''

نازلی کی نظریں کمرے کے فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی، البتہ باہر کے ٹریفک کا شور بے حد مدھم سنائی دے رہا تھا۔

جب نازلی نے کوئی جواب نہیں دیا تو نازش دوبارہ گویا ہوئی۔ ''اوکے! اگر تم یوں چاہتی ہو تو پھر ایسے ہی سہی۔''

نازلی اب بھی خاموش رہی۔

''ہمیں لیبارٹری میں تمہاری انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔'' نازش نے کہا۔

اس مرتبہ نازلی نے اپنی کرسی پر کسمساتے ہوئے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ ''تو کیا ہوا؟ میں لیبارٹری میں بارہا جاتی رہتی ہوں۔ البتہ جیسے میں بتا چکی ہوں کہ گزشتہ سنیچر میں وہاں نہیں گئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں تھی۔''

''ہاں۔'' نازش نے سرہلایا۔ ''تم اپنے کمرے میں بیٹھی یاد کررہی تھیں۔''

''یہ حقیقت میں پہلے بیان کرچکی ہوں۔'' نازلی نے کہا۔

''اور تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ کسی نے تمہارے کمرے کے دروازے پر دستک بھی دی تھی لیکن تم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا؟''

''ہاں۔''

''یہ ایک عمدہ جھوٹ تھا۔'' نازش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تقریباً قابل یقین...''

[illegible]

بڑا ہونہار ہے میرا بچہ اسکول میں ہمیشہ اول آتا ہے۔ بس آج چھٹی منا رہا ہے

نازلی نے اس مرتبہ کچھ نہیں کہا۔ البتہ اس کی نگاہیں بدستور کمرے کے فرش پر جمی ہوئی تھیں۔

''لیکن تمہاری انگلیوں کے نشانات ایک ایسی جگہ موجود پائے گئے ہیں جہاں نہیں ہونے چاہیے تھے۔''

''وہ کس جگہ؟'' نازلی نے بے ساختہ پوچھا۔

اس مرتبہ نازش نے براہ راست جواب دینے سے گریز کیا۔

''ہمارے خیال کے مطابق جو واقعہ پیش آیا وہ یوں تھا۔'' نازش نے کہا۔ ''بیالوجی میں اپنے کمزور گریڈ کی بنا پر تمہیں اسکالرشپ سے محروم کیے جانے کا خطرہ تھا اور مڈٹرم کے ٹیسٹ بھی سر پر آرہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے اسی ڈپریشن کی بنا پر تم ٹیسٹ کے جوابات کی تلاش میں تھیں۔ یقیناً اس دوران پروفیسر سارہ بخاری وہاں آگئی ہوں گی اور تمہیں یہ کام کرتے ہوئے پکڑ لیا۔''

''آپ یہ ثابت نہیں کرسکتیں۔'' نازلی نے کہا۔

نازش آگے کی جانب جھک گئی۔ اس کے ہاتھ نازلی سے ٹکرائے تو نازلی کپکپانے لگی۔

''میرا خیال ہے کہ ہم ثابت کرسکتے ہیں۔'' نازش نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

نازلی کے جسم پر بدستور کپکپی طاری تھی۔

''وہ فائل جس میں مڈٹرم کے جوابات موجود تھے، اس پر تمہاری انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ تمہارے پاس پروفیسر سارہ کی فائلوں کو ٹٹولنے کا کوئی جواز نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے ڈاکٹر سارہ بخاری کے بارے میں جو کچھ سنا ہے میں نہیں سمجھتی کہ وہ تمہاری اس حرکت کو نظرانداز کر دیتیں۔''

[illegible]

نازلی خاموش بیٹھی رہی۔

''اور وہ سائن، نازلی! وہ تکمیلی سائن جو پروفیسر سارہ بخاری تھامے ہوئے تھی، وہ تمہاری طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک بار جب ہم نے اندازہ کرلیا کہ وہ ہمیں کیا بتانا چاہ رہی تھی تو پھر باقی سب کچھ سمجھنا بہت آسان ہوگیا۔''

''سائن... تکمیلی سائن؟'' نازلی نے کہا۔ ''میری طرح انجا بھی تو تکمیلی ہے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟''

''نہیں، یہ سمبل بیالوجی میں تکمیلی کے لیے مخصوص ہے لیکن اس سائن کا ایک اور مطلب بھی ہے۔ ایک ایسا مطلب جس کی طرف ہمارا ابتدا میں دھیان ہی نہیں گیا تھا۔'' نازش نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' نازلی نے پوچھا۔

''تمہیں شاید معلوم ہوگا کہ علمِ فلکیات میں یہ نشان سیارہ زہرہ کی علامت ہے۔'' نازش نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''سیارہ زہرہ؟'' نازلی نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''ہاں اور پروفیسر سارہ بخاری کی زیرِ ہدایات تم جس ڈرامے میں کام کررہی تھیں اس میں تمہارے کردار کا نام 'زہرہ جبیں' تھا۔''

یہ سن کر نازلی کرسی پر ڈھیر سی ہوگئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ ''انہیں اس وقت وہاں موجود نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''ہاں، انہیں وہاں موجود نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' نازش نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''سیکیورٹی کے مطابق وہ ریہرسل کی شب کبھی بھی ساڑھے چھ بجے سے پہلے لیبارٹری میں نہیں آتی تھیں۔''

اب نازلی نے ہلکی آواز میں رونا شروع کردیا۔

''میرا مقصد انہیں قتل کرنا ہرگز نہیں تھا۔'' نازلی نے قدرے توقف کے بعد خود ہی بولنا شروع کردیا۔ ''میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح مڈٹرم میں پاس ہوجاؤں۔ لیکن ڈاکٹر سارہ بخاری سخت اشتعال میں تھیں۔ انہوں نے مجھے فوری طور پر یونیورسٹی سے بے دخل کرنے کی دھمکی دی۔ میں نے انہیں سمجھانے، قائل کرنے کی بے حد کوشش کی لیکن انہوں نے میری ایک نہیں سنی۔''

''نازلی!'' نازش نے اس کی جانب ہمدردی کی نگاہ ڈالتے ہوئے ملائم لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس سے قبل ہم مزید آگے جائیں، تمہیں اپنے لیے کسی وکیل کو طلب کر لینا بہتر ہوگا۔ وہ اس معاملے میں قانونی طور پر تمہاری مدد کر سکتا ہے۔''

نازلی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔

☆☆☆

''اس کیس کو حل کرنے میں آپ بھی برابر کے شریک ہیں، چیف!'' نازش نے کہا۔ ''آخرکار یہ آپ کے زیرِ مطالعہ میگزین 'سائنٹفک امریکن' تھا جس نے مجھے یہ آئیڈیا دیا تھا۔''

کیپٹن جنید پوری سنجیدگی اور صبر و سکون کے ساتھ لیفٹیننٹ نازش کی بات مکمل ہونے کا انتظار کررہا تھا۔

''اپنے آخری لمحات میں پروفیسر سارہ بخاری نے اس سائن کے ذریعے اپنے قاتل کی نشان دہی کی کوشش کی تھی۔ اس کلیو کے بغیر ہم اس کیس کو کبھی بھی حل نہیں کرسکتے تھے۔ یقینی طور پر ہمارے پاس پروفیسر سارہ بخاری کی فائلوں پر سے انگلیوں کے نشانات حاصل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن جب ہمیں اس بات کا احساس ہوا کہ ہمارا سب سے اہم مشتبہ فرد وہ کوئی ہے جسے بیالوجی میں ایک عمدہ گریڈ کی ضرورت ہے تو بات سمجھ میں آگئی کہ شاید وہ فرد ٹیسٹ میں اپنے جوابات کا نتیجہ تلاش کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ جب پروفیسر سارہ بخاری نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑلیا۔ باقی کی صورتِ حال آپ کے سامنے ہے۔''

کیپٹن جنید نے یہ تفصیل سننے کے بعد ستائشی انداز میں سر کو جنبش دی اور ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''گڈ ورک، نازش!''

''تھینک یو، چیف!'' نازش نے جواباً سیلوٹ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی طرف سے یہ کہنا ہی میرے لیے ایک اعزاز کی بات ہے۔''

تب کیپٹن جنید نے اپنی میز پر سے ایک پیڈ اور ایک قلم اٹھالیا اور لکھنا شروع کردیا۔

نازش دل ہی دل میں مسکرادی۔ چیف نے اس مختصر ملاقات کے برخاست ہونے کا اشارہ دے دیا تھا۔ وہ چیف کے کمرے سے اٹھ کر باہر نکل آئی جہاں اس کا اسسٹنٹ کامران بے چینی سے اس کا انتظار کررہا تھا۔

وہ لپک کر نازش کے پاس آیا اور بے تابی سے کہنے لگا۔ ''چیف نے کیا کہا؟''

''گڈ ورک، نازش!'' نازش نے سرگوشی کے انداز میں چیف کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

پھر وہ دونوں بے ساختہ ہنسنے لگے۔

میزان

تنویر ریاض

یہ حقیقت ہے کہ اپنے بڑوں کا بویا ہوا آنے والی نسل کو کاٹنا پڑتا ہے... اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ خون کا اثر ضرور رنگ دکھاتا ہے... ایک جنگجو خاندان کے گرد گھومتی کہانی... گزشتہ نسلوں کا قرض آنے والی نسلوں پر منتقل ہو رہا تھا...

ملاقاتِ محل کے تسلسل کا سلسلہ... ایک پُراسرار کہانی کے تار بج جاتے...

میں اس وقت دس سال کا تھا جب میرے پیارے انکل نے میری پیاری آنٹی کو قتل کردیا۔ وہ خلیج کی جنگ میں حصہ لینے کے بعد ایک سلور اسٹار اور زخمی کندھے کے ساتھ واپس آئے تھے۔ ہمارا پورا خاندان ائرپورٹ پر ان کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ انکل آرمنڈ نے مجھے اپنے بازو میں اٹھالیا اور گھمانے لگے۔ میں نے بوکھلا کر دوسرے رشتے داروں کی طرف دیکھا۔ وہ سب بے وقوفوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔ انکل کے زخمی بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ

ایک پٹی کے ذریعے ان کے سینے سے بندھا ہوا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اسٹول سے گر گئے تھے اور جلد ٹھیک ہو جائیں گے لیکن وہ جھوٹ بول رہے تھے اور ان کا کندھا کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں اور بھی کئی زخم آئے تھے جو دوسروں کو نظر نہیں آ رہے تھے لیکن انکل کو ان کے بارے میں اچھی طرح معلوم تھا۔

چند ہفتوں بعد میں نے آنٹی وینی کو مما سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ انکل رات میں بار بار اٹھ کر دبے پاؤں گھر کا چکر لگاتے اور دروازوں، کھڑکیوں کو چیک کرتے ہیں۔ ان کی اس حرکت نے آنٹی کو خوف زدہ کر دیا تھا اور اس کی وجہ بھی بہت جلد سامنے آ گئی۔ جن دنوں انکل کویت میں لڑ رہے تھے تو ان کی غیر موجودگی میں آنٹی وینی نے اپنے پرانے آشنا سے ملنا شروع کر دیا۔ وال ہیلا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور آنٹی کو یہ جان لینا چاہیے تھا کہ ایسی باتیں چھپی نہیں رہ سکتیں۔ انکل آرمنڈ کو اس بارے میں پتا چل جائے گا۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ خود ہی انکل آرمنڈ کو سب کچھ بتا دیتیں لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اس کے بجائے وہ اپنے زخمی شوہر اور تین بچوں کو چھوڑ کر اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ چلی گئیں۔

انکل یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ ان کے دل میں انتقام کا جذبہ سر اٹھانے لگا اور انہوں نے سرگرمی سے آنٹی کی تلاش شروع کر دی اور وہ گے لارڈ کے مضافات میں واقع ایک شراب خانے میں ان دونوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر رقص کر رہے تھے، جب انکل بارش میں بھیگتے ہوئے وہاں پہنچے۔ ان کے دائیں ہاتھ میں اعشاریہ چار، پانچ کا ریوالور دبا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک لفظ کہے بغیر ان دونوں کو گولی مار دی اور وہیں اسٹول پر بیٹھ کر پولیس کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ انہیں پچیس سال قید کی سزا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی میرا بچپن نشیب و فراز کی زد میں آ گیا۔

میرے والدین نے انکل آرمنڈ کے بچوں کی ذمے داری سنبھال لی اور اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے خاندان کا سائز دگنا ہو گیا۔ مجھے اپنا بیڈ روم ان کی دو لڑکیوں کے حوالے کرنا پڑا اور میں خود تہ خانے میں اپنے کزن اینڈریو کے ساتھ سونے لگا۔ گو کہ وہ میرا ہم عمر تھا لیکن میری اس سے بھی نہیں بنی۔ ڈیڈی نے ایک ہفتے تک تو ان لڑ[illegible] کو برداشت کیا پھر ایک دن انہوں نے ہمیں بلا کر کہا۔ ”ہمارا خاندان پہلے ہی مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ تم دونوں کے درمیان خونی رشتہ ہے۔ اس لیے آج کے بعد تمہیں مل جل کر رہنا چاہیے۔ یقیناً تم نہیں چاہو گے کہ میں دوبارہ یہ بات تمہیں سمجھاؤں۔“

آنے والے چند ہفتوں میں ہم نے جنگ بندی پر عمل کیا۔ اس دوران میں ہمارے درمیان محتاط قسم کی دوستی ہو گئی۔ اس کے بعد بھی ہمارے درمیان لڑائی ہوتی رہی لیکن اس کی نوعیت مختلف تھی۔ ہم نے باکسنگ کے دستانے خرید لیے اور ایک دوسرے کو سکھانے لگے۔ آٹھویں جماعت میں پہنچنے تک ہمارے درمیان بھائیوں جیسی قربت ہو چکی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے کپڑے پہننے لگے اور رات کی تنہائی میں سرگوشیاں کر کے آپس کی باتیں شیئر کرتے۔ ہائی اسکول میں ہم دونوں ہاکی ٹیم میں شامل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں آئس اسکیٹنگ میں بھی پریکٹس ہو گئی۔ باکسنگ، ہاکی، اسکیٹنگ کی وجہ سے ہماری شہرت پھیلتی جا رہی تھی۔

میرے ڈیڈی ڈولف نے ہمیں کبھی کھیلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ ڈبل شفٹ میں کام کیا کرتے تھے کیونکہ اخراجات بڑھ جانے کی وجہ سے انہیں زیادہ پیسوں کی ضرورت تھی لیکن وہ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ اسکول میں ہمیں دو اسموک بوائز کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ دراصل یہ اصطلاح ہمارے بزرگوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی جو وال ہیلا کے مضافات میں واقع ڈھنگ تھلگ چھوٹے چھوٹے مکانات میں رہا کرتے تھے اور انہیں گرم رکھنے کے لیے سرکاری جنگل سے مفت لکڑی دی جاتی تھی۔ ہم غریب ضرور تھے لیکن ہمیں اپنے ورثے پر فخر تھا پھر ایک حادثے نے ہمارے گھر کا شیرازہ تتر بتر کر دیا۔ ابھی میں اور اینڈریو ہائی اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ میرے والدین کی گاڑی کو نشے میں دھت ڈرائیور نے اپنی پک اپ سے ٹکر مار دی۔ ڈیڈی تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے جبکہ مما کا چہرہ بری طرح زخمی ہوا اور انہیں بائیں ٹانگ سے بھی محروم ہونا پڑا۔ شرابی ڈرائیور مقامی کونسل کا ممبر تھا اور نشے کی حالت میں گاڑی چلاتے ہوئے اس نے یہ دوسرا ایکسیڈنٹ کیا تھا لیکن پیسے اور سیاسی اثر و رسوخ کی بنا پر وہ بچ گیا۔ اس کے وکیل نے بڑی ہوشیاری سے جانے حادثہ کو کاؤنٹی کی حدود سے باہر ثابت کر دیا۔ اس کے [illegible] نے یہ موقف بھی اختیار کیا کہ اس حادثے میں میرے [illegible] بھی برابر کے قصوروار تھے کیونکہ وہ خود بھی شراب خانے سے واپس آ رہے تھے۔ اس لیے ان کا نشے کی حالت میں ہونا بعید از قیاس نہ تھا۔ جج نے ملزم کو پانچ سال قید کی سزا سنائی۔ میرے دو برس اسے بچوں کے مرکز میں گزارنا تھے۔ [illegible] کی صورت میں وہ عارضی رہائی کا حق دار تھا۔ گویا اس طرح وہ ایک دن بھی سلاخوں کے پیچھے نہیں رہتا۔ اس کے برعکس اسے مناسب طبی امداد کے لیے اسپتال بھیج دیا گیا۔

اینڈریو یہ فیصلہ سن کر مشتعل ہو گیا اور اس نے عدالت کی سیڑھیوں پر ملزم کو دبوچ لیا۔ اس کے ایک ہی مکے سے اس کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ بڑی مشکل سے تین سپاہیوں نے ان دونوں کو علیحدہ کیا اور جج نے اینڈریو کو سرکاری اہلکاروں پر حملہ کرنے کے الزام میں ایک سال قید کی سزا سنا دی۔ میں اس سے پہلے ہی فوج میں جا چکا تھا۔ باپ کی موت اور ماں کے معذور ہو جانے کے بعد گھر کو چلانے کی ذمے داری مجھ پر آن پڑی تھی۔ چھ سال بعد میں ملٹری پولیس کا آفیسر بن چکا تھا۔ جب انکل آرمنڈ جیل سے رہا ہوئے۔ جیل میں ان کے اچھے چال چلن اور اعزاز یافتہ فوجی ہونے کی وجہ سے ان کی سزا میں تخفیف ہو گئی اور وہ چودہ سال بعد ہی جیل سے باہر آ گئے۔ یہ دُہرے قتل کی کم سے کم سزا تھی۔

وہ بالکل بدل گئے تھے اور انہیں اپنے جرم پر کوئی ندامت نہیں تھی بلکہ وہ ایک سپاہی کی سی شان سے گھر میں داخل ہوئے جو محاذ سے زخمی ہو کر آیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا نام اب بھی زخمی سپاہیوں کی فہرست میں شامل تھا۔ رہائی کے بعد انہیں چودہ سال کی پنشن کا چیک ملا جس کی مالیت تین لاکھ چھبیس ہزار ڈالرز تھی۔ اس رقم سے انہوں نے جیل کے اطراف میں ایک شراب خانہ خرید لیا۔ دونوں لڑکیاں ابھی تک مما کے ساتھ رہ رہی تھیں جو زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے نوادرات کی دکان میں کلرک کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ انکل نے مہربانی یہ کی کہ وہ دکان خرید کر انہیں دے دی۔ انہوں نے بچوں سے بھی دوری ختم کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ دونوں لڑکیاں ان کی شکل دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔ البتہ اینڈریو دوبارہ باپ کے پاس لوٹ آیا۔ ان دونوں نے جنگل کے علاقے میں ایک خستہ حال کیبن خرید لیا اور اس کی از سرِ نو تعمیر شروع کر دی۔

سات ماہ بعد مقامی کونسلر آسٹن ویلنڈر اچانک ہی غائب ہو گیا جس کی گاڑی سے میرے والدین کو حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ شکار کھیلنے کی غرض سے وال ہیلا کے مضافات میں گیا تھا۔ دوپہر کے وقت وہ کلب ہاؤس میں موجود تھا جہاں اس نے شاہانہ انداز میں شراب نوشی کی پھر اپنی پسندیدہ [illegible] سیون ایم ایم اٹھا کر چل دیا جس میں دوربین [illegible] تھی۔ جب رات گئے اس کی واپسی نہیں ہوئی تو اس کی تلاش شروع ہوئی۔ وہ کلب ہاؤس واپس نہیں آیا تھا اور نہ ہی [illegible] رائفل مخصوص جگہ پر موجود تھی۔ عام طور پر کوئی بھی شکاری راستہ بھٹک جانے یا زخمی ہونے کی صورت میں تین فائر کرتا ہے۔ اس کے کچھ وقفے کے بعد تین فائر دوبارہ کیے جاتے ہیں تاکہ ان کی آواز سن کر قرب و جوار کے لوگ چوکنا ہو جائیں اور اسے مدد مل سکے۔ لیکن کسی نے بھی گولی چلنے کی آواز نہیں سنی۔

قدرتی طور پر پولیس کا شبہ سب سے پہلے انکل آرمنڈ اور اینڈریو پر ہی گیا۔ انہوں نے اس بارے میں میری ماں سے بھی چند سوالات کیے جن کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ گو کہ وہ بڑے یقین سے کہہ رہے تھے کہ اس گمشدگی میں ہمارے خاندان کا ہاتھ ہے لیکن کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر وہ کوئی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ویلنڈر کی لاش مل جاتی، تب بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ کی بنیاد پر تفتیش کو آگے بڑھایا جا سکتا تھا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور ویلنڈر کی گمشدگی کا کیس بھی داخلِ دفتر ہو گیا۔

میری تعیناتی ان دنوں یوگینڈا میں تھی لیکن میری ماں مجھے تازہ ترین خبروں اور حالات سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔ ویلنڈر کی گمشدگی بڑی عجیب تھی۔ عام طور پر ہر شکارگاہ میں مختلف قسم کے نشانات کے ذریعے حدود کا تعین کر دیا جاتا ہے۔ یہ شکارگاہ اسی ہزار ایکڑ رقبے پر محیط سرکاری جنگل سے متصل تھی اور بعض اوقات شکاری یا مہم جو، ان حدود کو پار کر کے جنگل میں چلے جاتے تو کبھی واپس نہ آتے لیکن بعد میں ان کی گاڑیاں اور ہڈیاں ضرور مل جاتی تھیں۔

میعاد پوری ہونے کے بعد میں نے ملازمت میں توسیع لینے کا ارادہ ترک کر دیا اور مشی گن پولیس میں سراغ رساں کے طور پر کام شروع کر دیا۔ یہ یونٹ بڑے جرائم کی تفتیش کرتا تھا اور اس کا دائرۂ کار بے حد وسیع تھا۔ اٹھارہ مہینے تک میں نے بڑی محنت سے کام کیا۔ اس کے بعد مجھے اہم ذمے داریاں دی جانے لگیں۔ ایسی ہی ایک مہم کے دوران میں انسدادِ منشیات کی ٹیم کے ساتھ جنگل کی طرف جا رہا تھا کہ میں نے فضا میں کسی چیز کے جلنے کی بو محسوس کی۔ میں نے فوراً ہی اپنے ساتھیوں کو پوزیشن لینے کا اشارہ کیا اور خود پیٹ کے بل جھاڑیوں کے درمیان رینگنے لگا۔ آگے جا کر ان جھاڑیوں کی جگہ چھوٹی شاخوں اور پودوں نے لے لی تھی۔ ہم ایک کھلی جگہ کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں درختوں کی تعداد برائے نام تھی۔

میرے [illegible] جانب [illegible] تھی۔ [illegible] کے پیچھے انسدادِ منشیات کے دو [illegible] اور [illegible] تھے۔ ان دونوں کے پاس [illegible] تھیں۔ مجھے [illegible]

دفاع کر سکیں گے۔ اس کھلی جگہ سے پندرہ گز کے فاصلے پر رک کر دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کے وسط میں ایک کیبن نظر آرہا تھا جو مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے اور تباہ شدہ سلگتا ہوا ڈھانچا ہر جانب بکھرا ہوا تھا۔ فضا میں ایک ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی جلن سے میری آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

"لگتا ہے یہ کوئی تجربہ گاہ تھی۔" زینا نے سرگوشی کی۔ "اور کام کرنے والوں کی بے پروائی سے تباہ ہوگئی۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔" میں نے اس جگہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "یہاں ضرور کوئی غلط کام تو ہوا ہوگا۔"

"شاید ہم کسی سے معلوم کر سکیں۔" زینا نے کہا۔ "ممکن ہے کہ اس وقت کوئی عمارت کے اندر موجود ہو جب یہ دھماکا ہوا تھا۔"

وہ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "دروازے کے ہینڈل پر سرخ دھبے نظر آرہے ہیں اور کیبن سے لے کر جھاڑیوں تک خون کے دھبے موجود ہیں۔ دیکھو' وہاں کون ہے۔"

جیکنز بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ اچانک ہی درختوں کے جھنڈ سے فائرنگ ہونے لگی۔ جیکنز فوراً ہی زمین پر گر گیا۔

"یہاں سے چلے جاؤ۔" کوئی زور سے چلّایا۔ "اس جگہ کو خالی کردو۔"

میں آہستہ سے اٹھا اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ بیس گز کے فاصلے پر جیکنز پیٹ کے بل گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "جیکنز! کیا تمہیں گولی لگی ہے؟"

"نہیں، اس کا نشانہ خطا گیا ہے۔"

"تم اپنی جگہ پر ہی رکو۔ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔" دوسرا ایجنٹ بولا۔ "وہ ہمیں نشانہ بنارہے ہیں۔"

"وہ محض ایک تنبیہ تھی۔" میں نے کہا۔ "تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ وہ اپنے شکار کو بچانے کے لیے گلہری پر بھی فائر کردیتے ہیں۔ اگر اسے تمہارے ساتھی کو مارنا ہوتا تو وہ ایسا کر چکا ہوتا۔"

میں نے درختوں کے جھنڈ کی طرف منہ کر کے زور سے آواز لگائی۔ "کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟"

"کون بول رہا ہے؟" کسی نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"میں ڈیلن ہوں، اینڈریو کا کزن۔ یاد کرنے کی کوشش کرو۔"

"تم ہاکی کھیلتے تھے نا؟"

"وہ اسکول کے زمانے کی بات ہے۔" میں اس کی آواز پہچان چکا تھا۔ وہ آرنی تھا۔ "اب میں سپاہی ہوں۔ تمہاری آواز سے لگ رہا ہے کہ تم زخمی ہو۔ زخم زیادہ گہرا تو نہیں؟"

"میرے بازو سے خون بہہ رہا ہے۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے بھائی نے سب لوگوں کو یہاں سے بھگا دیا ہے اور اب یہ جگہ مکمل طور پر تباہ ہوگئی ہے۔ اگر انہوں نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو بھڑک اٹھیں گے۔ بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"یہ نہیں ہوسکتا آرنی! میں تمہیں زخمی حالت میں چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں؟ میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔ مجھ پر گولی مت چلانا۔"

میں نے اپنا ریوالور ہولسٹر میں رکھا اور درخت کی آڑ سے باہر آگیا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا رکھے تھے۔ میں چند منٹ تک ساکت کھڑا رہا تاکہ آرنی کا دماغ صورتِ حال کو سمجھنے کے قابل ہو جائے پھر میں آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگا۔

میدان کے آخری سرے پر واقع جھاڑیوں میں سے ایک لڑکا باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی اور اس کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بائیں کندھے سے خون بہہ رہا تھا۔

"بندوق نیچے کرو آرنی! تم یقیناً مجھ پر گولی چلانا نہیں چاہو گے۔"

لڑکا تھوڑا سا ہچکچایا پھر اس نے آہستہ سے رائفل نیچے کردی۔ میں نے اس سے رائفل لے کر اسے خالی کیا اور ایک طرف رکھ دی۔ لڑکا بڑی مشکل سے زمین پر بیٹھ سکا۔

"کیا تمہارے ساتھ یہاں کوئی اور بھی ہے؟" میں نے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، صرف میں ہی ہوں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ایک پانچ انچ لمبا لکڑی کا ٹکڑا اس کے کندھے میں پیوست ہو گیا تھا جس کی وجہ سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اپنی قمیص پھاڑ کر ایک کپڑا زخم کے گرد مضبوطی سے لپیٹ دیا لیکن لکڑی کے ٹکڑے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اسے نکالتے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔

"اس جگہ کو مضبوطی سے پکڑے رکھو۔" میں نے اپنے لہجے میں نرمی لاتے ہوئے کہا۔ "ویسے کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

"میں نہیں جانتا۔ میں کیبن میں سو رہا تھا کہ کسی نے جاکر مجھے باہر نکلنے کے لیے کہا پھر کوئی چیز چھت سے ٹکرائی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور سب کچھ تباہ ہو گیا۔ میں پاگلوں کی طرح باہر کی جانب بھاگا۔ اوہ میرے خدا! میرے بھائی مجھے مار ڈالیں گے۔"

"تم ان کی فکر نہ کرو۔ اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔" یہ کہہ کر میں انسدادِ منشیات کے ایجنٹوں کی طرف بڑھا اور ان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "آرنی کا کہنا ہے کہ وہ اندر تھا جب کسی نے کیبن کو آگ لگا دی۔ مجھے وہ شخص مطلوب ہے جبکہ لیبارٹری اور منشیات تمہارا مسئلہ ہے۔"

"اس لڑکے کا کیا کریں؟" روڈی نے کہا۔ "اس نے سرکاری آدمیوں پر گولی چلائی ہے۔ یہ بھی مجرم ہے۔"

"اس نے ہوائی فائر کیا تھا۔ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔ اس کے بھائی اسے اپنے مال کی حفاظت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ جیل نہیں بلکہ اسپتال جائے گا۔"

"لگتا ہے کہ یہ دھماکا گرینیڈ یا کسی دوسرے بم کے بجائے ڈائنامیٹ سے کیا گیا تھا۔" زینا ایک چھوٹی سی دھات کی نالی دکھاتے ہوئے بولی جس میں دو تار جڑے ہوئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ موسیو نے فیوز تبدیل کرتے وقت اسے گرا دیا ہوگا۔" آرنی نے کہا۔

"موسیو کون ہے؟" جیکنز نے پوچھا۔

"ڈیرل موسیو!" میں نے اس کا پورا نام لیتے ہوئے کہا۔ "وہ جنگل میں لکڑیاں کاٹتا ہے اور اس کام کے لیے اسے ڈائنامیٹ کا استعمال بھی کرنا ہوتا ہے۔"

"تم اس کیپ کو دیکھ کر کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ اسی ڈائنامیٹ کی ہے؟" جیکنز نے کہا۔

"چند ہفتے پہلے موسیو کی نوجوان لڑکی نے منشیات کی زیادہ مقدار لے لی تھی۔" زینا نے وضاحت کی۔ "وہ اسی حالت میں گاڑی چلاتے ہوئے ٹریفک میں پھنس گئی اور حادثہ پیش آگیا۔ موسیو کو اس بات کا بھی غصہ تھا۔ ممکن ہے یہ کارروائی اسی نے کی ہو۔"

"یہ کام اس کے کسی لڑکے یا کارندے کا بھی ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس لڑکے کو ہر حال میں پکڑنا ہوگا۔ ...! تم کیا کہتے ہو؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ... ہم یہاں آئے تھے۔ کیا میں یہ خبر اخبارات کو جاری کردوں؟"

"اس کا کریڈٹ تمہیں جاتا ہے۔ مجھے صرف آرنی چاہیے اور تم..." میں نے جیکنز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جانتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔" وہ اپنے ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس طرح باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"میں ایسے لوگوں کے ساتھ کام کرنا پسند نہیں کرتا جو غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو خطرات میں ڈالتے ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ تم محتاط رہو گے۔"

☆☆☆

واپسی پر میں نے آرنی کو زینا کے ساتھ روانہ کردیا تاکہ وہ اس کے کاغذات تیار کرواسکے اور خود لباس تبدیل کرنے کی غرض سے گھر کی طرف روانہ ہوگیا جن پر آرنی کے خون کے دھبے لگ گئے تھے۔ مجھے اپنی گاڑی سڑک پر کھڑی کرنا پڑی کیونکہ ڈرائیو وے میں پہلے سے ہی دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک ممّا کی زرد واکس ویگن جبکہ دوسری سیاہ ڈاج کو میں نہیں پہچانتا تھا۔ میں جونہی اپنے مکان کی سیڑھیوں کی جانب بڑھا، سادہ لباس میں دو افراد نے میرا راستہ روک لیا۔

"میں لیفٹیننٹ شیرون کیٹن ہوں اور میرا تعلق مشی گن اسٹیٹ پولیس سے ہے اور یہ میرا ساتھی سارجنٹ بسکی ہے۔" وہ اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے بولی۔ "کیا ہم تم سے تھوڑی سی بات کرسکتے ہیں؟"

"یقیناً۔ اندر آجاؤ۔"

"بہتر ہوگا کہ ہم یہیں بات کرلیں۔" کیٹن نے میری ماں کی کار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تمہیں آسٹن ولنڈر یاد ہے؟" بسکی نے پوچھا۔

"ہاں، اس کی گمشدگی پر تو بہت شور مچا تھا۔ کیا اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہ رہے ہو؟"

"اس کی لاش مل گئی ہے۔" کیٹن نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہاں سے؟"

"سرکاری جنگل سے۔ اسے ایک قبر میں دفن کیا گیا تھا جو زیادہ گہری نہیں تھی۔ گزشتہ دنوں ... کی ایک ٹیم ڈائنا سارز کے ڈھانچوں کی تلاش کے لیے کھدائی کررہی تھی

تک مجھے کوئی بہتر جگہ نہیں مل جاتی لیکن اس گھر میں بچے ہوئے اٹھارہ مہینے گزر چکے تھے۔ میں نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو مجھے ویکیوم کلینر کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ مما ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی مشین بند کر دی۔

"تمہارا کھانا مائکرو ویو میں رکھا ہوا ہے۔"

میں کچھ کہے بغیر باتھ روم میں گھس گیا۔ پہلے کپڑے اتارے، پھر غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔ اتنی دیر میں مما میز پر کھانا لگا چکی تھیں۔ انہوں نے کافی کے دو کپ بنائے اور ایک میری طرف بڑھا دیا۔

"اسٹیٹ پولیس والے کیا جاننا چاہ رہے تھے؟"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ان کا تعلق اسٹیٹ پولیس سے ہے؟"

"جب انہوں نے تمہاری تلاش میں دروازہ کھٹکھٹایا تو میں نے اس مجیم تجیم شخص کو پہچان لیا۔ وہ اس سے پہلے بھی ویلنڈر کی تلاش میں آ چکا تھا۔ اس کا انداز کافی جارحانہ تھا۔"

"وہ اب بھی ایسا ہی ہے۔" میں نے اچانک ہی موضوع بدل دیا اور بولا۔ "میں جب بھی کوئی دلچسپ کیس پکڑتا ہوں تو آپ کو یہ کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ مجھے اچھے سے کھانے کی ضرورت ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ میں تمہاری غیر موجودگی میں گھر کی صفائی اور زندگی کے آثار دیکھنے کے لیے چلی آتی ہوں لیکن ابھی تک مجھے ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ کیا تمہاری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے؟"

"میں اس معاملے میں تھوڑا سا بد قسمت ہوں۔ خیر، یہ بتائیں کہ کاروبار کیسا چل رہا ہے؟"

"تم جانتے ہو کہ ہماری دکان شکار کے موسم میں ہی چلتی ہے۔ اب کرسمس تک معاملہ گرم رہے گا۔ میں نے تم سے اسٹیٹ پولیس والوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ یہاں کس لیے آئے تھے؟"

"انہوں نے ویلنڈر کو تلاش کر لیا ہے۔"

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر مما نے پوچھا۔ "کہاں سے ملی؟"

"سرکاری جنگل سے۔ اسے ایک گڑھے میں دفن کر دیا گیا تھا۔"

"بہت اچھے۔" وہ کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولیں۔ "وہ وہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"ان کا کہنا ہے کہ کسی نے اسے گولی ماری تھی۔"

"کیا وہ قاتل کے بارے میں جانتے ہیں؟"

"نہیں لیکن انہیں شبہ ہے کہ یہ کام اینڈریو یا انکل آرمنڈ کا ہو سکتا ہے۔"

"یقیناً اینڈریو ایسا نہیں کر سکتا اور آرمنڈ..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں پھر بولیں۔ "کیا... آرمنڈ کو اس بارے میں علم ہے؟"

"میں نہیں جانتا مما! انہوں نے تو مجھے بھی انکل سے دور رہنے کا حکم دیا ہے۔"

"کیوں؟ تم تو خود پولیس میں ہو؟"

"ہاں لیکن میرے خاندانی پس منظر کی وجہ سے وہ مجھے حقیر سمجھتے ہیں۔"

اس کے بعد مما نے کوئی بات نہیں کی۔ میں نے ان کے کھانے کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔ اسپتال سے زینا کو ساتھ لیا اور جنگل کے کنارے واقع آرا مشین کی جانب روانہ ہو گیا جو موس ورکس کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔

"آرنی کیسا ہے؟" میں نے راستے میں پوچھا۔

"وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ انہوں نے لکڑی کا ٹکڑا نکال کر پٹی کر دی ہے اور اسے ایک رات کے لیے اسپتال میں رکھیں گے تاکہ اس کی عمومی حالت کا جائزہ لیا جا سکے۔ کیا ہم اس پر بھی کوئی الزام عائد کر سکتے ہیں؟"

"فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ روڈی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہم چاہیں تو اس پر نصف درجن الزامات عائد کیے جا سکتے ہیں۔"

"وہ دیکھنے میں تو بدمعاش نہیں لگتا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "وہ محض ایک وڈ اسموک بوائے ہے اور غلط رشتے داروں کے چنگل میں پھنس گیا ہے۔"

"یہی بات تمہارے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور جیپ کو ایک کچے راستے پر اتار دیا جو جنگل کی طرف جاتا تھا۔ نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں آرا مشین چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ فیکٹری ایک پرانے گودام میں قائم کی گئی تھی جہاں کٹی ہوئی لکڑیوں کا ڈھیر رکھا ہوا تھا جسے ترپال سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ٹریلر کھڑا ہوا تھا جس میں فیکٹری کا آفس بنایا گیا تھا۔ ہم نے دستک دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور دروازہ کھول کر

کہ اس کی جگہ انہیں آسٹن کا ڈھانچہ مل گیا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"تین روز پہلے کی۔"

"تین دن پہلے۔" میں بڑبڑایا۔ "وال ہیلا پولیس کو اس کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی؟"

"شاید انہیں یہ خطرہ ہو کہ لاش دوبارہ غائب نہ ہو جائے۔" ویسکی نے کہا۔ "تین سال پہلے میں بھی تلاش کرنے والوں کے ساتھ تھا اور تم لوگوں نے اس تلاشی کو ناکام بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی تھی۔"

"میری بات مت کرو۔ میں ان دنوں یوگنڈا میں تھا لیکن میں نے اس کا کیس پڑھا ہے۔ ویلنڈر کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"اسے قتل کیا گیا۔" ویسکی نے کہا۔ اب وہ دونوں مجھے دیکھ رہے تھے۔ "اس کے سر کے عقبی حصے میں دو گولیاں ماری گئیں۔"

"ہتھیار کون سا استعمال کیا گیا؟"

"نو ملی میٹر۔" کیپٹن نے کہا۔ "تمہیں حیرانی ہو رہی ہے؟"

"ہاں، ویلنڈر جیسے لوگ سنجیدہ شکاری نہیں ہوتے۔ انہیں صرف اپنے گھر میں ٹرافیاں سجانے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ اندھا دھند نشانہ لگاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کے کسی ساتھی کی غلطی سے یہ حادثہ پیش آیا ہو لیکن سر میں دو گولیاں لگنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ اس وقت میں منشیات کے ایک کیس میں مصروف ہوں لیکن اس کے لیے کچھ وقت نکال سکتا ہوں۔ وہ گڑھا کہاں پر ہے؟"

"تم مذاق کر رہے ہو۔" ویسکی ہنستے ہوئے بولا۔ "اس کیس سے تمہارے خاندان کا تعلق ہے۔ اس لیے ہم تمہیں جائے واردات کے قریب بھی نہیں آنے دیں گے۔"

"ہم اس لیے یہاں نہیں آئے۔" کیپٹن نے جلدی سے کہا۔ "ہمیں پہلے سے شبہ تھا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ ایک سابق مجرم جسے کونسل کے ممبر پر حملہ کرنے کے جرم میں سزا ہو چکی ہے۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ "اینڈریو؟ تمہارا خیال ہے کہ میرے کزن اینڈریو نے اسے قتل کیا ہے؟"

"وہ ایک مرتبہ عدالت کی سیڑھیوں پر کونسل کے رکن پر حملہ کر چکا ہے۔"

"اس سے یہ حرکت ضرور سرزد ہوئی تھی۔ وہ ہاکی کا کھلاڑی ہے۔ فوری طور پر جوش میں آ کر مکا تو مار سکتا ہے لیکن کسی کو قتل نہیں کرے گا۔"

"پھر یہ کام تمہارے انکل آرمنڈ کا ہو سکتا ہے۔" ویسکی نے کہا۔ "اسے پستول استعمال کرنے کی عادت ہے۔ تمہیں تو اپنی آنٹی اور اس کے بوائے فرینڈ کا قتل یاد ہو گا؟"

"وہ اس کی سزا بھگت چکے ہیں۔ اب تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"تمہیں پولیس کی مدد کرنا ہو گی۔" کیپٹن نے کہا۔ "ابھی تک ہم نے لاش کے دریافت ہونے کا اعلان نہیں کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم ان دونوں مشتبہ افراد سے پوچھ گچھ کرو، اس سے پہلے کہ انہیں یہ بات معلوم ہو۔"

"تم چاہتی ہو کہ میں اپنے ہی خاندان کے لوگوں کی گردن میں پھندا ڈال دوں کیونکہ تمہاری تحقیقات اب تک بے نتیجہ رہی ہے۔"

"میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ کچھ نہیں کرے گا۔" ویسکی نے کہا۔ "یہ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں۔"

"اس میں کچھ حقیقت بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں اس وجہ سے انکار نہیں کر رہا۔ میری ان دونوں سے بہت کم ملاقات ہوتی ہے۔ اگر اینڈریو یا انکل آرمنڈ کا ویلنڈر کی موت سے کوئی تعلق ہے تو وہ مجھے کیوں بتائیں گے؟"

"جو بھی ہو، اب یہ بات اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو گی۔" ویسکی نے کہا۔ "جب تک کوئی بڑی مجبوری نہ ہو، تم اس سے دور رہو گے۔ اگر تم نے اسے باخبر کیا تو..."

"وہ شاید پہلے سے جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "وہ ایک بار کے مالک ہیں جہاں لوگ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ انہوں نے اپنے کان بند کر رکھے ہوں گے؟ اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں اپنے فرائض کے سلسلے میں آج کسی وقت ان سے ملنے والا ہوں۔"

"ویلنڈر کے قتل کی تحقیقات تمہارے کسی بھی کام سے زیادہ اہم ہے۔" ویسکی میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ اپنے انکل سے دور رہو۔"

"مجھے کوئی ایسا کاغذ نہیں ملا جس میں تمہارے احکامات کی تعمیل کرنے کے لیے کہا گیا ہو۔ اب میرا راستہ چھوڑ دو کیونکہ مجھے اپنے کپڑوں پر سے خون کے دھبے صاف کرنے ہیں۔"

یوگنڈا سے واپس آنے کے ایک ہفتے بعد ہی میں نے وال ہیلا میں ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا تھا۔ اس میں دو کمرے اور ایک باتھ روم تھا۔ یہ ایک عارضی [illegible]

اندر داخل ہو گئے۔

فیکٹری کا مالک ڈیرل موسیو اپنے فورمین جمی اسٹب کے ساتھ میز پر جھکا ہوا کوئی نقشہ دیکھ رہا تھا۔ دونوں نے بیک وقت ہمیں دیکھا لیکن ان کے چہروں پر حیرانی نظر نہیں آئی۔

"تم کیا چاہتے ہو......؟" موسیو نے دوبارہ نقشے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "کیا اس منشیات فروش کا سراغ مل گیا جس نے میری بیٹی کو یہ زہر دیا تھا؟"

"ہم نے اس لیبارٹری پر آج صبح چھاپا مارا تھا۔" میں نے کہا۔ "تمہاری کارروائی کے تقریباً ایک گھنٹے بعد۔"

"میں آج سارا دن یہیں پر تھا۔ تم کسی سے بھی پوچھ سکتے ہو۔"

"اگر کسی سے مراد وہ لوگ ہیں جو تمہارے پاس کام کرتے ہیں تو وہ وہی کہیں گے جو تمہاری زبان پر ہے۔ ہمیں جائے واردات سے ایک کیپ ملا ہے۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ ہر کیپ پر کیمیکل سے نشان لگا ہوتا ہے اور ان کی فروخت کا ریکارڈ بھی رکھا جاتا ہے۔ اس کی مدد سے یہ معلوم کرنا مشکل نہیں کہ اس کا خریدار کون تھا لہٰذا جھوٹ مت بولو۔ تم پہلے ہی کافی مشکل میں پھنس چکے ہو۔"

"یہ تنہا نہیں ہے۔" جمی مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ "میرے پاس ایک درجن لڑکے ہیں جنہیں اپنی نوکری عزیز ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ مسٹر موسیو کو یہاں سے لے جاؤ گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔"

"تم نہیں جانتے کہ تم سے کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے۔" زینا نے کہا اور اپنا پلاسٹک بیگ اس کی میز پر خالی کر دیا۔ اس میں ایک خون آلود کیپ تھی۔

"یہ کیا ہے؟" موسیو چونکتے ہوئے بولا۔

"آرنی کی خون آلود شرٹ۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ اس وقت کیبن میں موجود تھا جب تم نے دھماکا خیز مواد سے اسے اڑایا؟"

موسیو نے حیرت سے ہمیں دیکھا پھر کیپ پر نظریں جما دیں پھر بمشکل تمام بولا۔ "وہ ٹھیک تو ہے؟"

"نہیں، وہ اسپتال میں ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا ایک بازو کاٹنا پڑ جائے۔"

"تم کیا کہتے ہو جمی؟" میں نے کہا۔ "کیا اب بھی تم اپنے مالک کی ہاں میں ہاں ملاؤ گے؟"

جمی نے باری باری مجھے اور موسیو کو دیکھا پھر بولا۔

"میں کیا کروں موسیو؟"

"اپنے کام پر جاؤ۔ میں ان سے نمٹ لوں گا۔"

جمی ہمیں گھورتا ہوا وہاں سے چل دیا پھر دروازے کے پاس رکتے ہوئے بولا۔ "میرے درجن بھر آدمی باہر موجود ہیں۔ یہ ہمیں یہاں سے نہیں لے جا سکتے۔"

"ہمیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔" زینا نے غصے سے کہا۔ "البتہ میں تمہیں سرکاری کام میں مداخلت کرنے کے الزام میں ضرور گرفتار کر سکتی ہوں۔"

جمی بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے موسیو سے پوچھا۔

"تم نے اس لیبارٹری کا پتا کیسے چلایا؟"

"میرا ایک ملازم اچھے اور قیمتی درختوں کی تلاش میں پھر رہا تھا کہ اس کی نظر اس کیبن پر چلی گئی۔"

"تم جانتے تھے کہ وہ لیبارٹری ڈیلیک کے غیر قانونی کاموں کے لیے استعمال ہو رہی ہے؟"

"مجھے پورا یقین تھا۔ باہر ڈیلیک کی شیورلیٹ کھڑی ہوئی تھی۔"

"کیا تمہارے آدمی نے ڈیلیک کو کیبن میں جاتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"نہیں، وہ فوراً ہی واپس آ گیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ یہ لڑکے کس قسم کے ہیں۔"

"اس اطلاع کے ملتے ہی تم اپنی کارروائی کے لیے روانہ ہو گئے؟"

"تم اس کی وجہ بھی جانتے ہو گے۔"

"کیونکہ تمہاری بیٹی نے زیادہ مقدار میں منشیات لے لی تھی اور تم اس کا ذمے دار ان لوگوں کو سمجھتے تھے۔ خدا تم پر رحم کرے۔ میں تو تمہیں کافی عقل مند سمجھتا تھا۔"

"میری بیٹی موت کے منہ سے واپس آئی ہے۔" موسیو نے برہمی سے کہا۔ "اور تم پولیس والے کچھ نہ کر سکے۔"

"ہمیں کچھ ہفتے قبل ہی اس لیبارٹری کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔" زینا نے کہا۔ "اور ہم ڈیلیک کے بھائی کے آنے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ ایک ساتھ ہی سب لوگوں کو پکڑ سکیں۔"

"تمہاری حماقت کی وجہ سے وہ بچ گئے اور آرنی اسپتال پہنچ گیا۔ میں تمہیں گرفتار کیے بغیر ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں اس جرم میں کم از کم دس سال کی سزا ہو سکتی ہے۔" زینا نے کہا۔

موسیو کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ کھوکھلی آواز میں بولا۔

دیکھو، اس فیکٹری سے ایک درجن خاندان پل رہے ہیں۔ اگر میں جیل چلا گیا تو یہ لوگ بھوکے مر جائیں گے۔ کیا تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟"

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ایک صورت ہو سکتی ہے۔"

"کہو، میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"سب سے پہلے تمہیں ایک تحریری بیان کی شکل میں اپنے جرائم کا اعتراف کرنا ہوگا۔ یہ میری دراز میں محفوظ رہے گا اور اگر تم اس مشکل سے نکل آئے تو میں اسے ضائع کر دوں گا۔ اس کے علاوہ تم آرنی کے علاج کے تمام اخراجات برداشت کرو گے اور صحت یاب ہونے پر اسے کام پر بھی لگاؤ گے۔ سب سے اہم بات یہ کہ آئندہ جب بھی تمہارے آدمی جنگل میں لکڑی تلاش کرنے جائیں اور اگر انہیں وہاں کوئی لیبارٹری یا گودام وغیرہ نظر آئے تو ہمیں اس کی اطلاع فوراً ملنی چاہیے۔ وہ لوگ دوسری لیبارٹری ضرور قائم کریں گے کیونکہ یہ ان کا کاروبار ہے۔ تمہیں قانون کو ہاتھ میں لینے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود ہی اس لیبارٹری کو تباہ کر دیں گے۔"

"میں حلفیہ کہتا ہوں کہ مجھے وہاں اس لڑکے کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔" موسیو گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

"اگر مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا تو اب تک تمہیں ہتھکڑی لگ چکی ہوتی۔"

وہاں سے واپسی پر ہم نے انکل آرمنڈ کے بار کا رخ کیا۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ہفتے کی شب ہونے کی وجہ سے وہاں اچھا خاصا رش تھا اور بار کے علاوہ ڈائننگ ہال بھی جوڑوں اور فیملیز سے بھرا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے دوسرے گاہکوں سے کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے کاؤنٹر کے آخری سرے پر اسٹول سنبھال لیے۔ کاؤنٹر پر موجود عورت میرے پاس آئی تو میں نے اسے اپنا پولیس کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔

"آرمنڈ سے کہو کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

اس نے سر ہلاتے ہوئے پشت میں لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا۔ ایک منٹ بعد انکل آرمنڈ اپنے دفتر سے باہر آئے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر بار میڈ کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور بیئر کے تین گلاس لے کر ہماری جانب آ گئے۔

"اس کارڈ کو جیب میں رکھ لو۔ میرے گاہکوں پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ پہلے بیئر پی لو۔"

"میں تم سے ذاتی حیثیت میں ملنے نہیں آیا انکل۔"

"زیادہ رعب جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔" زینا نے گلاس اٹھا کر بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے زینا کہتے ہیں اور میں چند ماہ سے اس کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔"

"اوہ، میرے بھتیجے کی نئی ساتھی۔" انکل آرمنڈ سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا کیونکہ اس سے پہلے ڈیلن اپنی کسی گرل فرینڈ کو مجھ سے ملانے نہیں لایا۔"

"شاید ڈرتا ہوگا کہ کہیں تم اسے نہ چرا لو۔" زینا بولی۔ "یا انہیں غائب نہ کر دو۔"

"وہ میرے دیوانگی کے دن تھے۔" انکل آرمنڈ نے کہا۔ "اب میں اپنی زندگی کا سنہری دور گزار رہا ہوں۔"

"میں نے تو کچھ اور ہی سنا ہے۔" زینا بولی۔

"میں نے بھی تمہارے بارے میں کچھ باتیں سن رکھی ہیں۔" انکل آرمنڈ نے جواب دیا۔ "کبھی ایک ساتھ ڈنر کرنے کا موقع ملا تو تفصیل سے بات کریں گے۔ فی الحال کام کی بات ہو جائے۔ ہاں تو بھتیجے! اس وقت کیسے آنا ہوا؟"

"کسی نے ڈیلیک کی لیبارٹری کو دھماکا خیز مواد سے اڑا دیا ہے۔"

"کیا اس کا نام موسیو ہے؟" انکل آرمنڈ نے کہا۔

"تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟" زینا نے پوچھا۔

"مجھے تو ابھی تک معلوم نہیں ہے۔" انکل آرمنڈ کندھے اچکاتے ہوئے بولے۔ "صرف اندازے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ جب سے اس کی لڑکی نے زیادہ مقدار میں منشیات لی تھی، تبھی سے وہ ان کی تلاش میں تھا۔"

"جب کیبن کو نشانہ بنایا گیا تو آرنی اندر موجود تھا۔ وہ بری طرح زخمی ہوا اور اب اسپتال میں ہے۔ میں تمہارے پاس صرف اس لیے آیا ہوں کہ ڈیلیک برادران کو بتا دو اگر انہوں نے موسیو سے بدلہ لینے کی کوشش کی یا دوبارہ آرنی کو کسی لیبارٹری کی حفاظت پر مامور کیا تو میں ذاتی طور پر اس کا نوٹس لوں گا۔ کیا تم یہ بات انہیں بتا سکتے ہو؟"

"ہاں لیکن اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ میرے کہے پر کان دھریں۔" انکل آرمنڈ نے کہا۔ "ان کا اگلا قدم کیا ہوگا؟"

"وہ اپنے چھوٹے بھائی کو واپس لے جانا چاہیں گے جبکہ ہم نے آرنی کو ان سے الگ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے اور موسیو اس کا اسپتال کا بل ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے لیے یہ خدمت بلا معاوضہ انجام دے سکتا ہوں لیکن یہ پولیس کا کام ہے۔ تم مجھے کیوں گھسیٹ رہے ہو؟"

”تاکہ پولیس کی نظروں میں تمہاری پوزیشن بہتر ہو جائے۔ آسٹن ویلنڈر کی لاش مل گئی ہے اور اسٹیٹ پولیس کی تحویل میں ہے۔“

”مذاق مت کرو۔ وہ اتنا عرصہ کہاں غائب رہا؟“

”اس کی لاش اس جگہ سے دو میل کے فاصلے پر ایک گڑھے سے ملی ہے جہاں وہ شکار کھیل رہا تھا۔“

”وہ وہاں کس طرح پہنچ گیا؟ غالباً نشے میں اسے گڑھا نظر نہیں آیا اور وہ اس میں گر پڑا۔“

”کسی نے اس کے سر کے عقبی حصے میں دو گولیاں مار کر اس کی لاش گڑھے میں دبا دی تھی اور اسٹیٹ پولیس تمہیں اور اینڈریو کو مشتبہ سمجھ رہی ہے۔“

”میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ میرے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا عذر موجود ہے۔“

”تم کیا عذر پیش کرو گے جبکہ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟“ زینا نے پوچھا۔

”میرے پاس یہ عذر ہمیشہ ہوتا ہے کیونکہ میں یہاں سے کہیں نہیں جاتا اور ہمیشہ دوستوں کے درمیان رہتا ہوں۔“

”ویلنڈر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس لیے وہ مشتبہ افراد سے ضرور پوچھ گچھ کریں گے۔“

”میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کون تھا اور کیا کرتا تھا۔ وہ میرے بھائی کا قاتل ہے اور اس نے تمہاری ماں کو ایک ٹانگ سے محروم کیا۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ تم قانون کے رکھوالے ہو لیکن کبھی کبھی تمہارا نظام انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ چاہو تو اپنے کزن اینڈریو سے پوچھ لو۔ وہ اس وقت شوٹنگ پول پر ہے۔“

زینا مجھے لے کر عقبی حصے کی جانب چلی گئی جہاں بہت سے لوگ بلیئرڈ کھیل رہے تھے۔ وہاں نصف درجن کے قریب میزیں تھیں لیکن زیادہ تر لوگوں کی توجہ وسط میں پڑی میز پر تھی۔ وہ ایک طویل قامت شخص تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی اسٹک پکڑ لی۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ وہ پہلے جیسا ہینڈسم نہیں رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جگہ جگہ زخموں کے نشان تھے۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور بولا۔

”کیسے گزر رہی ہے کزن؟“

”تمہارے مقابلے میں بہتر ہوں۔“ میں نے کہا اور اس سے لپٹ گیا۔ ”تمہارے ساتھ کیا ہوا؟“

”ایک بددماغ پولیس افسر سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ شاید اس کا نام ڈیسکی یا اس سے ملتا جلتا تھا۔“

”ڈیسکی۔“ میں نے تصحیح کی۔

”ہاں، یہی نام تھا۔ وہ مجھ سے ویلنڈر کے بارے میں سوالات کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ ہاں میں نے یہ سب کچھ کیا ہے اور اب مجھے کام پر جانے کو دیر ہو رہی ہے۔ اس لیے مجھے معاف رکھو۔ وہ یہ مذاق برداشت نہ کر سکا اور اس نے میری یہ درگت بنا دی۔“

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ کیا تم اس کے خلاف شکایت درج کرانا چاہتے ہو؟“

”کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ میری شکایت پر توجہ دیں گے؟ اسے بھول جاؤ ڈیلن! اس نے دھوکے سے مجھ پر حملہ کیا۔ آئندہ میں محتاط رہوں گا۔“

”اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ تم اس سے دور ہی رہو۔ میں اسے دیکھ لوں گا۔“

”تم کیا کرو گے آفیسر لاکروس؟“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ”کیا اسے گرفتار کر سکتے ہو؟“

”نہیں لیکن اسے سیدھا کر دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

”میں نے ہمیشہ تمہارے وعدے پر اعتبار کیا ہے لیکن اس کی کوئی مدت ہونی چاہیے۔ میں ساری عمر انتظار نہیں کر سکتا۔“

”بے فکر رہو۔ تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“

☆☆☆

پولیس ڈپارٹمنٹ کی عمارت میں شیرف اور اسٹیٹ پولیس کے دفاتر بھی تھے۔ زینا تو اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں نے سیدھا اس حصے کا رخ کیا جہاں اسٹیٹ پولیس کے افسران بیٹھا کرتے تھے۔ کیتھن اور ڈیسکی کانفرنس روم میں موجود تھے۔ میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”اگر اپنے کزن کے بارے میں کہنا چاہ رہے ہو تو سن لو کہ میں نے صرف اپنا دفاع کیا تھا۔“ ڈیسکی سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ”اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اس کا گزشتہ [illegible] بتاتا ہے کہ وہ ایسی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔“

”اگر اس نے تم پر حملہ کیا تھا تو وہ اس [illegible] تحویل میں کیوں نہیں ہے؟“

”وہ تمہارا کزن ہے اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا البتہ سبق ضرور سکھا دیا جو وہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔“

”کیا واقعی ایسا ہی ہوا تھا لیفٹیننٹ؟“ میں نے [illegible] سے پوچھا۔ ”کیا اینڈریو نے تمہارے ساتھی پر حملہ کیا تھا؟“

”میں موقع پر موجود نہیں تھی۔“ وہ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ”لیکن میرے پاس سارجنٹ ڈیسکی کے موقف پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیا تمہارے کزن نے شکایت درج کروائی ہے؟“

”نہیں اور یہی بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔ وہ کوئی گلیوں میں پھرنے والا لڑکا نہیں جسے تم تھپڑ مار کر بھول جاؤ۔ وہ وڈ اسموک پوائنٹ ہے اور اسے کبھی نہیں بھولے گا ورنہ ہی میں۔“

”لوگ کہتے ہیں کہ کسی لاکروس سے کبھی مت الجھنا۔“ ڈیسکی طنزیہ انداز میں بولا۔ ”تم اپنے کزن سے زیادہ طاقت ور نظر نہیں آتے۔ اگر تمہارے اندر ہمت ہے تو اپنا بہترین داؤ آزما کر دیکھ لو۔“

”بس اتنا کافی ہے۔“ کیتھن نے غصے سے کہا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو سارجنٹ؟“

”میں چاہتا ہوں کہ تم اور تمہارا یہ گوریلا یہاں سے چلے جائیں۔ اس سے پہلے کہ میرا کزن اس پر حملہ کرنے کے الزام میں جیل جائے۔ لہٰذا میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کیس پر کام کرنے دو۔ اگر کامیاب نہ ہو سکا تو خود اپنے انکل کو تمہارے سامنے لا کر کھڑا کر دوں گا۔“

”ہم اپنی طرف سے مکمل چھان بین کر چکے ہیں لیکن کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ تم بھی ایک نظر ڈال لو اور ہمیں بتاؤ اگر کوئی پہلو ہماری نظروں سے اوجھل رہ گیا ہو۔“

”فارنسک رپورٹ کیا کہتی ہے؟“

”اس سے ہمیں کوئی مدد نہیں ملی کیونکہ لاش کو جانوروں نے خراب کر دیا تھا۔“

”وہ کون سے جانور ہو سکتے ہیں؟“

”اس بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ تین سال گزر جانے کے بعد وہاں صرف ڈھانچہ ہی باقی رہ گیا تھا۔“

”ہڈیوں پر کاٹنے کے نشانات سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑا جانور تھا۔“ یہ کہہ کر میں تصویروں کی جانب [illegible] ان میں سے کچھ جائے واردات کی تھیں۔ ان میں سے [illegible] گڑھے کی بھی تھی۔ دوسری تصویر اس سے متعلق قطعہ [illegible] تھی [illegible] مجھے احساس ہوا کہ کیا دیکھ رہا ہوں تو [illegible] بغیر نہ رہ سکا۔

”کیا ہوا؟“ کیتھن بولی۔

”یہ دیکھو۔ یہاں درختوں کے بیچ گھاس اور دلدل نظر آ رہی ہے اور یہ شکارگاہ تک چلی گئی ہے جہاں ویلنڈر شکار [illegible] گیا تھا۔ تمہارے خیال میں ویلنڈر اس گڑھے میں کیسے گرا ہوگا۔“

ڈیسکی بولا۔ ”وہ خود نہیں گرا۔ کسی شخص نے درختوں کے عقب سے اسے گولی ماری اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔“

”اگر اینڈریو اسے مارنا چاہتا تو وہ آدھ میل کے فاصلے سے بھی اس کا نشانہ لے سکتا تھا۔ میرے خیال میں تو یہ ایک حادثہ ہے۔ اس لیے کیس کو بند کر دینا چاہیے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی اس کی لاش کو دلدل سے گزر کر دو میل تک لے جائے اور اس گڑھے میں دفن کر دے۔“

”ظاہر ہے کہ اس نے اپنے جرم کو چھپانے کے لیے ایسا کیا ہوگا۔“ کیتھن نے کہا۔

”اگر آپ کسی لاش کو ضائع کرنا چاہیں تو اسے دفن کرنے کی ضرورت نہیں۔ جھاڑیوں میں پھینک دینا کافی ہے۔ جنگلی جانور دو دن میں اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ یہ جاننا بہت مشکل ہے کہ اس کی لاش کو کس نے گڑھے میں دفن کیا۔ کم از کم وہ اینڈریو تو نہیں ہو سکتا۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ویلنڈر ایک بھاری بھرکم آدمی تھا اور اس کا وزن تین سو پونڈ سے کم نہیں ہوگا۔ میرے خیال میں تو ڈیسکی جیسا توانا شخص بھی اسے اٹھا کر دلدل میں سے نہیں گزر سکتا۔ اس کے علاوہ ہم ایک اور بات بھی نظر انداز کر رہے ہیں۔“

یہ کہہ کر میں نے ایک پرانا نقشہ ان کے سامنے پھیلا دیا۔ ”یہ 1908ء میں ہیکر ہارڈ ووڈ کمپنی نے تیار کیا تھا۔ ان لکیروں کو دیکھو جو جھیل کے کنارے سے آ رہی ہیں۔ اس وقت لکڑی لے جانے کے لیے ٹرک دستیاب نہیں تھے لہٰذا وہ اس مقصد کے لیے ٹرین استعمال کرتے تھے اور انہوں نے جنگل سے ساحل تک ریلوے لائن بچھائی تھی۔ جب آدھے جنگل کی کٹائی ہو چکی تو انہوں نے ریل کا استعمال بند کر دیا اور یہ ریلوے لائن اکھاڑ دی لیکن اب بھی اس کا کچھ حصہ موجود ہے۔“

”مجھے تو اس تصویر میں کہیں ریلوے لائن نظر نہیں آ رہی۔“ کیتھن نے کہا۔

”وہ گھاس کے نیچے چھپ گئی ہے لیکن نقشہ دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ اس گڑھے کے قریب سے گزر رہا ہے۔“

”اس کا ہمارے کیسے سے کیا تعلق؟“ ڈیسکی نے پوچھا۔

”لگتا ہے کہ اس جنگل میں صرف لکڑی ہی واحد قیمتی شے نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تیار ہو جاؤ، آج رات ہم جنگل کی سیر کے لیے جائیں گے۔“

☆☆☆

وہ دونوں میری جیپ پر سوار تھے اور میں بڑے ماہرانہ انداز میں اسے چلاتا ہوا اس حصے کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں وہ گڑھا تھا۔ راستہ بہت دشوار گزار تھا اور آگے جا کر سڑک بہت تنگ ہو گئی تھی۔ دونوں جانب درختوں کے جھنڈ اور خودرو جھاڑیوں نے ماحول کو اور زیادہ پُراسرار بنا دیا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد میں نے جیپ روک دی اور بولا۔ ''وہ گڑھا یہاں سے سو گز کے فاصلے پر مغرب میں ہے۔''

''ہم یہاں دو دن تک کام کرتے رہے۔'' وہ بولی۔ ''لیکن مجھے تو ریلوے لائن کہیں نظر نہیں آئی۔''

''ممکن ہے کہ تم نے غور نہ کیا ہو۔'' میں نے جیپ کو ریورس گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ہم دوسری طرف سے اسے دیکھ سکتے ہیں۔''

میں نے جیپ کا رخ زیریں حصے کی جانب موڑ دیا۔ بیس منٹ تک چلنے کے بعد میں نے نوٹ کیا کہ راستہ مزید تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے جیپ روکی اور نیچے اتر آیا۔

''یہی وہ جگہ ہے۔''

''یہاں تو مجھے درختوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا۔'' ویسکی نے کہا۔

''یہ سب نئے درخت ہیں۔ غور سے دیکھو کہ ان کے بیچ کیا اگ رہا ہے۔''

''اوہ میرے خدا!'' کیتھی گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو چرس کے پودے ہیں۔''

''تین سال پہلے یہ ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ تم اس کے اردگرد لکڑی کے گٹھر دیکھ سکتی ہو۔ پھر کسی نے اس جگہ کی صفائی کر کے یہ پودے لگائے۔ یہ کسی ووڈاسٹوک بوائے کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی منظم گروہ کا کام ہے۔ ممکن ہے کہ ان کا تعلق اسپین سے ہو۔ وہ پہلے بھی اس علاقے میں کاشت کاری کر چکے ہیں۔''

''لگتا ہے کہ تمہیں منشیات کی تجارت کے بارے میں خاصی معلومات ہیں۔'' ویسکی نے مشتبہ انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، تمہاری بات سمجھ میں آ گئی لیکن ویلنڈر کو یہاں کیوں مارا گیا؟''

''اس کے پاس نو ملی میٹر کی رائفل تھی جو شکاری استعمال نہیں کرتے لیکن یہ بدمعاشوں کا پسندیدہ ہتھیار ہے۔'' یہ کہہ کر میں اس میدان کے کنارے تک گیا اور جھک کر تھوڑی سی مٹی ہٹائی تو اس میں سے ایک ہڈی برآمد ہوئی۔

''یہ کیا ہے؟'' کیتھی نے پوچھا۔ ''ایک ور...ش؟''

''ہاں لیکن انسان کی نہیں بلکہ کسی کتے کی ہے۔ یہ کاشت کار ان کتوں کو یہاں کی حفاظت کے لیے رکھتے ہیں تاکہ ہرن اور دوسرے جانور ادھر کا رخ نہ کریں۔''

''میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ ویلنڈر یہاں کیوں آیا تھا؟''

''وہ چور راستے سے یہاں آیا تھا۔'' میں نے ایک تنگ پگڈنڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پرانی ریل کی پٹڑی یہاں آ کر ختم ہو جاتی ہے مگر چرس کی کاشت کرنے والوں نے ایک متبادل راستہ بھی بنا رکھا تھا تاکہ چھاپے کی صورت میں وہاں سے فرار ہو سکیں۔ یہ راستہ یقیناً شکارگاہ سے بھی گزرتا ہوگا۔ ویلنڈر کوئی لکڑہارا نہیں تھا۔ وہ راستہ بھٹک کر اس پگڈنڈی پر چلتا ہوا یہاں تک آ گیا اور رکھوالی کرنے والے کتوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ پھر کسی محافظ نے اس کے سر میں دو گولیاں اتار دیں اور اس کی لاش کو گڑھے میں دفن کر دیا۔''

''یہ کتا اب تک یہاں کیوں موجود ہے؟'' کیتھی نے پوچھا۔

''وہ اسے بھول گئے اور وہ اپنے مالکوں کا انتظار کرتے کرتے مر گیا لیکن وہ پلٹ کر نہیں آئے۔ جن لوگوں نے ویلنڈر کو مارا تھا، وہ اس گینگ میں نچلے درجے کے ملازم تھے جنہوں نے تین سال پہلے ڈیٹرائٹ یا سٹی ناؤ میں پناہ لی تھی۔ نارکوٹکس والے انہیں پہچاننے میں تمہاری مدد کر سکتے ہیں کیونکہ انہیں ایسے لوگوں کے بارے میں مکمل معلومات ہوتی ہیں۔''

''تم نے تو بہت آسانی سے یہ معاملہ حل کر دیا۔'' ویسکی طنزیہ انداز میں بولا۔ ''بہت ہی عمدہ کہانی ہے جس میں تمہارے کزن کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لیکن اس پر یقین کرنے کی کوئی ایک وجہ بتا دو؟''

''میں تمہیں اس کی کئی وجوہات بتا سکتا ہوں۔ یہ سب پیسے کا کھیل ہے اور تمہاری ناک کے نیچے ہو رہا ہے۔''

''یہ چرس کے پودے ہیں لیکن انہیں اکھاڑا نہیں گیا۔'' کیتھی بولی۔

''حیرت ہے کہ کسی نے اس جگہ کو صاف کر کے ان پودوں کی کاشت کی، ان کی حفاظت کے لیے کتے رکھے، دس لاکھ ڈالرز کی فصل اگائی اور اسے بیچنے سے پہلے چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھے تو اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔''

''میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔'' ویسکی نے کہا۔ ''ممکن ہے انہیں اس فصل کے مناسب پیسے نہ مل رہے ہوں۔ شاید تمہارا اندازہ ہو گیا ہو کہ وہ لا کروس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

میں نے اسے گھور کر دیکھا اور مڑتے ہوئے بولا۔ ''تم سے کسی بات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔''

وہ میرا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ ''میں تم سے مخاطب ہوں۔''

میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے اپنی طرف آنے دیا پھر جھک کر اس کے پیٹ میں ٹکر ماری تو وہ زمین پر جا گرا۔ میں چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو گیا اور اس کے چہرے پر مکے برسانے لگا۔ اس نے مدہوش ہو کر اپنا ریوالور نکالنا چاہا لیکن میں نے اس کی کلائی دبوچ لی۔

''بس بہت ہو چکا۔'' کیتھی چلاتے ہوئے بولی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا لیکن اس کے ریوالور کی نال میری جانب تھی۔

میں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''اگر میں نے اسے چھوڑ دیا اور اس نے دوبارہ مجھ پر حملہ کیا تو میں تم دونوں میں سے کسے گولی ماروں؟''

کیتھی نے جھک کر اس کا ریوالور نکالا تو میں نے بھی اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر دیے اور بولا۔

''اس نے مجھ پر پہلے ہاتھ اٹھایا تھا۔ تم نے خود دیکھا ہے۔''

کیتھی نے اثبات میں سر ہلایا اور گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''وہ اکثر ایسا کرتا ہے۔''

ہم بمشکل تمام اسے جیپ تک لے کر آئے۔ میں نے جیپ کی چابی کیتھی کو دیتے ہوئے کہا۔ ''اس راستے پر آگے جا کر تمہیں ساحلی سڑک مل جائے گی جو سیدھی قصبے کی طرف جاتی ہے۔ میں پیدل آ جاؤں گا۔ جیپ کو پولیس اسٹیشن پر چھوڑ دینا۔''

اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور بولی۔ ''تم اپنی نوکری اور تھانے داروں کے درمیان پھنس گئے ہو۔ اگر معلوم ہو جائے کہ ذاتی طور پر کس کی مدد کرو گے تو مجھے ضرور فون کرنا۔''

میں نے کچھ نہیں کہا اور اس نے میری خاموشی کو ہی جواب سمجھا۔ اس کا کہنا صحیح تھا۔ واقعی میں نے اسے سب کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے ایک نظر میدان پر ڈالی اور عقبی راستے سے آہستہ آہستہ چل دیا۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ راستہ کہاں ختم ہوتا ہے۔

☆☆☆

اس رات میں انکل آرمنڈ کے ہاں پہنچا تو وہ

تعلیمِ بالغاں میں محاوروں کا درست استعمال

☆ چار چاند لگنا۔ میک اپ کی وجہ سے دلہن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

☆ پانی پانی ہونا۔ برف کو ریفریجریٹر سے نہ نکالو۔ ورنہ یہ پانی پانی ہو جائے گی۔

☆ سر پر اٹھانا۔ ناہید نے پانی کی بھری گاگر سر پر اٹھالی۔

☆ کھچڑی پکانا۔ نادیہ اور نجمہ نے امی سے چھپ کر کھچڑی پکائی۔

☆☆☆

نہلے پہ دہلا

☆ اگر دل کہیں نہ لگ رہا ہو تو...؟

کسی راہ چلتی لڑکی سے اظہارِ محبت کر لیا۔ اگر دل نہ لگا تو کھوپڑی میں جوتے ضرور لگ جائیں گے۔

☆ گدھے کے سر سے سینگ کیسے غائب ہوئے تھے؟

گھوڑے کے مقابلے میں الیکشن میں کھڑا ہو گیا تھا۔

(ریاض بٹ، کراچی)

مشہور گولڈون فلموں کے خالق سیموئیل گولڈون اور اس کی بیوی نے شادی کی چھبیسویں سالگرہ منائی۔ تقریب کے دوران سیموئیل نے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے ایک دعوت کے دوران فرانسس ہوورڈ کو دیکھا۔ وہ کئی نوجوانوں میں گھری ہوئی تھی جو اس کی خوب صورتی کی تعریفیں کر رہے تھے۔ پروڈیوسر سیموئیل گولڈون راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا اور فرانسس سے بولا۔

''آپ کے بالوں کا اسٹائل آپ کے چہرے کے لیے موزوں نہیں ہے۔''

اگلے روز اس نے فرانسس کو فون کر کے ملنے کی درخواست کی تو وہ بولی۔ ''اچھا! تم ہو... کل تمہیں میرے بالوں کا اسٹائل پسند نہیں آیا تھا نا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''یہی ایک بات تھی جو اس وقت تمہیں متاثر کر سکتی تھی۔''

دو ہفتے بعد ان کی شادی ہو گئی۔

(کراچی سے کنزی یونس کی ناٹ)

میرے سامنے بیئر کا گلاس رکھتے ہوئے بولے۔

"سنا ہے چند گھنٹے پہلے تم نے ایک پولیس آفیسر کا دماغ درست کر دیا۔ اس کے لیے میں تمہارا احسان مند ہوں۔"

"یہ میں نے تمہارے لیے نہیں کیا۔"

"جانتا ہوں۔ تم یہ سب کچھ اینڈریو کے لیے کر رہے ہو۔ اگر وہ ان پولیس والوں کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ اسے حوالات میں بند کر دیتے۔ اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔"

"انکل! تمہیں میرا شکر گزار ہونے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی میں تم پر کوئی احسان کرنا چاہتا ہوں۔"

"اب تمہارے ماتھے پر بل کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ وہ پولیس والے تو واپس چلے گئے۔ وہ جس مقصد سے آئے تھے، انہیں اس میں کچھ کامیابی ہوئی؟"

"تھوڑی سی پیش رفت ہوئی ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "ایسا لگتا ہے کہ ویلنڈر غلطی سے اس علاقے میں چلا گیا جہاں کچھ لوگوں نے چرس کی کاشت کر رکھی ہے۔ اس پر رکھوالی کرنے والے کتوں نے حملہ کیا اور وہ کسی محافظ کی گولی کا نشانہ بن گیا۔"

"اگر تم اس محافظ کا نام جاننا چاہتے ہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

میں نے بیئر کا گلاس کاؤنٹر پر رکھا اور ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "تم اس کا نام کیسے جان پاؤ گے؟"

"شاید تم بھول رہے ہو کہ میں ایک بار چلاتا ہوں۔ یہاں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں اور ان میں پولیس والے، جرائم پیشہ بدمعاش، شریف شہری سبھی طرح کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ میرے کانوں میں بھانت بھانت کی آوازیں پڑتی ہیں۔ تم اس کا نام جاننا چاہتے ہو یا نہیں؟"

"تمہیں یہ پریشانی نہیں کہ جب اسے گرفتار کیا جائے گا تو وہ کیا کہے گا؟"

"وہ کچھ نہیں کہے گا۔" انکل مسکراتے ہوئے بولے۔ "وہ مر چکا ہے۔ گزشتہ خزاں میں اس کا کار چلاتے ہوئے حادثہ ہوا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تو اس کے دو بھائی اور ہیں جو کوبراز کے گینگ میں شامل ہیں۔ وہ ماہر نشانے باز ہیں اور ان کے پاس نائن ایم ایم کی رائفل بھی ہوتی ہے جس سے ویلنڈر کو مارا گیا۔"

"اگر وہ اب بھی یہیں کہیں موجود ہیں تو کیتھی انہیں ڈھونڈ نکالے گی۔ وہ بہت اچھی پولیس آفیسر ہے۔"

"اس طرح سب لوگ مطمئن ہو جائیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"نہیں، شاید سب لوگ خاموش نہ رہیں۔"

"مسئلہ کیا ہے بھتیجے؟"

"اسی ہزار ایکڑ۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"اس سرکاری جنگل کا رقبہ اسی ہزار ایکڑ سے جو دنیا کے کئی ممالک سے زیادہ ہے۔ اتنی بڑی جگہ کو چھوڑ کر کوبراز نے شکارگاہ سے متصل جگہ کا انتخاب کیوں کیا؟"

"یہ جگہ ریلوے لائن سے قریب تھی اور وہاں آنا جانا آسان تھا۔"

"یہ حادثہ شکارگاہ سے چوتھائی میل کے فاصلے پر پیش آیا۔ وہاں راستوں کی نشاندہی کے لیے ٹیپ لگا دی گئی ہے اس لیے کسی کا بھٹک جانا ممکن نہیں۔ جب تک کوئی شخص ان نشانیوں کو تبدیل نہ کر دے اور اسی وجہ سے ویلنڈر غلطی سے اس قطعۂ زمین پر پہنچ گیا۔"

"اوہ میرے خدا! تمہیں تو پولیس کی نوکری چھوڑ کر ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے لکھنا چاہئیں۔"

"مجھ سے مذاق مت کرو انکل! میں تمہارا بے تکلف دوست نہیں بلکہ قانون کا محافظ ہوں۔"

"تم میرے چہیتے بھتیجے بھی ہو اور اسی لیے میرا اندازہ ہے کہ تم نے اسٹیٹ پولیس آفیسرز سے یہ تھیوری بیان نہیں کی ہوگی۔"

"ہاں، اس پر بھی بات نہیں ہوئی۔"

"یہ صرف ایک نظریہ ہے یا اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے؟"

میں بار کاؤنٹر پر جھکا۔ میرا چہرہ ان سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ میں نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے انکل کہ کوبراز نے اس جگہ کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ حرکت کسی ووڈ اسموک بوائے کی ہے جس نے اس زمین کو صاف کیا، وہاں چرس کے پودے لگائے اور پھر اسے منشیات فروش گروہ کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ جب انہوں نے اپنے محافظ اور کتے چھوڑ دیے تو اس نے راستے کی نشانیاں تبدیل کر دیں تاکہ ویلنڈر بھٹک کر وہاں پہنچ جائے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اس کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔ منشیات فروشوں کو ڈر تھا کہ ویلنڈر کی تلاش میں پولیس پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے وہ فرار ہو گئے اور پھر بھی ... نہ کیا۔ اس طرح وہ قطعہ درخشیات کے پودے ... ملکیت میں آ گئے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ویلنڈر کی قسمت ہی خراب ہو اور وہ واقعتاً بھٹک کر وہاں چلا گیا ہو۔"

"کوئی شخص اتنا بد قسمت نہیں ہو سکتا۔"

"یہ اس کے کرموں کا پھل بھی ہو سکتا ہے۔ وہ ... زندگی جو کچھ کرتا رہا، اس کا حساب ایک ہی دفعہ میں ... ہو گیا۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"میں تمہیں بتاتا ہوں بھتیجے۔ فرض کرو تم صحیح کہہ رہے ... اگر تمہارا شک مجھ پر ہے تو کیا ایک بدمعاش کو منشیات کا ... فروخت کرنا یا راستے کی نشانیاں تبدیل کرنا قانون کی ... ورزی ہے؟ میں نے تو ایسا کبھی نہیں سنا۔"

"یہ کوئی کھیل نہیں ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسی ... کی وجہ سے ویلنڈر مارا گیا۔"

"تمہارے باپ کا قتل بھی ایسے ہی ہوا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا کہ میرا بھائی کتنا محنتی آدمی تھا۔ اس نے میری غیر موجودگی میں پورے گھر کی دیکھ بھال کی تھی۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔"

"تم اس قانون کی بات کر رہے ہو جو تمہارے باپ کے قاتل کو سزا نہ دے سکا۔ تمہارے خیال میں اس وقت جو کچھ ہوا، وہ ٹھیک تھا؟"

"نہیں۔"

"ٹھیک ہے، اگر تم سچ جاننا چاہتے ہو تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا پھر تمہارا جو دل چاہے وہ کرنا۔"

میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر بولا۔ "بتاؤ۔"

"سچ تو یہ ہے کہ ویلنڈر نے بس ایک ہی اچھا کام کیا تھا کہ اس نے تمہاری ماں کو مدد کی پیشکش کی تھی اور اس کے علاوہ اس کے شوہر کی موت پر افسوس کا اظہار کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے پوری زندگی میں کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ وہ یہاں شکار کے بہانے آتا اور زیادہ وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ پورکر میں رہتا۔ جب میں نے یہ بار خریدا تو اس کے چند ماہ بعد وہ ... بھی آیا تھا۔ وہ آتے ہی مجھ پر برہم ہو گیا اور مغلظات ... لگا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کے لیے کہا تو وہ دھمکیوں ... شاید وہ میرے ماضی کے بارے میں نہیں جانتا ... اس نے مجھے ووڈ اسموک بوائے کہہ کر مخاطب کیا۔"

"کیا تمہیں اس پر اعتراض ہے؟"

"نہیں بلکہ مجھے اپنے ووڈ اسموک بوائے ہونے پر فخر ... لیکن وہ اس نام سے پکار کر میری بے عزتی کر رہا تھا۔ ... نے اسے سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں تم خود اندازہ لگا سکتے ہو۔"

"تم نے اسے صرف اس لیے مار دیا کہ اس نے تمہیں ووڈ اسموک بوائے کہا تھا؟"

"میں نے اسے نہیں مارا بلکہ ایسی مشکل میں ڈال دیا جہاں سے وہ کبھی نہیں نکل سکے۔ تمہارا باپ ایک اچھا آدمی تھا لیکن اس شخص کی وجہ سے وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ وہ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر باہر آ گیا لیکن قدرت کی طرف سے دی گئی سزا سے نہ بچ سکا۔"

"اور اگر میں اس کے قتل کے الزام میں تمہیں گرفتار کر لوں تو؟"

"تم سچ جاننا چاہ رہے تھے، وہ میں نے بتا دیا۔ اب تمہارا جو دل چاہے کرو۔ میں وہی کروں گا جو میرا دل کرے گا۔"

"کیا میں اسے دھمکی سمجھوں؟"

"بالکل نہیں۔" انکل آرمنڈ نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "تم ہمیشہ میرے چہیتے بھتیجے رہو گے، چاہے حالات کیسے بھی ہوں لیکن..."

"ہاں، ہاں بولو۔ رک کیوں گئے؟"

"کبھی کسی لا کروس سے مت الجھنا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہاں سے چلا آیا۔

میں قانون کا محافظ ہوں اور اس سے پیار کرتا ہوں۔ میں نے فوجی کارروائیوں میں بربریت اور سفاکی کے بڑے دل خراش مناظر دیکھے تھے لیکن وہاں قانون بے بس تھا۔ ویلنڈر کے ساتھ جنگل میں جو کچھ ہوا وہ انصاف سے قریب تر تھا اور ہمارا نظام اسے کبھی ایسی سزا نہیں دے سکتا تھا۔ انسان کو جرم سے باز رکھنے اور اسے سزا دینے کے لیے بے شمار قانون بن چکے ہیں لیکن ان سے معاشرے میں بہتری نہیں آئی۔ ہر مجرم کے اندر ایک شیطان موجود ہوتا ہے جو جانتا ہے کہ قانون کو اپنے حق میں کس طرح استعمال کیا جائے۔

کیتھی سمجھتی ہے کہ میں درمیان میں پھنس گیا ہوں لیکن اس کا خیال غلط ہے۔ انصاف کرتے وقت کوئی درمیانی راستہ نہیں ڈھونڈا جاتا۔ دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ مجرم کو سزا ملتی ہے یا وہ بری ہو جاتا ہے۔ اگر مجھے قانون اور اپنے خاندان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو وہی کروں گا جو میری ذمے داری بنتی ہے۔ میں بھی تو ووڈ اسموک بوائے ہوں اور اچھی طرح اپنے مقام کو پہچانتا ہوں۔

اجالوں کے سفیر

سلیم فاروقی

ایک ایسے عہد میں جب نگاہوں میں کوئی خوش کن نظارہ نہیں اور آنکھوں میں کوئی خواب نہیں... بے یقینی اور مایوسی کی کیفیت نے ہر شخص کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے... نئی نسل کی نئی آواز ہمارے اور ہمارے مستقبل کے لیے ایک بشارت ہے... اس کا وجود شکست و ریخت کے درمیان تعمیرِ نو کا ایک اشارہ ہے... نئی نسل کی امنگیں اور ولولے مستقبل کی نوید بن رہے ہیں... ہماری الجھی ہوئی زندگی سنجیدہ صورتِ حال میں زندہ رہنے کی آرزو ہے... اکسیر ہے... ہماری نوجوان نسل کے ایک ایسے ہی دلیر اور بہادر جوان مرد کی روداد حیات... جس کے لیے ہر قدم پر ایک نئی رکاوٹ تھی مگر اس کے قدم ڈگمگانے کے بجائے ہر لمحہ متحرک تھے...

موجودہ حالات کے ہنگاموں میں ایک نئی فکر اور حوصلہ [illegible]

مجھے ملازمت جوائن کیے ہوئے دوسرا دن تھا۔ پولیس ٹریننگ سینٹر شہداد پور سے ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد مجھے حیدرآباد کے اس تھانے میں تعینات کیا گیا تھا۔ یوں میں اس تھانے میں سب سے جونیئر اور کم عمر اے ایس آئی تھا۔

میں پرانی فائلیں کھول کر بیٹھ جاتا اور ان کیسوں کو غور سے پڑھتا جو سینئر پولیس افسران نے حل کیے تھے۔ میں اپنے بارے میں آپ کو بتا دوں کہ میں اپنے محلے اور کالج میں بہت سرکش اور منہ پھٹ مشہور تھا۔ میں پولیس میں بھی یہی سوچ کر آیا تھا کہ محنت اور جانفشانی سے کام کروں گا اور اپنے طور پر اس تاثر کو غلط ثابت کر دوں گا کہ پولیس والے، کام چور اور بددیانت ہوتے ہیں۔

میں اس دن بھی ایک پرانی فائل کے مطالعے میں مصروف تھا کہ سپاہی غلام رسول میرے کمرے میں داخل ہوا اور خاکی رنگ کا ایک لفافہ مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ”سر جی! یہ آپ کو انچارج صاحب نے بھجوایا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔

لفافہ دیکھ کر میں سمجھا کہ اس میں کوئی سرکاری حکم ہوگا لیکن اس میں تو صرف پانچ پانچ سو روپے کے دو نوٹ تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انچارج صاحب نے مجھے یہ رقم کیوں بھجوائی ہے؟

میں اسی وقت اٹھا، اپنی وردی درست کی اور انچارج صاحب کے کمرے میں پہنچ کر انہیں سیلوٹ کیا۔ انہوں نے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا کیونکہ وہ اس وقت کسی سے ٹیلی فون پر بات چیت کر رہے تھے۔

وہ ٹیلی فون پر باتیں کرتے رہے اور میں بیٹھا پہلو بدلتا رہا۔ ایسے پولیس افسر اور وہ بھی کسی پولیس اسٹیشن کے انچارج کے طور پر میں نے پہلے ہی دن انہیں پسند نہیں کیا تھا۔ ان کا جسم بے ڈول تھا اور پیٹ کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے اپنی قمیص میں بڑی سی فٹ بال چھپا رکھی ہو۔ میری نظریں گھڑی پر تھیں۔ وہ پورے بارہ منٹ بعد ٹیلی فون سے فارغ ہوئے اور بولے۔ ”حسن! کوئی خاص بات ہے... تم مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہو؟“

”سر! آپ نے مجھے جو لفافہ بھجوایا ہے وہ...“

”ارے یار! تم ابھی بالکل نئے ہو۔“ انہوں نے ہنس کر کہا۔ ”اگلے ہفتے تمہیں یہ شکایت نہیں ہوگی۔“

”شکایت کیسی سر؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بھئی، اس میں رقم کم ہے۔ اصولاً تو تمہیں اس سے زیادہ ملنا چاہیے تو بھی نہیں ملتا لیکن میں نے سوچا کہ...“

”سر! کیا مطلب ہے آپ کا؟ وہ رقم... آپ نے کس سلسلے میں بھجوائی ہے؟“

انچارج صاحب نے گھور کر مجھے دیکھا پھر طنزیہ لہجے میں بولے۔ ”تم اتنے بھولے تو نہیں ہو کہ تمہیں اس کا مطلب بھی سمجھانا پڑے۔“

اچانک سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔ میں نے جیب سے لفافہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا اور خود پر بہت ضبط کر کے بولا۔ ”سر! میں یہ رقم نہیں لے سکتا۔“

انچارج صاحب نے مجھے گھورا اور طنزیہ لہجے میں بولے۔ ”حسن! تمہیں ڈیوٹی جوائن کیے ہوئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا ہے۔ ہر نیا آنے والا اے ایس آئی پہلے پہل یہی کرتا ہے۔ پہلی دفعہ مجھے بھی بہت عجیب لگا تھا۔ ابھی تم نوجوان ہو، دل میں محنت اور دیانت داری سے کام کرنے کا جذبہ بھی ہوگا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ سب اس حقیقت کو قبول کر لیتے ہیں۔“

”سر! میں کوشش کروں گا کہ ایسا وقت کبھی نہ آئے۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

اسی روز انچارج صاحب نے مجھے پولیس موبائل کے گشت پر لگا دیا۔ میرے ساتھ ایک ڈرائیور اور چار سپاہی بھی ہوتے تھے۔

ڈرائیور ایک پرانا حوالدار تھا۔ وہ پکا پولیس والا تھا۔ موبائل وین ایک جگہ کھڑی کر کے وہ پسار کر بیٹھ جاتا اور سگریٹ پھونکتا رہتا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے سپاہی بھی گاڑی سے اتر جاتے اور ادھر اُدھر گھومتے رہتے۔ وہ وقفے وقفے سے ہمیں چائے دے جایا کرتے تھے۔

میں نے دو دن تو یہ برداشت کیا، تیسرے دن میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ”حوالدار صاحب! ہماری ڈیوٹی علاقے میں گشت کرنے کی ہے۔ آپ تو یہیں جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

ڈرائیور نے ناگواری سے مجھے دیکھا پھر بولا۔ ”سرکار ہمیں پیٹرول اس لیے نہیں دیتی کہ ہم اسے یونہی پھونک ڈالیں۔“

ابھی اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک موٹر سائیکل ہمارے نزدیک آ کر رکی۔ اس پر ایک لڑکا اور ایک لڑکی سوار تھے۔ دونوں شکل سے حواس باختہ لگ رہے تھے۔

نوجوان نے حوالدار سے کہا۔ ”جناب! ابھی ابھی ہمیں دو لڑکوں نے لوٹ لیا ہے اور وہ موٹر سائیکل پر سیدھے گئے ہیں۔“

”او بھائی! تم تھانے جا کر اس واقعے کی رپورٹ درج کراؤ۔ وہ تو اب تک نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچے ہوں گے۔“

لڑکا مایوس ہو کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ میں نے آواز دے کر اسے روک لیا اور گاڑی سے اتر کر اس کی طرف بڑھا۔

”ان لوگوں نے تم سے کیا کیا چھینا ہے؟“ میں نے کہا۔

”میرا اور میری بیوی کا موبائل فون، میرا پرس اور میری بیوی کا بیگ۔ تقریباً چار ہزار روپے نقد تھے ہمارے پاس۔ اس کے علاوہ میری بیوی کا لاکٹ بھی لے گئے ہیں۔“

”ان کے حلیے بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”ان میں سے ایک تو ورزشی جسم کا مالک تھا اور دوسرا چلا دبلا۔ پتلے دبلے لڑکے کا بایاں ہاتھ زخمی تھا اور اس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔“

”ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے کہا پھر تحکمانہ لہجے میں حوالدار سے کہا۔ ”گاڑی اسٹارٹ کرو۔“ دو سپاہی بھی گاڑی سے باہر کھڑے تھے۔ میں نے انہیں بھی گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور یوں خراماں خراماں روانہ ہو گیا جیسے کہیں سیر کے لیے جا رہا ہو۔

”گاڑی کی اسپیڈ بڑھاؤ۔“ میں نے جھنجلا کر کہا۔

اس نے بھی جھنجلا کر یک لخت اسپیڈ بڑھا دی اور تیز رفتاری سے چلنے لگا۔ میری نظر ان وارداتیوں کی تلاش میں تھی۔ اس وقت ہر موٹر سائیکل والا مجھے مشکوک نظر آ رہا تھا۔

کافی دور آنے کے بعد حوالدار نے کہا۔ ''صاحب! آپ فضول میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ وارداتیے تو اب تک نہ جانے کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔''

''خاموشی سے چلتے رہو۔'' میں غرا کر بولا۔

اس نے جھنجلا کر رفتار مزید بڑھا دی۔

اچانک میری نظر سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک موٹر سائیکل پر پڑی۔ ایک لڑکا اس کا پلگ کھولے ہوئے اس کی صفائی کر رہا تھا۔ دوسرا لڑکا اس کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر پٹی دیکھ کر میں چونک اٹھا اور چیخ کر بولا۔ ''گاڑی روکو۔''

حوالدار نے اچانک بریک لگا دیے۔ گاڑی کے ٹائر زمین سے رگڑ کھا کر چرچرائے۔ میں نے اپنا سروس ریوالور نکالا اور دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

پولیس موبائل کو آتے دیکھ کر وہ دونوں بھی چوکنا ہو گئے اور ایک طرف بھاگ نکلے۔

میں نے چیخ کر کہا۔ ''رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے ایک ہوائی فائر کر دیا۔

وہ دونوں اچانک رک گئے۔ اس وقت تک میرے چاروں سپاہی بھی میرے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ میرے حکم پر انہوں نے دوڑ کر ان دونوں اچکوں کو دبوچا اور انہیں ہتھکڑی پہنا دی۔ سپاہیوں نے انہیں دھکیل کر موبائل میں بٹھا دیا۔

سپاہی بہادر خان نے سب سے پہلے ان کی تلاشی لی اور مال مسروقہ کے ساتھ ساتھ ان کی جیب سے موبائل فون بھی نکال لیے۔ ان میں سے ایک کے پاس سے ایک پستول بھی برآمد ہوا۔

میں نے ایک سپاہی سے کہا کہ ان کی موٹر سائیکل بھی موبائل میں چڑھا دو۔

میں انہیں لے کر پولیس اسٹیشن پہنچا تو وہاں دو سپاہیوں اور ہیڈ محرر کے علاوہ کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

میں نے ان دونوں کو حوالات میں بند کر دیا۔ اسی وقت وہاں لٹنے والا نوجوان بھی اپنی بیوی کے ساتھ پہنچ گیا۔

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں نے دونوں اچکوں کو نہ صرف گرفتار کر لیا ہے بلکہ ان کے قبضے سے مسروقہ مال بھی برآمد کر لیا ہے تو وہ حیرت و بے یقینی کے انداز میں میری شکل دیکھنے لگا۔ اس کی بیوی بھی بہت حیران تھی۔

''آپ ایسا کریں۔'' میں نے نوجوان سے کہا۔ ''ان دونوں کے خلاف رپورٹ درج کرا دیں۔ میں ان کے خلاف ابھی پرچہ کاٹ دوں گا۔ ان پر تو ڈکیتی اور غیر قانونی اسلحہ رکھنے کا کیس بنے گا اور دونوں کو کم سے کم تین سال کی سزا تو میں دلوا کر ہی رہوں گا۔''

''ہماری رقم اور دوسری اشیا... ان کا...''

''وہ چیزیں فی الحال پولیس کی تحویل میں رہیں گی۔ میں ان تمام چیزوں کی ایک رسید بنا کر آپ کو دے دوں گا۔ آپ کو عدالت سے وہ چیزیں واپس مل جائیں گی۔''

''ہم کورٹ کچہری کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''آپ بس ہماری رقم اور دوسری چیزیں ہمارے حوالے کر دیں پھر چاہے ان دونوں کو پھانسی چڑھا دیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے محترمہ؟'' میں نے کہا۔ ''اس طرح تو وہ لوگ پھر آزاد ہو جائیں گے اور...''

''سوری آفیسر!'' لڑکے نے کہا۔ ''آپ چاہیں تو ہمیں کچھ بھی نہ دیں لیکن ہم کورٹ میں نہیں جائیں گے۔''

میرا دل چاہا کہ اس لڑکے کے منہ پر ایک جھنپڑ رسید کروں اور کہوں کہ تم ہی لوگوں کی وجہ سے یہ لوگ قانون کی گرفت میں نہیں آپاتے۔

میں نے اسے رسان سے سمجھایا۔ ''دیکھیے مسٹر! میں نے آپ کے ساتھ تعاون کیا ہے تو آپ کو بھی میرے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔''

''اچھا، اب میں سمجھا۔'' لڑکے نے کہا۔ ''ہم یہ تعاون کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس جتنا کیش ہے وہ آپ رکھ لیں اور...''

''بکواس بند کرو۔'' میں گرج کر بولا۔ ''پہلے پولیس میں رپورٹ کرتے ہو پھر اپنی آسانی کے لیے ہمیں رشوت کی پیشکش بھی کرتے ہو۔''

''میں تو آپ سے یہ کہہ...''

''اوئے تم نے سنا نہیں، صاحب نے کیا کہا ہے۔'' سپاہی اعجاز احمد نے خاص پولیس والوں کے اسٹائل میں کہا۔ ''ورنہ ابھی تمہیں بھی ان دونوں کے ساتھ ہی اندر کر دوں گا۔''

''کس جرم میں؟'' نوجوان نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''ایک پولیس آفیسر کو رشوت دینے کے جرم میں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''پولیس تو ہمیشہ یہی کرتی ہے۔'' لڑکی نے کہا۔ ''تب ہی تو لوگ پولیس میں رپورٹ درج کراتے ہوئے گھبراتے ہیں۔''

اسی وقت انچارج کی گاڑی پولیس اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ اسی تھانے کا ایک گھاگ سب انسپکٹر ابرار بھی تھا۔

انچارج اپنی گاڑی سے اتر کے میرے ہی کمرے میں آ گیا۔

''کیا پرابلم ہے حسن؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے جواب میں تفصیل سے اسے پورا واقعہ بتا دیا۔

''کیوں بھئی، تم پولیس کو رشوت دینے کی کوشش کر رہے تھے؟'' اس نے گرج کر کہا پھر بلند آواز میں بولا۔ ''غلام رسول! اسے بھی لاک اپ میں بند کر دو۔ میں بتاؤں گا کہ اس کا جرم کیا ہے؟'' پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا۔ ''بی بی! آپ جا سکتی ہیں۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''حسن! تم ان اچکوں سے تفتیش کرو۔''

میں سمجھ گیا کہ اب یہ معاملہ میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اب انچارج نہ ان اچکوں کی ایف آئی آر کاٹے گا، نہ اس نوجوان کو بغیر کچھ لیے وہاں سے جانے دے گا۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو لڑکی بوجھل قدموں سے باہر کی طرف جا رہی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اس بے چاری کے پاس تو ایک پیسا بھی نہیں ہے۔ سب کچھ تو وہ اچکے پہلے ہی چھین چکے تھے۔

میں تیزی سے اس کی طرف لپکا اور کہا۔ ''سنیے!''

لڑکی ٹھٹک کر ایک دم رک گئی۔ وہ یوں سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی جیسے میں اسے بھی گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔

وہ تھوک نگل کر بولی۔ ''جی، فرمائیے؟''

''آپ گھر تک کیسے جائیں گی؟ اور آپ رہتی کہاں ہیں؟''

''میں لطیف آباد سات نمبر میں رہتی ہوں۔'' لڑکی نے کہا۔ ''اور میری فکر مت کریں، میں ٹیکسی کے ذریعے گھر تک پہنچ جاؤں گی اور گھر جا کر اسے کرایہ ادا کر دوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ مڑی اور تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گئی۔

میں ان لٹیروں سے تفتیش کرنے کی غرض سے اس کمرے میں پہنچ گیا جو ملزمان سے تفتیش کے لیے مخصوص تھا۔

میں نے سپاہی اعجاز سے کہا۔ ''ان دونوں ملزمان میں سے ایک کو یہاں لے آؤ۔''

اس تھانے میں اعجاز ہی وہ واحد شخص تھا جو مجھے پسند تھا۔ وہ پڑھا لکھا اور خاصا مہذب نوجوان تھا اور بے روزگاری سے تنگ آ کر پولیس میں بھرتی ہو گیا تھا۔ وہ اپنے چال ڈھال اور گفتگو سے ''پولیس والا'' بالکل نہیں لگتا تھا۔ وہ بااصول اور کھرا شخص تھا اور مجھے اس کی یہی بات سب سے زیادہ پسند تھی۔

نقش بر ذہن

شوہر سفر کر کے ہوائی جہاز سے اترا تو ائیرپورٹ پر بیوی استقبال کے لیے موجود تھی۔ دونوں چلنے لگے تو ایک حسین ائیر ہوسٹس قریب سے گزری۔ شوہر نے بے ساختہ اس سے کہا۔ ''مس فری، خدا حافظ امید ہے ہمیں آئندہ بھی ایک ساتھ فضا میں اڑنے کا موقع ملے گا۔'' ائیر ہوسٹس مسکراتی ہوئی چلی گئی تو بیوی نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔

''یہ کیا معاملہ ہے؟ تمہیں اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟''

شوہر نے بوکھلا کر کہا۔ ''وہ بورڈ پر اس کا نام پائلٹ کے نام کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔''

بیوی بولی۔ ''ذرا اس پائلٹ کا نام بھی تو بتا دو نا!''

تھوڑی دیر بعد وہ دبلے پتلے ملزم کو وہاں لے آیا اور اس کی کمر پر زوردار لات رسید کر کے اسے کمرے میں دھکیل دیا۔ جرائم پیشہ افراد کے ساتھ وہ اسی بے رحمی سے پیش آتا تھا۔

دبلا پتلا ملزم اس کی زبردست لات کھانے کے بعد کمرے کے وسط میں آ گرا لیکن فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں اس کمرے میں موجود واحد کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے پوچھا۔

''غنی... عبدالغنی۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''لوٹ مار کا یہ دھندا کب سے کر رہے ہو؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''آ... آج... پہلی دفعہ... میں...''

اعجاز نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر تڑاخ دار تھپڑ مارا کہ وہ الٹ کر کمرے کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔

''سچ سچ بول۔'' اعجاز بھڑک کر بولا۔ ''کب سے وارداتیں کر رہا ہے؟'' اعجاز نے اس کے بال پکڑ کر اسے بری طرح جھنجوڑ دیا۔ ''اب اگر جھوٹ بولا تو میں تجھے الٹا لٹکا دوں گا۔''

''صاحب جی!'' وہ سہم کر بولا۔ ''میں... تقریباً ایک سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔'' اس نے اپنی ہتھیلی کی پشت سے ہونٹوں سے بہنے والا خون صاف کیا۔

''اب تک کتنی وارداتیں کر چکے ہو؟'' اعجاز نے گرج کر پوچھا۔

"ٹھیک سے یاد نہیں... ہے... صاحب... شاید... گیارہ... یا... بارہ۔" اس نے کہا۔

"اپنے دوسرے ساتھیوں کے نام اور پتے بتا؟" اعجاز نے پھر اس کے بالوں کو جھٹکا دیا۔

"ایک تو... یہی لطیف ہے۔" اس نے کہا۔ "جسے آپ نے... آج گرفتار کیا ہے... دوسرا اقبال ہے جو بالے کے نام سے مشہور ہے... تیسرا رشید ہے۔ وہ کمانڈو کہلاتا ہے... چوتھا... اصغر ہے... جسے سب لوگ خانزادہ کے نام سے جانتے ہیں... بس میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔"

"ان کے پتے بھی لکھواؤ۔" اعجاز نے کہا اور اپنی پاکٹ ڈائری نکال لی۔ اس نے ان سب کے پتے بھی لکھوا دیے۔

"اگر ان میں سے کوئی نام اور پتا غلط ہو تو میں تیری کھال کھینچ لوں گا۔" اعجاز نے کہا۔

"اب تم اس کے ساتھی کو لے آؤ۔" میں نے اعجاز سے کہا۔ وہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے آہستہ سے کہا۔ "اس نے جو نام اور پتے لکھوائے ہیں انہیں ابھی کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"او کے سر!" اعجاز نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کسرتی جسم والے بدمعاش کو لے کر آ گیا۔ وہ چہرے ہی سے ہٹ دھرم نظر آ رہا تھا۔ اس نے پہلے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے گھورا پھر نفرت بھرے انداز میں اپنے ساتھی اور اعجاز کو دیکھا۔ اعجاز، غنی کو وہاں سے لے گیا اور اسے چھوڑ کر فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس دوران میں وہ بدمعاش کمرے کا جائزہ لیتا رہا جیسے وہ اس پولیس اسٹیشن کے دورے پر آیا ہو۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"کیا غنی نے میرا نام نہیں بتایا؟" اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کوشش کر رہا تھا کہ خود پر قابو رکھوں۔ اس کا انداز مجھے اشتعال دلا رہا تھا۔ میں نے ضبط کر کے پوچھا۔ "میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

"میرا نام کچھ بھی سمجھ لیں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ کھا کر وہ لڑکھڑایا لیکن اپنے پیروں پر کھڑا رہا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" میں نے بائیں ہاتھ سے اس کے بال پکڑ لیے اور زور دار جھٹکا دیا۔

"آپ چھوڑ دیں سر!" اعجاز نے کہا۔ "میں اس سے سب کچھ پوچھ لوں گا۔"

وہ جانتا تھا کہ اگر میں نے مار پیٹ شروع کر دی تو اس ملزم کا حلیہ بگڑ جائے گا۔

"ہاں بھئی اور مار کھائے گا یا میری بات کا جواب دے گا۔" اعجاز نے اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "نام کیا ہے تیرا؟"

"میرا نام لطیف ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن تم لوگوں کو یہ مار پیٹ بہت مہنگی پڑے گی۔" اس نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔

"تو ہماری فکر چھوڑ۔" اعجاز نے کہا۔ "ہم ہمیشہ مہنگی چیزیں خریدتے ہیں۔ تو یہ بتا، تیرے ساتھ اور کتنے لوگ ہیں؟"

"مجھے ایک ٹیلی فون کرنے کی اجازت دے دو۔" لطیف نے کہا۔ "پھر تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ میرے ساتھ کتنے لوگ ہیں؟"

اعجاز نے اچانک اپنے گھٹنا اس کی ناف پر دے مارا اور غرا کر بولا۔ "تو لوٹ مار کا دھندا کب سے کر رہا ہے؟"

"کون سا دھندا؟" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

"اسے الٹا لٹکاؤ اعجاز۔" میں نے گرج کر کہا۔ "یا پھر چیرا لگاؤ۔ یہ ایسے زبان نہیں کھولے گا۔"

چیرے کا نام سن کر اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ میں نے آج تک کسی پر ایسا وحشیانہ تشدد نہیں کیا تھا اور کرنا بھی نہیں چاہتا تھا، صرف اسے دھمکا رہا تھا۔

"تم... تم ایسا نہیں کر سکتے۔" اس نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔

"اگر تو نے زبان نہ کھولی تو میں ایسا ہی کروں گا۔" اعجاز نے کہا۔

پھر پانچ منٹ کے اندر اندر اس نے اپنے کئی ساتھیوں کے نام پتے بتا دیے۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ اس سے قبل اس نے کتنی وارداتیں کی ہیں اور مسروقہ مال کہاں بیچا ہے۔

ہماری وہ رات اور دوسرا دن بہت مصروف گزرا۔ میں نے چن چن کر تقریباً ان تمام لوگوں کو گرفتار کر لیا جن کے نام لطیف اور غنی نے بتائے تھے۔ ان کے قبضے سے مسروقہ مال بھی برآمد کر لیا اور بہت سے افراد کے قبضے سے کافی [illegible] اسلحہ بھی ہاتھ لگا۔ گرفتار ہونے والوں کے توسط سے دوسرے لوگوں کی نشاندہی ہوئی اور حیدر آباد میں کافی عرصے تک یہ دھڑ پکڑ کا سلسلہ جاری رہا۔

مجھے حیدر آباد میں تعینات ہوئے تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ میری شاندار کارکردگی کے سلسلے میں محکمے نے مجھے سب انسپکٹر کے عہدے پر ترقی دے دی اور اعجاز حوالدار ہو گیا کیونکہ وہ میرا دستِ راست تھا۔

اس ڈیڑھ برس کے عرصے میں ہم نے بہت سے چوروں، ڈاکوؤں اور اغوا برائے تاوان کے ملزمان کو گرفتار کیا تھا۔ مجھے صدمہ اس وقت ہوا جب ان ملزمان میں سے بیشتر ضمانت سے باعزت طور پر بری ہو گئے۔ سب سے زیادہ صدمہ مجھے اس نوجوان کا تھا جس کی شکایت پر یہ سلسلہ شروع ہوا تھا۔ انچارج صاحب نے اس کے گھر والوں سے بھی دس ہزار روپے کھرے کر لیے تھے۔ یہ باتیں مجھے اعجاز بتایا کرتا تھا کیونکہ حرام کے اس پیسے میں میرا کوئی حصہ ہوتا ہی نہیں تھا۔

پھر محکمے نے میری کارکردگی دیکھتے ہوئے مجھے کمانڈو ٹریننگ کے لیے منتخب کر لیا۔

ایک سال کی اس ٹریننگ نے مجھے یکسر بدل کر رکھ دیا۔ مجھ میں بلا کی خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ میں ٹریننگ سے فارغ ہوا تو مجھے کراچی کے درخشاں پولیس اسٹیشن بھیج دیا گیا۔ اب میں پہلے والا ڈرا سہما حسن نہیں تھا بلکہ اپنے انچارج اور سینئر افسران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تھا۔ خوشی اس بات کی تھی کہ یہاں اعجاز پہلے سے موجود تھا۔ اس نے بہت پُرتپاک انداز میں میرا استقبال کیا۔

"کیسے ہو اعجاز؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں سر!" اس نے جواب دیا۔ "لیکن کام کرنے کا مزہ تو اب آئے گا۔"

میں ایک دم سنجیدہ ہو گیا اور اس سے کہا۔ "اعجاز! ایسی محنت کا کیا فائدہ؟ ہم اپنی جان پر کھیل کر، دن رات ایک کر کے مجرموں کو گرفتار کریں اور کوئی عیار وکیل قانونی داؤ پیچ لڑا کر انہیں باعزت بری کرا لے۔"

"سر! اس میں سب سے زیادہ قصور ہمارے افسران کا ہوتا ہے۔ ملزمان کی ایف آئی آر ایسی ہوتی ہے کہ عدالت انہیں بری کر دیتی ہے۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "سر! کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائیں؟"

"نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان مجرموں کو عدالت تک پہنچنے کی مہلت ہی نہ دیں۔"

اعجاز چونک کر بولا۔ "سر! میں سمجھا نہیں؟"

"بات بالکل صاف اور سیدھی ہے۔" میں نے سفاکی سے کہا۔ "میں نے سوچ لیا ہے کہ میں ایسے کسی بھی ملزم کو زندہ نہیں چھوڑوں گا کہ وہ عدالت سے بری ہو سکے۔"

درخشاں پولیس اسٹیشن کی حدود میں کلفٹن اور ڈیفنس کا کچھ علاقہ تھا۔ دوسرے ایس ایچ او کی طرح یہاں کا ایس ایچ او بھی وہی روایتی پولیس افسر تھا۔

اس نے پہلے ہی دن مجھ سے کہا۔ "حسن صاحب! میں نے سنا ہے کہ آپ "اکل حلال" کے قائل ہیں؟"

"آپ نے بالکل درست سنا ہے سر۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت اچھی بات ہے۔" اس کے لہجے میں تضحیک تھی۔ "لیکن مجھے امید ہے کہ آپ دوسروں کے کاموں میں رخنہ نہیں ڈالیں گے۔"

"میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں سر۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اور یہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی میرے کام میں رخنہ ڈالے۔"

"آپ کو رولز اینڈ ریگولیشن کی پابندی کرنا ہوگی۔" انچارج صاحب نے کہا۔

"سر! میں نے پولیس فورس میں آج ہی شمولیت اختیار نہیں کی ہے۔ گزشتہ تین برس سے سروس کر رہا ہوں۔ مجھے رولز بھی معلوم ہیں اور ریگولیشن بھی۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ انچارج کو سیلیوٹ کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

مجھے وہاں تعینات ہوئے پانچ دن ہو چکے تھے لیکن ابھی تک کوئی بھی کیس باضابطہ طور پر میرے حوالے نہیں کیا گیا تھا۔ میں سارا دن اپنے آفس میں بیٹھا بور ہوتا رہتا تھا یا پھر اپنی عادت کے مطابق ان کیسوں کی فائلیں لے کر بیٹھ جاتا جن سے مجھے کچھ سیکھنے کا موقع ملے۔

اس دن بھی میں ایک پرانی فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد اخبارات پر سرسری نظر ڈال رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ڈیوٹی افسر نے بتایا کہ ایس ایس پی علی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

دوسرے ہی لمحے ایس ایس پی صاحب کی آواز سنائی دی۔ "سب انسپکٹر حسن؟"

"سر!" میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔

"میرے آفس میں آئیے۔" انہوں نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں فوراً ان کے آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے ان کے بارے میں سنا تھا کہ بہت بااصول اور دیانت دار افسر ہیں اور کسی بھی قیمت پر سمجھوتا نہیں کرتے۔ میں ان سے کبھی ملا نہیں تھا لیکن دل سے ان کی عزت کرتا تھا۔

میں دستک دے کر ان کے کمرے میں داخل ہوا تو

وہاں ایک انسپکٹر اور ڈی ایس پی پہلے سے موجود تھے۔ ایس ایس پی صاحب نے اپنی سیٹ سے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا تو ان لوگوں کو بھی اٹھنا پڑا جو وہاں موجود تھے۔

"یہ ہے سب انسپکٹر حسن!" انہوں نے وہاں موجود لوگوں سے یوں میرا تعارف کرایا جیسے وہ خود مجھے برسوں سے جانتے ہوں۔ "یہ ڈی ایس پی انصاری صاحب ہیں اور یہ انسپکٹر نذیر احمد صاحب ہیں۔" انہوں نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

ڈی ایس پی نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "آپ کا تو بہت نام سنا ہے جناب!"

"سر! کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں تو ابھی آپ لوگوں سے سیکھ رہا ہوں۔"

انسپکٹر نذیر نے ہنس کر کہا۔ "حسن صاحب! ہمارے محکمے کی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں جب کسی اے ایس آئی کو صرف ایک سال میں سب انسپکٹر کے عہدے پر ترقی دی گئی ہو۔"

ان دونوں کی آنکھوں میں میرے لیے خوش گوار تاثرات نہیں تھے۔ چند منٹ بعد وہ دونوں وہاں سے رخصت ہو گئے تو ایس ایس پی صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ "حسن! تم جانتے ہو کہ تمہیں یہاں کیوں تعینات کیا گیا ہے؟ میری خواہش پر۔ مجھے تم جیسے نڈر، بے باک اور دیانت دار افسروں کی ضرورت ہے۔"

"سر! میں کوشش کروں گا کہ آپ کا اعتماد قائم رہے۔"

"اس وقت کراچی کے حالات تو تمہارے سامنے ہی ہیں۔ شہر میں لاقانونیت کا دور دورہ ہے۔ کسی بھی بدمعاش پر ہاتھ ڈالا جائے تو اس کے لاک اپ تک پہنچنے سے پہلے ہی کسی سیاسی راہنما، منسٹر یا کسی اعلیٰ افسر کا ٹیلی فون اس سے پہلے آجاتا ہے اور پولیس اسے رہا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔"

"سر! پولیس میں کون سے فرشتے بیٹھے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کسی کا ٹیلی فون موصول نہ بھی ہو تو ملزم "کک مکا" کر کے آزاد ہو جاتا ہے۔"

"ہاں، میں یہی کہنا چاہ رہا ہوں کہ تم جیسے افسر کم سے کم بک نہیں سکتے۔ میں ہر طرح سے تمہیں سپورٹ کروں گا۔"

"تھینک یو سر!" میں نے کہا۔ "اب میں زیادہ اعتماد سے کام کر سکوں گا۔"

ایس ایس پی صاحب سے ملاقات کر کے میں باہر نکلا تو میرے اعتماد اور حوصلے میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ اسی دن انچارج صاحب نے مجھے نائٹ ڈیوٹی سونپ دی۔ میرے ساتھ اے ایس آئی اقبال اور سب انسپکٹر جمشید بھی تھے۔

میں شام کو پولیس اسٹیشن پہنچا تو حسب معمول، انچارج صاحب موجود نہیں تھے۔ روزانہ پانچ بجے کے مطابق وہ علاقہ گشت پر ہوتے تھے۔ وہ رات دس بجے سے پہلے پولیس اسٹیشن نہیں پہنچتے تھے۔ اے ایس آئی اقبال اور سب انسپکٹر جمشید، البتہ موجود تھے اور دونوں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

ان سے ملاقات کے بعد میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو میرے کمرے میں ادھیڑ عمر کے ایک صاحب موجود تھے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکا بھی تھا۔ وہ دونوں شکل سے مہذب اور پڑھے لکھے لگ رہے تھے لیکن اس وقت بہت پریشان اور مضطرب تھے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ "آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"ارے صاحب، ملنا کیسا؟" وہ تلخ لہجے میں بولے۔ "میری بیٹی کو سرعام اغوا کر لیا گیا ہے اور یہاں کوئی اس کی ایف آئی آر تک درج کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔"

"آپ کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "آپ کو کیسے علم ہوا؟"

"وہ میرے ہی ساتھ تو تھی۔" ان صاحب کی آواز بھرا گئی۔ "آج اس کی سالگرہ تھی۔ میں اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ شاپنگ کرنے نکلا تھا۔ میں ایک شاپنگ پلازا سے شاپنگ کر کے باہر نکلا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس وقت ایک لینڈ کروزر ہمارے نزدیک آ کر رکی۔ اس میں سے چار آدمی اترے۔ وہ چاروں مسلح تھے۔ انہوں نے میری بیٹی کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور وہاں سے فرار ہو گئے۔"

"آپ کی بیٹی کی عمر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آج اس کی اکیسویں سالگرہ تھی۔" ان صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "نہ جانے میری بیٹی کس حال میں ہو گی؟"

"آپ فکر مت کریں۔ میرے ساتھ آئیں۔ پہلے میں آپ کی ایف آئی آر درج کرا دوں۔"

میں انہیں لے کر ہیڈ محرر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ انہیں دیکھ کر ہیڈ محرر درشت لہجے میں بولا۔ "پھر آ گئے؟ میں نے آپ سے کہا تو ہے کہ ہم آپ کی بچی کو تلاش کر رہے ہیں۔" یہ وہ گھسا پٹا جملہ تھا جو ہر پولیس اسٹیشن کے ہیڈ محرر اور دوسرے افسروں کی زبان پر رہتا ہے۔

"رشید خان!" میں نے ہیڈ محرر سے درشت لہجے میں کہا۔ "ذرا آرام سے بات کرو اور مجھے ان کی ایف آئی آر

دکھاؤ۔"

"سر! ابھی ایف آئی آر تو درج نہیں کی ہے۔" اس نے کہا۔ "ان سے ایک درخواست ضرور لکھوالی ہے۔"

"ایف آئی آر درج نہیں کی ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟"

"سر! آپ پہلے جمشید صاحب سے مل لیں۔" اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "وہ بہت دیر سے آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور وہاں سے دوسرے کمرے میں آ گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے اس کمرے میں پہنچا۔ وہ آہستگی سے بولا۔ "سر! پہلے آپ ان بزرگوار کی دی ہوئی درخواست پڑھ لیں۔ پھر ایف آئی آر درج کرنے کی بات کریں۔"

"کیا ہے اس درخواست میں؟" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے اغوا میں ایک ایم این اے کے بیٹے کو ملوث کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس گاڑی میں لڑکی کو اغوا کیا گیا ہے، اس گاڑی کا نمبر بھی ہے۔ وہ گاڑی بھی اسی ایم این اے کی ہے۔"

"تو پھر؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے انچارج صاحب سے بات کی تھی۔ انہوں نے کہا ہے کہ ایف آئی آر ابھی درج نہ کی جائے۔"

"اس لیے کہ ملزم ایک ایم این اے کا بیٹا ہے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اس واقعے کی ایف آئی آر ابھی اور اسی وقت درج کرو اور اس کی ایک کاپی ان صاحب کو بھی دو۔"

"لیکن سر! وہ انچارج صاحب۔۔۔وہ۔۔۔"

"تم فکر مت کرو، ان سے میں خود بات کروں گا۔"

"ٹھیک ہے سر! میں آپ کے کہنے پر ایف آئی آر درج کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

ہیڈ محرر نے ان صاحب کی درخواست نکالی اور ایف آئی آر کے رجسٹر پر لکھنے لگا۔ ان کی درخواست کی ایک کاپی ان صاحب کے پاس بھی موجود تھی۔ اس نے ان سے کاپی لے کر پڑھی۔ ان کا نام احسان احمد تھا۔ وہ وزارتِ داخلہ کے ریٹائرڈ اسسٹنٹ سیکریٹری تھے۔ احسان صاحب نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ میں اپنی بیٹی نورین اور بیٹے عرفان کے ساتھ شاپنگ کر کے واپس جا رہا تھا کہ چار آدمیوں نے ہمارا راستہ روکا اور میری بیٹی نورین کو گن پوائنٹ پر اٹھا کر لے گئے۔ مجھے ایم این اے معین الدین کے بیٹے منور پر شبہ ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی نورین کو کئی بار اغوا کی دھمکی دے چکا ہے۔ انہوں نے اس بینڈ کروزر کا رجسٹریشن نمبر بھی لکھا تھا جس میں نورین کو اغوا کیا گیا تھا۔

ہیڈ محرر نے ایف آئی آر کی ایک کاربن کاپی احسان صاحب کی طرف بڑھا دی۔

"ٹھیک ہے، آپ میرے ساتھ آ جائیں۔" میں نے احسان صاحب سے کہا۔ وہ میرے کمرے میں آ گئے۔ میں نے ان سے کہا۔ "آپ مجھے تفصیل سے بتائیے کہ آپ کو منور پر شک کیوں ہے؟"

"منور میری بیٹی کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ پہلے تو اس نے نورین سے دوستی کرنا چاہی لیکن نورین نے اسے جھڑک دیا۔ پھر وہ نورین کے پیچھے پڑ گیا۔ اس نے کئی بار نورین کو دھمکی بھی دی تھی کہ اگر تم اپنی ضد سے باز نہ آئیں تو میں تمہیں اٹھوا لوں گا۔"

"یہ بات نورین نے آپ کو خود بتائی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔۔۔ اس نے کئی دفعہ دبے لفظوں میں منور کی شکایت کی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اسے یونیورسٹی سے اٹھا لوں اور اس کی تعلیم ادھوری رہ جائے۔"

"ٹھیک ہے، اب آپ گھر جائیں اور پریشان مت ہوں۔ پولیس ہر طرح سے آپ کی مدد کرے گی۔"

"میں نے برسوں وزارتِ داخلہ کی ملازمت میں گزارے ہیں بیٹا! تم وہ پہلے پولیس افسر ہو جس کے لہجے میں مجھے سچائی نظر آئی ہے۔"

"آپ کا بہت شکریہ سر!" میں نے کہا۔ "میں کوشش کروں گا کہ آپ کو پولیس کی کارکردگی میں بھی سچائی نظر آئے۔"

ان سے رخصت ہو کر میں ڈیوٹی روم میں پہنچا۔ اقبال اور جمشید اس وقت سگریٹ پھونک رہے تھے۔ اقبال، جمشید کو کوئی فحش لطیفہ سنا رہا تھا اور جمشید بلند آواز میں ہنس رہا تھا۔

انہیں ہنستا چھوڑ کر میں جھنجلا کر اپنے کمرے میں آیا اور سیل فون پر اعجاز سے کہا کہ فوراً تھانے پہنچو۔ میں نے اس وقت پولیس موبائل کو تیار رہنے کو بھی کہا۔

اعجاز کے پہنچتے ہی میں نے اسے موبائل میں بیٹھنے کو کہا اور ایم این اے معین کے بنگلے کی طرف روانہ ہو۔۔۔ ڈیفنس ہی میں رہتا تھا۔

اس کے محل نما بنگلے کے وسیع و عریض آہنی گیٹ کے ساتھ پولیس کی ایک پوسٹ تھی۔ موبائل دیکھ کر وہاں ڈیوٹی پر موجود دونوں سپاہی بھی ہمارے نزدیک آ گئے اور حوالدار نے پوچھا۔ "خیر تو ہے استاد جی! ادھر کیسے آئے؟"

"تم ہوشیار ہو کر۔۔۔ اپنی ڈیوٹی پر جاؤ۔" میں نے درشت لہجے میں کہا اور ڈور بیل کا بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی ایک باوردی چوکیدار گیٹ پر آیا اور بولا۔ "جی صاحب! کس سے ملنا ہے؟"

"معین صاحب گھر پر موجود ہیں؟"

"نہیں سر! وہ تو نہیں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"ان کا بیٹا منور تو موجود ہوگا؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں، چھوٹے صاحب موجود ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"ان سے کہو کہ سب انسپکٹر حسن ان سے ملنا چاہتا ہے۔"

چوکیدار واپس چلا گیا اور فوراً ہی لوٹ بھی آیا اور بولا۔ "آپ اندر آ جائیے۔"

میں نے اعجاز کو ساتھ لیا اور باقی لوگوں کو وہیں چھوڑ کر اندر داخل ہو گیا۔ گیٹ سے رہائشی حصے تک ایک طویل روش تھی، خاصا وسیع و عریض لان تھا۔ وہاں سوئمنگ پول بھی موجود تھا۔ پورچ میں اس وقت دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہاں لینڈ کروزر موجود نہیں تھی جس میں نورین کو اغوا کیا گیا تھا۔

چوکیدار نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور بتایا کہ چھوٹے صاحب ابھی آ رہے ہیں۔ میں نے ڈرائنگ روم کا سرسری سا جائزہ لیا۔ وہ انتہائی آراستہ ڈرائنگ روم تھا۔ کھڑکیوں پر انتہائی قیمتی پردے لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر بہت خوب صورت پینٹنگز آویزاں تھیں اور پورا کمرا انتہائی بیش قیمت ڈیکوریشن کی اشیا سے سجا ہوا تھا۔

ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ کھلا اور گندمی رنگ اور درمیانے قد کا ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کے جسم پر اس وقت بہترین تراش کا سوٹ تھا اور لباس سے کسی مہنگے پرفیوم کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "جی فرمائیے آفیسر! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ میری یہی خدمت کر سکتے ہیں مسٹر منور کہ میں جو کچھ پوچھوں، آپ سچ سچ بتا دیں۔"

"واٹ؟" اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ "آپ مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہیں؟" اس نے بپھر کر کہا۔ "آپ جانتے نہیں کہ یہ۔۔۔"

"معین صاحب کا بنگلہ ہے۔" میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔ "لیکن ایک لڑکی کے اغوا کا معاملہ ہے اس لیے مجھے یہاں آنا پڑا۔"

اغوا کا ذکر سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ فوراً ہی سنبھل کر بولا۔ "لڑکی کے اغوا کا مجھ سے کیا تعلق؟"

"تعلق ہے مسٹر منور!" میں نے کہا۔ "اس لڑکی کا نام نورین ہے اور وہ یونیورسٹی میں آپ کے ساتھ ہی پڑھتی ہے۔"

"تو پھر؟" اس نے مجھ سے یوں پوچھا جیسے اپنے کسی گھریلو ملازم سے مخاطب ہو۔

میری کھوپڑی بھی اچانک گھوم گئی۔

"اس لڑکی کے باپ نے آپ پر اغوا کا الزام لگایا ہے۔"

"اور آپ دوڑے دوڑے یہاں آگئے؟" اس نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ کی لینڈ کروزر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے پاس کئی گاڑیاں ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ کون سی گاڑی کس وقت کہاں ہوتی ہے۔" پھر وہ انتہائی بداخلاقی سے بولا۔ "اب اگر آپ کے سوالات ختم ہو گئے ہوں تو آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ مجھے ایک پارٹی میں جانا ہے۔"

"آپ آج چار بجے کہاں تھے؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"میں آپ کے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" اس نے کہا۔ "آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔"

"مسٹر منور! میرے سوالوں کا جواب تو آپ کو دینا ہی پڑے گا۔" میں نے بپھر کر کہا۔ "اگر آپ نے جواب یہاں نہ دیے تو میں مجبوراً آپ کو پولیس اسٹیشن لے جاؤں گا۔"

"کیا؟" اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "اب تم جیسے دو دو ٹکے کے ملازم مجھے پولیس اسٹیشن لے جانے کی دھمکی دیں گے۔ شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ۔" وہ چیخ کر بولا۔

اچانک اعجاز نے جھپٹ کر اس کے گلے میں پڑی ہوئی ٹائی پکڑ لی اور درشت لہجے میں بولا۔ "تجھے عزت راس نہیں آتی۔ ابھی تجھے ٹھڈے مارتا ہوا یہاں سے تھانے لے جاؤں گا۔"

"شٹ اپ یو باسٹرڈ!" وہ دہاڑ کر بولا۔ "تمہاری اتنی جرأت کہ میرے گریبان پر ہاتھ ڈالو۔ میں تمہاری اس دو ٹکے کی ملازمت کی ایسی کی تیسی کر دوں گا۔"

"شرافت سے چلو گے یا میں ہتھکڑی ڈال کر تمہیں یہاں سے لے جاؤں۔" میں نے بپھر کر کہا۔

"چلو کہاں چلنا ہے۔" وہ بھی بپھر کر بولا۔ "لیکن یہ سمجھ لو کہ یہ تمہاری ملازمت کا آخری دن ہے۔"

اعجاز سے ضبط نہ ہو سکا اور اس کی کمر پر لات جماتے ہوئے بولا۔ "سیدھی طرح چلو ورنہ کہیں یہ تمہاری زندگی کا آخری دن نہ بن جائے۔"

منور کے ملازمین نے اسے اس حال میں دیکھا تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ اس نے چیخ کر اپنے ایک ملازم سے کہا۔ "پاپا کو ابھی ٹیلی فون کرو اور انہیں بتاؤ کہ یہ لوگ مجھے پولیس اسٹیشن لے جا رہے ہیں۔"

ہم نے اسے موبائل وین میں بٹھایا اور پولیس اسٹیشن لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔ انچارج صاحب اس وقت تک نہیں آئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس معاملے میں ضرور دخل اندازی کریں گے اس لیے میں فوری طور پر منور کو تفتیش کے مخصوص کمرے میں لے گیا۔ اعجاز میرے ساتھ تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کیا اور منور کی کمر پر زوردار لات رسید کر دی۔ جواب میں مشتعل ہو کر وہ ہمیں انتہائی غلیظ گالیاں دینے لگا۔

اعجاز نے جیب سے ایک پسٹل نکالا اور منور کی طرف اچھال دیا۔ اس نے بے اختیار وہ پسٹل پکڑ لیا۔

"اب تم کلمہ پڑھ لو اور مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" اعجاز نے سفاک لہجے میں کہا۔ "میں کبھی نہتے شخص کو نہیں مارتا اس لیے تمہیں بھی یہ پسٹل دے دیا ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" منور چیخ کر بولا۔

اعجاز نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا اور بولا۔ "بھونک تو تو رہا ہے کتے! تو ہمیں دو ٹکے کا آدمی سمجھتا ہے نا، اب یہی دو ٹکے کا آدمی تیرے لیے موت کا فرشتہ بن گیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے منور کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مزید رسید کر دیا۔

منور غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر اسی پسٹل سے فائر کرنا چاہا لیکن صرف "کلک" کی آواز آئی۔ پسٹل میں یقیناً میگزین نہیں تھا۔ اس نے وہ پسٹل ہی اعجاز کی طرف دے مارا۔

اعجاز نے ایک طرف ہو کر خود کو بچایا پھر جیب سے رومال نکال کر وہ پسٹل اس میں لپیٹ لیا اور بولا۔ "تو اغوا کے ساتھ ساتھ پولیس مقابلہ بھی کرتا ہے۔ ہم تیرے گھر پوچھ گچھ کے لیے گئے تو تو نے ہم پر پسٹل تان لیا۔ تیرے پاس اس پسٹل کا لائسنس ہے؟"

"کیا بکواس ہے؟" منور چیخ کر بولا۔ "یہ پسٹل میرا نہیں ہے۔"

"اب تجھ پر تین کیس بنیں گے۔ اغوا، پولیس مقابلہ اور غیر قانونی اسلحہ رکھنے کا۔"

میں فوراً اعجاز کی عیاری سمجھ گیا۔ اس نے منور کو گرفتار کرنے کا ایک ٹھوس جواز پیدا کر لیا تھا۔

وہ مجھے کمرے کے ایک گوشے میں لے گیا اور آہستہ سے بولا۔ "ہم وہاں اس سے پوچھ گچھ کرنے پہنچے تو نہ صرف اس نے تعاون کرنے سے انکار کر دیا بلکہ جیب سے پسٹل نکال کر ہم پر فائر بھی کرنا چاہا۔ اگر آپ بروقت اس کے ہاتھ پہ لات رسید نہ کر دیتے تو اس وقت آپ زندہ نہ ہوتے۔"

"تم اتنے عیار کب سے ہو گئے؟" میں نے پوچھا۔

"ایسے لوگ بغیر عیاری اور مکاری کے ہاتھ نہیں آتے۔" اعجاز نے مسکرا کر کہا پھر منور پر پل پڑا اور ڈپٹ کر بولا۔ "بتا نورین کہاں ہے؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں کہ..."

منور نے ایک مرتبہ پھر اس کی دھنائی شروع کر دی۔ منور نے اب تک پولیس والوں کو بے عزت ہی کیا تھا۔ وہ تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے باپ کے ہوتے ہوئے کوئی اسے ٹیڑھی نظر سے دیکھ بھی سکتا ہے۔

"جب تک تیرا باپ مدد کو یہاں پہنچے گا، اس وقت تک تیرے ہاتھ پاؤں توڑ کر تجھے معذور کر دوں گا۔" یہ کہہ کر اعجاز پھر اس کی طرف بڑھا لیکن دروازے پر زوردار دستک ہوئی تو وہ رک گیا۔ منور ایک کونے میں بیٹھا ہانپ رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ انچارج صاحب غصے میں آگ بگولا ہو کر اندر داخل ہوئے اور غصے سے بولے۔ "تم لوگ جانتے ہو یہ کون ہے؟"

"یس سر!" میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ "ہم جانتے ہیں کہ یہ قومی اسمبلی کے ایک کرپٹ ممبر معین کا بیٹا ہے۔"

"اس کے باوجود تمہیں اتنی جرأت ہوئی کہ نہ صرف اسے گرفتار کر کے یہاں لے آئے بلکہ اس پر تشدد بھی شروع کر دیا؟"

"سر! قانون تو سب کے لیے برابر ہے۔ چاہے وہ ان منسٹر کا بیٹا ہو یا کسی موچی کا۔"

"شٹ اپ۔" اس نے درشت لہجے میں اعجاز سے کہا۔ "اور اسے میرے کمرے میں لے آؤ۔"

اعجاز نے اسے اٹھایا اور باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ منور یوں وہاں سے نکلا جیسے ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر ہو گئی تو اعجاز اسے پھر دبوچ لے گا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور ایس ایس پی صاحب کو ٹیلی فون کر دیا۔ رابطہ ہونے پر میں نے کہا۔ "سر! میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے..."

"میں جانتا ہوں حسن! تم نے منور کو گرفتار کر لیا ہے۔ اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت تھی؟"

"سر! میں تو اس سے صرف پوچھ گچھ کرنے گیا تھا۔ اس نے پہلے تو ہم سے بات کرنے ہی سے انکار کر دیا اور ہمیں گالیاں دینے لگا۔ میں نے سختی سے بات کی تو اس نے ایک دم پسٹل نکال کر مجھ پر فائر کرنا چاہا۔"

"میں ابھی پانچ منٹ میں پولیس اسٹیشن پہنچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر ایس ایس پی صاحب نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ایس ایس پی صاحب فوراً ہی وہاں پہنچ گئے۔ انہیں دیکھ کر ہر شخص مستعد ہو گیا۔ میں نے برآمدے میں ان کا استقبال کیا۔

"منور کے خلاف سب سے پہلے تو دفعہ تین سو تریپن (پولیس مقابلہ) اور دفعہ تین سو چوبیس (ارادۂ قتل) کی ایف آئی آر کٹواؤ بلکہ ایسا کرو کہ ہیڈ محرر کو ایف آئی آر کے رجسٹر سمیت انچارج کے کمرے میں بلوا لو۔"

"یس سر!" میں نے جواب دیا پھر ایک سپاہی کو بلا کر کہا۔ "ہیڈ محرر کو ایف آئی آر کے رجسٹر سمیت انچارج صاحب کے کمرے میں بھیجو۔ ایس ایس پی صاحب بلا رہے ہیں۔"

میں ایس ایس پی صاحب کے ساتھ انچارج کے کمرے میں داخل ہوا تو منور ایک کرسی پر آرام سے بیٹھا کولڈ ڈرنک پی رہا تھا۔

"یہ ملزم ہے یا آپ کا کوئی مہمان ہے؟" ایس ایس پی صاحب نے انچارج سے پوچھا۔

"سر... یہ..."

"کھڑے ہو جاؤ۔" ایس ایس پی صاحب نے ڈپٹ کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ کر انہوں نے دونوں لینڈ لائن ٹیلی فونز کے ریسیور اٹھا کر ٹیبل پر رکھ دیے۔

منور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"سر! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" انچارج نے حیرت سے کہا۔

اسی وقت ہیڈ محرر اپنے رجسٹر سمیت وہاں آ گیا اور ایس ایس پی صاحب کو زوردار سیلیوٹ کیا۔

"حسن!" ایس ایس پی صاحب نے کہا۔ "اس واقعے کی ایف آئی آر کٹواؤ۔"

اس کیس میں مدعی میں تھا اس لیے ایف آئی آر بھی مجھے

ہی درج کراتا تھی۔ دس منٹ کے اندر اندر منور کے خلاف اغوا، پولیس مقابلہ اور اقدامِ قتل کی ایف آئی آر درج ہو گئی۔

ایس ایس پی صاحب نے ایک سپاہی سے کہا۔ "اسے لے جا کر لاک اپ میں بند کر دو۔"

اسی وقت مجھے باہر گاڑیاں رکنے کی آواز آئی۔ سپاہی منور کو لے کر جا چکا تھا۔ ایس ایس پی صاحب نے دونوں ریسیور دوبارہ کریڈل پر رکھ دیے۔

مجھے باہر برآمدے میں قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ پھر ڈی آئی جی کرائمز کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر ایس ایس پی صاحب سمیت سبھی افراد کھڑے ہو گئے۔ ڈی آئی جی صاحب شدید غصے میں تھے۔ انہوں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "معین صاحب کے بیٹے کو کس نے اریسٹ کیا ہے؟"

"سر! انہیں سب انسپکٹر حسن نے اریسٹ کیا ہے۔" مجھ سے پہلے ہی انچارج صاحب بول اٹھے۔

"کون ہے سب انسپکٹر حسن؟" وہ غصے میں یہ بھی بھول گئے کہ انہوں نے کچھ عرصے پہلے مجھے تعریفی سند سے نوازا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا۔

"تم جانتے ہو کہ تم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے؟" ڈی آئی جی صاحب غرا کر بولے۔

"سر! اگر کسی مجرم کو گرفتار کرنا غلطی ہے تو میں نے یہ غلطی کی ہے۔" میں نے بے خوفی سے کہا۔

"تمہارے خلاف ایکشن تو میں بعد میں لوں گا، پہلے مسٹر منور کو باعزت طور پر ان کے گھر چھوڑ کر آؤ۔"

"اب یہ ممکن نہیں ہے سر!" ایس ایس پی صاحب نے کہا۔ "منور کے خلاف دفعہ تین سو تریپن اور دفعہ تین سو چوبیس کے تحت ایف آئی آر درج ہو چکی ہے۔"

"وہاٹ؟" ڈی آئی جی صاحب گرج کر بولے۔ "لگتا ہے تم سب کے ساتھ ساتھ اب میری ملازمت بھی جائے گی۔"

"سر! آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں؟" ایس ایس پی صاحب نے کہا۔ "پولیس اگر مجرموں کو گرفتار نہیں کرے گی تو کون کرے گا؟ سب انسپکٹر حسن نے اپنا فرض نبھایا ہے۔"

"وہ ایف آئی آر ذرا مجھے بھی دکھائیے۔" ڈی آئی جی صاحب درشت لہجے میں بولے۔

وہ ابھی تک کھڑے ہوئے تھے اس لیے ہم لوگ بھی کھڑے ہوئے تھے۔

فوراً ہی ہیڈ محرر ایف آئی آر کا رجسٹر لے کر آ گیا۔ ڈی آئی جی صاحب نے کھڑے کھڑے ایف آئی آر پر سرسری سی نظر ڈالی۔ وہ شاید ملزم کا نام اور دفعات کی تصدیق کرنا چاہتے تھے۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولے۔ "کچھ بھی کریں ایس ایس پی صاحب! مسٹر منور کو رہا کریں ورنہ بہت برا ہو گا۔"

"سر! آپ تحریری طور پر حکم دے دیں۔ میں اسے رہا کرا دیتا ہوں۔" ایس ایس پی صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔

ڈی آئی جی صاحب تلملا کر رہ گئے۔ وہ تحریری طور پر حکم کیسے دے سکتے تھے۔

اس وقت تک میڈیا والوں کو نہ جانے اس واقعے کی خبر کیسے ہو گئی تھی۔ کئی اخبارات اور ٹی وی چینلز کے رپورٹرز پولیس اسٹیشن کے احاطے میں موجود تھے۔

"اب تو منور کی ضمانت کل صبح ہی ہو سکے گی۔" ڈی آئی جی صاحب کے لہجے میں تشویش تھی۔ پھر وہ درشت لہجے میں بولے۔ "ایس ایس پی علی، سب انسپکٹر حسن، حوالدار اعجاز اور انچارج پولیس اسٹیشن! آپ لوگ میرے آفس میں رپورٹ کریں۔"

اسی وقت ایک سپاہی اندر داخل ہوا اور بولا۔ "سر! میڈیا والے آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"آپ میں سے کوئی میڈیا کو کسی قسم کا کوئی بیان نہیں دے گا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ میڈیا والوں نے انہیں گھیر لیا۔ کیمروں کے فلیش کے ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی چل رہی تھی۔ "سر! آپ نے مسٹر منور کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟ انہیں کس نے گرفتار کیا ہے؟ یہ پولیس کی کوئی انتقامی کارروائی تو نہیں ہے؟" کئی سوالات کیے جا رہے تھے۔

"میں اس سلسلے میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔" ڈی آئی جی صاحب نے سرد لہجے میں کہا، اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔

پولیس کے دو تین سپاہیوں نے ان کے لیے راستہ بنایا۔ ٹی وی اور اخبارات کے کیمرے اس وقت بھی چل رہے تھے۔

ایس ایس پی صاحب یہ دیکھ کر باہر نکلے تو میڈیا والوں نے انہیں گھیر لیا۔ وہ تحمل سے بولے۔ "اس سلسلے میں فوری طور پر آپ لوگوں کو کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔ میں کل صبح تک پریس کو بریف کروں گا۔"

"سر! یہ تو بتا دیجیے کہ مسٹر منور پر کیا الزامات ہیں؟" ایک لڑکی نے بلند آواز میں پوچھا۔

"فی الحال میں کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ آپ لوگ کچھ صبر سے کام لیں۔" اس وقت بھی ٹی وی کیمرے آن تھے۔ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے ساتھ لیا اور میڈیا کے لوگوں سے بچتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھے۔

ہمارے پیچھے پیچھے انچارج صاحب بھی اپنی گاڑی کی طرف لپکے۔

ہم لوگ ڈی آئی جی صاحب کے آفس پہنچے تو وہ بے چینی اور اضطراب کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ پھر کے بولے۔ "ابھی کچھ دیر پہلے ہی معین صاحب کا ٹیلی فون آیا تھا۔ میں نے ابھی انہیں یہ نہیں بتایا ہے کہ منور کے خلاف ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔" وہ ایس ایس پی صاحب سے مخاطب ہوئے۔ "آپ بتائیے، میں انہیں کیا جواب دوں؟"

"آپ انہیں بتا دیجیے کہ ان کے بیٹے کے خلاف ایف آئی آر درج ہو چکی ہے۔" ایس ایس پی صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔

"اس کا نتیجہ جانتے ہیں آپ؟" وہ غصے میں آگ بگولا ہو گئے۔

"جانتا ہوں۔" ایس ایس پی صاحب نے کہا۔ "ہم دونوں کو معطل کر دیا جائے گا، ممکن ہے ملازمت سے نکال بھی دیا جائے۔ میں اس کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں۔"

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ ڈی آئی جی صاحب نے چونک کر ٹیلی فون کی طرف دیکھا، پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔ "آئی جی صاحب بھی اسلام آباد میں ہیں۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے ریسیور اٹھایا اور بولے۔ "ہیلو... یس سر... میں انکوائری... کر رہا ہوں... سب انسپکٹر حسن نے... جی ہاں۔" انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "ہوم سیکریٹری صاحب سے بات کرو۔"

میں نے ریسیور ان کے ہاتھ سے لے لیا اور مؤدب لہجے میں بولا۔ "سر! سب انسپکٹر حسن بول رہا ہوں۔"

"مسٹر منور کو تم نے اریسٹ کیا ہے؟" انہوں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "اور اریسٹ کیا ہے تو ابھی تک رہا کیوں نہیں کیا؟"

میں نے بہت پُراعتماد انداز میں انہیں بھی پوری تفصیل بتا دی۔

"تم منور کو گرفتار کرنے گئے ہی کیوں تھے؟"

"میں انہیں گرفتار کرنے نہیں گیا تھا سر! محض پوچھ گچھ کرنے گیا تھا۔"

"تم ایک معمولی شخص کی شکایت پر منہ اٹھا کر ایک ڈی آئی جی کے گھر جا پہنچے؟" انہوں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"منور کوئی وی آئی پی نہیں ہے سر!" میں نے اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اور اگر ایف آئی آر میں کسی وی آئی پی کا نام بھی ہوتا تو میں پوچھ گچھ ضرور کرتا۔ قانون تو سب کے لیے برابر ہے سر۔"

"شٹ اپ!" ہوم سیکریٹری صاحب چیخ کر بولے۔ "مجھے قانون مت سکھاؤ اور ابھی اور اسی وقت منور کو رہا کرو۔"

"سر! آپ مجھے تحریری طور پر حکم دے دیں۔ میں اسے چھوڑنے میں ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔"

"ٹیلی فون ڈی آئی جی کو دو۔" ہوم سیکریٹری جھنا کر بولا۔

میں نے ریسیور ڈی آئی جی صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

"یس سر... جی ہاں سر... میں دیکھتا ہوں سر... سب کو... او کے سر!" انہوں نے ریسیور رکھ کر ٹشو پیپر سے پیشانی پر آیا ہوا پسینا پونچھا اور سرد لہجے میں بولے۔ "ایس ایس پی علی! ہوم منسٹر صاحب کے حکم پر آپ سمیت پولیس اسٹیشن کے پورے اسٹاف کو معطل کیا جا رہا ہے۔ آپ کو تحریری حکم ابھی چند منٹ میں مل جائے گا۔ اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔"

"سر..." انچارج صاحب نے مری مری آواز میں کہا۔ "میرا تو اس میں کوئی قصور بھی نہیں ہے... سب انسپکٹر حسن نے میرے علم میں لائے بغیر یہ کارروائی کی ہے۔"

"آپ جا سکتے ہیں۔" ڈی آئی جی صاحب نے دوبارہ زیادہ درشت لہجے میں کہا۔

میڈیا والے یہاں بھی موجود تھے۔ ہم ڈی آئی جی آفس کے بیرونی رستے سے باہر نکلے اور پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ میں نے وہاں پہنچ کر اپنا ذاتی سامان سمیٹا اور اسے ایک بیگ میں بھر لیا۔

چند منٹ بعد ہمیں معطل کرنے کا تحریری حکم بھی آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ دوسرے پولیس افسران بھی تھے۔ وہ سب مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ میں نے اپنا سروس ریوالور، بیلٹ اور شانوں پر لگے ہوئے اسٹارز نکال کر ان آفیسرز کے سامنے رکھ دیے۔

انچارج صاحب نے بھی چارج ایک انسپکٹر کے حوالے کیا۔ اعجاز اور تھانے کے دوسرے عملے سے بھی اسلحہ لے لیا گیا۔ معطل ہونے والا ہر شخص مجھے کھا جانے والی

نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میری گرفتاری کے بھی احکامات ہوتے تو وہ لوگ میرے ساتھ بدترین سلوک کرتے اور تشدد کے وہ تمام طریقے مجھ پر آزماتے جو وہ اب تک دوسرے ملزمان پر آزماتے رہے تھے۔

پولیس اسٹیشن سے باہر نکلنے کے بعد ہمیں ایک مرتبہ پھر پریس رپورٹرز اور الیکٹرانک میڈیا کے لوگوں نے گھیر لیا۔

"سر!" ایک ٹی وی چینل کے رپورٹر نے بلند آواز میں پوچھا۔ "کیا آپ نے واقعی مسٹر منور کو اریسٹ کیا ہے؟"

"جی ہاں، میرے ایک سب انسپکٹر نے اسے گرفتار کیا ہے۔ اس کی پاداش میں ہم سب کو معطل کر دیا گیا ہے۔" پھر انہوں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "اس واقعے کی تفصیل آپ کو سب انسپکٹر حسن بتائیں گے۔"

اخبارات اور ٹی وی چینلز کے کیمروں اور مائکروفونز کا رخ میری طرف ہو گیا۔ میں نے میڈیا کو تفصیل سے پورا واقعہ بتا دیا۔

"کیا ہم مسٹر منور سے مل سکتے ہیں؟" ایک رپورٹر نے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے کہا۔ "میں تو معطل ہو چکا ہوں۔ ہاں، پولیس اسٹیشن کا موجودہ اسٹاف اگر آپ کو اجازت دے دے تو آپ ان سے ضرور ملیں۔"

پھر ایس ایس پی صاحب نے کہا۔ "او کے، تھینک یو جنٹل مین!" یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ اعجاز میری ذاتی بائیک لے آیا تھا۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کی تو اعجاز بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میڈیا والے اب بھی مجھ سے بے سروپا سوالات کر رہے تھے لیکن تفصیل بتانے کے بعد میں وہی باتیں دہرانے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میرا رخ ایس ایس پی صاحب کے بنگلے کی طرف تھا۔ وہ جاتے جاتے مجھے بنگلے پر پہنچنے کا اشارہ کر گئے تھے۔

میں ان کے بنگلے پر پہنچا تو وہ میرے ہی منتظر تھے۔ ان کے جسم پر ابھی تک یونیفارم تھی۔

"تم لوگوں نے ابھی تک کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔" انہوں نے کہا۔ "پہلے کھانا کھا لیں، پھر کوئی بات کریں گے۔" ایس ایس پی صاحب نے کہا۔

کھانے کی میز پر بھی خاموشی رہی۔ ہم سب ہی اپنے اپنے طور پر کچھ سوچ رہے تھے۔

کھانے کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔

"میں نے پریس کو بیان دے کر منور کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔ میڈیا اس واقعے کو اتنا اچھالے گا کہ صوبائی ہوم سیکریٹری کیا، وفاقی ہوم منسٹر بھی بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔" انہوں نے اٹھ کر ٹی وی کھول دیا۔ ہر چینل پر یہی بریکنگ نیوز چل رہی تھی کہ پولیس نے قومی اسمبلی کے ایک رکن محسن کے بیٹے کو اغوا اور اقدامِ قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔

پھر اسکرین پر مجھے اپنا چہرہ نظر آیا۔ میں پریس کو بریف کر رہا تھا کہ میں نے منور کو کیوں گرفتار کیا اور اس کے بعد تھانے نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا۔ واضح رہے کہ محسن صاحب کا نام وفاقی کابینہ میں ایک وزارت کے لیے زیرِ غور تھا۔

ایس ایس پی صاحب نے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی بند کر دیا۔ پھر مسکرا کر بولے۔ "اب ہر ٹی وی چینل رات بھر یہی خبر نشر کرتا رہے گا اور کل کے اخبارات میں بھی یہ خبر فرنٹ پیج پر شائع ہوگی۔"

"سر! اس چکر میں ہم نورین کی بازیابی کو بھلا بیٹھے۔" میں نے کہا۔

ایس ایس پی صاحب چونک کر بولے۔ "مجھے یقین ہے کہ اب تک نورین کو اس کے گھر پہنچا دیا گیا ہوگا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ نورین کا اغوا تو سرے سے ہوا ہی نہیں۔"

"وہ لوگ احسان صاحب پر دباؤ ڈالیں گے کہ وہ اپنا بیان بدل دیں۔"

میرے سیل فون میں نورین کے والد احسان صاحب کا نمبر محفوظ تھا۔ میں نے سیل فون نکالا اور ان کا نمبر ڈائل کر دیا۔

احسان صاحب نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی اور بولے۔ "انسپکٹر صاحب! ابھی کچھ دیر پہلے نورین گھر پہنچ چکی ہے۔ جو لوگ اسے لے کر آئے تھے، انہوں نے نورین کو دھمکی دی ہے کہ اگر اس نے کسی کو اپنے اغوا کے بارے میں بتایا تو نورین کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔"

"مجھ سے بات کراؤ۔" ایس ایس پی صاحب نے کہا۔

میں نے سیل فون انہیں دے دیا۔ انہوں نے کہا۔ "مسٹر احسان! میں ایس ایس پی علی بول رہا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس آپ کے پاس پہنچے گی اور آپ کو بیان بدلنے کو کہا جائے گا۔ ہم نے تو اپنا فرض پورا کر دیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ کس حد تک ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں... جی ہاں، میں سمجھتا ہوں... بہرحال، میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن اتنا سمجھ لیں کہ آپ نے جو کچھ بیان [illegible] پولیس آپ کو بھی گرفتار کر لے گی۔" انہوں نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر اپنے سیل فون سے کوئی نمبر ڈائل کیا [illegible]

بولے۔ "خاور! تم اپنے چینل کی ایک ٹیم لے کر فوری طور پر مغویہ کے گھر چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں ایک اور بریکنگ نیوز ملے گی۔ مغویہ اپنے گھر واپس آ چکی ہے۔ جلدی کرو ورنہ تم سے پہلے پولیس پہنچ جائے گی۔"

انہوں نے کئی چینلز اور اخبارات کے کرائم رپورٹرز کو بھی احسان صاحب کے گھر بھیج دیا۔

پھر مسکرا کر بولے۔ "اب پولیس سے پہلے میڈیا وہاں پہنچ جائے گا۔ اس وقت تک وہ لوگ نورین اور احسان صاحب سے بات کر چکے ہوں گے۔ اب پولیس بھی ان پر دباؤ نہیں ڈال سکتی۔"

میں اور اعجاز دیر تک ایس ایس پی صاحب سے بات چیت کرتے رہے۔ میں نے گھڑی دیکھی تو صبح ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ میں نے ایس ایس پی صاحب سے رخصت کی اجازت چاہی تو وہ بولے۔ "تم لوگ اس وقت کہاں جاؤ گے؟ میں یہیں تمہارے سونے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"آپ کے گھر والوں کو ناحق زحمت ہوگی۔" میں نے کہا۔

"زحمت کیسی۔" وہ مسکرا کر بولے۔ "میری وائف اور بچے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں صرف ایک ملازم ہے۔ وہ بھی اپنے کوارٹر میں سو رہا ہوگا۔"

ہم دونوں وہیں ایک بیڈروم میں لیٹ گئے۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اعجاز بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ راتوں رات ہماری زندگی میں ایسا سانحہ رونما ہوا تھا کہ نیند آ بھی نہیں سکتی تھی۔ میرا ذہن پھر گھوم پھر کے منور کی طرف چلا گیا۔ وہ بدنام زمانہ آدمی تھا۔ شہر بھر کے جرائم پیشہ افراد سے اس کے تعلقات تھے اور پولیس کے بڑے بڑے اہلکاروں کو وہ معصوم اور مظلوم نظر آ رہا تھا۔ میں پولیس کے ہتھکنڈوں کو بھی جانتا تھا کہ وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ وہ کسی بھی طرح منور کو رہا کر سکتے تھے۔

"دیکھا جائے گا۔" میں نے سر جھٹک کر سوچا اور کروٹ بدل لی۔ پھر نہ جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔

میری آنکھ کسی کے جھنجوڑنے پر کھلی تھی۔ وہ ایس ایس پی صاحب کا ملازم تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ "آپ کو اس طرح اٹھانے کی معذرت چاہتا ہوں سر!" [illegible] "صاحب نے آپ کو فوراً بلایا ہے۔"

"[illegible] بجے ہیں؟" [illegible]

"سر! [illegible] کوئی [illegible] ہے۔" اعجاز نے کہا۔

"ورنہ [illegible] ایس ایس پی صاحب ہمیں اس طرح [illegible]"

میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا، باتھ روم میں جا کر منہ پر دو چار چھپکے مارے۔ اپنے بال سنوارے اور باتھ روم سے باہر نکل آیا۔ میرے جسم پر ابھی تک پولیس کی وردی تھی۔ میں جوتے کے تسمے باندھ رہا تھا کہ اعجاز بھی آ گیا۔ وہ بھی میری طرح پولیس کی وردی میں تھا۔ ہم دونوں بہت عجلت میں ایس ایس پی صاحب کے بیڈروم تک پہنچے۔

میں نے دروازے پر دستک دی تو ایس ایس پی صاحب کی بھاری آواز سنائی دی۔ "آ جاؤ۔"

میں اور اعجاز بیڈروم میں داخل ہوئے۔ ایس ایس پی صاحب اضطراب کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ ان کے جسم پر شب خوابی کا لباس تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر شدید پریشانی کے تاثرات تھے۔

"خیریت تو ہے سر!" میں نے پوچھا۔ "آپ نے..."

"خیریت نہیں ہے حسن۔" انہوں نے کہا اور ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا۔

ٹی وی پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ معروف سیاست دان اور قومی اسمبلی کے ممبر محسن کے بیٹے پر پولیس کا تشدد... پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے انہیں بغیر کسی الزام کے گرفتار کیا، حوالات میں بند کر کے ان پر تشدد کیا اور ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ بھی بنا دیا۔

پھر اسکرین پر مجھے خوب صورت سی ایک لڑکی دکھائی دی جو بہت ڈری سہمی لگ رہی تھی۔ ایک رپورٹر اس سے پوچھ رہا تھا۔ "آپ بتائیے مس نورین! آپ کو کس نے اغوا کیا تھا؟"

"مجھے کسی نے بھی اغوا نہیں کیا تھا۔"

نورین کا جواب سن کر مجھے ایسا لگا جیسے میرے سر پر کسی نے ہتھوڑا رسید کر دیا ہو۔ یہی حالت اعجاز کی تھی۔

"پھر آپ کے والد نے پولیس اسٹیشن جا کر آپ کے اغوا کی رپورٹ درج کیوں کرائی؟" رپورٹر نے پوچھا۔

اس وقت احسان صاحب کا چہرہ اسکرین پر نمودار ہوا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "میں اپنے بیٹے کے ساتھ شاپنگ کرنے گیا تھا۔ ہم لوگ گھر لوٹے تو نورین گھر پر نہیں تھی۔ میں نے کافی دیر اس کا انتظار کیا۔ پھر گھبرا کر اس کی تمام سہیلیوں کو ٹیلی فون کیا، وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ مجھ سے زیادہ اس کی ماں کی حالت خراب تھی۔ میں گھبرا کر اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے پولیس اسٹیشن چلا گیا... میں پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا ہی تھا کہ وہاں موجود سب انسپکٹر حسن نے مجھے

نے پوچھا کہ آپ یہاں کس سلسلے میں آئے ہیں۔ جب میں نے اسے نورین کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تو اس نے مجھ سے کہا۔ آپ گمشدگی کی نہیں بلکہ اغوا کی رپورٹ درج کرائیں اور میں جس کا نام لوں اس پر اغوا کا شبہ ظاہر کریں۔ میں نے انکار کیا تو اس نے مجھے خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیں اور کہا کہ جو میں کہوں، ویسا ہی کرو ورنہ ابھی تم دونوں باپ بیٹے کو حوالات میں ڈال دوں گا۔"

"اس نے ایسا کیوں کیا؟" رپورٹر نے پوچھا۔

"یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔ میرا خیال ہے کہ منور صاحب یا تحسین صاحب سے اس کی کوئی ذاتی رنجش رہی ہو گی۔"

"پھر آپ نے رپورٹ درج کرا دی؟" رپورٹر نے پوچھا۔

"میں اس وقت کر بھی کیا سکتا تھا۔" احسان کے چہرے پر بے بسی تھی۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ دونوں باپ بیٹی کو گولیوں سے بھون کر رکھ دوں۔ اتنا بڑا اور سنگین جھوٹ۔ اس جھوٹ کی وجہ سے میرا مستقبل تو تباہ ہو ہی گیا تھا، پولیس مجھے گرفتار بھی کر سکتی تھی۔

"ناظرین! آپ نے دیکھا کہ پولیس ذاتی انتقام کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے۔ سب انسپکٹر حسن نے کل رات اپنے بیان میں کیا کہا تھا۔ ذرا وہ ایک دفعہ پھر دیکھیں۔"

اسکرین پر میرا چہرہ نمودار ہوا۔ میں پریس کو اس کیس کی تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

ایس ایس پی صاحب نے ٹی وی بند کر دیا۔ اس وقت ان کا ملازم ناشتے کی ٹرالی لے آیا۔

"سر... اب تک تو ہماری گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری ہو چکے ہوں گے۔" میں نے عالم اضطراب میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"آرام سے بیٹھو حسن!" ایس ایس پی صاحب نے کہا۔ "پہلے ناشتا کر لو، پھر ہم اس موضوع پر بات کریں گے۔" میں نے کسی نہ کسی طرح ایک سلائس کھایا اور چائے کا کپ لے کر بیٹھ گیا۔

"تمہارا اندازہ درست ہے حسن!" ایس ایس پی صاحب نے کہا۔ "نہ صرف تم دونوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں بلکہ پولیس نے تمہارے گھروں پر چھاپے بھی مارے ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب نے ٹیلی فون کر کے مجھے بھی ہدایات دی ہیں کہ میں انہیں بتائے بغیر یہ شہر نہ چھوڑوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی گرفتاری کا وارنٹ جاری نہیں ہوا؟" میں نے کہا۔

"ہوم سیکریٹری نے اس واقعے کی مزید تحقیقات کے لیے پولیس کے چار اعلیٰ افسران کی ایک کمیٹی بھی قائم کر دی ہے۔ میری گرفتاری کا وارنٹ اگر ابھی نہیں نکلا تو کمیٹی کی تحقیقات کے بعد جاری ہو جائے گا۔" پھر وہ پُرسکون لہجے میں بولے۔ "اس سے پہلے کہ پولیس تمہیں گرفتار کرے، تم دونوں خود ہی پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤ تو بہتر ہے۔"

"سر! یہ آپ کا حکم ہے؟" میں نے سوال کیا۔ "اگر یہ آپ کا حکم ہے تو ہم لوگ ابھی اور اسی وقت خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔"

"یہ میرا حکم نہیں بلکہ مشورہ ہے۔" ایس ایس پی صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یوں بھی اب میں حکم دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"سر! ایسا نہ کہیے۔" اعجاز نے کہا۔ "آپ آج بھی ہمارے لیے قابل احترام ہیں۔ آپ صرف حکم کریں۔"

"نہیں بھئی۔ یہ صرف مشورہ تھا۔" ایس ایس پی صاحب پھیکے انداز میں مسکرائے۔

"سر! گرفتار کرنے کے بعد وہ لوگ پہلے تو ہم پر اتنا تشدد کریں گے کہ ہم دونوں زندگی بھر کے لیے معذور بھی ہو سکتے ہیں پھر آپ کی گرفتاری کے بعد تو جیل سے باہر کوئی ہمارا پُرسانِ حال بھی نہیں ہو گا۔ آزاد رہ کر ہم مجرموں کو پکڑنے کی بھی پوزیشن میں ہوں گے۔" پھر میں اعجاز سے بولا۔ "فوراً یہاں سے نکلو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"ٹھہرو۔" ایس ایس پی صاحب نے کہا۔ پھر بیڈ کی سائڈ ٹیبل سے چیک بک نکال کر انہوں نے چیک پر رقم لکھ کر سائن کیے اور بولے۔ "یہ چیک رکھ لو، تمہارے کام آئے گا۔ انکار مت کرنا حسن! میں جانتا ہوں کہ اس وقت تم دونوں کی جیب میں پانچ سو سے زیادہ کی رقم نہیں ہو گی۔"

میں نے چیک ان سے لیا اور اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ واقعی اس وقت میری جیب میں تین سو ستر روپے تھے۔ اعجاز کے پاس شاید سو، ڈیڑھ سو روپے ہوں۔

ہم دونوں تیزی سے باہر نکلے اور میں نے بائک پر سوار ہو کر اسے کک لگائی۔ بائک اسٹارٹ ہوتے ہی [illegible] پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ایس ایس پی صاحب اس وقت [illegible]

[illegible] دیا اور موٹر سائیکل کو مین روڈ پر لے آیا۔ سب سے پہلے تو ہمیں اپنی وردیوں سے نجات حاصل کرنا تھی۔ ہم لوگ اس وقت گھر بھی نہیں جا سکتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے گھروں کی نگرانی ہو رہی ہو گی۔

"سر! پہلے تو اس بائک سے چھٹکارا پائیں۔ آپ سے زیادہ آپ کی یہ ہیوی بائک مشہور ہے۔" اعجاز نے کہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

ڈیفنس سے نکل کر ہم لوگ اس وقت کورنگی روڈ پر جا رہے تھے۔ اس وقت تک تمام دکانیں بھی بند تھیں اور دفاتر میں بھی لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ سڑک پر صرف وہ بسیں اور گاڑیاں تھیں جو فیکٹری میں کام کرنے والے مزدوروں اور دوسرے اہلکاروں کو لے کر فیکٹریوں کی طرف جا رہی تھیں۔ سڑک پر ٹریفک کا ازدحام نہیں تھا جو کراچی کی مصروف شاہراہوں پر دیکھنے کو ملتا ہے۔

میرا رخ کورنگی کی طرف تھا۔ کورنگی کے علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں پولیس کی ایک موبائل وین نظر آئی لیکن میری بائک کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ اب میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہماری بائک ایک بگولے کی طرح پولیس وین کے سامنے سے گزر گئی۔ مجھے تو یہ بھی نظر نہیں آیا کہ وین میں سوار پولیس والوں میں سے کسی نے ہمیں دیکھا بھی تھا یا نہیں۔ زیادہ، مکان اس بات کا تھا کہ ان لوگوں نے ہم پر توجہ نہیں دی تھی ورنہ وہ لوگ ہمارا پیچھا ضرور کرتے۔

اعجاز نے چیخ کر کہا۔ "شکر ہے سر! ان لوگوں نے ہم پر توجہ نہیں دی۔" وہ چیخ کر اس لیے بول رہا تھا کہ موٹر سائیکل کی آواز اور ہوا کے شور میں اس کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچ پاتی۔ "ادھر کہاں جا رہے ہیں سر؟"

"کورنگی میں میرا ایک بہت پرانا دوست رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ چند سال پہلے حیدرآباد کا بہت بڑا بدمعاش تھا۔ اسے میں نے ایک دفعہ موت کے منہ سے بچایا تھا۔ اس کے بعد نہ صرف اس نے بدمعاشی چھوڑ دی بلکہ مجھ سے دوستی بھی ہو گئی۔ بعد میں اس کی نشاندہی پر میں نے حیدرآباد کے [illegible] کا قلع قمع کیا تھا۔"

"آپ کہیں نادر خان کی بات تو نہیں کر رہے؟" اعجاز نے پوچھا۔

"ہاں، میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ حیدرآباد سے کراچی آ گیا تھا۔ بدمعاش بننے سے پہلے وہ بہت اچھا موٹر مکینک تھا۔ اب یہاں کورنگی میں اس نے اپنی ورکشاپ کھول رکھی ہے لیکن اس وقت میں اس کی ورکشاپ پر نہیں بلکہ گھر جاؤں گا۔"

ایک جگہ پہنچ کر میں نے بائک روک دی اور اعجاز سے کہا۔ "تم یہیں رکو۔ میں اس کے گھر پیدل جاؤں گا۔ بائک دیکھ کر تو محلے کا ہر شخص چونک جائے گا۔"

وہ جاتی گرمیوں کی ایک صبح تھی اس لیے موسم کچھ خنک تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر اپنی قمیص بھی اتار دی۔ اب میں صرف پینٹ اور بنیان میں تھا۔ میں نے قمیص بھی اعجاز کو دی اور خود نادر کے گھر روانہ ہو گیا۔

گلی میں سے صرف ایک لڑکی گزری۔ وہ شاید کسی کالج کی طالبہ تھی۔ وہ مجھ پر توجہ دیے بغیر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ پھر ایک دودھ والا میرے نزدیک سے گزر گیا۔

میں اس وقت تک نادر کے مکان تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا مکان گلی کے دوسرے سرے پر تھا اور خاصی بہترین حالت میں تھا۔ میں نے ڈور بیل بجائی تو دروازہ کھولنے والا ایک نوعمر بچہ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "بیٹا! ذرا ابو کو بھیجو۔"

"آپ کا نام؟" بچے نے مجھے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ان کا دوست حسن ہوں، حیدرآباد سے آیا ہوں۔ یہاں آتے ہوئے مجھے دو لڑکوں نے لوٹ لیا ہے بیٹا! کم بخت میرے بیگ کے ساتھ ساتھ نقد رقم اور میری شرٹ تک لے گئے۔"

اسی وقت مجھے دروازے پر نادر دکھائی دیا۔ وہ آگے بڑھا اور گرم جوشی سے میرے گلے لگ گیا، اور بولا۔ "اندر آؤ یار! یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟"

"ابو! انکل کو کچھ لوگوں نے گن پوائنٹ پر لوٹ لیا ہے۔ وہ تو ان کے کپڑے تک لے گئے۔" بچہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ذہین تھا۔

"اچھا، تم جا کر ناشتا بنواؤ، میں انکل کو اوپر لے جا رہا ہوں۔" اس نے دروازے کے نزدیک ہی ایک زینے کی طرف اشارہ کیا۔ زینہ بھی خاصا کشادہ تھا۔

نادر مجھے ایک بیڈ روم میں لے گیا اور بولا۔ "اب تم اطمینان سے بیٹھو۔ چاہو تو نہا لو۔ میں تمہارے لیے کپڑے لے کر آتا ہوں۔"

"ایک منٹ یار!" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ حولدار اعجاز بھی ہے۔ میں نے اسے گلی کے باہر چھوڑ دیا ہے۔ ہاں، اس کے لیے بھی کوئی شرٹ لیتے جانا۔ میری طرح وہ بھی وردی میں ہے۔"

نادر کے جانے کے بعد میں باتھ روم میں گھس گیا۔

وہاں سے باہر نکلا تو کمرے میں اعجاز موجود تھا۔ نادر کے لائے ہوئے کپڑے بیڈ پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اعجاز کو باتھ روم میں جانے کا اشارہ کیا اور خود کپڑے بدل کر آرام سے لیٹ گیا۔

نادر خان واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ایک ٹی وی سیٹ تھا اور تازہ اخبار بھی تھا۔

"یار! یہ تم نے بہت زبردست کام کیا ہے۔"

"تم اخبار دیکھو، میں ناشتا لے کر آتا ہوں۔"

"میری بائنک کہاں ہے؟" میں نے پوچھا کہ مبادا بائنک نادر خان نے اپنے گھر کے باہر کھڑی کر دی ہو۔

"اسے تو میں ورک شاپ چھوڑ آیا۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس نے ناشتے میں خاصا اہتمام کر ڈالا تھا۔ ہم دونوں نے خوب ڈٹ کر ناشتا کیا۔ اس وقت تک میں نے نادر کو کچھ بتایا تھا، نہ اس نے پوچھا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر چائے پیتے ہوئے میں نے اسے بتایا۔ "میں ابھی تھوڑی دیر میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ ہم دونوں نہ صرف معطل ہو چکے ہیں بلکہ ہماری گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری ہو چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری وجہ سے تم بھی کسی مصیبت میں پڑو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو حسن؟" نادر برا مان کر بولا۔ "مجھے تو رات ہی معلوم ہو گیا تھا کہ تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ میں کل رات وقفے وقفے سے تمہارے سیل فون پر کال کرتا رہا لیکن تمہارا تو سیل فون ہی بند تھا۔ صبح ٹی وی چینلز پر بریکنگ نیوز میں بتایا گیا کہ معطل سب انسپکٹر حسن اور حوالدار اعجاز کی گرفتاری کے لیے پولیس نے ان کے گھر اور مختلف ٹھکانوں پر چھاپے مارے لیکن انہیں گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ میڈیا میں تمہیں جس انداز میں اچھالا جا رہا ہے، مجھے اس بات پر انتہائی حیرت بھی کہ تم جیسا دیانت دار افسر ایسا بھی کر سکتا ہے۔"

"میڈیا وہی زبان بولتا ہے جو صاحب اقتدار چاہتے ہیں پھر اس شخص احسان نے تو میری پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔ اسے ڈرایا دھمکایا گیا ہے یا پیسے سے خریدا گیا ہے۔ یہ میں نہیں جانتا لیکن اس کے اور نورین کے بیانات نے واقعی مجھے مجرم بنا دیا ہے لیکن میں بھی معین اور اس کے بیٹے کو قانون کے سامنے بے نقاب کر کے ہی رہوں گا۔ آج کل عدلیہ آزاد ہے، مجھے اس کے خلاف صرف ٹھوس شواہد جمع کرنا ہوں گے۔"

"سر! فی الحال تو ایس ایس پی صاحب کا دیا ہوا چیک کیش کرا لیں ورنہ کل کلاں کو انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا تو ان کا بینک اکاؤنٹ بھی سیز کر دیا جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"تم لوگوں کا باہر نکلنا مناسب نہیں ہے۔ وہ چیک مجھے دے دو، میں کیش کرا لاؤں گا۔"

میں نے اپنے پرس سے چیک نکال کر اسے دے دیا۔ وہ اسی وقت چیک کیش کرانے چلا گیا۔

"اب سب سے پہلے تو ہمیں کوئی محفوظ ٹھکانا ڈھونڈنا پڑے گا۔" میں نے اعجاز سے کہا۔ "ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رہ سکتے۔"

"ٹھکانے کا بندوبست میں کر لوں گا۔" اعجاز نے کہا۔

"بندوبست تو میں بھی کر لوں گا لیکن اب میں کسی پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوں۔"

پھر اعجاز اٹھ کر ٹی وی لگانے لگا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ نادر کو گئے ہوئے چالیس منٹ سے زیادہ ہو چکے تھے۔ وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے تشویش ہو رہی تھی۔ بینک یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اگر وہ پیدل بھی جاتا تو مشکل سے پندرہ منٹ کا راستہ تھا۔

اسی وقت ایک چینل پر چلتا پروگرام رک گیا اور بریکنگ نیوز دکھائی جانے لگی۔ نیوز ریڈر کہہ رہی تھی۔ "منور کیس میں پولیس نے سب انسپکٹر حسن اور حوالدار اعجاز کے مزید ٹھکانوں پر چھاپے مار کے ان کے دو ساتھیوں رشید اور اکمل کو گرفتار کر لیا ہے۔ دونوں پولیس اہلکار ابھی تک مفرور ہیں۔ پولیس نے تحقیقات کر کے یہ معلوم کر لیا ہے کہ اس کیس میں ایک معطل ایس ایس پی علی احمد کے گھر دونوں ملزمان نے رات بسر کی تھی۔ پولیس ایس ایس پی علی سے مزید پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دونوں ملزمان رات کو میرے ہی ساتھ تھے لیکن علی الصباح یہاں سے چلے گئے تھے۔ پولیس افسران پر مشتمل تحقیقاتی کمیٹی کل تک اپنی رپورٹ وزیر داخلہ کو پیش کر دے گی۔"

"بند کرو یہ بکواس۔" میں نے برا سا منہ بنا کر اعجاز سے کہا۔ "پورا میڈیا یہ سمجھ رہا ہے کہ میں نے منور پر ظلم کیا ہے اور اسے کسی ذاتی رنجش کی بنا پر گرفتار کیا ہے۔" میں نے ...

"نادر خان کو ٹیلی فون کریں۔ آپ کے پاس تو اس کا نمبر بھی ہے۔"

"اگر وہ بینک میں ہوا تو ٹیلی فون ریسیو نہیں کرے گا۔" میں نے کہا اور اپنا سیل فون نکال کر اسے آن کیا۔ ... سیل فون تھمتے ہی اس میں کے بعد دیگرے ... ایس ایم ایس

آ گئے۔ ان میں دو ایس ایم ایس نادر کے تھے لیکن وہ کل کی تاریخ میں کیے گئے تھے۔ اس نے صرف اتنا لکھا تھا کہ مجھے کال کرو۔ ایک ایس ایم ایس، ایس ایس پی صاحب کا تھا، انہوں نے بھی کال کرنے کو کہا تھا۔

اسی وقت نادر کمرے میں داخل ہوا۔

"کہاں رہ گئے تھے یار! مجھے تو پریشانی ہو رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"میں نے وہ چیک ڈیفنس کی ایک برانچ سے کیش کرایا ہے۔ بعد میں اگر پولیس تحقیقات بھی کرے گی تو اسے تمہارے ٹھکانے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہوگا۔"

مجھے نادر خان کی دور اندیشی پر خوشی ہوئی۔ اسے بھی اندازہ تھا کہ آج نہیں تو کل ایس ایس پی صاحب کو بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔ پولیس کمیٹی کی تحقیقات کا ڈراما صرف انہیں گرفتار کرنے کے لیے رچایا جا رہا تھا۔

نادر خان نے ڈیڑھ لاکھ کی رقم میرے حوالے کر دی۔ اس رقم کو میں نے دو حصوں میں تقسیم کیا اور ایک حصہ اعجاز کو دے دیا۔ اس نے جھجک کر مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔ "آئندہ نہ جانے کیا صورتِ حال ہو۔ ممکن ہے ہم لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں۔ اس صورت میں ہمارے پاس رقم کا ہونا تو ضروری ہے۔" اعجاز نے وہ نوٹ لے لیے۔

"اب تم ایک کام کرو۔" میں نے نادر خان سے کہا۔ "میری بائنک بھی فروخت کر دو۔" میں نے کہا۔ "وہ بائنک بھی ہمارے لیے خطرہ ہے۔"

"لیکن سر! اس طرح تو پولیس نادر تک پہنچ جائے گی۔ بائنک خریدنے والا اسے چلائے گا بھی اور گاڑی روڈ پر آئی تو پکڑی جائے گی۔ پھر اس کے ذریعے پولیس نادر خان تک پہنچ جائے گی۔"

"تم وہ بائنک فوری طور پر استعمال مت کرو۔ میں اسے اپنی ورک شاپ کے پچھلے حصے میں چھپا دوں گا۔ اگر تمہیں ضرورت ہے تو میری گاڑی لے لو۔"

"لیکن پھر تم کیا استعمال کرو گے؟" میں نے کہا۔

"میرے پاس تو گاڑیاں آتی ہی رہتی ہیں۔"

میں نے اعجاز سے کہا۔ "تم کسی ٹھکانے کی بات کر رہے تھے؟"

"میرے ایک کزن کا فلیٹ خالی پڑا ہے۔" اعجاز نے کہا۔ "وہ بیوی بچوں سمیت خود راولپنڈی میں ہے۔ میں اس سے بھی بات کر لیتا ہوں۔"

"وہ کسی ٹھکانے کی فکر تم کیوں کرتے ہو یار!" نادر نے کہا۔ "میرے پاس یہاں کورنگی ہی میں کئی ٹھکانے ہیں۔ وہ علاقہ بھی غیر آباد ہے اور جگہ بھی اتنی بڑی ہے کہ وہاں دو کیا دو سو آدمی بھی رہ سکتے ہیں۔ ایک زیر تعمیر فیکٹری ہے جس کی تعمیر گزشتہ دو ڈھائی سال سے رکی ہوئی ہے۔ فیکٹری کے مالک کی گاڑیاں مرمت کے لیے میری ورک شاپ میں آتی ہیں اس لیے اس سے میرے اچھے تعلقات ہیں۔ اس نے مجھے فیکٹری کی دیکھ بھال کرنے کو کہا تو میں انکار نہ کر سکا۔ فیکٹری کیا، وہاں ابھی کسی قسم کی کوئی مشینری نہیں ہے۔ صرف عمارت ہے۔ میں نے مین گیٹ پر تالا ڈال دیا ہے اور روز ایک چکر لگا لیتا ہوں۔ فیکٹری میں لائٹ بھی ہے اور پانی بھی۔ بس مجھے ایک کمرے کی صفائی کرنا پڑے گی۔"

"صفائی تو ہم خود کر لیں گے۔" اعجاز نے کہا پھر مجھ سے بولا۔ "سر! اس فلیٹ کے مقابلے میں یہ جگہ زیادہ بہتر ہے۔"

☆☆☆

میں اور اعجاز اس وقت اس فیکٹری کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ ضرورت کی ہر چیز نادر خان نے وہاں مہیا کر دی تھی۔ فرش پر دو اسپرنگ والے میٹرس ڈال دیے تھے۔ کمرے میں لیمپ ایسے رخ سے لگایا تھا کہ اس کی روشنی باہر نہ جا سکے۔ کھانے پینے کی اشیا وہ روزانہ لے کر آتا تھا۔ اب میں چاہتا تھا کہ شروعات منور ہی سے کروں لیکن نادر خان اور اعجاز اس کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم اپنی تحقیقات کی ابتدا نورین اور اس کے باپ سے کریں۔ ہمیں اس جگہ منتقل ہوئے دوسرا دن تھا لیکن ابھی تک کیس کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا تھا۔

اس دن، رات کو نادر خان آیا تو وہ کچھ فکر مند تھا۔ اس نے تھرماس سے ہمارے لیے چائے نکالی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پولیس نے ایس ایس پی صاحب کو گرفتار کر لیا ہے۔" "تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ایس ایس پی صاحب بھی ہمارے ساتھ برابر کے شریک تھے اور منور کے خلاف ایف آئی آر انہی کے حکم پر کاٹی گئی تھی۔"

میں عالمِ اضطراب میں کھڑا ہو گیا۔ "یار! ہماری وجہ سے ایک شریف آدمی کتنا ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ میڈیا نے تو اس خبر کو خوب اچھالا ہوگا۔"

"میڈیا تو اب پورے محکمۂ پولیس کو موردِ الزام ٹھہرا رہا ہے کہ پولیس دونوں ملزمان حسن اور اعجاز کی پشت پناہی کر رہی ہے ورنہ وہ دونوں اب تک گرفتار ہو چکے ہوتے۔" نادر خان نے کہا پھر وہ بولا۔ "آج ایکشن کی رات ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"آج ہم لوگ نورین کو اٹھا لیں گے۔"

"کیا؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"ہمارا مقصد نورین اور اس کے باپ سے سچ اگلوانا ہے۔" اعجاز نے کہا۔ "ہم انہیں بُری نیت سے نہیں اٹھا رہے اور آپ کو بھی اس آپریشن میں ہمارا ساتھ دینا ہے۔"

"پورے شہر کی پولیس کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسے حالات میں ہم خالی ہاتھ کیا کر سکتے ہیں؟ ہمارے پاس تو چاقو تک نہیں ہے۔"

"میں ابھی اتنا بے بس نہیں ہوں یار۔" نادر خان نے کہا۔ "میں نے جرائم کی زندگی سے توبہ ضرور کر لی ہے لیکن میرے رابطے اب بھی موجود ہیں۔" وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا پھر فوراً ہی کسی دوسرے کمرے سے ایک سوٹ کیس لے آیا۔ اس نے سوٹ کیس کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔

سوٹ کیس میں ہر قسم کا اسلحہ موجود تھا۔ اس میں پسٹل، ماؤزر، سگ (SIG) کی دور مار رائفلیں اور جرمن لیوگر بھی موجود تھا۔ ان ہتھیاروں کے علاوہ اس میں ان ہتھیاروں کے فاضل میگزین بھی بھرے ہوئے تھے۔

"بس توپ اور ٹینکوں کی کمی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم اگر اس اسلحے سمیت پکڑے جاتے تو اب تک پولیس نہ جانے تم سے دہشت گردی کی کن کن وارداتوں کا اعتراف کرا چکی ہوتی۔"

میں نے اسلحے کے اس ڈھیر میں سے جرمن لیوگر اور ایک پسٹل نکال لیا۔ نادر اور اعجاز نے بھی اپنے پسندیدہ ہتھیار نکال لیے۔ وہ غیر قانونی ہتھیار لیتے ہوئے ایک لمحے کو ہچکچایا، پھر یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا کہ اس کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ہے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ دیر تک اپنے پلان پر غور کرتے رہے۔

میں نے اعجاز اور نادر سے کہا۔ "ایک بات ذہن نشین کر لو۔ ہمیں پولیس سے کسی بھی صورت میں نہیں ٹکرانا ہے۔"

"پولیس نے اگر ہم پر فائرنگ کی تو جواب میں ہم کیا پھول پھینکیں گے؟" نادر نے کہا۔

"اگر ایسی نوبت آ گئی تو پھر دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔

رات کو ایک بجے کے قریب ہم تینوں پوری طرح مسلح ہو کر نکل گئے۔ نادر کے پاس پرانے ماڈل کی ٹیوٹا کرولا تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کا انجن بہت بہترین حالت میں ہوگا۔ ویسے اس گاڑی کی باڈی بھی بہت مضبوط تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر نادر تھا۔ ہم لوگ بہت اطمینان سے ڈیفنس کے اس بلاک تک پہنچ گئے جہاں احسان کا بنگلا تھا۔ نادر خان نے گاڑی ایک خالی پلاٹ پر پارک کر دی اور ہم پیدل ہی احسان کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں نے چلتے چلتے آہستہ سے کہا۔ "ذرا محتاط رہنا، ممکن ہے بنگلے پر بھی پولیس کا کوئی اہلکار ڈیوٹی پر ہو۔"

"ہم ہر طرح سے محتاط ہیں۔" اعجاز نے کہا۔ "ویسے احسان کوئی ایسا وی آئی پی بھی نہیں ہے کہ اس کے بنگلے پر پولیس کا کوئی اہلکار ہو۔"

احسان نے صرف ایک دفعہ اپنا پتا بتایا تھا اور میرے ذہن میں محفوظ ہو گیا تھا۔ گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ میں سب سے آگے تھا۔ اعجاز مجھ سے کچھ فاصلے پر چل رہا تھا اور نادر سامنے والے بنگلوں کی طرف تھا لیکن پوری طرح چوکنا تھا۔ وہاں ابھی بہت کم بنگلے تعمیر ہوئے تھے۔ ایک ایک بنگلے کے بعد دو دو، تین تین پلاٹ خالی تھے جن پر خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ یہاں تمام بنگلوں پر نمبر نہیں تھے، صرف چند ایک پر نمبر نظر آ رہے تھے۔ میں انہی کے سہارے بنگلوں اور پلاٹوں کو شمار کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

چلتے چلتے اچانک میری نظر ایک بنگلے کے گیٹ پر پڑی تو میں ٹھٹک گیا۔ گیٹ پر صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے احسان احمد کے نام کی تختی نظر آ گئی۔ اس سے پہلے ایک خالی پلاٹ تھا، میں اس پلاٹ میں چلا گیا۔ فوراً ہی اعجاز اور نادر بھی میرے پاس آ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہی احسان کا بنگلا ہے لیکن ہم اس کی عقبی سمت سے اندر داخل ہوں گے۔

میں اس خالی پلاٹ میں آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف بڑھا۔ وہاں سے گزر کر ہم احسان کے بنگلے کے عقب میں آ گئے۔ عقبی سمت میں گھور اندھیرا تھا۔ بنگلے کی چار دیواری خاصی بلند تھی۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ نادر دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اعجاز نے اس کے کندھوں پر پاؤں رکھے اور وہ آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔ یوں اعجاز کے ہاتھ دیوار تک پہنچ گئے۔ اس نے دیوار کا سرا دونوں ہاتھوں سے تھام کر زور لگایا اور اوپر چڑھ گیا۔ اوپر بیٹھ کر چند لمحے اس نے اردگرد کا جائزہ لیا پھر اندر کی طرف کود گیا۔ اس کے پیروں میں جاگرز تھے۔ اس لیے اندر ہلکی سی دھمک ہوئی پھر خاموشی چھا گئی۔ ہم لوگ سانس روک کے کسی ردِعمل کا انتظار کرتے رہے لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

کچھ دیر بعد عقبی سمت کا چھوٹا سا دروازہ خفیف کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اندر سے اعجاز نے گردن باہر نکالی اور ہم دونوں کو بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں تیزی سے اندر داخل ہو گئے۔ اعجاز نے پھر دروازہ بند کر دیا۔ بنگلے کا یہ حصہ خاصا اجاڑ اور ویران تھا۔ ہم دبے قدموں آگے بڑھے اور اندر داخل ہونے کے لیے کوئی راستہ ڈھونڈنے لگے۔ وہاں پر دروازہ انتہائی مضبوط تھا اور کھڑکیوں کے باہر کی طرف بھی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔

ہم لوگ ابھی اندر جانے کا راستہ تلاش کر ہی رہے تھے کہ ہمیں طرف سے مجھے کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ میں پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا۔ نادر اور اعجاز بھی فوراً زمین پر لیٹ گئے۔ کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔ وہ رہ رہ کر کھانس رہا تھا۔ میں نے پسٹل نکال لیا۔ اس پر سائلنسر پہلے ہی فٹ تھا۔

کھانسنے والا بائیں طرف سے نکل کر سیدھا دیوار کی طرف چلا گیا اور ضروری حاجت سے فارغ ہونے لگا۔ اس نے جاتے ہوئے تو ہمیں نہیں دیکھا تھا لیکن واپسی میں تو ضرور دیکھ سکتا تھا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پنجوں کے بل بے آواز دوڑتا ہوا اس شخص کے سر پر جا پہنچا۔ وہ اب کھڑا ہو چکا تھا اور واپس پلٹنے ہی والا تھا۔

میں نے گن کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی اور سفاک لہجے میں بولا۔ "آواز نکالی تو یہیں ڈھیر کر دوں گا۔" میں نے ایک نقاب سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔

وہ گھگیا کر بولا۔ "آ... آپ... کون ہو جی؟"

"تمہاری موت۔" میں نے کہا۔

"کک... کیا... مم... میں..."

"میں میں بند کرو۔" میں نے لہجے میں مزید سفاکی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"مم... میں... ڈیوٹی پر ہوں جناب!" اس نے کہا۔ "اگر آپ کی احسان صاحب سے کوئی دشمنی ہے تو مجھے کیوں مار رہے ہیں؟"

"اور کتنے آدمی ڈیوٹی پر ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بس، میں اکیلا ہی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

وہ پولیس کا سپاہی تھا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ پولیس نے احسان کی حفاظت کے لیے ایک سپاہی وہاں ڈیوٹی پر لگا رکھا تھا لیکن اس بے چارے سے تو اپنی حفاظت نہیں ہو رہی تھی، وہ احسان کی حفاظت کیا کرتا۔

"ہمیں اندر لے کر چلو۔" میں نے کہا۔ "کہنے کا دروازہ کھلواؤ۔"

"وہ تو جی سو رہے ہوں گے۔"

"تو انہیں جگاؤ ورنہ تم ہمیشہ کے لیے سو جاؤ گے۔"

"میں انہیں جگاتا ہوں جناب!" سپاہی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں اسے لے کر سامنے والے دروازے کی طرف پہنچا۔ اس دوران میں اس کی تلاشی لے کر میں نے سروس ریوالور اور سیل فون اس سے لے لیا تھا۔

میں ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور اسے دروازہ کھلوانے کا اشارہ کیا۔ اعجاز اور نادر دوسری طرف ستون کی آڑ میں تھے۔ ان دونوں کے چہرے بھی چھپے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھ کر تو پولیس کے اس سپاہی پر لرزہ طاری ہو گیا۔ شاید وہ سمجھ رہا ہوگا کہ ہم وہاں ڈکیتی کی غرض سے آئے ہیں۔ تین آدمی اندر ہیں تو باہر بھی کچھ لوگ موجود ہوں گے۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی پھر دوسری مرتبہ ذرا زوردار انداز میں دروازہ کھٹکھٹایا۔

اندر قدموں کی آہٹ سنائی دی اور کوئی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں محمد خان!" اس کی آواز بھی کپکپا رہی تھی۔

"کیا بات ہے محمد خان؟" اندر سے آواز آئی۔ اس مرتبہ میں نے احسان کی آواز پہچان لی۔

"مجھے سردی لگ رہی ہے اور بخار بھی محسوس ہو رہا ہے سر! اگر آپ کے پاس کوئی رضائی یا کمبل ہو تو مجھے دے دیں اور اگر بخار کی کوئی گولی ہو تو وہ بھی دے دیں۔"

اچانک دروازے کے سامنے والا حصہ تیز روشنی میں نہا گیا۔ احسان شاید اندر سے باہر کا جائزہ لے رہا تھا پھر اس نے دروازہ کھول دیا اور بولا۔ "آؤ، اندر آ جاؤ۔"

محمد خان اس وقت واقعی کانپ رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ واقعی کانپ رہا ہے یا اداکاری کر رہا ہے۔ محمد خان کانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ میں نے زقند لگائی، اور اس سے پہلے کہ احسان دوبارہ دروازہ بند کرتا، میں نے دروازے کے بیچ میں اپنا پیر اڑا دیا۔

"اتنی جلدی مت کرو۔" میں نے غرا کر کہا اور گن اس کے سینے پر رکھ دی۔

"کون ہو تم لوگ؟"

میں نے اسے پیچھے دھکیلا اور بولا۔ "اندر چلو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا کہ ہم لوگ کون ہیں؟"

میرے اندر گھستے ہی اعجاز اور نادر بھی اندر آ گئے۔

"لیکن تم ہو کون؟" احسان نے جھنجلا کر کہا۔
اعجاز نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ لگایا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ احسان لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔
اعجاز نے گھوم کر محمد خان کی کھوپڑی پر پسٹل کا دستہ رسید کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ اندر کی طرف کھسک رہا تھا۔
محمد خان تیورا کر دھم سے فرش پر گر گیا۔ اس کے گرنے سے خاصی آواز پیدا ہوئی تھی۔
اچانک وہاں نورین اور احسان کا بیٹا آ گئے۔ وہاں کا منظر دیکھ کر نورین نے چیخنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی اعجاز جھپٹ کر اس تک جا پہنچا تھا۔ خوف کے مارے اس کی چیخ گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔ اعجاز نے دوسرے ہاتھ سے احسان کے بیٹے کی گردن بھی دبوچ لی اور بولا۔ "آواز نکالی تو تیری گردن توڑ دوں گا۔ اندر کمرے میں چلو تم دونوں۔"
وہ غرا کر بولا۔
میں نے احسان کو اٹھایا۔ اس کے چہرے پر اعجاز کی انگلیوں کے نشان ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اسے کھڑا کیا اور نادر سے کہا۔ "تم ذرا اس محافظ کو دیکھو اگر وار ہلکا پڑا ہو تو ایک ضرب اور لگا دو اور جا کر گاڑی لے آؤ۔" پھر میں نے دھکیل کر احسان کو بھی کمرے میں پہنچایا۔ نورین اور اس کا بھائی دونوں بیڈ پر سہمے ہوئے انداز میں بیٹھے تھے۔ احسان کا حلیہ دیکھ کر نورین تڑپ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "پاپا... آپ ٹھیک تو ہیں؟" پھر وہ اعجاز سے بولی۔ "تم لوگ... کون ہو اور... کیا چاہتے ہو؟"
"زیادہ بک بک مت کرو اور خاموشی سے بیٹھی رہو۔"
اعجاز نے درشت لہجے میں کہا۔
"دیکھو... تم... یہ... غلط کر رہے ہو... میں..."
لڑکے نے کچھ کہنا چاہا۔
اعجاز نے جھپٹ کر اس کے بال پکڑ لیے اور اسے باہر کی طرف دھکیلنے لگا۔ اس لڑکے کو ساتھ لے جانا ہمارے پلان میں شامل نہیں تھا۔ بس اسے یہ یقین دلانا تھا کہ نورین اور اس کے باپ کو انہی لوگوں نے اغوا کیا ہے جنہوں نے اس سے پہلے بھی نورین کو اغوا کیا تھا۔
چند منٹ بعد اعجاز واپس آ گیا اور بولا۔ "سالا بہت چڑ چڑ کر رہا تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔"
"تت... تم نے... میرے بھائی کو مار دیا؟"
نورین ہذیانی انداز میں بولی۔
"زیادہ بک بک کرے گی تو تجھے بھی ڈھیر کر دوں گا۔"
"تم لوگ بتاؤ... کہ تم کیا چاہتے ہو؟" احسان نے کہا۔
"یہ بات تو ہم نے پہلے بھی بتائی تھی۔" اعجاز درشت لہجے میں بولا۔
اسی وقت نادر کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ "ان دونوں کو باہر لے چلو۔" پھر اس نے نورین کا بازو پکڑ کر اسے باہر کی طرف گھسیٹا۔
"میرا ہاتھ چھوڑو۔" نورین ہمت کر کے بولی۔ "چلو، کہاں چلنا ہے؟"
ہم ان دونوں کو گن پوائنٹ پر باہر لائے۔ اس سے پہلے میں نے پورچ میں جلنے والا تیز روشنی کا بلب بند کر دیا تھا۔ باہر بھی تاریکی تھی۔
نادر اپنی گاڑی پورچ ہی میں لے آیا تھا۔ اس نے احسان اور نورین دونوں کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا پھر ان کے ساتھ اعجاز بھی بیٹھ گیا۔
میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا اور اپنا پسٹل نکال کر اس کا رخ احسان کی طرف کر دیا اور بولا۔ "اگر تم دونوں میں سے کسی نے بھی آواز نکالی تو اسے گولی مار کے گاڑی سے باہر پھینک دوں گا۔"
راستے بھر نورین اور احسان خاموش بیٹھے رہے۔ اس وقت بھی نادر گاڑی بہت اطمینان سے ڈرائیو کر رہا تھا۔
ہم دوبارہ اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو رات کے تین بج رہے تھے۔ نادر نے ان لوگوں کے لیے الگ الگ کمروں کا بندوبست کیا تھا۔ دونوں کو ان کمروں میں دھکیل دیا گیا۔ دروازہ باہر سے بند کر کے میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے نادر سے کہا۔ "اس وقت مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے۔ اس کا بندوبست کرو۔"
"اس کا بندوبست تو میں نے پہلے ہی کر رکھا ہے۔" اس نے الیکٹرک کیتل مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ "دودھ، چینی، پتی سب کچھ ہے۔ ابھی دس منٹ میں چائے تیار ہو جائے گی۔"
چائے پیتے ہوئے میں نے نادر سے پوچھا۔ "تم نے اس لڑکے کا کیا کیا؟"
"کچھ بھی نہیں، صرف اس کی تلاشی لے کر اسے کمرے میں دھکیل دیا اور یہ اطمینان کر لیا کہ کمرے میں ٹیلی فون وغیرہ کا کوئی کنکشن نہیں ہے پھر اسے کمرے میں بند کر دیا۔ اسے یہ یقین دلانا تھا کہ ہم نے نورین کو پہلے بھی اغوا کیا تھا۔ اس نے ہمارے حق میں بیان دے کر بہت اچھا کیا۔ اب بار بار تو تم منور پر اغوا کا الزام نہیں لگا سکتے نا!"
میں چائے پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب ذرا میں اپنے مہمانوں کی خبر لے لوں۔" میں نے کہا اور کمرے سے باہر نکلنا چاہا۔
"ایک منٹ حسن!" نادر نے کہا۔ "اپنا چہرہ تو چھپا لو۔"
میں نے مفلر سے اپنا سر اور چہرہ دونوں اچھی طرح چھپایا پھر نورین کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر انرجی سیور روشن تھا اور نورین گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھی تھی۔ آہٹ سن کر اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس وقت پہلی مرتبہ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ٹی وی اسکرین پر وہ جتنی خوب صورت دکھائی دی تھی، اس سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ اس کا چہرہ انتہائی پرکشش تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں اس وقت سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا جسم بھی بہت متناسب تھا۔ اگر منور نے اس سے شادی کرنا چاہی تھی تو اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ نورین تھی ہی اتنی پرکشش اور حسین کہ کوئی بھی اس سے شادی کے لیے بے قرار ہو سکتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اب بھی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ بالوں کی ایک آوارہ لٹ اس کی پیشانی پر جھول رہی تھی جسے اس نے ہاتھ سے پیچھے کر دیا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کی آنکھوں میں اب خوف بالکل نہیں تھا۔
"تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" اس نے نفرت بھرے لہجے میں پوچھا۔
"اس سوال کا جواب تمہیں پہلے بھی مل چکا ہے۔ اغوا ہونے کے بعد تم نے سب سے پہلے یہی سوال کیا تھا۔" میں نے آواز کو قدرے بھاری بنا کر کہا۔
"تو کیا منور..."
"ہاں۔" میں نے کہا۔ "تمہیں انہی کے کہنے پر ہم یہاں لائے ہیں۔ وہ بھی ابھی تھوڑی دیر میں قاضی کو لے کر پہنچنے والے ہیں۔"
"میں اس بدمعاش سے شادی تو دور کنار ملنا بھی پسند نہ کروں۔ اس سے بہتر ہے کہ تم مجھے گولی مار دو۔"
"آج تو تم بہت نخرے دکھا رہی ہو۔" میں نے اسے مشتعل دلانا چاہا۔ "پولیس اور پریس کے سامنے تو تم نے کہا تھا کہ منور بہت مہذب آدمی ہیں۔ وہ ایسی حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ بس سب انسپکٹر نے اپنی کسی ذاتی دشمنی کی وجہ سے مجھے وہ بیان دینے پر مجبور کیا تھا۔"
"ہاں، میں نے کہا تھا لیکن اس کے لیے بھی اس لفنگے نے مجھے اور پاپا کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے ہماری مرضی کا بیان نہ دیا تو ہم لوگ میرے باپ اور بھائی کو قتل کر دو گے اور مجھے اغوا کر کے کہیں بیچ دو گے۔"
"اگر تم نے منور صاحب کی بات نہ مانی تو ہم اب بھی یہی کریں گے۔" میں نے سفاکی سے کہا۔
"ضرور کرو۔" نورین نے اٹل لہجے میں کہا۔ "میں اس سے شادی تو ہرگز نہیں کروں گی، چاہے وہ میرے باپ اور بھائی کو ختم کر دے یا مجھے کسی خلیجی ریاست میں بیچ دے۔" پھر وہ خودکلامی کے انداز میں بولی۔ "میں فضول میں اس لفنگے سے خوف زدہ ہو گئی۔ میں اگر اس سب انسپکٹر کے خلاف بیان نہ دیتی تو وہی سب انسپکٹر میری حفاظت بھی کرتا۔"
"وہ دو ٹکے کا سب انسپکٹر۔" میں نے لہجے میں حقارت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تمہاری حفاظت کرتا جو آج اپنی دیانت داری اور فرض شناسی سمیت پولیس سے چھپا چھپا پھر رہا ہے۔"
"یہ بھی میری ہی غلطی ہے۔" وہ افسردگی سے بولی۔ "میرے ایک بیان نے نہ صرف اس کا کیریئر تباہ کر دیا بلکہ اسے مجرم بھی بنا دیا۔"
"اب تم یہاں بیٹھی اسے یاد کرتی رہو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں ذرا معلوم کر لوں کہ منور صاحب اب تک آئے کیوں نہیں؟" یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا اور دروازہ بند کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ میں نے جیب سے ٹیپ ریکارڈر نکال کر نادر کو دے دیا اور بولا۔ "ذرا چیک کرو، ریکارڈنگ ٹھیک ہوئی ہے یا نہیں؟"
وہ چھوٹا سا لیکن انتہائی طاقتور اور حساس مائکروفون والا ریکارڈر تھا۔ نادر نے ریکارڈنگ چیک کی اور ہنس کر بولا۔ "بہترین ہے۔ اس وقت تو میں نے ہیڈفون لگا رکھا ہے اس لیے اس کی آواز باہر نہیں آ رہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ہیڈفون میرے کانوں پر لگا دیا۔
ریکارڈنگ واقعی صاف اور واضح تھی۔ نورین کی آواز صاف پہچانی جا رہی تھی۔
"اب میں احسان کے پاس جاتا ہوں۔" میں نے ریکارڈر اٹھا کر کہا۔ "دیکھوں وہ کیا کہتا ہے؟"
احسان فرش پر بیٹھا خلا میں تک رہا تھا۔ اس کا بایاں گال سوج گیا تھا۔ اعجاز نے تھپڑ مارتے وقت شاید اپنا سارا غصہ اس پر نکال دیا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کے جسم میں جنبش ہوئی اور وہ کسمسا کر رہ گیا۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم... چاہتے کیا ہو؟“

”تم کیا سمجھتے ہو، منور تمہیں اور تمہاری بیٹی کو بھول گیا ہوگا؟“

احسان نے چونک کر مجھے دیکھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے مجھے پہچان لیا ہو۔ اس سے بات کرتے وقت میں نے اپنی آواز اور لب و لہجہ تک بدل کر بات کی تھی۔

”تم... منور کے آدمی ہو؟“

”ہاں، میں منور صاحب کا آدمی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”پہلے تو تم بہت اچھل رہے تھے۔ پولیس کے پاس دوڑے دوڑے گئے تھے، ایف آئی آر درج کرائی تھی... اب کیا کرو گے؟“

”معین صاحب نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔“ احسان چیخ کر بولا۔

”آواز نیچی رکھو۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”کیسا دھوکا؟“

”انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہارے دونوں بچوں کو امریکا بھجوا دوں گا اور پانچ کروڑ روپے نقد دینے کا وعدہ کیا تھا۔“

”تو اس میں دھوکا کیسا؟“ میں نے کہا۔ ”کیا انہوں نے تمہیں پیسے نہیں دیے تھے؟“

”پیسوں کا کیا ہے۔ پیسے تو میں خود بہت کما لیتا۔ میں تو اپنی بیٹی کی وجہ سے مجبور ہوا تھا۔“ احسان نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ ”معین صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم ہماری مرضی کا بیان دے دو تو نورین کی طرف کوئی ٹیڑھی آنکھ سے بھی نہیں دیکھے گا۔“ وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”میں نے اپنی بیٹی کی خاطر اتنا بڑا جھوٹ بولا۔ پولیس کے کئی ایمان دار افسروں کا مستقبل تاریک کر دیا۔ وہ سب انسپکٹر تو بے چارہ میری مدد کر رہا تھا۔ میں نے اسی کو مجرم بنا دیا۔“

”وہ دو ٹکے کا سب انسپکٹر حسن تمہاری کیا مدد کر سکتا تھا؟“ میں نے کہا۔

”اس نے تمہارے منور صاحب کے خلاف ایسا کیس بنا دیا تھا کہ ان کے باپ کا اثر رسوخ اور دولت بھی منور کو جیل جانے سے نہیں بچا سکتی تھی۔“

”اب وہ سب انسپکٹر خود پولیس سے منہ چھپائے چھپائے پھر رہا ہے۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”یہ سراسر میری اور نورین کی غلطی ہے۔“ احسان نے کہا۔ ”اگر وہ سب انسپکٹر آزاد ہوتا تو تم لوگوں کی بھی یہ جرأت نہ ہوتی کہ...“

”اچھا، زیادہ باتیں مت بناؤ۔“ میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”ابھی تھوڑی دیر میں منور صاحب یہاں آنے والے ہیں۔ وہ آج ہی نورین سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔“

”ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ نورین تو اس کی شکل سے بھی نفرت کرتی ہے۔ وہ کبھی اس نکاح پر راضی نہیں ہوگی۔“

”اسی لیے تو ہم تمہیں بھی یہاں لائے ہیں کہ تم اپنی بیٹی کو سمجھاؤ۔“

”ورنہ... تم لوگ ہمیں جان سے مار دو گے؟“ احسان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”معین صاحب نے مجھے یہی دھمکی تو دی تھی کہ وہ میرا کاروبار تباہ کر دیں گے۔ مجھے اور میرے بیٹے کو ختم کرا دیں گے اور نورین کو اغوا کر کے کہیں بیچ دیا جائے گا۔“

”یہ دھمکی نہیں تھی۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”ہم اب بھی ایسا ہی کریں گے۔ اب تو تم پولیس کے پاس بھی نہیں جا سکتے۔“

”کاش میں نے سب انسپکٹر حسن کے خلاف بیان نہ دیا ہوتا۔“ احسان نے کہا۔

”زندگی میں ایسے بہت سے ”کاش“ آتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ نہ ہو کہ تمہاری زندگی میں ایک اور ”کاش“ کا اضافہ ہو جائے۔“ میں اسے کمرے میں حیران و پریشان چھوڑ کر باہر آ گیا۔

اس کی یہ گفتگو بھی ریکارڈ ہو چکی تھی۔ اب ہمارے پلان کا دوسرا حصہ شروع ہونے کا وقت تھا۔ اس مرحلے میں مجھے منور کو اٹھانا تھا۔ وہ اتنی آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ اگر اعجاز، نورین کا ہمدرد بن کر اسے یہاں سے نکال دے اور اسے سیدھا پولیس اسٹیشن جانے کا مشورہ دے تو سب بگڑی ہوئی بات بن سکتی تھی۔ میں نے اپنا پلان نادر اور اعجاز کو بتایا تو انہیں بھی پسند آیا لیکن نادر نے کہا۔ ”نورین کو پولیس اسٹیشن کے بجائے سیدھا ہائی کورٹ کے کسی جج کے پاس جانا چاہیے۔ اب وہی نورین کو بچا سکتا ہے۔ پولیس تو اسے پھر منور کے حوالے کر دے گی۔“

دوسرے دن اعجاز نے نورین اور احسان کو راضی کر لیا کہ ان لوگوں کو یہاں سے نکل کر سیدھا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے پاس جانا چاہیے۔ اعجاز نے ان کی گفتگو بھی ریکارڈ کر لی تھی۔ اس نے ریکارڈر میری طرف بڑھا دیا۔ میں ہیڈ فون کان سے لگا کر ان کی گفتگو سننے لگا۔

”سنو!“ اعجاز نے کہا۔ ”میں خود بھی اس لفنگے منور سے بہت تنگ ہوں۔ الو کا پٹھا روز کسی نہ کسی لڑکی کو اٹھوا لیتا ہے۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں ہے۔ یہ تو تمہاری قسمت اچھی ہے کہ وہ اپنے کسی مسئلے میں الجھا ہوا ہے۔ اگر تم کہو تو میں تمہیں اور تمہارے باپ کو یہاں سے رہا کرا سکتا ہوں۔“

”تم... تم واقعی ایسا کر سکتے ہو؟“ نورین نے پوچھا۔

”ہاں، منور کے دوسرے آدمی تو رات کو شراب پی کر تاش کھیلتے ہی، غل غپاڑا کرتے ہیں پھر لیٹ کر سو جاتے ہیں۔ تمہیں یہاں سے نکالنا بہت آسان ہے۔ لیکن... تم جاؤ گی کہاں؟ منور تمہیں پھر اغوا کرا لے گا۔“

”میں یہاں سے سیدھی پولیس کے پاس جاؤں گی۔“ نورین نے کہا۔

”اور پولیس والے تمہاری بات سن لیں گے؟“ اعجاز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”وہ تو تمہیں خود منور کے حوالے کر دیں گے۔“

”کاش... کاش! میں نے اس سب انسپکٹر حسن کے خلاف بیان نہ دیا ہوتا۔“ نورین نے شکستہ لہجے میں کہا۔

”اب تمہارے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے۔“ اعجاز نے کہا۔ ”تم یہاں سے سیدھی چیف جسٹس ہائی کورٹ کے گھر چلی جاؤ اور انہیں سب کچھ بتا دو۔“

”ہاں، یہ بہت اچھا مشورہ ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اب عدالت کسی کے دباؤ میں نہیں ہے۔ وہاں میری بات ضرور سنی جائے گی... لیکن... پاپا...“

”میں انہیں بھی تمہارے ساتھ ہی رہا کرا دوں گا۔“ اعجاز نے کہا۔

میں نے اعجاز کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کارکردگی پر بہت خوش تھا۔

”میں نے یہی باتیں احسان سے بھی کی ہیں اور اسے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ تم ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے پاس چلے جاؤ۔ وہ ہر طرح سے تمہاری مدد کریں گے۔ احسان بھی اس پر راضی ہے لیکن ان لوگوں کو وہاں لے کر جائے گا کون؟“ اعجاز نے کہا۔ ”ہمیں تو دیکھتے ہی پولیس گرفتار کر لے گی پھر ہمارا نورین کے ساتھ جانا ٹھیک بھی نہیں ہے۔ یہی سمجھا جائے گا کہ ہم نے ان دونوں پر دباؤ ڈالا ہوگا۔“

”تم لوگوں کو وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ نادر نے کہا۔ ”میں احسان اور نورین کو ان کے بنگلے پر چھوڑ دوں گا۔ مجھے پولیس پہچانتی ہے، نہ نورین اور احسان۔“

”ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔“ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے۔ میں نے نادر سے کہا۔ ”اگر تم ابھی ان لوگوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ تو جسٹس صاحب سے ان کی ملاقات ہو سکتی ہے۔ وہ گھر سے ساڑھے سات، آٹھ بجے تک نکلتے ہوں گے۔“

”ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔“ نادر نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے ساتھ اعجاز بھی اٹھا اور بولا۔ ”میں نورین سے کہوں گا کہ میں نے اپنے ایک ساتھی کو تیار کر لیا ہے۔ وہ تم لوگوں کو چیف جسٹس صاحب کے بنگلے تک پہنچا دے گا۔“ اعجاز وہاں سے نکل کر نورین کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

نادر نے اسے آواز دے کر روکا اور کہا۔ ”تم ان دونوں کو فیکٹری سے باہر لے کر آنا۔ میں گاڑی لے کر فیکٹری کے گیٹ پر جاتا ہوں۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“ میں نے کہا۔ ”تم نورین اور احسان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دینا تاکہ وہ اس جگہ کو پہچان نہ سکیں۔ اس کے لیے تم کوئی بھی بہانہ کر سکتے ہو۔ پھر ان لوگوں کو یہیں سے گاڑی میں بٹھا دینا بلکہ تم بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ جانا اور آگے جا کر کہیں اتر جانا تاکہ نورین یا احسان اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹانے کی کوشش نہ کریں۔“

آدھے گھنٹے کے اندر اندر نادر ان لوگوں کو لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں نے ایک جوا کھیلا تھا۔ اس کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اعجاز واپس آ گیا۔

”تم کیا فیکٹری سے نکلتے ہی واپس آ گئے؟“ میں نے کہا۔ ”تم پیدل تو اتنی جلدی یہاں نہیں پہنچ سکتے تھے؟“

”نادر نے مجھے کورنگی روڈ پر اس جگہ اتار دیا تھا جہاں سے ڈیفنس کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ واپسی پر مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں اس میں کورنگی کے مین بازار تک آیا پھر رکشا پکڑ کر اس طرف آ گیا۔“

”گڈ!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”تم تو بہت ذہین ہو گئے ہو۔“

”سر! بس آپ کی صحبت کا اثر ہے۔“ اعجاز نے کہا۔

اس کے جملے پر ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔ کئی دن بعد مجھے بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔ مجھے اپنا قہقہہ بھی عجیب لگا۔ ہم لوگ دوبارہ اسی کمرے میں آ گئے۔ پھر ہم لوگ یونہی ادھر ادھر کے قصے دہراتے رہے۔

کافی دیر بعد میں نے اعجاز سے کہا۔ "یار! ذرا چائے بنالو اور ہو سکے تو کچھ کھانے کے لیے بھی لے آؤ۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد اب مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

اعجاز نے الیکٹرک کیتلی میں پانی رکھ کر اس کا پلگ آن کر دیا اور سائڈ میں رکھی ہوئی ٹوکری اٹھا کر اس میں سے کچھ بسکٹ کے پیکٹ اور نمکو وغیرہ نکال لیا اور بولا۔ "اس وقت تو آپ کو یہی ناشتا مل سکتا ہے۔"

"لے آؤ یار۔" میں نے کہا۔ "ہم کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں نہیں ہیں۔ یہاں تو جو بھی مل جائے غنیمت ہے۔"

بسکٹ کھا کر اور چائے کا ایک ایک کپ پی کر ہم دوبارہ نادر کا انتظار کرنے لگے۔ اسے گئے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ اب تک تو اسے لوٹ آنا چاہیے تھا۔

"نہ جانے نورین اور اس کے باپ نے وہاں کیا بیان دیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "ممکن ہے ان لوگوں نے خوف زدہ ہو کر ایک مرتبہ پھر منور اور معین کے حق میں بیان دے دیا ہو۔"

"ایسا ہوتا تو نورین بھی جسٹس صاحب کے بنگلے پر نہ جاتی۔" اعجاز نے کہا۔ "وہ یہاں سے سیدھی پولیس اسٹیشن جاتی۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر اسے منور کے حق میں ہی بیان دینا ہوتا تو اسے بھلا کیا خوف ہو سکتا تھا؟"

اسی طرح آدھ گھنٹا مزید گزر گیا۔ مجھے اب پریشانی شروع ہو گئی تھی۔ کہیں نادر کسی مصیبت میں گرفتار تو نہیں ہو گیا؟ کہیں پولیس نے اس کو گرفتار تو نہیں کر لیا؟

اسی وقت باہر گاڑی رکنے اور فیکٹری کا مین گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔

"میرے خیال میں نادر واپس آ گیا۔" اعجاز نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے میں بھی کمرے سے باہر نکلا۔ نادر اپنی گاڑی فیکٹری کے اندر لا رہا تھا۔ اعجاز نے خوش ہو کر کہا۔ "نادر آ گیا ہے سر۔"

نادر نے گاڑی سے اتر کر مین گیٹ بند کیا اور تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا ہم تک پہنچ گیا۔ گاڑی سے اترنے کے بعد اس نے عقبی سیٹ پر رکھی ہوئی کھانے کی باسکٹ نکال کر اعجاز کو دی، پھر ٹی وی سیٹ بھی اٹھا لیا۔

اس نے کمرے میں داخل ہو کر ٹی وی سیٹ ایک طرف رکھا تو میں نے پوچھا۔ "کیا رہا؟"

"میں نے ان دونوں کو چیف جسٹس صاحب کے بنگلے کے نزدیک چھوڑ دیا تھا اور دور رہ کر انہیں دیکھتا رہا۔ جب تک وہ لوگ جسٹس صاحب کے بنگلے میں داخل نہیں ہو گئے، میں وہیں کھڑا رہا۔ پھر وہاں سے میں سیدھا گھر چلا گیا اور وہاں سے تم لوگوں کے لیے ناشتا لے کر آیا ہوں۔"

"تم نے ٹی وی سیٹ لا کر بہت اچھا کیا۔" اعجاز نے کہا۔ "اگر چیف جسٹس صاحب نے کوئی ایکشن لیا تو وہ میڈیا پر بریکنگ نیوز ہوگی۔"

"اسی خیال سے میں ٹی وی اٹھا لایا ہوں۔" نادر نے کہا اور ناشتا ٹرے میں رکھ کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اس وقت کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن نادر کے خیال سے میں خود پر جبر کر کے کھانے لگا۔ اعجاز کا بھی یہی حال تھا۔ اس نے جلدی جلدی دو چار لقمے لیے اور چائے کا کپ لے کر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک نادر نے ٹی وی لگا دیا تھا۔

"یہاں کیبل کا بندوبست تو ہے نہیں۔" نادر نے کہا۔ "ہاں پی ٹی وی اور دوسرا ایک چینل ہم صاف دیکھ سکتے ہیں۔"

اسی وقت پی ٹی وی پر نیوز بلیٹن شروع ہو گیا لیکن اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہی معمول کی خبریں۔ وہی بم دھماکے اور ٹارگٹ کلنگ۔ اعجاز نے مایوس ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "اتنے بے صبرے کیوں ہو رہے ہو؟ ابھی تو چیف جسٹس صاحب ان لوگوں سے بات کر رہے ہوں گے یا ممکن ہے اب تک ان لوگوں کی چیف جسٹس صاحب سے ملاقات ہی نہ ہوئی ہو۔"

نیوز بلیٹن کے بعد وہی پروگرام دوبارہ شروع ہو گیا جس کا سلسلہ نیوز اپ ڈیٹ کی وجہ سے رک گیا تھا۔

میں نے چائے کا ایک اور کپ نکال لیا اور چائے پینے لگا۔ موسم اب خاصا خنک ہو گیا تھا۔ میں ٹہلتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں نے اب تک اس فیکٹری کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ وہ خاصے بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی فیکٹری تھی۔ اس عمارت کے سوا ابھی تک وہاں کچھ بھی تعمیر نہیں ہوا تھا۔ فیکٹری کے چاروں طرف اتنی جگہ خالی تھی کہ کسی میدان کا گمان ہوتا تھا۔ وہاں بہ یک وقت بہت سے ٹرک اور بسیں کھڑی ہو سکتی تھیں۔

میں دوبارہ اندر آ گیا۔ اعجاز بھی شدید اضطراب میں مبتلا تھا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے نادر سے ماضی کی باتیں شروع کر دیں۔

"تم حیدر آباد سے کراچی کیوں شفٹ ہو گئے؟" میں نے پوچھا۔

"وہاں میرے بہت سے جاننے والے تھے۔ وہ اکثر

میری ورک شاپ پر آجاتے تھے اور مجھے لعن طعن کرتے تھے کہ میں نے یہ کیا دھندا شروع کر دیا ہے۔ وہ لوگ باتوں باتوں میں مجھے ترغیب دیتے تھے کہ میں دوبارہ وہی زندگی اپنالوں۔ میں نے تنگ آکر حیدرآباد چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر میں نے کراچی میں ورک شاپ اور مکان دیکھا اور یہاں شفٹ ہو گیا۔" وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "یہ سب تمہاری مہربانی ہے حسن! تم نے مجھے اس تاریک راہ سے نکالا ہے ورنہ آج میں بھی کسی پولیس مقابلے یا گینگ وار میں مارا گیا ہوتا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "انسان وقت پورا ہونے ہی پر مرتا ہے اور تم..."

اسی وقت اچانک ٹی وی پر بریکنگ نیوز کے الفاظ نمودار ہوئے۔ میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ نیوز کاسٹر بتا رہی تھی۔

"منور اغوا کیس نے ایک ڈرامائی موڑ لے لیا ہے۔ رات اس کیس کی بنیادی کردار نورین کے بھائی نے پولیس کو رپورٹ درج کرائی تھی کہ کچھ نامعلوم لوگ اس کی بہن اور والد کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ اس کی تصدیق وہاں ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبل محمد خان نے بھی کی تھی۔ آج علی الصباح نورین اور احسان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ نورین نے بیان دیا ہے کہ اسے اور اس کے والد کو منور کے آدمیوں نے اغوا کیا تھا۔ اس نے ایک اور بیان دیا ہے کہ اسے پہلے بھی منور اغوا کر چکا ہے۔ اس واقعے کی ایف آئی آر درخشاں پولیس اسٹیشن میں درج کرائی گئی تھی۔ تفتیشی افسر سب انسپکٹر حسن نے اس ایف آئی آر کی بنیاد پر مسٹر منور کو گرفتار کر لیا تھا۔ بعد میں نورین اپنے بیان سے منحرف ہو گئی تو ایس آئی حسن، حوالدار اعجاز اور ایس ایس پی علی احمد سمیت پولیس کے کئی افسران کو معطل کر دیا گیا۔ بعد میں پولیس نے ایس ایس پی علی احمد کو گرفتار کر لیا تھا لیکن سب انسپکٹر حسن اور حوالدار اعجاز پولیس کے ہاتھ نہیں آئے تھے۔ ہم اپنے نمائندے سے اس واقعے کی تفصیلات معلوم کرتے ہیں۔ جی فاروق! آپ بتائیے کہ اس وقت ہائی کورٹ میں کیا ہو رہا ہے؟"

پھر چینل کا نمائندہ اسکرین پر نمودار ہوا اور بولا۔ "شازیہ! میں اس وقت ہائی کورٹ میں موجود ہوں۔ نورین اور اس کے والد احسان پہلے چیف جسٹس صاحب کے گھر پہنچے تھے۔ جسٹس صاحب نے ان کے بیانات سنے اور انہیں اپنے ساتھ کورٹ لے آئے ہیں۔"

"کیا آپ کی نورین یا احسان صاحب سے کوئی بات ہوئی ہے؟" نیوز کاسٹر نے پوچھا۔

"شازیہ! ابھی تک میڈیا کے کسی آدمی کو نورین یا اس کے والد تک نہیں پہنچنے دیا گیا ہے۔ البتہ وہاں ڈیوٹی پر موجود پولیس کے ایک سینئر افسر سے میڈیا کی بات ہوئی ہے۔ وہ اس وقت بھی یہاں موجود ہیں۔ میں ان سے بات کرتا ہوں۔"

کیمرے نے پولیس کے ایک ڈی ایس پی کو فوکس کیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ باجوہ تھا۔ ڈی ایس پی رشید باجوہ۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ پولیس کا انتہائی کرپٹ افسر تھا۔

"سر! آپ اس واقعے پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟" رپورٹر نے اس سے پوچھا۔

"سچ پوچھیے تو اس کیس کی تفصیلات کا مجھے بھی علم نہیں ہے۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ منور کیس میں انوالو نورین کو اس کے گھر سے اغوا کیا گیا تھا۔ احسان صاحب کے بیٹے نے رات گئے پولیس اسٹیشن آکر رپورٹ درج کرائی تھی کہ اس کے باپ اور بہن کو کچھ نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا ہے۔"

"لیکن اب سننے میں آرہا ہے کہ نورین کے اغوا میں منور اور معین صاحب کا ہاتھ ہے؟"

"میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔" ڈی ایس پی نے محتاط انداز میں کہا۔ "ابھی تک نورین یا احسان سے میری بات نہیں ہو سکی ہے۔"

"بہت شکریہ۔" رپورٹر نے کہا۔

پھر نیوز کاسٹر اسکرین پر آگئی اور بتانے لگی کہ ابھی تک ہمیں اس بارے میں مزید تفصیلات کا علم نہیں ہے۔ ہم آپ کو مزید تفصیلات مہیا کرتے رہیں گے۔

اعجاز نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اس نے کہا۔ "اگر ہماری نوکری بحال نہ بھی ہوئی تو مجھے اب اتنا افسوس نہیں ہوگا۔ عدالت معین اور منور کے خلاف یقیناً ایکشن لے گی۔"

پھر وقفے وقفے سے مختلف خبریں آتی رہیں۔ اصل خبر ہم نے شام کو سنی۔ چیف جسٹس نے معین کا نام ای سی ایل یعنی ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں ڈال دیا تھا اور منور کو گرفتار کرنے کے احکامات جاری کر دیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایس ایس پی علی احمد صاحب کو رہا کر... ملازمت پر بحال کر دیا تھا اور ہم دونوں کو بھی ملازمت پر بحال کر دیا گیا تھا۔

اعجاز کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میری آنکھیں بھی نم تھیں۔ پھر روتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا اور آنسو بہنے لگے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ مجھے اس دن یقین ہو گیا کہ انسان اگر حق پر ہو تو اللہ بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ نادر بھی آبدیدہ ہو رہا تھا۔ وہ بھی باری باری ہم دونوں سے بغل گیر ہوا اور ہمیں گاڑی میں بٹھا کر گھر لے آیا۔

میں اور اعجاز جلد از جلد وہاں سے رخصت ہونا چاہتے تھے۔ لیکن نادر کی ضد تھی کہ میں کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔

اس کی بیوی نے اس دن کھانے پر خصوصی اہتمام کیا تھا۔ اس دن میں نے نادر کی بیوی کو دیکھا۔ وہ سیدھی سادی خوش شکل عورت تھی۔

وہ پہلی دفعہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "حسن بھائی! جب آپ یہاں آئے تھے تو انہوں نے مجھے آپ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا ورنہ میں آپ کی خدمت کرتی۔"

"ایسی بات نہیں ہے بھابی!" میں نے کہا۔ "نادر میرا دوست ہے۔ اس نے اس وقت دوستی خوب نبھائی ہے۔"

"گڈو بھی آپ کی طرح ذہین ہے حسن بھائی!" نادر کی بیوی نے کہا۔ "اس نے پہلے ہی دن مجھے بتایا تھا کہ ابو کے جو دوست آئے ہیں، وہ شاید پولیس میں ہیں۔ انہوں نے خاکی پینٹ اور پولیس والوں کی طرح لانگ شوز پہن رکھے تھے۔"

"گڈو واقعی ذہین ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ اس وقت بھی ٹی وی آن تھا۔ اچانک پھر بریکنگ نیوز شروع ہو گئی۔ نیوز کاسٹر بتا رہی تھی کہ معطل ہونے والے ایس ایس پی علی احمد صاحب نے دوبارہ اپنے عہدے کا چارج لے لیا ہے۔ وہ اس وقت میڈیا سے گفتگو کر رہے ہیں۔

پھر اسکرین پر ایس ایس پی صاحب کا چہرہ نمودار ہوا۔ انہوں نے پریس کو بتایا کہ مجھے اپنی سچائی کا یقین تھا۔

"سر! آپ سب انسپکٹر حسن اور حوالدار اعجاز کے بارے میں کچھ کہیں گے؟" ایک رپورٹر نے پوچھا۔

"سب انسپکٹر حسن اور اعجاز میرے محکمے کے دو انتہائی باصول اور دیانت دار افسران ہیں۔ انہیں بھی ان کی ملازمت پر بحال کر دیا گیا ہے۔ پولیس منور کی گرفتاری کے لیے چھاپے مار رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہم جلد ہی اسے گرفتار کر لیں گے۔"

اسی وقت خبر آئی کہ پولیس نے منور کو اس کے ایک دوست کے فلیٹ سے گرفتار کر لیا ہے۔

اب ہم لوگ چلتے ہیں۔ ایس ایس پی صاحب کو اس وقت ہماری ضرورت ہے۔" میں نے نادر سے کہا۔ "ہم سے ملاقات ہوتی رہے گی۔" پھر میں نے گڈو کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے ہاتھ پر پانچ ہزار روپے رکھ دیے۔ نادر نے کچھ بولنا چاہا لیکن میں نے اسے ٹوک دیا۔ "تم کچھ مت بولنا۔ یہ میرا اور گڈو کا معاملہ ہے۔" پھر میں گڈو سے مخاطب ہوا۔ "بیٹا! تم ان پیسوں سے اپنے لیے کوئی اچھا سا موبائل فون خرید لینا۔"

اسی وقت میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی تو ایس ایس پی صاحب کا نام دیکھ کر چونک اٹھا۔

"یس سر!" میں نے جلدی سے کال ریسیو کی۔

"تم دونوں کہاں ہو؟ فوراً اپنی ڈیوٹی پر پہنچو۔"

"او کے سر!" میں نے کہا۔ "ہم بس نکل ہی رہے ہیں۔"

☆☆☆

ایک ہفتے بعد عدالت نے معین کی گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری کر دیے۔ اسے گرفتار کرنے بھی میں اور اعجاز ہی گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے معین کے ساتھیوں پر بھی ہاتھ ڈال دیا اور کئی بارسوخ افراد کو سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔

☆☆☆

اس کیس کو بھی ایک سال ہو چلا ہے۔ اس ایک سال کے دوران بہت خوش گوار تبدیلیاں آئی ہیں۔ ایس ایس پی صاحب کو ڈی آئی جی کرائمز بنا دیا گیا ہے اور مجھے انسپکٹر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی ہے۔ اعجاز اب اے ایس آئی ہے۔ ہم دونوں کو بھی کرائم برانچ میں بھیج دیا گیا ہے۔

اس ایک سال کے دوران میری شادی ہو چکی ہے۔ اب نورین میری بیوی ہے۔ اعجاز جب بھی احسان صاحب سے ملتا ہے، معافیاں مانگتا ہے کہ اس نے ان کے ساتھ بہت بدسلوکی کی تھی۔ احسان صاحب ہنس کر رہ جاتے ہیں۔

میں نے سچائی کا جو سفر ملازمت کے پہلے دن سے شروع کیا تھا وہ آج بھی جاری ہے اور انشاء اللہ مرتے دم تک جاری رہے گا۔

شہر کے بڑے بڑے نامی گرامی بدمعاش میرے نام سے کانپتے ہیں لیکن میری بیوی اکثر مجھ پر رعب جماتی ہے کہ اگر میں بیان نہ دیتی تو تم آج یا تو ملک سے فرار ہو چکے ہوتے یا پھر مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے۔

میں اس کی بات پر ہنس کر رہ جاتا ہوں۔ وہ اگر بیان نہ بھی دیتی تو میں منور کو اسی طرح سلاخوں کے پیچھے پہنچا کر ہی دم لیتا۔

★

استقامت

کاشف زبیر

زندگی کے ہر محاذ پر ہر شخص اپنی بساط کے مطابق جنگ کرتا ہے... کسی کا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو کے پیوندِ خاک ہو جاتا ہے... تو کسی کے سینے پر فتح و کامرانی کا تمغہ سجتا ہے... اسے بھی اچانک ہی ایک جنگ سے دوچار ہونا پڑا... یہ جنگ اعتبار... یقین اور مسلسل دعاؤں کے گریہ کناں لمحات کے زیرِ اثر تھی... اس پر اپنی اور اپنے خاندان کی بقا کی ایسی ذمے داری آن پڑی تھی کہ جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ آخری سانس تک مستقل مزاجی سے اپنی جگہ مستحکم تھا...

جمشید رضی اپنے بنگلے کے گیٹ کے سامنے رکا اور اس نے کار میں لگا ریموٹ کا بٹن دبایا۔ ساتھ ہی وہ کسی سے موبائل پر بات کر رہا تھا۔ ''دیکھیے رحمان صاحب... آپ نے مجھ سے ڈیل کی تھی... سودا ہوا تھا، قیمت طے ہوئی تھی اور اب آپ انکار کر رہے ہیں... قیمت میں کمی کا اور کیا مطلب ہے... میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ بہتر تیسری پارٹی کے ہیں... وہ قیمت پر دوبارہ بات نہیں کرے گی... اس صورت میں آپ کو بیعانہ بھی واپس نہیں ملے گا۔'' گیٹ کھلا اور وہ گاڑی اندر لے گیا۔ یہ تقریباً چار کنال پر بنا ہوا جدید طرز کا خوب صورت بنگلا تھا۔ اس کے چاروں طرف تقریباً بارہ فٹ اونچی دیوار تھی۔ اس پر ہر بیس فٹ بعد جدید قسم کی سرچ لائٹ لگی تھی جو اندر اور باہر یکساں روشنی کر رہی تھی۔

جمشید نے کار لے جا کر پورچ میں روکی اور موبائل بند کر کے نیچے اتر آیا۔ اس نے ایک سلور رنگ کا بریف کیس اٹھانا چاہا مگر یہ ہتھکڑی کی مدد سے کار کلپ سے منسلک تھا۔ اس نے چابی سے ہتھکڑی کھولی اور بریف کیس لے کر نیچے اتر آیا۔ پھر اس نے دوسرا نمبر ملایا۔ ''اعجاز صاحب! میں جمشید بات کر رہا ہوں... جی رحمان صاحب کا فون آیا تھا... وہ قیمت سے مطمئن نہیں ہیں... میں نے ان کو بتا دیا ہے... قیمت کم نہیں ہوگی اور اگر سودا منسوخ ہوا تو بیعانہ واپس نہیں ملے گا... وہ کل تک جواب دیں گے... جی بہتر میرے پاس محفوظ ہیں... میں انہیں گھر لے آیا ہوں۔'' جمشید بات کرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف جانے لگا۔ وہ تقریباً پینتالیس برس کا کھرے نقوش والا آدمی تھا۔ سر کے بال کناروں سے خاصے سفید ہو چکے تھے اور اس نے انہیں کلر نہیں کیا تھا مگر یہ اس کی شخصیت کو سوبر بنا رہے تھے۔ اس نے بڑے فریم کی عینک لگا رکھی تھی جو اس کے بڑے چہرے اور ستواں ناک پر جچ رہی تھی۔ نفیس قسم کے تھری پیس سوٹ میں وہ ہائی کلاس بزنس مین لگ رہا تھا۔

بنگلا پورچ کی سطح سے کوئی چار فٹ اونچا تھا اور پورا سفید رنگ کا بنا ہوا تھا۔ اس کی تعمیر میں شیشے کا استعمال بہت زیادہ تھا جسے تحفظ دینے کے لیے جدید انداز کی نہایت [illegible] کی فولادی گرل تھی۔ بنگلا دو منزلہ تھا۔ اس کے چاروں طرف موٹی اور باہر کی طرف نکلی گرل تھی۔ لان پر نہایت سبز گھاس تھی اور نہایت قرینے سے پودوں کے تختے تھے یا آرائشی درخت لگے تھے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہا تھا کہ اس کی نظر سیڑھیوں کے ساتھ والی گھاس پر کسی سنہری چیز پر گئی۔ وہ جھکا اور پلٹ کر واپس آیا۔ گھاس پر چند ادھ جلے سگریٹ کے ٹکڑوں کے ساتھ اس کا سنہری لائٹر پڑا تھا۔ سونے کی پالش والے لائٹر پر جے آر کے حروف ابھرے ہوئے تھے۔ اس نے لائٹر جیب میں ڈالا اور دروازے تک آیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یقیناً ریحانہ نے اسے آتے دیکھ کر دروازہ کھول دیا تھا، وہ اندر داخل ہوا۔ یہ بڑا لاؤنج تھا جس کا فرش یوں چمک رہا تھا جیسے ابھی پالش کیا ہو مگر اس میں فرنیچر نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک طرف شیشے والا دروازہ تھا اور دوسری طرف بڑا سا جدید طرز کا کچن۔ ریحانہ کچن میں مصروف تھی۔ وہ رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ جمشید نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور تیسری کال کرنے میں لگ گیا۔ ریحانہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر اسے فون پر مصروف دیکھ کر رک گئی۔ جمشید شیشے کے دروازے تک آیا۔ اس نے دروازے کے ساتھ لگے ڈیجیٹل پیڈ پر چند نمبر ملائے تو شیشے کا دروازہ کھل گیا۔ یہ بہت موٹا شیشہ تھا جس پر بنے ڈیزائن کی وجہ سے اندر کا منظر صاف نظر نہیں آتا تھا۔ پورے کمرے میں سرخ قالین بچھا تھا۔ ایک طرف صرف ایک میز اور اس پر فون کے ساتھ چند دوسری چیزیں تھیں۔ میز کے ساتھ ہی عقبی دیوار پر ایک بڑے سائز کی پینٹنگ لگی تھی جس میں چند گھوڑے ایک وسیع سرسبز لینڈ اسکیپ میں دوڑ رہے تھے۔ جمشید نے بریف کیس میز پر رکھ دیا۔ اس تیسری کال سے فارغ ہو کر اس نے بریف کیس کھولا۔ یہ اندر سے سیاہ دھات کا بنا ہوا تھا۔ یہ چار انچ چوڑا، چھ انچ لمبا اور دو انچ موٹا بکس تھا۔ وہ اسے پُرخیال نظروں سے دیکھنے لگا۔
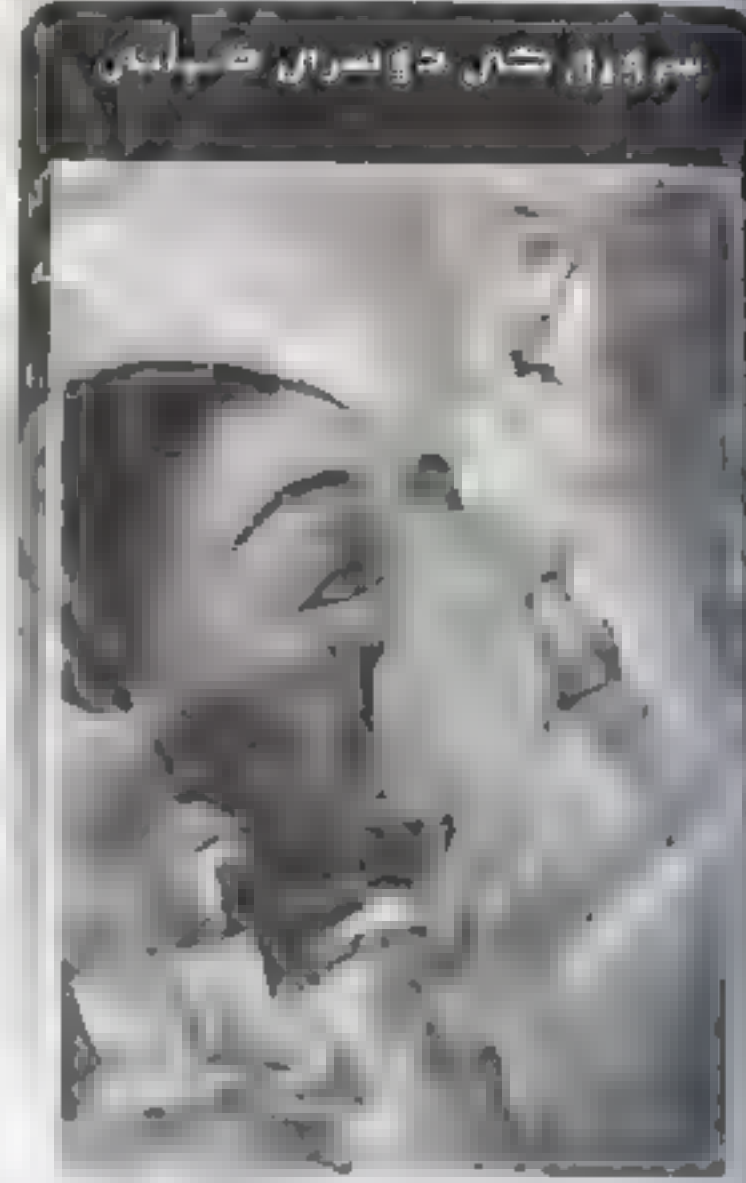
☆☆☆

اس سڑک پر دونوں طرف درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ ایک کچے راستے پر سڑک سے کچھ دور ایک پرانی خستہ حال پیلے اور سفید رنگ کی وین کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ تین افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے جو سب سے بڑا تھا، اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ اس نے براؤن پتلون پر سفید رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی جس پر دھاریاں تھیں۔ اس کی ہلکی لیکن نیچے کی طرف لٹکتی مونچھیں اسے سخت مزاج ظاہر کر رہی تھیں۔ اس کی چھوٹی آنکھوں اور ابھری بھوؤں سے بھی اس تاثر کو تقویت مل رہی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ ''ایک بار پھر غور سے سن لو۔ ہمیں دو درجن پیلے رنگ کے ایک جیسے ہیرے حاصل کرنے ہیں۔ ان میں سے کوئی ہیرا تیس قیراط سے کم نہیں تھا۔ ان دو درجن ہیروں کی مالیت پچاس کروڑ روپے تھی۔''

''پچاس کروڑ...'' ان میں سے ایک نوجوان نے سیٹی بجا کر کہا۔ ''یہ ہیرے کہاں ہیں؟''

''ہم وہیں جا رہے ہیں۔ دبئی کے ایک شیخ مجیب الحامد نے ان کا آرڈر کیا تھا۔ ہیرے اعجاز نامی جوہری کی ملکیت ہیں۔ اس نے ان کی کٹنگ اور پالش انڈیا میں کرائی ہے اور ان کو ایک جیسا سائز اور ڈیزائن دیا ہے۔''

''کیا ہم اعجاز کے پاس جا رہے ہیں؟'' دوسرے آدمی نے کہا، وہ بتیس تینتیس برس کا تھا اور خاصا تنومند بھی تھا۔

''نہیں، رحمان نامی شخص پاکستان میں شیخ الحامد کا ایجنٹ ہے۔ سودا اس کے توسط سے ہو رہا ہے لیکن قیمت میں کچھ مسئلہ ہوا ہے اور اب ہیرے جمشید نامی اس جوہری کے پاس ہیں جو اس سودے میں کمیشن ایجنٹ کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اعجاز اور رحمان کا رابطہ جمشید نے کرایا ہے۔''

نوجوان نے پُرخیال نظروں سے تنومند شخص کو دیکھا اور بولا۔ ''اب سمجھے، ہم جمشید جوہری کے بنگلے پر جا رہے ہیں۔''

''تو چلو۔'' تنومند شخص نے بے تابی سے کہا۔ پچاس کروڑ روپے کے ہیروں کا سن کر وہ بے تاب ہو گیا تھا۔

"آرام سے میرے دوست۔" مونچھوں والے نے کہا۔ "یہ کام آسان نہیں ہے۔ جمشید کا بنگلا بہت محفوظ ہے۔ وہاں جگہ جگہ الارم ہیں اور الارم وہاں نہیں بجتے بلکہ اس سوسائٹی کے کنٹرول سینٹر میں بجتے ہیں...." مونچھوں والا تفصیل سے بتانے لگا کہ انہیں کیا کرنا تھا اور کیا نہیں کرنا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس میں وہ چیزیں بھی نہایت اہم تھیں جو انہیں نہیں کرنی تھیں۔ ہر قدم پھونک کر اٹھانا تھا۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک انہیں سمجھاتا رہا پھر اس نے وین کا عقبی دروازہ کھولا۔ "چلو تیاری پکڑو۔"

وین کے عقبی حصے میں تین عدد گارڈز جیکٹس تھیں۔ اس کے علاوہ پی کیپس تھیں اور سب سے اہم چیز اسلحہ تھا جس میں دو عدد پستول اور ایک شاٹ گن تھی۔ مونچھوں والے نے پستول چیک کیا جبکہ تنومند شخص نے شاٹ گن اٹھالی۔ نوجوان نے پستول لیا تھا۔ مونچھوں والے نے کہا۔ "اپنے ساتھ کوئی شناختی چیز نہیں رکھنی ہے۔ اگر ہے تو یہیں چھوڑ جاؤ۔"

لیکن ان میں سے کسی کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔ ان کے پاس صرف رسٹ واچز تھیں۔ آخر میں مونچھوں والے نے وین سے تین عدد نیلے رنگ کے چھوٹے تکیے کے غلاف نکالے۔ ان کے اوپری حصے میں آنکھوں والی جگہ سوراخ کیے گئے تھے۔ مونچھوں والے نے ایک ایک غلاف ان تینوں کو دے دیا۔ "یاد رکھنا، نام نہیں لینا ہے۔ میں اوّل ہوں، تم دوم ہو۔" اس نے تنومند شخص کی طرف دیکھا اور پھر نوجوان کی طرف دیکھا۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔

"ظاہر ہے میں سوم ہوں۔"

وہ سب ہنس دیے پھر انہوں نے وین بند کی اور پیدل سڑک کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

جمشید کسی قدر فکر مند نظر آرہا تھا۔ رحمان نے پہلے اس سے قیمت طے کی اور دس لاکھ روپے بیعانہ دیا لیکن اب وہ قیمت کا ازسرنو تعین کرنا چاہتا تھا۔ جمشید کے اصرار پر وہ اس سے ایک ملاقات کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ جمشید اٹھ کر پیچھے دیوار تک آیا۔ اس نے میز کی دراز سے ایک چھوٹا سا ریموٹ نکالا۔ اس پر دو بٹن لگے تھے، ایک سرخ اور ایک سفید۔ اس نے سفید بٹن دبایا تو تصویر دائیں طرف سرک کر ایک طرف ہو گئی اور اس کے پیچھے چھپا سیف سامنے آگیا۔ یہ بھی نمبروں سے کھلنے والا سیف تھا۔ جمشید نے اسی ریموٹ کا سرخ بٹن دبایا تو سیف کی ننھی اسکرین آن ہو گئی۔ اس پر نمبر آگئے۔ اس نے نمبر ملایا اور سیف کھل گیا۔ اندر تقریباً دو مکعب فٹ کا سیف تھا۔ اس میں نوٹوں کی گڈیاں اور بہت کچھ رکھا تھا لیکن سیاہ بکس کے ہیرے سیف کی تمام چیزوں سے کہیں زیادہ مالیت رکھتے تھے۔ بکس اندر رکھ کر اس نے سیف بند کیا تو اس کا ڈیجیٹل ڈسپلے خود بہ خود آف ہو گیا اور ریموٹ کا.... سفید بٹن دبانے پر تصویر اپنی جگہ آگئی۔ یہ سارا جدید ترین نظام تھا۔ وہ میز کی طرف آیا تھا کہ دروازے پر کسی کا ہیولہ نظر آیا اور پھر ریحانہ کی آواز آئی۔

"جمشید! اگر تم فارغ ہو گئے ہو تو باہر آؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

"بس ایک منٹ آیا۔" جمشید نے کہا اور بریف کیس بند کر کے باہر آیا۔ ریحانہ دوبارہ کچن کی طرف چلی گئی۔ اس نے سبزیاں سمیٹ کر ایک ٹرے میں رکھیں اور اسے فریج میں رکھ دیا۔ کچن جگمگا رہا تھا کیونکہ اس کی ساری دیکھ بھال اور کھانا بنانے کا کام ریحانہ کرتی تھی۔ ریحانہ اسے دیکھ کر بولی۔

"میں تم سے شازی اور جنید کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں بھی تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" جمشید نے کہا۔ "لیکن پہلے تم بتاؤ؟"

"اب میں اکیلے ان دونوں بچوں پر کنٹرول نہیں کر سکتی۔"

"تب کیا میں تمہاری مدد کے لیے دوسری شادی کروں۔" جمشید کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "بچوں کو دیکھنا کس کی ذمے داری ہے؟"

ریحانہ نے پاؤں پٹخے۔ "تم میری مشکل کیوں نہیں سمجھ رہے ہو؟ میں یہ گھر دیکھوں یا بچوں کو۔"

"تم دونوں کام کر سکتی ہو۔ گھر میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں ہر کام کے لیے بہترین سہولتیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن کام تو مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔ اب میں یہ دونوں رول نہیں نبھا سکتی۔ مجھے اس گھر کے لیے کم سے کم تین ملازم...."

"میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ اس گھر میں کوئی ملازم نہیں آئے گا۔ جز وقتی ملازم آتے ہیں۔"

"جن کے سر پر مجھے مستقل سوار رہنا پڑتا ہے۔" ریحانہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"صرف ایک صفائی کرنے والی کی نگرانی کرنی پڑتی ہے کیونکہ وہ گھر کے اندر آتی ہے۔" جمشید نے تصحیح کی۔ "گارڈننگ اور لانڈری کا سارا کام باہر ہوتا ہے۔"

"صبح سے شام تک میں کچن اور ان کاموں میں لگی رہتی ہوں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر ان سب کاموں کے ساتھ میں بچوں کی نگرانی نہیں کر سکتی۔ جنید انیس سال کا ہو گیا ہے۔ اس کی اپنی بیرونی سرگرمیاں ہیں اور آج شازی بھی مجھ سے کسی فرینڈ کے ساتھ پارٹی میں جانے کی اجازت مانگ رہی تھی۔"

"جی پاپا۔" شازیہ عرف شازی کی آواز آئی، وہ سیڑھیوں کے پاس کھڑی تھی۔ "اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔ اپنی مرضی سے باہر جا سکتی ہوں۔"

"ابھی تم اتنی بڑی نہیں ہوئی ہو۔" جمشید نے بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ "میں اچھی طرح جانتا ہوں ان پارٹیوں میں کیا ہوتا ہے۔ ویسے تم کس فرینڈ کے ساتھ جا رہی ہو؟"

"روبی کے ساتھ۔" شازیہ کے بجائے ریحانہ نے کہا۔

جمشید جاتے جاتے رک گیا اور پھر اس نے شازیہ کی طرف دیکھا۔ "تم کہیں نہیں جاؤ گی.... سنا تم نے؟"

شازیہ سترہ سال کی خوب صورت اور دلکش لڑکی تھی۔ باپ کے سخت لہجے اور انکار پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ پلٹی اور تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ مگر جمشید اس کی طرف توجہ دیے بغیر اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔

☆☆☆

دارالحکومت کی حدود میں یہ پوش سوسائٹی تھی۔ اسے خاص طور سے ان دولت مند لوگوں کے لیے بنایا گیا تھا جن کو سیکیورٹی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ پوری سوسائٹی باؤنڈری وال میں تھی اور یہ عام قسم کی باؤنڈری وال نہیں تھی بلکہ اس پر خاردار تاروں سمیت روشنی اور نگرانی کا بندوبست بھی تھا۔ کوئی شخص آسانی سے سوسائٹی کی حدود میں نہیں گھس سکتا تھا۔ سوسائٹی کا اپنا ایک حفاظتی نظام تھا جس میں کیمرے، گھروں میں لگے ہوئے سیکیورٹی سسٹم سے رابطہ، مستعد گارڈز جو باکس اور گاڑیوں میں گشت پر رہتے تھے اور سینٹرل سیکیورٹی سسٹم تھا۔

جمشید نے دس سال پہلے یہاں بنگلہ بنایا تھا۔ اس کا باپ جیولر تھا اور اس کی پرانے شہر میں ایک چھوٹی سی دکان تھی مگر یہ چھوٹی سی دکان بھی خوب چلتی تھی کیونکہ مجید جیولرز کی ساکھ تھی۔ اس کا سونا ہمیشہ کھرا اور پتھر ہمیشہ اوّل نمبر کا ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس چھوٹی سی دکان کے سامنے بڑی کاروں والے آتے تھے۔ جمشید نے ابتدائی تربیت اپنے باپ سے حاصل کی تھی۔ پھر وہ پتھروں کے بارے میں مزید تعلیم حاصل کرنے یورپ چلا گیا۔ تین سال بعد وہ واپس آیا اور اس نے باپ سے قرض لے کر اپنی الگ جیولری شاپ کھول لی۔ اس نے شہر کے پوش علاقے کا انتخاب کیا تھا۔ وہ پتھروں کا کام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے باپ سے جو سب سے اہم بات سیکھی تھی، وہ دیانت داری تھی۔ اس کے باپ کا کہنا تھا۔ "بیٹا میں چاہتا تو اس سے زیادہ دولت کما سکتا تھا مگر پھر مجید جیولر کی ساکھ وہی ہوتی جو عام جیولرز کی ہوتی ہے۔ میں نے دولت کم کمائی ہے لیکن ساکھ بہت کمائی ہے۔"

جمشید نے اس سے وعدہ کیا۔ "بابا! میں جو کام کروں گا، اس میں ہمیشہ دیانت کو سامنے رکھوں گا۔"

مجید خوش ہو گیا۔ "دنیا اور آخرت میں کامیابی کا راستہ یہی ہے۔"

جمشید کے پاس باپ کا حوالہ تھا پھر مجید بہت سا کام اسے بھیج دیتا تھا اس لیے اسے ترقی کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ پانچ سال بعد وہ نہ صرف باپ کا قرض اتار چکا تھا بلکہ اپنی ذاتی ساکھ بھی بنا چکا تھا۔ ریحانہ سے اس کی شادی ارینج تھی اور اس نے ریحانہ کو پہلی بار شادی کی رات دیکھا تھا۔ شادی سے پہلے اور اس کے بعد بھی اسے عورتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی ساری دلچسپی اپنے بزنس سے تھی۔ کم سے کم ریحانہ یہی سمجھتی تھی۔ جمشید نے اسے سب دیا تھا، اس کا پورا خیال رکھا تھا، اس کی ہر خواہش پوری کی تھی مگر ساتھ ہی وہ زندگی کو اپنے اصولوں کے تحت گزارتا آیا تھا۔ ریحانہ شادی کے دو سال سسرال میں رہی۔ مجید کا پرانے شہر میں حویلی نما مکان تھا۔ پھر جمشید نے دارالحکومت میں ایک لگژری فلیٹ لے لیا اور تب اس کے کچھ انوکھے اصول ریحانہ کے علم میں آئے۔ اس وقت بھی جمشید کروڑ پتی تھا مگر اس نے گھر میں کوئی ملازم رکھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے ریحانہ سے کہا۔ "میں ملازم رکھنے کے خلاف ہوں کیونکہ وہ گھر کے بھیدی ہوتے ہیں اور عام طور سے وہی چوریاں، ڈکیتیاں کراتے ہیں۔"

"سب ملازم تو ایسے نہیں ہوتے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر ہم کسی کے بارے میں کیسے جان سکتے ہیں کہ وہ کیسا ہے۔ ہمیں اس کو پرکھنے اور جاننے میں بہت طویل عرصہ لگے گا اور وہ ہمارے بارے میں بہت جلد سب جان جائے گا۔"

ریحانہ بہت جھنجلائی مگر جمشید نے اس معاملے میں اس کی ایک نہیں سنی اور مستقل ملازم رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ جز وقتی ملازم بھی ... رکھنے کی جرأت ملی تھی کہ ریحانہ مستقل ان کے ساتھ رہے گی اور کسی موقع پر انہیں اکیلا

نہیں چھوڑے گی۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔ اگر خود مستقل سر پر رہنا تھا تو ملازم رکھنے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ جمشید نے فلیٹ میں ایک چھوٹا لیکن جدید ترین سیف رکھا تھا۔ وہ اپنے قیمتی اور اہم جواہرات گھر میں رکھتا تھا کیونکہ دکان پر ڈاکے کا خطرہ رہتا تھا اور اسے اپنی قیمتی اشیا گھر میں رکھنا پڑتی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ گھریلو ملازموں کو رکھنے کے سخت خلاف تھا۔ فلیٹ کی سیکیورٹی بہت اچھی تھی۔ کوئی غیر متعلقہ شخص بلا اجازت اندر نہیں آسکتا تھا۔

اس کے باوجود جمشید مطمئن نہیں تھا۔ اس نے ریحانہ کے لیے اسلحے کا لائسنس حاصل کیا اور پھر اسے مجبور کر کے ایک شوٹنگ کلب بھیجا جہاں اس نے پستول چلانے کی تربیت حاصل کی۔ جمشید کے خیال میں یہ سب اس لیے ضروری تھا کہ ریحانہ فلیٹ میں اکیلی ہوتی تھی اور اگر کوئی ڈاکو اندر تک آنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ اپنا دفاع کر سکتی تھی۔ جمشید تو چاہتا تھا کہ وہ خالی ہاتھ سے سیلف ڈیفنس کی تربیت بھی حاصل کرے مگر ان دنوں وہ امید سے ہو گئی اور یوں اس کی جان چھوٹی۔ وہ شادی کے تین سال بعد امید سے ہوئی تھی۔

جمشید کا بزنس اچھا چل رہا تھا اور اب اس کے پاس بیرون ملک سے بھی کام آتا تھا۔ پندرہ سال پہلے جب اس سوسائٹی کا آغاز ہوا تھا تب ہی اس نے یہاں پلاٹ حاصل کر لیا تھا۔ اسے سوسائٹی کا نظریہ اچھا لگا تھا۔ اس لیے جیسے ہی وہاں ترقیاتی کام مکمل ہوئے اور کچھ آبادی بھی ہو گئی تو جمشید نے بھی وہاں بنگلا بنوا لیا۔ اس نے روایتی مقامی ڈیزائن کے بجائے ایک جدید مغربی ڈیزائن پسند کیا تھا اور اسی کے مطابق اپنا بنگلا تعمیر کرایا تھا۔ سوسائٹی کی اپنی سیکیورٹی بہترین تھی اور ساتھ ہی جمشید نے بنگلے میں الیکٹرونک سیکیورٹی کا جدید ترین نظام لگوایا تھا جو فول پروف تھا۔

جمشید کا خیال تھا کیونکہ وہ کسی کو دھوکا نہیں دیتا اور نہ لوٹتا ہے اس لیے کوئی اسے بھی نہ لوٹے۔ وہ اپنی چیزوں کی حفاظت کے معاملے میں بہت حساس تھا۔ اس نے اس بڑے بنگلے میں بھی اپنا اصول برقرار رکھا تھا۔ یہاں بھی کوئی کل وقتی ملازم نہیں تھا۔ روز صفائی کے لیے ایک ملازمہ آتی تھی اور ریحانہ اپنی نگرانی میں پورے بنگلے کی صفائی کراتی تھی۔ اس کام میں خاصا وقت لگتا تھا اور یہ وقت ریحانہ کو ملازمہ کے ساتھ گزارنا پڑتا۔ پورا بنگلا سینٹرلی ایئر کنڈیشنڈ تھا اور کہیں سے گرد و غبار آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس لیے مکمل صفائی کی ضرورت کم پڑتی تھی۔ ریحانہ صرف استعمال ہونے والے حصے روز صاف کراتی تھی، باقی بنگلے کی صفائی ہفتے یا دس دن میں ایک بار کی جاتی تھی۔ لانڈری اور مالی کا کام کرنے کے لیے جز وقتی ملازم آتے تھے اور وہ بھی ہفتے میں تین بار چند گھنٹوں کے لیے۔ بنگلے کے زیادہ تر کام خودکار طریقے سے ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ پودوں اور گھاس کو پانی دینے کا نظام بھی خودکار تھا۔ رات دو بجے اسپرنکلر شاور کی مدد سے پودوں اور گھاس کو پانی دیا جاتا تھا۔ کچن میں بہترین اور جدید ترین مشینری اور اوون نصب تھے جن سے کھانا بنانے میں بڑی سہولت تھی۔ ریحانہ ہفتے میں دو تین بار خود جا کر چیزوں کی شاپنگ کر لاتی تھی۔ تینوں وقت کا کھانا اسے خود بنانا پڑتا تھا۔ اگرچہ یہ مشکل نہیں تھا مگر اس میں وقت تو لگتا تھا۔

اب وہ اس معمول سے جھنجلانے لگی تھی اوپر سے شازیہ اور جنید بڑے ہو گئے تھے اور اسے ان کے لیے وقت نہیں ملتا تھا۔ ریحانہ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا اور جمشید بھی ایک ایسے گھر سے تعلق رکھتا تھا جہاں اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی اقدار کا خیال رکھا جاتا تھا لیکن شازیہ اور جنید ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو اپر کلاس میں آگیا تھا۔ مگر ابھی تک پرانی اقدار سے چمٹا ہوا تھا اس لیے ان کی اسکولنگ اور ان کے دوست اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے وہ انہی کے طور طریقے اپنانا چاہتے تھے، وہ مکمل آزادی چاہتے تھے جو اس طبقے کے نوجوانوں کو ملی ہوئی تھی۔ مگر جمشید اور ریحانہ انہیں ایسی آزادی دینے کے حق میں نہیں تھے۔ اگرچہ کوئی پابندی بھی نہیں تھی سوائے اس کے کہ ہر کام ان سے پوچھ کر کیا جائے۔ ہاں باپ کی اجازت کے بغیر انہیں کچھ کرنے یا کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی، خاص طور سے شازیہ کو۔

ان دونوں بہن بھائی کو یہ پابندیاں کھلتی تھیں۔ خاص طور سے شازیہ کو اور وہ آج صبح سے ریحانہ کے پیچھے پڑی تھی کہ اسے روبی کے ساتھ اس کے دوستوں کی پارٹی میں جانے دیا جائے۔ ریحانہ اس بارے میں اتنا نہیں جانتی تھی مگر اسے یہ معلوم تھا کہ یہ پارٹیز نوجوان لڑکیوں کے لیے ٹھیک نہیں ہوتی ہیں۔ البتہ جمشید کئی سال یورپ میں گزار چکا تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس قسم کی پارٹیز میں کیا ہوتا ہے اور اب ہمارے ہاں بھی اوپری طبقے کے بگڑے گھرانوں کے نوجوان ایسی پارٹیاں دینے لگے ہیں جہاں مادر پدر قسم کی آزادی ہوتی تھی۔ اور پھر روبی ان دونوں کو ٹھیک نہیں لگتی تھی اس لیے جمشید نے سنتے ہی انکار کر دیا تھا۔ وہ بیڈروم میں کپڑے بدل کر ٹائی لگا رہا تھا کہ ریحانہ آگئی۔ "تم پھر کہیں جا رہے ہو؟"

"ہاں ایک کام ہے لیکن میں جلد آجاؤں گا۔"

"ڈنر۔۔۔"

"آکر کروں گا۔" جمشید نے کہا۔ اس وقت باہر اندھیرا چھا رہا تھا۔ "جنید کہاں ہے؟"

"کہہ رہا تھا کہ یونیورسٹی سے دوستوں کے ساتھ جائے گا مگر اب تک آنے کو کہہ رہا تھا۔"

"برخوردار کی کیا رپورٹ ہے؟"

ریحانہ نے منہ بنایا۔ "کبھی جلدی آجاتا ہے اور کبھی دس بجے گھر آتا ہے لیکن اس سے زیادہ دیر نہیں کرتا۔"

"اس بار اس کے سمسٹر کا کیا ہوا؟"

"گریڈ اچھا آیا ہے۔" ریحانہ بولی۔ "ویسے تم باپ ہو کبھی تم بھی پوچھ لیا کرو۔"

جمشید نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم جانتی ہو، میں صبح جاتا ہوں اور شام کو واپس آتا ہوں۔ کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ دیر ہو جاتی ہے پھر گھر آکر بھی بزنس کے چکر میں رہتا ہوں۔"

"جمشید اب میں اس بارے میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں آکر بات کرتا ہوں۔ ابھی مجھے ایک کپ کافی دو۔" جمشید نے ٹالنے والے انداز میں کہا تو ریحانہ غصے میں کچن کی طرف چلی گئی۔ ڈنر تیار تھا، اس نے کافی کے لیے پانی رکھا اور ٹرے میں شازیہ کے لیے کھانا نکالا۔ وہ اوپر اس کے بیڈروم تک آئی اور دروازے پر دستک دی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اندر سے شازیہ بولی۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں دروازہ کھولو۔۔۔ تمہارے لیے کھانا لائی ہوں۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، یہ ٹرے باہر رکھی ہے جب بھوک لگے کھا لینا۔" ریحانہ نے برہمی سے کہا۔ "تم سب نے مجھے نوکر سمجھ رکھا ہے۔"

وہ ٹرے دروازے کے ساتھ رکھ کر نیچے آئی تو کافی کا پانی ابلنے لگا تھا، وہ کافی تیار کرنے لگی۔ عین اسی وقت اوپر شازیہ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے باہر جھانکا۔ اس نے ٹرے اندر کی اور اپنے کمرے کا دروازہ لاک کرتی ہوئی [illegible] سے نیچے آئی۔ بنگلے سے [illegible] دروازے تھے۔ [illegible] ایک مخفی حصے میں کھلتا تھا۔ [illegible] کے ساتھ [illegible] سسٹم لگا تھا۔

پاس ورڈ لگائے بغیر نہ یہ کھلتے تھے اور نہ بند ہوتے تھے۔ دن اور رات کے پاس ورڈ الگ الگ تھے۔ رات دس بجے کے بعد جو پاس ورڈ درکار ہوتا تھا وہ شازیہ اور جنید کے علم میں نہیں تھا۔ مگر اس کا ایک آپشن تھا جو دن کا پاس ورڈ جانتا تھا، وہ مینو میں جا کر رات کا پاس ورڈ تبدیل کر سکتا تھا۔ عقبی دروازہ برائے نام استعمال ہوتا تھا اس لیے جب تک کوئی رات کو دروازہ نہ کھولتا، اسے پتا نہیں چلتا کہ پاس ورڈ بدل گیا ہے۔

شازیہ نے تیزی سے پاس ورڈ تبدیل کیا۔ اب اسے رات کے وقت اندر آنے میں دشواری پیش نہیں آتی، وہ پہلی بار اس طرح گھر سے چھپ کر جا رہی تھی۔ لان کے درختوں کے پیچھے سے ہوتے ہوئے وہ پورچ تک آئی۔ یہاں اس کی چھوٹی سی سرخ رنگ کی شیوی کار کھڑی تھی۔ ایک مہینا پہلے اس کا او لیول کا رزلٹ آیا تھا اور اس نے اپنی کلاس میں ٹاپ پوزیشن حاصل کی تھی۔ جمشید نے اسے تحفے میں کار گفٹ کی تھی۔ چوتھی کار ریحانہ کی تھی اور ان تمام کاروں میں گیٹ کھولنے اور بند کرنے والا ریموٹ لگا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ یہ گیٹ اندر موجود سسٹم کی مدد سے بھی کھولا اور بند کیا جا سکتا تھا اور اگر بجلی نہ رہتی تو اسے مخصوص چابی کی مدد سے بھی کھولا یا بند کیا جا سکتا تھا۔ شازیہ نے چپکے سے کار اسٹارٹ کی اور ہیڈ لائٹس آف کر کے اسے گیٹ تک لائی۔ جیسے ہی وہ سڑک پر آئی، اسے روبی کی گاڑی نظر آگئی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد روبی اپنی گاڑی اس کے برابر میں لے آئی اور چیخ کر بولی۔

"اجازت کیسے ملی؟"

"چپکے سے آئی ہوں۔" شازیہ بولی۔ اسے بڑی سنسنی محسوس ہو رہی تھی اس طرح گھر سے نکل کر۔ روبی نے قہقہہ لگایا۔ اسے سن کر خوشی ہوئی تھی۔

"آج مزہ کریں گے۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"زیادہ دور نہیں ہے، اسی سوسائٹی میں جانا ہے۔"

آگے سڑک مڑ رہی تھی اور روبی سے باتوں کے دوران شازیہ کو خیال نہیں رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا تو سامنے بل بورڈ کا پول اسی کی طرف آرہا تھا، اس نے عجلت میں اسٹیرنگ گھمایا تو دونوں کاریں ٹکراتے ٹکراتے بچیں۔ شازیہ نے بروقت دیکھ لیا ورنہ اس کی کار پول سے جا ٹکراتی۔ اس کے بعد وہ محتاط ڈرائیونگ کرنے لگی۔

☆☆☆

جنید اپنے دوستوں کے ہمراہ یونیورسٹی کیفے ٹیریا میں

تھا۔ اس کے دوست ٹن پیک بیئر سے شغل کر رہے تھے۔ اگرچہ یہاں بیئر نہیں ملتی تھی لیکن وہ باہر سے لے آتے تھے۔ جنید پیتا نہیں تھا حالانکہ اس کے دوستوں نے بہت اکسایا مگر وہ ناکام رہے۔ نہ اس کے تعلقات کسی لڑکی سے ایک حد سے زیادہ بڑھے تھے۔ اس نے اپنے دوستوں سے واضح کہہ دیا تھا کہ بعض کام وہ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس سے دوستی برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اسے کبھی ان کاموں پر مجبور نہ کریں۔ اسے احساس تھا کہ وہ ان حدوں کو عبور نہیں کر سکتا اور ساتھ ہی ساتھ اسے جھنجلاہٹ بھی ہوتی تھی کہ وہ ابھی تک ان فرسودہ روایات سے چمٹا ہوا ہے۔ وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ اس کے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔ ان کے ساتھی نوجوان کس رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور ان کی کیا مصروفیات تھیں۔ کبھی کبھی اس کا دل بھی چاہتا کہ وہ اسی رنگ میں رنگ جائے اور وہی سب کرے جو یہ نوجوان کر رہے تھے لیکن پھر اس کے اندر سے کوئی اسے روک لیتا اور جب رکاوٹ آتی تو وہ بہت مضطرب ہو جاتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے؟ اس کے دوستوں کے مشاغل امیر زادوں والے تھے یعنی تفریح اور عیاشی۔

جنید یونیورسٹی میں تھا اور باپ کے ساتھ جیولر کا کام سیکھنے کے ساتھ ایم بی اے بھی کر رہا تھا۔ وہ صبح شاپ پر ہوتا اور ایوننگ میں کلاس لیتا۔ آٹھ بجے تک اس کی کلاسز ختم ہو جاتیں اور وہ عام طور سے ساڑھے آٹھ بجے تک گھر آجاتا تھا۔ مگر جب دوستوں کے ساتھ ہوتا، کچھ دیر بھی ہو جاتی تھی۔ آج کی دو کلاسز باقی تھیں، اس کے بعد ہی وہ گھر جا سکتا تھا۔ ایک کلاس خالی تھی اس لیے وہ کیفے ٹیریا میں آبیٹھے۔ آرش اور عرفان رنگین مزاج تھے۔ پینے پلانے کے شوقین تھے۔ وہ زندگی انجوائے کرتے تھے، بیک وقت کئی لڑکیوں سے چکر چلاتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جنید بھی ان کی طرح ہو جائے مگر وہ ان کی بات نہیں مانتا تھا اس لیے اکثر وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس وقت بھی اسے چھیڑنے کے لیے آرش نے ٹن اس کی طرف بڑھایا۔ ''آج تم بھی پی کر دیکھ لو۔''

''میں تم سب کو کئی بار بتا چکا ہوں کہ میں یہ سب نہیں کر سکتا۔'' جنید نے کہا۔ عرفان نے بھی آرش کا ساتھ دیا۔

''یار چکھ کر تو دیکھو... مزہ نہ آئے تو الٹی کر دینا۔''

''میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس پر مجھے پچھتانا پڑے۔'' جنید نے سنجیدگی سے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ''او کے پھر ملیں گے۔''

''بھاگ رہا ہے بزدل...'' آرش نے قہقہہ لگایا۔

''مرد بن یار... ایسی چیزوں سے بھاگتا رہا تو کچھ اور ہی بن جائے گا۔'' عرفان نے بھی کہا۔

''کلاس کا وقت ہو گیا ہے اور یہ تو وقت بتائے گا کہ کون میدان چھوڑ کر بھاگتا ہے۔ آج ماما نے ڈنر گھر پر کرنے کو کہا ہے۔ آج میں کہیں نہیں جا سکوں گا۔''

''یار! مجھے تمہارا گھر عجیب لگتا ہے۔ اتنے بڑے گھر میں صرف چار افراد اور ایک بھی ملازم نہیں ہے۔ تم لوگ چاہو تو درجن بھر ملازم رکھ سکتے ہو۔''

جنید نے شانے اچکائے۔ ''بس پاپا کی مرضی نہیں ہے۔ ویسے ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کھانا ماما بناتی ہیں اور وہ بہت اچھا بناتی ہیں۔ ہر چیز اور کام اپنے وقت پر تیار ملتا ہے۔''

''ویسٹرن اسٹائل ہے تم لوگوں کا؟''

''صرف رہائش کے معاملے میں۔'' جنید جیکٹ پہنتے ہوئے بولا۔ آج باہر کسی قدر خنک تھی۔ ''باقی معاملات میں ہم مشرقی ہی ہیں۔''

جنید کیفے ٹیریا سے نکلا تو اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ اسے اپنے ماں باپ پر غصہ آنے لگا جنہوں نے اسے سہولتیں تو ایلیٹ کلاس والی دی تھیں، تعلیم بھی اسی طبقے میں تھی اور اٹھنا بیٹھنا بھی ان میں ہی تھا لیکن وہ اب چاہتے تھے کہ ان کے بچے مشرقی اقدار پر عمل کریں۔ اگرچہ ریحانہ اور جمشید نے انہیں تربیت بھی ایسی ہی دی تھی۔ ان کے لیے قواعد و ضوابط تھے اور ان کے لیے اس پر عمل کرنا لازمی تھا۔ سب سے اہم بات تھی کہ وہ خود بھی انہی قواعد اور اصولوں پر عمل کرتے تھے۔ اس لیے وہ ان سے بھی مطالبہ کر سکتے تھے۔ جنید کلاس کی طرف جا رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ واپس چلا جائے اور دوستوں کی فرمائش پوری کر دے۔ مگر اسی لمحے اس کے موبائل کی بیل بجی، اس نے موبائل نکال کر دیکھا اس پر ماما لکھا ہوا تھا۔

☆☆☆

جمشید تیار ہو کر آیا۔ ریحانہ نے اسے کافی کا مگ تھما دیا۔ ''تم کیا کہنا چاہتے تھے بچوں کے بارے میں؟''

جمشید نے جیب سے لائٹر نکال کر اسے دکھایا۔ ''یہ باہر لان میں پڑا تھا اور اس کے ساتھ سگریٹ کے کچھ ٹکڑے تھے۔''

''میں نہیں جانتی... کیا جنید...؟''

''پوچھنا پڑے گا۔'' جمشید بولا اور پھر شازیہ کے بارے میں پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''اپنے کمرے میں، اس نے کھانے کے لیے کی

دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔'' ریحانہ نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''جمشید! مجھے لگتا ہے وہ مجھے ناپسند کرنے لگی ہے۔''

''وہ تمہیں ناپسند نہیں کرنے لگی ہے۔ وہ ہم دونوں کو ناپسند کرنے لگی ہے۔'' جمشید نے کافی کا گھونٹ لیا۔ ''تم ذرا چیک کرو کہ وہ کمرے میں کیا کر رہی ہے۔ نوجوان لڑکی کے معمولات پر نظر رکھنی چاہیے۔''

ریحانہ اوپر جانے لگی کہ کال بیل بجی۔ جمشید کچن کے پاس لگے کیمرا کنٹرول سسٹم کے پاس آیا۔ ایک مشین پر اسکرین لگی تھی جس پر چار کیمروں کی تصویریں آرہی تھیں۔ جمشید نے ایک بٹن دبایا تو گیٹ کے ساتھ لگا کیمرا اسکرین پر آگیا۔ وہاں سوسائٹی کے سیکیورٹی آفیسر کی وردی پہنے دو افراد کھڑے تھے۔ ان کے چہرے نظر نہیں آرہے تھے مگر ان کی وردیاں اور بیجز نمایاں تھے۔ ''یس؟'' جمشید نے انٹرکام پر پوچھا۔

''سر! ہم سیکیورٹی کی طرف سے آئے ہیں۔ اطلاع ملی ہے کہ کوئی دیوار کود کر آپ کے بنگلے میں داخل ہوا ہے۔''

''میرے بنگلے میں؟'' جمشید نے تشویش سے کہا۔ ''کس نے اطلاع دی ہے؟''

''شاید آپ کا کوئی پڑوسی ہے مگر اس نے نام نہیں بتایا ہے۔''

''یہاں کوئی نہیں آیا ہے، اس صورت میں الارم بجتا۔''

''ٹھیک ہے سر... اگر آپ مطمئن ہیں تو باہر آکر ہمیں سائن دے دیں۔''

یہ طریقہ کار تھا۔ اگر سیکیورٹی والے کسی شکایت پر آتے تھے اور شکایت درست نہیں ہوتی، تب بھی وہ رہائش کے مالک یا اس کے تجویز کیے ہوئے گھر کے فرد سے کاغذ پر سائن ضرور لیتے تھے تاکہ بعد میں کسی قسم کی گڑبڑ کی صورت میں سیکیورٹی کو الزام نہ دیا جا سکے۔ جمشید جھنجلانے لگا۔ جب وہ جانے والا تھا تو یہ مسئلہ سامنے آگیا۔ اب اسے دیر ہو رہی تھی۔ اسے شیخ الحامد کے مقامی ایجنٹ رحمان شاہ سے ملنا تھا۔ وہ اسے قائل کرنے کی ایک کوشش کرنا چاہتا تھا کہ یہ سودا کینسل نہ کرے ورنہ صرف اسے بلکہ جمشید کو بھی نقصان ہوتا۔ ہیروں کے مالک نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے پچاس کروڑ روپے مالیت کے ہیرے اس کے حوالے کر دیے تھے۔ اسے امید تھی کہ وہ رحمان کو قائل کر لے گا اور کل تک سودا فائنل ہو جائے گا۔ دانستہ دبئی میں ہونا تھی اور اس کے لیے ایجارکی سیٹ تک ہو چکی تھی۔ سودا کرانے پر اسے دو فیصد کمیشن ملتا یعنی دس لاکھ روپے لیکن رقم سے زیادہ یہ اس کی ساکھ کا سوال تھا۔ سودا منسوخ ہوتا تو اس کی ساکھ خراب ہوتی اور آئندہ اسے بڑے سودے نہیں ملتے۔ اس لیے جمشید پوری کوشش کر رہا تھا کہ یہ سودا منسوخ نہ ہونے پائے۔ اس نے سوچا اور کہا۔ ''ایک منٹ... میں گیٹ کھول رہا ہوں۔ تم میں سے کوئی اندر آکر مجھ سے سائن لے لے۔''

جمشید نے سسٹم کی مدد سے گیٹ کھول دیا۔ وہ مطمئن تھا کہ یہ سیکیورٹی والے ہیں۔ اس دوران میں ریحانہ، شازیہ کے بیڈروم کا دروازہ بجا رہی تھی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی کیونکہ شازیہ بدتمیزی کرتی تھی لیکن وہ اسے اس طرح نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اوپر سے پکار کر کہا۔ ''جمشید! وہ کوئی جواب نہیں دے رہی ہے۔''

''اضافی چابی سے لاک کھول لو۔'' جمشید نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ اضافی چابیاں ان کے بیڈروم میں تھیں۔ ریحانہ چابیاں لے آئی اور شازیہ کے بیڈروم کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ شاک رہ گئی۔ اندر کوئی نہیں تھا، اس نے چلا کر کہا۔ ''جمشید! وہ کمرے میں نہیں ہے۔''

جمشید اس دوران میں پاس ورڈ ملا کر دروازہ کھول چکا تھا۔ ریحانہ کی بات نے اسے چونکا دیا اور ایک لمحے کو اس کی توجہ دروازے سے ہٹی اور جب اس نے دوبارہ اس سمت میں دیکھا تو اس نے ایک نقاب پوش کو اپنے سامنے پایا۔ اس نے ایک نیلے رنگ کا غلاف پہن رکھا تھا اور اس میں صرف آنکھوں کی جگہ سوراخ تھا۔ جمشید نے خطرے کا احساس ہوتے ہی دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن نقاب پوش اندر آچکا تھا اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کے پیچھے دو نقاب پوش اور تھے۔ انہوں نے بھی بالکل ایسے ہی غلاف چڑھا رکھے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی اور تیسرا ایک پستول کے ساتھ تھا۔ جمشید دہشت زدہ ان تینوں کو دیکھ رہا تھا، اس نے اچانک چلا کر کہا۔ ''ریحانہ ڈاکو... سیکیورٹی کو کال کرو۔''

ریحانہ جواب تک شاک کی کیفیت میں شازیہ کے بیڈروم کے سامنے کھڑی تھی، جمشید کی آواز پر چونکی۔ اس نے اوپر سے نیچے جھانکا تو جمشید کے ساتھ تین عدد نقاب پوش دکھائی دیے۔ ایک نے اپنا پستول جمشید کے سر پر رکھ دیا اور بلند آواز سے بولا۔ ''مسز جمشید! اگر تم میرے تین گننے تک سامنے نہیں آئیں تو میں تمہارے شوہر کا بھیجا اڑا دوں گا۔''

''ریحانہ سیکیورٹی کو کال کرو۔'' جمشید نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ اس کے سر پر پستول رکھنے والے نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر سر سے اشارہ کیا تو وہ اندر کی طرف لپکے۔ ریحانہ تیزی سے ان سیڑھیوں تک آئی جو عقبی دروازے کی سمت میں تھیں۔ وہ نیچے آئی اور اس نے پاس ورڈ لگا کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن پاس ورڈ مسترد ہو گیا۔ وہ حیران ہوئی مگر یہ موقع وقت ضائع کرنے کا نہیں تھا۔ اس کا موبائل فون کچن کی میز پر تھا۔ فکسڈ فون کا ایک ایکسٹینشن ان کے بیڈ روم میں بھی تھا لیکن جیسے ہی وہ واپس اوپر آئی، اس نے ایک نقاب پوش کو سامنے پایا۔ اس نے شاٹ گن لہرائی اور اسے نیچے چلنے کا اشارہ کیا۔ دوسرا کمروں میں چھ نکتا پھر رہا تھا۔ ریحانہ نیچے لائی گئی تو جمشید کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

''انہوں نے تمہیں بھی پکڑ لیا۔ تم نے تاخیر کی۔''

''سوری، میں نے پیچھے والے دروازے سے باہر جانے کی کوشش کی لیکن اس کا پاس ورڈ ریجیکٹ ہو گیا۔ میرا موبائل کچن میں تھا اور جب اوپر فون تک جانے کی کوشش کی تو اس وقت تک یہ آگئے تھے۔''

''پاس ورڈ کیسے ریجیکٹ ہو گیا؟''

''میرا خیال ہے شازیہ نے باہر جاتے ہوئے تبدیل کیا ہوگا تاکہ رات دس بجے کے بعد اسے واپسی میں مشکل نہ ہو۔'' ریحانہ نے دبی آواز میں کہا۔ اس دوران میں ان کے سر پر صرف ایک نقاب پوش مسلط تھا اور یہ اوّل تھا۔ دوم اور سوم بنگلے کے دوسرے حصوں میں تھے۔

''مسز جمشید!'' اوّل نے کہا۔ وہ لہجے سے پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ ''ہم اس گھر کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

''پہلا سوال غیر متعلق ہے اس لیے اس کا جواب نہیں ملے گا۔'' اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''ہاں اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ فی الحال تو ہم سب کو ایک جگہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ تمہارا بیٹا اس وقت یونیورسٹی میں ہوتا ہے لیکن بیٹی یقیناً گھر پر ہوگی۔''

''وہ گھر پر نہیں ہے۔'' ریحانہ نے مرتعش لہجے میں کہا۔ وہ تقریباً چالیس برس کی خوب صورت اور جوان نظر آنے والی عورت تھی۔ متناسب نقوش اور ہلکے سے میک کے ساتھ وہ دل کش لگ رہی تھی مگر اس وقت خوف اور فکر نے اس کا حسن گہنا دیا تھا۔ اول چونکا۔

''پھر کہاں ہے؟''

''وہ اپنی سہیلی کے ساتھ پارٹی میں گئی ہے۔''

''پارٹی میں؟'' اول نے خود سے کہا اور پھر ہنسا۔ ''اوہ، تمہارا تعلق جس طبقے سے ہے، وہاں لڑکیاں بھی پارٹیوں میں جاتی ہیں؟''

اتنے میں دوم نیچے آیا اور اس نے رپورٹ دی۔ ''اوپر کوئی نہیں ہے۔''

''یعنی گھر میں صرف مسٹر اور مسز جمشید ہیں۔'' اول نے کہا اور جمشید کی طرف دیکھا۔ ''اب میں تمہارے اس سوال کا جواب دوں گا کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟''

جمشید نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''دیکھو، ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہاں سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔''

''وہ ہم دیکھ لیں گے۔'' اول نے کہا اور دوم کی طرف دیکھا۔ ''ان سے سب لے لو ایک ایک چیز...''

دوم آگے آیا اور اس نے جمشید کی تلاشی لی۔ اس کا پرس، چابیاں، کار کا ریموٹ اور موبائل فون نکال لیا۔ اول نے موبائل فون آف کر کے باقی چیزوں سمیت اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس نے ریحانہ کی طرف دیکھا۔ ''مسز جمشید اگر تمہارے پاس کچھ ہے تو خود دے دو، اگر بعد میں کچھ نکل آیا تو ہم تمہاری جسمانی تلاشی لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

''خبیث۔'' جمشید نے بے اختیار کہا اور اول کی طرف بڑھا تھا کہ دوم نے اس کے رخسار پر شاٹ گن کی نال ماری۔ جمشید چکرا کر نیچے گرا۔ ضرب شدید تھی۔ رخسار پھٹ گیا تھا اور خون بہہ نکلا تھا۔ ریحانہ چیخ مار کر جمشید کی طرف جھپٹی۔ جمشید ہوش میں تھا اور آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ اس کی عینک ایک طرف جا گری تھی۔ ریحانہ نے دوپٹے سے اس کا رخسار صاف کیا اور پھر زخم کو دوپٹے سے دبا لیا۔ اس نے سر اٹھا کر ان دونوں کی طرف دیکھا اور گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تم چاہو تو... تو تلاشی لے لو لیکن پلیز ایسی باتیں مت کرو۔ کوئی شوہر اپنی بیوی کے بارے میں ایسی بات نہیں سن سکتا ہے۔''

''اسے کہو کہ خود کو قابو میں رکھے۔'' اول نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اس وقت گھر کا سربراہ وہ نہیں ہے۔''

جمشید نے اپنا رومال نکال کر رخسار پر رکھ لیا اور اٹھ گیا۔ اس نے ریحانہ کو خود سے نزدیک کر لیا تھا۔ ریحانہ کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اب اسے کہیں زیادہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا اور چند لمحے پہلے تک وہ شازیہ کے بارے میں فکرمند تھی لیکن اب وہ شکر ادا کر رہی تھی کہ شازیہ گھر میں نہیں تھی ورنہ اسے بھی وہی خطرہ لاحق ہو جاتا جو ریحانہ کے ذہن میں اپنے لیے تھا۔ اول اسے غور سے دیکھ رہا تھا اور شاید اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ ریحانہ کس حوالے سے خوف زدہ ہے۔ اس نے کہا۔ ''مسز جمشید! مجھے اپنے الفاظ پر افسوس ہے مگر میں تمہیں بتا دوں، اگر تمہارے شوہر نے ہمارا مطالبہ پورا نہیں کیا تو تمہیں خود کو بہت کچھ بھگتنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ مسٹر جمشید! ذرا اپنے دفتر کی طرف چلو۔''

''تم میری شاپ کی بات کر رہے ہو؟'' جمشید نے انجان بن کر کہا۔

''میں تمہارے اس دفتر کی بات کر رہا ہوں جو تم نے گھر میں بنا رکھا ہے۔ تم شاید بھول گئے، میں نے کیا کہا تھا۔ ہم اس بنگلے کے بارے میں سب جانتے ہیں۔'' وہ ان دونوں کو دھکیلتے ہوئے جمشید کے دفتر والے کمرے تک لائے اور مطالبہ کیا۔ ''اسے کھولو۔''

جمشید کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی، اس نے پاس ورڈ ملا کر دروازہ کھول دیا۔ اس دوران میں سوم آگیا اور اس نے کہا۔ ''تمام فون لائنز اور انٹرنیٹ کنکشن ختم کر دیے ہیں۔''

''گڈ! اب تم یہیں رہو۔''

اول اور دوم ان کے ساتھ اندر آئے۔ اول نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''اسے ہٹاؤ ورنہ مجھے اتنی اچھی پینٹنگ تباہ کرتے ہوئے افسوس ہوگا۔''

''یہ تصویر ہے اس کے پیچھے دیوار ہے۔'' جمشید نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔'' اول نے استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تو وہ جیب سے چاقو نکال کر اسے کھولتا ہوا پینٹنگ کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ تصویر پر چاقو آزماتا، جمشید نے کہا۔ ''رکو میں اسے ہٹا رہا ہوں۔''

اس نے میز کی دراز میں رکھا ہوا ریموٹ نکال کر بٹن دبایا تو تصویر بائیں طرف سرک گئی اور اس کے پیچھے چھپی تجوری سامنے آگئی۔ اول نے تجوری کی طرف اشارہ کیا۔ ''اب اسے بھی کھولو۔''

جمشید کچھ دیر سے گھورتا رہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''تم اچھی طرح جانتے ہو ہم کیا چاہتے ہیں۔'' اول نے کہا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں ہم صرف وہی ہیرے لیں گے اور تمہاری تجوری کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔''

جمشید کا چہرہ تن گیا۔ [illegible] رومال زخم سے ہٹا دیا تھا [illegible] خون بہنا بند ہو گیا تھا مگر [illegible] زخم [illegible] ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور کسی قدر سوجن بھی [illegible] شاید چوٹ کا اثر ہڈی تک چلا گیا تھا۔ وہ خاموش کھڑا رہا تو اول اس کے پاس آیا اور پستول اس کی کمر سے لگا کر تقریباً اس کے کان میں گھس کر بولا۔ ''تم غالباً میری بات سمجھ نہیں رہے ہو، میں کہہ رہا ہوں یہ تجوری کھول دو اور اس میں موجود ہیرے میرے حوالے کر دو۔ میں اور میرے ساتھی بغیر کسی چیز کو ہاتھ لگائے جیسے آئے تھے ویسے ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ اب بات واضح ہے نا؟''

جمشید نے سر ہلایا تو اول خوش ہو گیا۔ ''تب، شاباش تجوری کھول دو۔''

جمشید نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اور مضبوط لہجے میں بولا۔ ''نہیں۔''

''نہیں۔'' اول کے لہجے سے خوشی غائب ہو گئی اور وہ دوبارہ بولا تو اس کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ ''تم شاید اسے مذاق سمجھ رہے ہو۔ لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ مذاق نہیں ہے۔ میں تمہیں ایک بار پھر سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔''

دوم ایک طرف مستعد کھڑا تھا۔ اول ٹہلتا ہوا ریحانہ کے پاس آیا اور ذرا جھک کر آہستہ سے بولا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ گولی لگے تو کیسی تکلیف ہوتی ہے؟ خاص طور سے کسی ایسی جگہ جہاں گولی لگنے سے آدمی مرتا نہیں ہے اور بے ہوش بھی نہیں ہوتا ہے۔ جیسے گھٹنا یا کلائی...''

ریحانہ دہشت زدہ ہو گئی۔ اس نے ہکلا کر کہا۔ ''نن... مجھے... نہیں... معلوم۔''

''اگر تمہارے شوہر نے انکار جاری رکھا تو تم بہت جلد جان جاؤ گی۔'' اول ریحانہ کے کان کے قریب بول رہا تھا اور اس کے منہ سے تمباکو کی بدبو آرہی تھی۔ شاید وہ تمباکو چبانے کا عادی تھا۔

''میری بات سنو۔'' جمشید جلدی جلدی بولنے لگا۔ ''وہ ہیرے تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے کیونکہ وہ مخصوص تراش کے ہیرے ہیں۔ اس ملک کا ہر اہم جیولر ان کے بارے میں جانتا ہے۔ یہاں کوئی بھی انہیں نہیں خریدے گا۔ اگر تم ان کو ملک سے باہر فروخت کرو گے تو ان کے اندر لیزر سے بنایا ہوا مارک ہے۔ اس سے پتا چل جائے گا کہ یہ ہیرے چوری کے ہیں اور کوئی انہیں نہیں خریدے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا...؟ قانونی لحاظ سے ان کی فروخت ناممکن ہے اور تم کسی ایسے ویسے کو فروخت کرو گے تو ان کی قیمت کا ایک فیصد بھی نہیں ملے گا۔''

''ایک فیصد۔'' اول نے متفکر لہجے میں کہا۔ وہ ٹہلنے لگا تھا۔ ''پچاس کروڑ روپے کا صرف ایک فیصد...'' اس نے

جشید کی طرف دیکھا۔ "یہ تو بہت کم ہے۔"
جشید پُر امید ہو گیا، اس نے زور دے کر کہا۔ "یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔"
"پچاس لاکھ روپے۔" اول نے ایک بار پھر خود سے کہا۔

☆☆☆

شازیہ اور روبی کی کاریں سوسائٹی کے آگے پیچھے ایک بڑے بنگلے کے سامنے رکیں۔ وہاں پہلے سے کوئی نصف درجن کاریں کھڑی تھیں۔ اندر سے بہت دھمک دار میوزک کی دبی ہوئی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ شازیہ کار سے اتری تو کسی قدر نروس تھی۔ روبی اس کے پاس آئی۔ اس نے بہت چست جینز کے ساتھ منی شرٹ پہن رکھی تھی جس میں اوپر شولڈر پر صرف دو پٹیاں تھیں اور وہ بہ مشکل جینز تک پہنچ رہی تھیں۔ چلنے کے دوران روبی کی کمر اور پیٹ جھلک رہا تھا۔ روبی تقریباً بیس بائیس برس کی معمولی نقوش کی لڑکی تھی لیکن ایک دولت مند گھرانے کی لڑکی تھی اور اس نے دولت سے خود کو پالش کر لیا تھا۔ جسمانی بناوٹ اچھی تھی اور شاید یہی اس کا واحد اثاثہ تھا۔ اس نے تنقیدی نظروں سے شازیہ کا جائزہ لیا جو کسی قدر ڈھیلی جینز کے ساتھ پوری آستین کی ٹی شرٹ میں تھی۔ اس کی لمبائی بھی معقول تھی۔ پاؤں میں پٹیوں والے سینڈل تھے جن میں اس کے گلابی پاؤں نمایاں تھے۔ سیدھے کھلے بالوں اور سادہ چہرے کے باوجود وہ روبی کے مقابلے میں ایسی لگ رہی تھی جیسے گہن لگے چاند کے مقابلے میں چودھویں کا چاند ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر کم سنی اور معصومیت جھلک رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں روبی نے تیز و شوخ میک اپ کر رکھا تھا اور اس پر بھی اسے بہ مشکل ہی خوب صورت کہا جا سکتا تھا۔

"یہ کس کی کوٹھی ہے؟"
"ریاض عرف راجی کی ہے۔ فارن منسٹری کے ایک سینئر بیوروکریٹ کا اکلوتا لڑکا ہے مگر اس کوٹھی میں اکیلا رہتا ہے۔ اس کی فیملی الگ رہتی ہے۔"
"بالکل اکیلا رہتا ہے؟" شازیہ نے پوچھا۔
"ہاں... مگر اکیلا کم ہوتا ہے۔" روبی نے آنکھ ماری۔ "میری بات سمجھ رہی ہو نا؟ ایک دو لڑکیاں لازمی اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔ کھلا پیسا ہے اور دل کھول کر خرچ کرتا ہے۔ ہر ہفتے پارٹی کرتا ہے جس میں اس کے دوست اور دوستوں کے دوست بھی شریک ہو سکتے ہیں۔"
"تم اس کی دوست ہو؟"
"نہیں، میں اس کی دوست کی دوست ہوں اور تم میری دوست ہو۔" روبی نے پھر اسے آنکھ ماری۔ "اندر چل کر دیکھو مزہ آ جائے گا۔"

گیٹ کھلا ہوا تھا اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ "حیرت ہے، یہاں کوئی گارڈ نہیں ہے؟"
"وہ تو تمہارے بنگلے پر بھی نہیں ہوتا ہے۔" روبی ہنسی۔
"ہمارے بنگلے پر بہترین الیکٹرانک سیکیورٹی ہے۔"
"یہ بھی سوسائٹی میں آتا ہے اس لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"
حالانکہ کوٹھی کسی قدر الگ تھلگ تھی۔ مگر ریاض اور اس کے ساتھی بے فکری سے اندر ہلے گلے میں مگن تھے۔ ایک ہال نما کمرے میں تیز میوزک پر کچھ لڑکیاں اور لڑکے ناچ رہے تھے اور کچھ دیوار کے ساتھ لگے صوفوں پر بیٹھے الکوحل سے شغل کر رہے تھے۔ ایک طرف میز پر کئی طرح کی شرابیں اور بیئر کی بوتلیں سجی تھیں اور وہاں موجود افراد اپنی اپنی پسند کی چیز پی رہے تھے۔ شازیہ نے آہستہ سے کہا۔ "یہ تو شراب پی رہے ہیں۔"
"تمہارا کیا خیال ہے، اس قسم کی پارٹیوں میں کولڈ ڈرنک یا چائے کافی ہو گی۔" روبی نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔ "آؤ میں تمہیں راجی سے ملواؤں، بہت اچھا لڑکا ہے۔"
یہ بہت اچھا لڑکا اس وقت دو لڑکیوں کے درمیان میں بیٹھا تھا اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک بتا رہی تھی کہ اس پر شباب و شراب کے علاوہ بھی کوئی نشہ طاری تھا۔ اس نے پہلے شازیہ کو سرسری سی نظروں سے دیکھا اور پھر اچانک ہی دلچسپی لینے لگا۔ اس نے گرم جوشی سے شازیہ کا ہاتھ تھاما اور اس وقت تک تھامے رکھا جب تک شازیہ نے خود واپس نہیں کھینچ لیا۔ اس نے نہ جانے کیا اشارہ کیا کہ اس کے ساتھ موجود لڑکیاں جو پہلے شازیہ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں، اچانک ہی اٹھ کر چلی گئیں۔ روبی نے شازیہ کو دھکا دے کر راجی کے برابر میں بٹھا دیا اور خود اس کے دوسری طرف بیٹھ گئی اور معنی خیز لہجے میں بولی۔ "میں نے شازی کو بتایا ہے تمہارے پاس بہت اچھا روبی کلیکشن ہے۔ اس کے پاپا بہت بڑے جیولر ہیں۔"
"تب تو میں اسے ضرور دکھاؤں گا۔" راجی کھڑا ہو گیا۔ وہ تقریباً پچیس برس کا کسی قدر اسمارٹ نوجوان تھا۔ مسلسل عیاشی اور بے اعتدالی نے اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔
"میرا خیال ہے اس کی ضرورت..." شازیہ نے انکار کرنا چاہا لیکن ان دونوں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ ایسا لگ رہا تھا یہ پہلے سے طے شدہ تھا۔ وہ دونوں اسے اندر ایک بیڈ روم میں لے آئے۔ روبی پیچھے تھی اور جب راجی اپنی تجوری کھول رہا تھا تو روبی کسی وقت چپکے سے کمرے سے نکل گئی۔ شازیہ کو پتا نہیں چلا کیونکہ اس کی ساری توجہ تجوری پر تھی۔ یہ نمبروں سے کھلنے والی تجوری تھی۔ راجی نے پہلے چھ سات اور آٹھ ملایا اور ڈائل کو ایک طرف گھمایا پھر ایک دو سات ملایا اور دوبارہ ڈائل واپس اپنی جگہ کر دیا۔ آخر میں اس نے تین چار سات ملایا اور ہینڈل گھما کر تجوری کھول دی۔ اندر پیچھے کی طرف نوٹوں کی گڈیاں قطار میں رکھی تھیں اور یہ خاصی بڑی رقم تھی مگر اندر کوئی روبی کلیکشن نہیں تھا۔ اس کے بجائے ایک شیشے کی چھوٹی بوتل میں سفید سفوف رکھا تھا۔ راجی نے بوتل نکال کر اسے ناک سے لگا کر ایک گہری سانس لی اور سفوف اڑ کر اس کی ناک میں گیا۔ اس نے سر جھٹکا... جیسے یہ سفوف اس کے دماغ پر لگا ہو۔ شازیہ پیچھے ہوئی اور اس سے پہلے کہ راجی اس کی طرف متوجہ ہوتا وہ پھرتی سے باہر نکل آئی۔ وہ ہال میں پہنچی تو روبی ایک لڑکے کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ اس کی طرف لپکی۔
"کیا ہوا... تم واپس کیوں آ گئیں؟"
"میں واپس جا رہی ہوں۔" شازیہ نے نارمل لہجے میں کہا۔
"مگر کیوں، ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ راجی نے کچھ کہا ہے؟"
"نہیں..." اس نے بہانہ کیا۔ "میں ماما کو بتائے بغیر آئی ہوں۔ ان کو پتا چل گیا تو آئندہ مجھے گھر سے نکلنے نہیں دیں گی۔"
روبی نے منہ بنایا۔ "تو بیک ورڈ۔"
"پلیز! وہ میری ماما ہیں۔" شازیہ کو غصہ آ گیا۔ وہ باہر آئی۔ روبی اس کے پیچھے تھی۔ وہ اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شازیہ نے کار میں بیٹھتے ہوئے اس سے کہا۔ "دیکھو، تم چاہتی ہو کہ ہماری دوستی برقرار رہے تو اس وقت مجھے مت روکو۔"
"او کے۔" روبی بادل ناخواستہ بولی۔ "پھر کب ملو گی؟"
"بعد میں بتاؤں گی۔" شازیہ نے کہا اور کار آگے بڑھا دی۔ وہاں سے نکل کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ اندر جاتے ہی اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ پھر راجی اسے بیڈ روم میں لے گیا اور اس نے تجوری سے سفوف نکال کر سونگھا تو شازیہ کی چھٹی حس نے اسے اشارہ کیا کہ اب اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ یہ جگہ اس کے گھر سے بہ مشکل دس منٹ کی ڈرائیو پر تھی۔ وہ واپس گھر تک پہنچی تو اسے خدشات لاحق ہو گئے کہ کہیں ماما یا پاپا کو اس کی گم شدگی کا علم نہ ہو گیا ہو۔ اس نے ریموٹ سے گیٹ کھولا اور کار اندر لے آئی۔ اندر آتے ہی اس نے ہیڈ لائٹس بند کر دی تھیں۔ پارکنگ میں صرف ماما اور پاپا کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ جنید ابھی گھر نہیں آیا تھا۔ یہ بھی اچھا تھا۔ اگر ماما کو پتا چل گیا تھا تو جنید کے سامنے اس کی عزت افزائی نہیں ہو گی۔

☆☆☆

اول خاصی دیر سے پچاس لاکھ کی گردان کیے جا رہا تھا۔ پھر اس نے جشید کی طرف دیکھا اور زیر لب بولا۔ "پچاس لاکھ روپے... ٹھیک ہے ہمارے لیے پچاس لاکھ بھی کافی ہیں۔ تجوری کھولو۔"
اس نے جشید کو کالر سے پکڑا اور اسے کھینچ کر تجوری تک لے آیا۔ جشید بولا۔ "خدا کے لیے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو... یہ ہیرے میرے پاس کسی کی امانت ہیں۔ میں تمہیں نہیں دے سکتا... کسی قیمت پر نہیں دے سکتا۔"
اول نے اس کا کالر چھوڑ دیا۔ دوم جھپٹ کر سامنے آیا اور اس نے پستول جشید کے سر سے لگا دیا اور ہیجانی لہجے میں بولا۔ "نہیں دے سکتے... میں تمہیں بتاتا ہوں... ابھی تمہارا بھیجا باہر نکالتا ہوں... کتے کے بچے... امانت دار بنتا ہے... بتاؤں تجھے۔"
"نہیں۔" ریحانہ چلائی۔
اول نے اسے پیچھے کیا۔ "اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی میں اس سے بات کر رہا ہوں۔ اس کا بھیجا تم کسی وقت بھی نکال سکتے ہو۔"
دوم پیچھے ہوا مگر اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ اس نے پستول کا دستہ اتنی قوت سے دیوار پر مارا کہ اس پر نشان آ گیا۔ اول جشید اور ریحانہ کو دوبارہ لاؤنج میں لے آیا۔ اس نے ریحانہ کو ایک طرف کھڑا کر دیا اور سوم کو اس کے سر پر مسلط کر دیا، اس نے حکم دیا۔ "جب میں کہوں، تمہیں اس عورت کو شوٹ کر دینا ہے۔"
ریحانہ نے سہم کر اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ نقاب کے پیچھے اس کے نقوش چھپے ہوئے تھے لیکن لگ رہا تھا کہ وہ خوش شکل نوجوان ہے۔ ہاتھ پاؤں مضبوط اور رنگت صاف تھی۔ اس نے نیلی ٹی شرٹ اور اس کے ساتھ نیوی بلیو رنگ کا ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ ریحانہ نے پہلی بار غور کیا۔ ان سب نے اپنی انگلیوں کے سروں پر سیاہ اسکاچ ٹیپ لپیٹ رکھا تھا اور یقیناً اس کا مقصد انگلیوں کے نشانات کی جگہ لگنے سے

بچاتا تھا۔ ویسے ان لوگوں کا اس طرح نقاب پوش ہو کر آنا ایک لحاظ سے اطمینان بخش تھا کہ وہ ان کی جان لینا نہیں چاہتے تھے ورنہ نقاب کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مگر انہیں ہیرے نہیں ملے تو وہ ان کی جان بھی لے سکتے تھے۔ اور وہ عورت تھی، اس کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ ہو سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں ریحانہ کو یہ نوجوان کسی قدر مختلف لگا۔ شاید اس لیے کہ اس نے اب تک ان کے خلاف کسی جارحانہ رویے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ریحانہ نے آہستگی سے کہا۔

"کیا تم سچ مچ مجھے مار دو گے؟"

"اگر ہیرے نہ ملے تو ہمیں ایسا ہی کرنا ہوگا۔" سوم نے بھی آہستہ سے کہا۔ "ویسے تمہارا شوہر بلا وجہ کی دیر کر رہا ہے۔ ہم ہیرے لے کر جائیں گے چاہے ہمیں اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔"

ریحانہ کے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ اول، جشید کو ایک طرف لے گیا اور اس سے دھیمے لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ دوم اپنا غصہ سرد کرنے کے لیے اب کچن میں تھا اور فریج کھول کر اس میں جھانک رہا تھا۔ اسے توقع تھی کہ اسے کولڈ ڈرنک یا اسی قسم کی کوئی چیز مل جائے گی۔ مگر ریحانہ نے فریج میں ایسی چیزیں رکھنا چھوڑ دی تھیں۔ کچھ عرصے پہلے شازیہ اور جنید بہت زیادہ کولڈ ڈرنک پینے لگے تھے اور یہ صحت کے لیے اچھی چیز نہیں ہوتی۔ مجبوراً دوم نے فریج سے دودھ کا جگ نکالا اور ایک گلاس میں نکال کر پینے لگا۔ گلاس خالی کر کے اس نے فریج سے ایک عدد سیب نکالا اور اس پر منہ مارتا ہوا ان کی طرف آیا۔ اس کی جسامت بتا رہی تھی کہ اسے کھانے پینے کا شوق ہے۔ اس نے سوم سے کہا۔ "ہوشیار رہنا، میں ایک بار پھر پورے گھر کا چکر لگا کر آتا ہوں۔"

وہ عقبی دروازے کی طرف آیا اور اس نے بلند آواز سے اس کا پاس ورڈ پوچھا۔ ریحانہ نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم، میری بیٹی نے اسے بدل دیا ہے۔"

اول نے کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا اس نے تم دونوں کو نہیں بتایا ہے؟"

"یہ کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے آنے سے پہلے یہاں سے نکلی ہوگی۔ کیا تم لوگوں نے آتے ہوئے راستے میں کسی سرخ شیوی کار کو دیکھا تھا؟"

اول سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے، میں نے دیکھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک سلور کار اور بھی تھی اور دونوں کو لڑکیاں چلا رہی تھیں۔"

"دوسری لڑکی روبی ہوگی۔" ریحانہ نے نفرت سے کہا۔ "وہی اسے بہکاتی ہے۔"

اول طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "بالکل... تمہاری بیٹی بہت سیدھی ہوگی مگر جب وہ اس پارٹی سے واپس آئے گی تو اتنی سیدھی نہیں رہے گی۔"

"تمہیں میری بیٹی پر کمنٹس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ریحانہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"سوری بیگم صاحبہ۔" اول کا لہجہ مزید طنزیہ ہو گیا۔ "میں بھول گیا تھا کہ میں یہاں کسی اور کام سے آیا ہوں۔" وہ ٹہلتا ہوا ریحانہ کے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا۔ "تمہارا شوہر ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اسے بالکل پروا نہیں ہے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ کیا تم اسے سمجھا نہیں سکتی ہو؟"

"میں... میں کیسے سمجھاؤں؟"

"تم اسے سمجھا سکتی ہو کیونکہ تم ایک بیوی ہو۔ اسے بتاؤ کہ ہم تمہارے ساتھ کیا کر سکتے ہیں۔ تم خود ایک عقل مند اور تجربے کار عورت ہو اور جانتی ہو کہ ایک بے بس عورت کے ساتھ کیا کیا جا سکتا ہے۔"

شرم اور غصے سے ریحانہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ یہ اچھی بات تھی کہ اول بہت دھیمی آواز میں یہ سب کہہ رہا تھا اور دور کھڑا جشید سننے سے قاصر تھا ورنہ اسے پھر جوش آ جاتا اور ابھی اس کے رخسار کے زخم سے خون رس رہا تھا جسے وہ رومال سے صاف کر رہا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے اول نے ریحانہ کا بازو پکڑ کر اسے جشید کی طرف دھکیلا اور بلند آواز سے بولا۔ "یہ آخری موقع ہے۔ اگر اب بھی اس نے تجوری نہیں کھولی تو وہی سب ہوگا جو میں نے تم سے کہا ہے۔"

ریحانہ لڑکھڑاتے قدموں سے جشید کی طرف آئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "پلیز جشید ان کی بات مان لو... یہ بہت بے رحم لوگ ہیں۔"

جشید کا چہرہ سخت ہو گیا، اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میں وہ ہیرے ان کے حوالے نہیں کر سکتا۔ وہ میرے پاس کسی کی امانت ہیں۔"

"یہ ہماری زندگیوں کا سوال ہے۔"

"یہ میری ساکھ کا سوال ہے۔" جشید کسی قدر بے بسی سے بولا۔

"تمہاری ساکھ کیا ہماری جانوں سے بڑھ کر ہے؟" ریحانہ کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔" جشید کی آواز دوبارہ مدھم ہو گئی۔ "اگر میں نے وہ ہیرے ان کو دے دیے تو سب کچھ بیچ کر بھی میں اس نقصان کو پورا نہیں کر سکوں گا۔ دوسرے مجھے یقین ہے کہ ایک بار میں نے تجوری کھول دی تو اس کے بعد یہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"اگر ایسا ہی ہے تو یہ نقاب لگا کر کیوں آئے ہیں؟"

"ہمیں دھوکا دینے کے لیے۔" جشید بولا۔ "یہ سب دھوکا ہے۔ ایک بار ان کو کھلی تجوری مل گئی تو یہ نہ صرف سب لے جائیں گے بلکہ ہمیں بھی قتل کر دیں گے۔"

"اگر تم نے تجوری نہ کھولی تو یہ ویسے بھی قتل کر دیں گے۔ شاید مجھے تمہارے سامنے بے آبرو..."

"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔" جشید نے بے ساختہ کہا۔

"تم روک سکتے ہو؟" ریحانہ کی آواز میں تلخی آ گئی۔ "تم مرد ہوتے ہوئے بھی ان کے سامنے بے بس ہو اور میں تو ہوں ہی ایک کمزور عورت۔"

وہ تینوں کچن کے پاس کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اول ذرا دھیمے مزاج کا آدمی تھا لیکن دوم غصے کا تیز تھا۔ اس نے کہا۔ "بس بہت ہو گیا۔ یہ زبان سے ماننے والا شخص نہیں ہے۔"

"ایک منٹ... انہیں بات کرنے دو۔" اول نے کہا اور سیکیورٹی والوں کی شرٹ اتار پھینکی۔ دوم اور سوم نے اس کی تقلید کی۔ نیچے انہوں نے عام لباس پہن رکھے تھے۔ سیکیورٹی کی شرٹس صرف دھوکا دینے کے لیے تھیں۔ اسی وجہ سے جشید نے بغیر تصدیق کے دروازہ کھول دیا تھا۔ ایک طرف ریحانہ اپنے شوہر کو سمجھا رہی تھی، دوسری طرف ان تینوں میں بھی بحث جاری تھی۔ بحث کرتے ہوئے اچانک دوم ان کی طرف لپکا۔ اس نے جشید کو گریبان سے پکڑا اور کھینچتا ہوا اسے دفتر والے کمرے میں لایا۔ اس نے گھما کر جشید کو تجوری کے ساتھ دیوار پر دے مارا۔ وہ بہت زور سے پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا اور کراہ کر رہ گیا۔ ریحانہ نے چیخ مار کر اس کے پیچھے آنے کی کوشش کی لیکن سوم نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "بیکار ہے، تمہارے شوہر نے خود مصیبت کو دعوت دی ہے۔"

ریحانہ نے التجا کی۔ "خدا کے لیے ہم پر رحم کرو۔ وہ ہیرے میرے شوہر کے پاس کسی کی امانت ہیں۔"

"اس کے لیے وہ تمہاری اور اپنی جان کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے... تم نے اسے سمجھایا نہیں؟"

"جشید بہت ضدی ہے۔" ریحانہ بولی۔

اول نے دفتر میں آ کر دوم کو روکا۔ ورنہ وہ جشید پر مزید تشدد کرتا۔ اس وقت بھی وہ غصے سے ٹہل رہا تھا اور بار بار اول سے کہہ رہا تھا کہ یہ شخص سبق سکھائے بغیر نہیں مانے گا۔ اس نے تنگ آ کر کہا۔ "تم کیا کرو گے؟"

"میں کیا کروں گا... ابھی بتاتا ہوں۔" دوم نے بھڑکتے لہجے میں کہا اور پھر جشید کی طرف لپکا جو دیوار سے لگا کھڑا ہانپ رہا تھا۔ دوم نے اس کا الٹا ہاتھ دیوار سے لگایا اور پوری قوت سے پستول کا دستہ اس پر مارا۔ جشید کے منہ سے دھاڑتی ہوئی چیخ نکلی۔ دوم نے ہاتھ بہت قوت سے دبا رکھا تھا۔ جشید تڑپنے کے باوجود ہاتھ نہیں چھڑا سکا۔ دوم نے ایک ضرب اور لگائی اور پھر جشید کا ہاتھ چھوڑا تو وہ اسے بغل میں دبا کر دوہرا ہو گیا۔ اس کی چیخیں سن کر ریحانہ بے تاب ہو گئی۔ اس نے اندر جانے کی کوشش کی لیکن سوم نے اسے روک لیا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتیں، سوائے اس کے کہ اسے تجوری کھولنے پر راضی کر لو۔"

"جشید بہت ضدی ہے، وہ اس طرح سے بھی نہیں مانے گا۔" ریحانہ بولی۔ "وہ میری اور اپنی جان کی پروا بھی نہیں کرے گا۔ وہ اصول پسند آدمی ہے اور اصولوں کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے۔"

"لیکن بعض دفعہ انسان کو اصولوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔" سوم نے کہا۔ "کیا اس کے لیے اس کے اصول اس کے گھر والوں کی زندگی سے زیادہ ہیں؟"

ریحانہ نے التجا کی۔ "پلیز! مجھے اس کے پاس جانے دو۔"

"میں نے کہا نا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تم میرے ساتھی کو نہیں جانتی ہو، اس کا غصہ بہت تیز ہے۔ ممکن ہے تم وہاں جاؤ تو وہ جشید کو ذہنی اذیت دینے کے لیے تمہارے خلاف کچھ کر گزرے۔ اس لیے تمہارے لیے یہیں رہنا بہتر ہے۔"

یہ سن کر ریحانہ سہم گئی اور خاموش ہو گئی۔

سوم ریحانہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ شاید ٹیک لینے کے لیے ذرا پیچھے ہٹا اور کچن کاؤنٹر سے ٹک گیا۔ اس کے عین دائیں طرف چمکیلی سطح والا فریج تھا جس میں اس کا عکس صاف دکھائی دے رہا تھا۔ شاید غلاف کے اندر اس کے چہرے پر کچھ آ گیا تھا اس نے اس طرح غلاف اتارا کہ ریحانہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے مگر اسے خبر نہیں تھی کہ فریج کی سطح پر اس کا عکس صاف دکھائی دے رہا تھا اور ریحانہ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ریحانہ نے اسے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی ٹیکنیشین تھا جو کچھ عرصے پہلے سیکیورٹی کمپنی کی طرف سے ان کا الیکٹرانک سیکیورٹی کا سسٹم اپ گریڈ کرنے آیا تھا۔ دروازوں کے لاک اور بعض دوسرے آلات اسی

نے لگائے تھے۔ ریحانہ اس سے بہت متاثر تھی کیونکہ اس نے اپنا کام بہت صفائی اور مہارت سے کیا تھا ایک بار جب ریحانہ جمشید سے فون پر بات کر کے مایوسی سے رو رہی تھی تو اسی نے اسے تسلی دی تھی۔ اس دن ریحانہ کی سالگرہ تھی اور جمشید نے اس سے جلد گھر آنے کا وعدہ کیا تھا مگر عین موقع پر اسے کچھ مصروفیت آگئی اور اس نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔

ریحانہ کو یاد تھا کہ اس ٹیکنیشین کا نام فہد تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ آج ریحانہ کی سالگرہ ہے تو وہ لنچ کے وقفے کے بعد لان سے خاص طور سے پھول توڑ کر اور ان کا گلدستہ بنا کر اس کے لیے لایا تھا۔ جب اس نے ریحانہ کو پھول دیے تب ریحانہ نے اس کی آنکھوں اور تاثرات میں پسند کی چمک دیکھی تھی۔ مگر یہ صرف پسند تھی، اس سے آگے کچھ نہیں تھا۔ ریحانہ جانتی تھی کہ وہ دلکش ہے اور اس عمر میں بھی کسی کو اچھی لگ سکتی ہے۔ اس نے اس پسند کو حسن کا خراج تحسین سمجھ کر قبول کر لیا تھا اور جب فہد اپنا کام مکمل کر کے چلا گیا تو وہ اسے بھول چکی تھی مگر فہد کے نقوش اس کے ذہن میں محفوظ تھے اب اس نے فریج کی سطح پر بھی دیکھ کر ان نقوش کو پہچان لیا تھا۔

جمشید ہاتھ بغل میں دبائے تجوری والی دیوار سے لگا بیٹھا تھا اور ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر اول اپنے ساتھی کو ایک طرف لے گیا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم نے کچھ زیادہ ہی سختی کر دی ہے۔ یہ نازک مزاج بزنس مین ہے۔ ہمیں اس کے ساتھ دوسری طرح سے پیش آنا چاہیے۔“

”تم نے کر کے دیکھ تو لیا ہے۔“ دوم نے جھنجلے سے کہا اور کچن کی طرف چلا گیا۔ اول نے اشارے سے سوم کو بلایا اور اسے جمشید کو باہر لے جانے کو کہا۔

”اسے اس کی بیوی کے پاس لے جاؤ۔“

وہ اسے سہارا دے کر لاؤنج میں لے آیا۔ ریحانہ نے بے تابی سے جمشید کو سنبھالا اور اس کا ہاتھ دیکھنے لگی۔ ہتھیلی پر سوجن آگئی تھی یقیناً ہڈی متاثر ہوئی تھی۔ ریحانہ نے اپنے دوپٹے کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر اسے جمشید کی ہتھیلی پر باندھ دیا پھر اس نے اسے کچن سے پانی لا کر پلایا۔ اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ ریحانہ نے آہستہ سے کہا۔ ”تم ان کی بات مان لو... پلیز یہ بہت ظالم ہیں۔“

اول اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ ”جمشید رضی! میری بات غور سے سنو۔ اب تمہارے پاس آخری موقع ہے۔ میں تمہیں صرف پانچ منٹ دوں گا اور اس کے بعد...“

☆☆☆

عین اس وقت شازیہ دبے قدموں اندر آئی تھی۔ اس نے پاس ورڈ ملا کر دروازہ کھولا اور اندر آ کر اسے بند کر کے پاس ورڈ دوبارہ ری سیٹ کر دیا کیونکہ وہ وقت سے پہلے آگئی تھی اس لیے اس نے دس بجے والا پاس ورڈ بھی تبدیل کر دیا۔ دن والے پاس ورڈ کی مدد سے رات کا پاس ورڈ بھی سیٹ کیا جا سکتا تھا۔ یہ بات ریحانہ یا جمشید کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اس طرح بچے رات کا پاس ورڈ اپنی مرضی سے بدل کر رات کو بھی اندر یا باہر آ سکتے تھے لیکن وہ رات کا پاس ورڈ پہلے والا ری سیٹ نہیں کر سکتے تھے اور اس سے پتا چل جاتا کہ کسی نے رات کا پاس ورڈ تبدیل کیا ہے۔ شاید اسی لیے انہوں نے سسٹم کی اس کمزوری کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ دبے قدموں اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ اسے نیچے سے کسی کے تیز تیز لہجے میں بولنے کی آواز آئی۔ وہ ٹھٹک گئی اور پھر سیڑھیوں کے پاس آ کر اس نے ماں کو پکارا۔

”ماما آپ کہاں ہیں؟“

لاؤنج میں ڈرے سہمے بیٹھے ریحانہ اور جمشید شازیہ کی آواز سنتے ہی تڑپ اٹھے۔ ریحانہ نے چیخ ماری۔ ”شازیہ بھاگ... یہاں ڈاکو ہیں۔“

”شازیہ بھاگ جاؤ، گھر سے نکل جاؤ۔“ جمشید بھی چلا رہا تھا۔

”پکڑو اسے۔“ اول نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور پھر پلٹ کر ان دونوں کی طرف آیا۔ اس نے... بیدردی سے ریحانہ کے منہ پر ہاتھ مارا اور وہ پلٹ کر گری۔ اس کی آواز بند ہو گئی۔ مگر اس کی چیخ شازیہ کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ پلٹ کر بھاگی۔ اس کا رخ عقبی حصے والی سیڑھیوں کی طرف تھا۔ وہ وہاں سے نکل کر باہر جا سکتی تھی۔ دوم اور سوم سیڑھیوں سے اوپر آئے اس دوران میں وہ نیچے اتر کر دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے پھرتی سے کوڈ ملا کر دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی جیسے ہی اس نے دروازہ بند کیا دوم وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے جھپٹ کر دروازے کو روکنے کی کوشش کی مگر سیکنڈ کے دسویں حصے کی تاخیر سے وہ ناکام رہا۔ اس نے دانت پیس کر گالی دی اور بلند آواز سے بولا۔ ”وہ پیچھے کی طرف نکل گئی ہے۔“

یہ سنتے ہی اول حرکت میں آگیا۔

شازیہ بھاگتی ہوئی لان کے سامنے والے حصے میں آئی پھر وہ پورچ کی طرف دوڑی جہاں اس کی سرخ شیوی کھڑی تھی۔ ابھی تک اسے کوئی باہر نظر نہیں آیا تھا۔ شازیہ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس محفوظ ترین گھر میں بھی ڈاکو گھس سکتے ہیں۔ اسے ماں کی چیخ یاد آ رہی تھی اور وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو روک رہی تھی۔ کار تک آ کر اس نے محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر تیزی سے اندر گھس گئی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے چابی نکالی۔ اس کار کے بغیر وہ گھر سے نہیں نکل سکتی تھی۔ موبائل کے استعمال کا اسے خیال نہیں آیا تھا۔ ورنہ وہ سیکیورٹی کو کال کر سکتی تھی۔ جمشید نے سب کے موبائل میں سیکیورٹی والوں کا نمبر خاص طور سے فیڈ کیا ہوا تھا۔ ابھی اس نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا تھا کہ سامنے سے اول ریحانہ کو جکڑے ہوئے نمودار ہوا۔ اس نے پستول ریحانہ کے سر سے لگا رکھا تھا۔ ایک منٹ بعد شازیہ اور ریحانہ لاؤنج میں موجود تھیں۔ شازیہ ماں باپ کے درمیان دبکی بیٹھی تھی۔ ریحانہ اپنی چوٹ بھول کر اسے پیار کر رہی تھی اور جمشید نے اسے یوں سختی سے جکڑ رکھا تھا جیسے کسی بلا کو اس تک پہنچنے نہیں دے گا۔ ریحانہ بار بار کہہ رہی تھی۔

”تم کیوں آگئیں میری بچی؟“

”مجھے آنا تھا ماما...“ شازیہ رونے لگی۔ ”آئی ایم سوری... میں چپکے سے گھر سے باہر گئی... آئی ایم سوری ماما...“

ان لوگوں نے اندر لانے سے پہلے شازیہ سے اس کا موبائل اور کار کی چابی لے لی تھی۔ جمشید اور ریحانہ کا موبائل وہ پہلے ہی لے چکے تھے اور گھر کے لینڈ فون کی لائن کاٹ چکے تھے۔ گویا وہ اب کسی طرح سے باہر سے مدد طلب نہیں کر سکتے تھے۔ اول ٹہلتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ دوم حالات قابو میں آنے کے بعد کچن کی طرف متوجہ تھا اور اب وہ ریحانہ کی ڈنر کے لیے تیار کی ہوئی ایک ڈش پلیٹ میں نکال کر چمچ سے کھا رہا تھا۔ سوم ایک طرف مستعد کھڑا تھا۔ اچانک اول تیزی سے ان کی طرف آیا اور غرا کر بولا۔ ”بس کرو یہ فیملی ڈراما... بہت ہو گیا... اب مجھے تجوری کھلی ہوئی چاہیے ورنہ...“ اس نے جمشید کو کالر سے پکڑ کر اٹھایا۔ ”تم نے سارے مواقع کھو دیے ہیں۔ تم سوچ سکتے ہو ہم تمہاری بیوی اور بیٹی کے ساتھ کیا کریں گے اور وہ بھی تمہارے سامنے...“

شازیہ سہم کر ماں کی گود میں گھس گئی۔ ریحانہ نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔

اول اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سرد اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جمشید! تجوری کھول دو۔“

جب جمشید کی طرف سے کوئی ردعمل نہیں ہوا تو وہ اسے دھکیلتا ہوا تجوری تک لایا اور زبردستی اس کا منہ تجوری کی طرف کر دیا۔ ”اسے کھولو... اس سے پہلے کہ وقت تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔“

”پلیز میری بات سنو...“

”مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی ہے۔“ وہ حلق کے بل دھاڑا۔ ”تم میری بات سنو... یہ تجوری کھول دو... ورنہ تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے ساتھ بہت برا ہوگا۔“

☆☆☆

آٹھ بجے جنید کی آخری کلاس بھی ختم ہوئی اور وہ باہر نکلا۔ آرش اور عرفان اسے پارکنگ میں ملے۔ آرش نے پھر اصرار کیا کہ وہ ان کے ساتھ چلے۔ وہ ایک ہائی کلاس اسنوکر کلب جانا چاہتے تھے مگر اس نے انکار کر دیا۔ ”آج ماما نے میری پسند کا ڈنر بنایا ہے اس لیے جانا ضروری ہے۔“

”یار! تیری ماما اچھی ہیں۔“ آرش نے سرد آہ بھری۔ اس کا تعلق ایک صنعت کار گھرانے سے تھا۔ ”میں نے آج تک اپنی ماما کے ہاتھ کا بنا ہوا کچھ نہیں کھایا۔ وہ پکاتی ہی نہیں ہیں۔“

”چل یار! میری ماما کے ہاتھ کا بنا ہوا کھا لے۔“ جنید نے پیشکش کی۔

”آج نہیں...“

”نخرے مت کر، چل۔“ جنید نے اصرار کیا۔ پھر عرفان سے کہا۔ ”تو بھی چل... اسنوکر کلب میرے ہاں سے چلے جانا۔“

جنید کے اصرار پر عرفان اور آرش مان گئے۔ وہ اپنی کاروں میں جنید کے پیچھے روانہ ہوئے۔ راستے میں جنید نے ریحانہ کو کال کی۔ وہ اسے دوستوں کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا موبائل بند تھا۔ جنید نے گھر کے نمبر پر کال کی مگر اس پر بیل جا رہی تھی اور کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے شازیہ کا نمبر ٹرائی کیا اور اسے بھی بند پا کر وہ تشویش زدہ ہو گیا۔ آخر میں اس نے جمشید کا نمبر ملایا، اسے بھی بند پا کر اس نے ان دونوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت وہ سوسائٹی کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اپنی کاریں کنارے پر روک کر وہ نیچے اتر آئے۔ آرش نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”یار! میں گھر کال کر رہا ہوں تو سب کے نمبر بند جا رہے ہیں اور گھر کے فون پر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا ہے۔“

”سب کے نمبر بند ہونا ٹھیک نہیں ہے۔“ عرفان نے کہا۔ ”کوئی پڑوسی ہے جو جا کر دیکھ سکے؟“

”نہیں یار! ہمارے آس پاس جو ایک دو پڑوسی ہیں ان سے تعلق ہی نہیں ہے۔“ جنید نے پریشانی سے کہا۔ ”میں سیکیورٹی والوں سے پوچھتا ہوں۔“

جنید نے سیکیورٹی سینٹر کال کی۔ وہاں سے اسے بتایا

کہ اس کے گھر سے کوئی سیکیورٹی وارننگ نہیں ملی ہے اور نہ ہی کوئی الارم بجا ہے۔ جشید نے کال ختم کر کے ان دونوں سے کہا۔ ”سیکیورٹی سے تو کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔“

”ہم خود چلتے ہیں۔“ آرش کار کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”ویسے بھی کچھ دیر کا سفر رہ گیا ہے۔“

☆☆☆

جشید تجوری پر اپنا مضروب ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ اس کا چمکیلا گول دروازہ سامنے تھا۔ تقریباً ڈیڑھ فٹ قطر کا خالص فولاد کا بنا ہوا یہ دروازہ تقریباً چھ انچ موٹی چادر کا تھا اور اس کا اپنا وزن دو سو کلوگرام سے زیادہ تھا۔ اسے سوائے ڈیجیٹل پیڈ پر نمبر ملائے بغیر کسی اور طریقے سے نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ اگر کسی وجہ سے ڈیجیٹل پیڈ خراب ہو جاتا تو صرف اسی کمپنی کا ماہر آ کر اسے بدل سکتا تھا۔ یہ ماہر دبئی سے آتا اور اس کی.... آمد و رفت اور مرمت کے تمام اخراجات جشید کو ادا کرنے پڑتے۔ اسے دیوار میں اس طرح فکس کیا گیا تھا کہ سامنے صرف اس کا دروازہ تھا۔ تجوری کا الارم سسٹم گھر کے مرکزی سیکیورٹی سسٹم سے ملا ہوا تھا۔ اگر اسے کاٹنے یا توڑنے کی کوشش کی جاتی تو سوسائٹی کے مرکزی کنٹرول روم میں الارم بجتا۔ تیز ترین شعلہ بھی اسے نصف گھنٹے سے پہلے نہیں کاٹ سکتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ڈاکو بغیر ویلڈنگ ٹارچ کے آئے تھے اور جشید سے تجوری کھلوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ تو واضح تھا کہ وہ سیکیورٹی سسٹم کے بارے میں سب جانتے تھے۔ اس لیے پہلے سے طے شدہ پلان پر عمل کر رہے تھے۔ انہیں کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ جب تک کہیں کوئی الارم نہیں بجتا سب ٹھیک تھا۔ جشید کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ تکلیف اور شاید ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پھر وہ اول کی طرف پلٹا اور مضبوط لہجے میں بولا۔ ”میں تجوری نہیں کھولوں گا۔“

اول کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ وہ پلٹا اور تیز قدموں سے ریحانہ اور شازیہ کی طرف بڑھا۔ جشید نے اس کے پیچھے آنے کی کوشش کی لیکن دوم جو وہیں تھا، اس نے جشید کو گھونسا مارا اور وہ دیوار کے پاس جا گرا۔ وہ بہت طاقتور آدمی تھا اور اس کا ہاتھ بھی قوت سے لگا تھا۔ جشید کی ناک سے بھی خون بہہ نکلا تھا۔ ریحانہ یہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ چلائی مگر اسے اس سے زیادہ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ اول نے اسے جھٹکے سے پکڑ کر اٹھایا۔ شازیہ اس سے الگ ہو گئی تھی۔ اس نے دوبارہ ماں سے لپٹنے کی کوشش کی لیکن اول نے ایک دھکے سے اسے دور پھینک دیا۔ شازیہ وہیں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ ریحانہ بولی۔ ”پلیز...“

”بکواس مت کرو۔“ اول غرایا۔ ”میں نے تمہیں بہت موقع دیا ہے لیکن اب... تمہارے شوہر کو بتانا پڑے گا کہ اس کی ہٹ دھرمی کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔“

وہ ریحانہ کو دھکیلتا ہوا اوون تک لایا۔ اس نے بٹن دبا کر اس کے چولہے جلا دیے اور ریحانہ کی گردن سامنے سے پکڑ کر اس کا سر چولہے کی طرف جھکانے لگا۔ جشید دور سے دیکھ رہا تھا اور شازیہ فرش پر سہمی پڑی سسک رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی ماں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اول نے ریحانہ کو مضبوطی سے پکڑنے کے لیے اپنا پستول کمر پر بیلٹ میں اڑس لیا تھا اور اب پوری قوت سے ریحانہ کا سر چولہوں کی طرف جھکا رہا تھا۔ وہ شعلوں سے بچنے کے لیے زور لگا رہی تھی۔ اول نے ایک ہاتھ سے گردن اور دوسرے ہاتھ سے اس کا دایاں بازو تھام رکھا تھا۔ ریحانہ کا جسم کمان کی طرح مڑ رہا تھا۔ اس کا صرف دایاں ہاتھ آزاد تھا اور وہ اسے پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اول اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ وہ غراتے ہوئے بولا۔ ”اگر تمہارے شوہر نے تجوری نہیں کھولی تو میں پہلے تمہیں اور پھر تمہاری بیٹی کو اسی طرح جلا کر مار دوں گا۔“

ریحانہ کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ اپنا سر چولہوں سے دور رکھے۔ ان سے اٹھتی آنچ اس کے بالوں تک آ رہی تھی اور وہ چرمرا رہے تھے۔ ان کے جلنے کی بو ریحانہ کی ناک تک آ رہی تھی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ وہ اسے نہیں روک سکتی تو وہ اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگی کہ کوئی چیز اس کے ہاتھ میں آ جائے اور وہ اس سے اپنا دفاع کر سکے۔ مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ جشید دور سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا لیکن دوم نے پھر مکا مار کر اسے گرا دیا اور اشارے سے کہا کہ وہ اپنی جگہ رہے۔ البتہ اس بار اس نے ہاتھ ہلکا رکھا تھا۔ جشید نے ناک سے بہتے خون کو آستین سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”پلیز اسے کچھ مت کہو۔“

”یہ آغاز ہے، اس کے بعد تمہاری بیٹی کی باری آئے گی۔“ دوم بولا۔ ”تم یہ سب نہیں دیکھنا چاہتے تو تجوری کھول دو۔“

جشید کو غصہ آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں تجوری نہیں کھول سکتا۔ تم ہم سب کو مار سکتے ہو لیکن مجھ سے یہ کام نہیں کروا سکتے۔“

”فکر مت کرو، میرا ساتھی تمہاری بیوی کو قتل نہیں کر رہا۔ وہ صرف ذرا اسے جلا رہا ہے اس کے بال اور شاید چہرہ جل جائے اور تمہیں ساری عمر ایک بدصورت بیوی کے ساتھ گزارہ کرنا پڑے۔ اگر نہیں کر سکتے تو دوسری شادی...“

”خبردار۔“ اچانک ریحانہ کی آواز آئی۔ اس نے اول کا پستول اس کے سر سے لگا رکھا تھا۔ جب وہ کسی چیز کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی تو اچانک اسے نقاب پوش کے پستول کا خیال آیا۔ اس نے بایاں گھٹنا اٹھا کر اس کی ناف تلے مارا اور جب وہ کراہ کر جھکا تو ریحانہ نے عقب میں ہاتھ مار کر اس کا پستول نکال لیا تھا۔ جب تک وہ خود کو سنبھالتا، ریحانہ پستول اس کے سر سے لگا چکی تھی اور خود اس کے عقب میں آ گئی۔ اس نے چلا کر کہا۔ ”خبردار... میں اسے شوٹ کر دوں گی۔“

دوم اور سوم دونوں ہی چونک گئے۔ دوم اپنا پستول تانے ہوئے دفتر سے باہر لاؤنج میں آ گیا اور سوم نے شاٹ گن شازیہ کے سر سے لگا دی۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ”پستول واپس کر دو... تم اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکو گی۔ اگر تم نے گولی چلائی تو میں تمہاری بیٹی کو گولی مار دوں گا اور میرا ساتھی تمہیں گولی مار دے گا۔“

”بکومت، میں اسے مار دوں گی ورنہ تم دونوں ہتھیار پھینک دو... جلدی۔“ ریحانہ چلائی۔ مگر ان دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ دوم بدستور اس پر پستول تانے ہوئے تھا اور سوم کی شاٹ گن شازیہ کے سر سے لگی تھی۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اول نے سکون سے کہا۔ وہ بالکل بھی ہراساں نہیں لگ رہا تھا۔ ”ہمارے لیے ہیرے اہم ہیں، ہم میں سے کسی کی جان اہم نہیں ہے۔ میری جان بچانے کی خاطر یہ ہتھیار نہیں پھینکیں گے۔“

ریحانہ کانپ رہی تھی لیکن اس کا پستول والا ہاتھ ساکت تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ غلاف پوش ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بے شک اس نے ایک آدمی پر قابو پا لیا تھا مگر باقی دو آزاد تھے اور گولی چلانے کے لیے تیار بھی تھے۔ اس نے کن انکھیوں سے شازیہ کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”ٹھیک ہے، میں پستول واپس کر دوں گی لیکن میری شرط یہ ہے کہ میری بیٹی کو باہر جانے دو۔“

”یہ سیکیورٹی کو خبردار کر دے گی۔“ اول غرایا۔ ”تم لوگ اسے نہیں جانے دینا۔“

”تم چپ رہو۔“ ریحانہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ”شازیہ کسی کو نہیں خبردار کرے گی کیونکہ یہاں ہم تمہارے رحم و کرم پر ہوں گے۔ اگر سیکیورٹی والے آئے تو تم ہمیں بھی مار دو گے۔ اسے جانے دو، دوسری صورت میں میں تمہیں مار

دوں گی اور کسی بھی شیشے پر صرف ایک فائر کافی ہوگا، اس کے بعد سیکیورٹی والوں کو یہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ انہیں آنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگتے۔"

"یہ... یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" سوم نے کہا۔ اس کی شاٹ گن شازیہ کے سر سے ہٹ گئی۔

دوم نے اول کی طرف دیکھا۔ "کیا کہتے ہو؟"

"ٹھیک ہے۔" اول نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا اور شازیہ سے بولا۔ "میں تمہیں جانے دے رہا ہوں لیکن یہ بات یاد رکھنا، اگر تم نے سیکیورٹی، پولیس یا کسی کو بھی خبردار کیا تو تمہارے ماں باپ تمہیں زندہ نہیں ملیں گے۔"

"میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔" شازیہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

"اسے جانے دو۔" اول نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ سوم نے پہلے ہی شاٹ گن ہٹالی تھی لیکن دوم بدستور پستول تانے رہا۔ اول کچھ دیر بعد غرایا۔ "میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

دوم نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں ہے۔"

"تب تم لڑکی اور اس کے باپ کو شوٹ کردو۔ جب یہ مجھے ماردے تو اسے بھی شوٹ کردینا اور خالی ہاتھ فرار ہوجانا۔" اول کے لہجے میں طنز آگیا۔ اس پر دوم کا ہاتھ جھک گیا۔

"تمہاری مرضی... باس تم ہو۔"

"سارا ملبا مجھ پر مت ڈالو... جو ہوگا سب کے ساتھ ہوگا۔" اول بولا۔ "اچھا یا برا... اب اسے جانے دو۔"

شازیہ اٹھ کر ماں کے پاس آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ ریحانہ نے اسے پیار کیا۔ "تم یہاں سے نکل جاؤ اور جب تک ہماری طرف سے کال نہ آئے گھر آنے کی کوشش مت کرنا۔ کسی طرح جنید کو بھی آنے سے روکنا مگر اسے اصل بات مت بتانا۔ یاد رکھنا اگر یہاں پولیس یا سیکیورٹی آئی تو ہمارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

شازیہ نے سر ہلایا۔ "میرا موبائل اور کار کی چابی ان لوگوں کے پاس ہے۔"

"اسے موبائل نہیں ملے گا۔" اول نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ہاں کار کی چابی مل سکتی ہے۔"

سوم نے چابی نکال کر شازیہ کی طرف اچھال دی۔ شازیہ چابی لیتی ہوئی باپ کی طرف آئی۔ کچھ دیر اس سے لپٹی رہی پھر اس نے سامنے والے دروازے سے باہر کا رخ کیا۔ ریحانہ اول کو ساتھ لیے ہوئے کچن کی پورچ کی طرف کھلنے والی کھڑکی تک آئی اور اس نے ونڈو بلائنڈ سرکا کر باہر جھانکا۔ وہ پوری طرح محتاط تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ موقع حاصل کیا تھا اور وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ شازیہ گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور گیٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔ اول نے نرمی سے کہا۔ "اب پستول واپس کردو۔"

مگر ریحانہ نے کچھ اور سوچا ہوا تھا۔ اس نے اچانک پستول کا رخ دروازے کے ساتھ موجود گلاس وال کی طرف کیا اور فائر کردیا۔ گولی لگتے ہی شیشہ چکنا چور ہوگیا تھا۔ یہ مخصوص گیس گلاس تھا جو پھٹ کر چھوٹے چھوٹے ذرات میں بدل جاتا ہے۔ فائر کرتے ہی اس نے پستول دور پھینک دیا۔ اول کے منہ سے گالی نکلی۔ "کتیا..." اس نے گھومتے ہوئے ریحانہ کو بہت قوت سے گھونسا مارا۔ وہ فرش پر جاگری اور بے سدھ ہوگئی۔ اول دروازے کی طرف لپکا اور اس نے دھاڑ کر سوم سے کہا۔ "سسٹم سے گیٹ لاک کردو... جلدی۔"

سوم کچن کے ساتھ لگے سیکیورٹی سسٹم کے کنٹرول پینل کی طرف لپکا۔ اس نے چند بٹن دبائے اور اسکرین پر گیٹ کا منظر آگیا۔ شازیہ کی کار اس کے سامنے آگئی تھی لیکن ابھی اس نے گیٹ نہیں کھولا تھا۔ اس نے تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں اور پھر انٹر کا بٹن دبایا۔ اس نے پلٹ کر اول کی طرف دیکھا۔ "گیٹ لاک ہوگیا ہے۔ اب یہ باہر نہیں جاسکے گی۔"

"لڑکی کو واپس لے آؤ، وہ اندر ہی ہے۔" اول نے اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھی تیزی سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد غلاف پوش جمشید کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ دفتر سے نکل آیا تھا اور ریحانہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ضرب نے اسے عارضی طور پر بے ہوش کردیا تھا۔ جمشید نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم لوگ انسانیت سے عاری ہو۔"

"ہم ڈاکو ہیں۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "تم ہم سے انسانیت کی توقع نہیں کرسکتے ہو۔"

"مجھے پانی لانے کی اجازت دو۔" جمشید نے کہا۔ "تم نے بہت بے رحمی کا مظاہرہ کیا ہے۔"

اول چپ ہوگیا۔ شاید اسے اپنی ضرورت سے ... سختی کا احساس ہوا تھا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ عورت نے ... کی توقع کے برخلاف مزاحمت کی تھی اور ایک موقع پر وہ اس پر حاوی ہوگئی تھی اگر اس کے ساتھی اپنے جذبات قابو میں نہ رکھتے تو ان کا منصوبہ ناکام بھی ہوسکتا تھا۔ مگر انہوں نے ... ہوشیاری سے اپنا دباؤ برقرار رکھا اور بالآخر عورت کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا۔ مگر اس نے عین موقع پر چالاکی سے فائر کرکے شیشہ توڑ دیا اور اس کے نتائج سامنے آسکتے تھے۔ یہ بات یقینی تھی کہ سوسائٹی کے سینٹرل کنٹرول روم میں الارم بج گیا ہوگا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "پڑے رہنے دو، اسے پانی نہیں ملے گا۔"

"دیکھو ابھی اس فائر کے نتیجے میں سیکیورٹی والے یہاں رابطہ کریں گے اور اس سلسلے میں تمہیں میری مدد کی ضرورت ہوگی اس لیے اگر تم چاہتے ہو کہ سیکیورٹی والے یہاں نہ آئیں... اس لیے مجھے پانی دو۔" جمشید نے آخری الفاظ چیخ کر کہے تھے۔

اول نے سوچا اور کچن کے سنک سے ایک گلاس میں پانی لاکر جمشید کو دیا۔ "اس فائر کا کیا نتیجہ نکلے گا؟"

"سیکیورٹی کنٹرول سینٹر میں الارم بجنے لگا ہوگا اور کسی وقت بھی ان کی طرف سے کال آجائے گی۔"

"الارم پروٹوکول کیا ہے؟"

"وہ شاید اس دراز میں رکھا ہے۔ سیکیورٹی مینول ہے۔" جمشید نے کچن کی ایک دراز کی طرف اشارہ کیا اور ریحانہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ اول دراز سے مینول نکال کر دیکھنے لگا۔ وہ شازیہ کی طرف سے بے فکر دکھائی دے رہا تھا جیسے اسے اعتماد ہو کہ اس کے ساتھی لڑکی کو نکل کر جانے نہیں دیں گے۔

☆☆☆
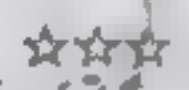
شازیہ کار لے کر بھاگی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ باہر نکل کر کیا کرے گی۔ اس کا موبائل چھین لیا گیا تھا لیکن اسے کسی طرح سے جنید سے رابطہ کرنا تھا۔ اسے خیال آیا کہ وہ سوسائٹی کے گیٹ کے پاس چلی جائے اور وہیں رک کر جنید کا انتظار کرے۔ تاریکی چھا چکی تھی لیکن وہاں روشنی ہوتی اور جنید کی کار اس کی نظروں میں آجاتی۔ بنگلے کا گیٹ پاس آتے ہی اس نے گیٹ کھولنے والا بٹن دبایا لیکن گیٹ نہیں کھلا۔ اس نے دوبارہ اور پھر بار بار بٹن دبایا مگر گیٹ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اندر موجود ڈاکوؤں نے سسٹم کی مدد سے گیٹ بند کردیا ہے۔ اب وہ ریموٹ سے بھی نہیں کھلتا جب تک سسٹم سے ... وہ گھبرا گئی، ڈاکو اسے دوبارہ پکڑ سکتے تھے۔ وہ کار سے اتر آئی اور تیزی سے ایک طرف موجود درختوں میں گھس گئی۔ وہ ان کی آڑ میں آگے بڑھ رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ ایک طرف مالی کے کام کے لیے سیڑھی رکھی تھی، وہ اس پر چڑھ کر بلند درختوں کی اضافی شاخیں کاٹتا تھا۔ وہ اس سیڑھی کی مدد سے اوپر دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود سکتی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی سیڑھی اور اوزاروں والے شیڈ تک آئی۔ یہاں المونیم کی تہ ہوجانے والی سیڑھی موجود تھی۔ وہ اسے کھینچتی ہوئی دیوار تک لائی اور پھر اسے کھول کر دیوار سے لگایا۔ مگر ابھی اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ پستول کی نال اس کی گردن سے آلگی۔

"بس گڑیا..." دوم بولا۔ "تم نے بہت بھاگ دوڑ کرلی، اب ذرا آرام کرو۔"

کامیابی کے اتنے پاس آکر ناکامی نے شازیہ کو رلا دیا۔ اس نے التجا کی۔ "پلیز..."

مگر وہ لوگ ان پر رحم کھانے نہیں آئے تھے۔ دوم اسے کھینچ کر اندر لے آیا جہاں جمشید ریحانہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ کراہنے لگی۔ شازیہ تیزی سے ان کی طرف آئی۔ جمشید اسے دیکھ کر شاک میں رہ گیا۔ "شازی! تمہیں پھر پکڑلیا ہے ان لوگوں..."

"سوری پاپا! میں نکل نہیں سکی۔" شازیہ نے روہانسے لہجے میں کہا۔ "انہوں نے گیٹ لاک کردیا ہے۔"

شیشے کی ٹوٹی دیوار اور ماں کی حالت نے اسے بتادیا تھا کہ یہاں بہت کچھ ہوچکا ہے۔ ریحانہ کے ماتھے پر بائیں جانب ہلکا سا ورم آگیا تھا۔ جمشید چیک کررہا تھا، اس کی نبض بہتر تھی اور وہ ہوش میں آرہی تھی۔ اول سسٹم کنٹرولر کے پاس کھڑا ہوا اس کی اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس پر کال آنے لگی۔ بیل کی آواز سن کر اس نے جمشید کی طرف دیکھا۔

"سینٹر سے کال آرہی ہے۔ اگر میں ریسیو نہ کروں تو کیا ہوگا؟"

"چند منٹ بعد سیکیورٹی کی گاڑی یہاں پہنچ جائے گی۔" جمشید نے کہا۔ "کیا میں بات کروں؟"

"نہیں، میں خود بات کروں گا۔" اول نے کہا اور سسٹم کے ساتھ لگا، تک اٹھا کر منہ کے پاس لایا۔

"یس۔"

"مسٹر جمشید؟" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"بات کررہا ہوں۔" غلاف پوش نے کسی قدر ہچکچا کر کہا۔

"سینٹر میں آپ کے گھر پر بریکنگ الارم کا نشان آرہا ہے... کیا کوئی مسئلہ ہوا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "یہاں تو کچھ نہیں ہوا ہے۔"

"تب پلیز ہائی پاس سیکیورٹی پاس ورڈ کی تصدیق کر

دیں تاکہ الارم ڈی ایکٹی ویٹ کیا جاسکے۔‘‘
’’سوری، پاس ورڈ میرے ذہن میں نہیں ہے۔‘‘
’’اس صورت میں ہمارا آدمی آکر آپ سے سائن لے گا۔‘‘ کال آپریٹر نے کہا۔ ’’تیسری صورت یہ ہے کہ پولیس کو اطلاع کی جاتی ہے اور اس کی طرف سے تصدیق کے بعد یہاں الارم ڈی ایکٹی ویٹ کیا جائے گا۔‘‘
’’ایک منٹ میں اپنی بیوی یا بیٹی سے معلوم کرتا ہوں، شاید ان کو بائی پاس سیکیورٹی پاس ورڈ یاد ہو۔‘‘
اول مائک ہینگ کرکے ان کے پاس آیا۔ سیکیورٹی پستول بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے جمشید سے کہا۔ ’’سیکیورٹی کو بائی پاس کرنے والا سیکیورٹی کوڈ کیا ہے؟‘‘
’’کوڈ میں جانتی ہوں۔‘‘ شازیہ نے جلدی سے کہا تو جمشید نے چونک کر اسے دیکھا کیونکہ اس کے خیال میں بائی پاس سیکیورٹی کوڈ صرف اس کے علم میں تھا اور اس نے کسی کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اول نے شازیہ کا بازو پکڑ کر اسے اٹھایا اور کھینچ کر سسٹم کنٹرولر کی طرف لے گیا۔ اس نے پستول کی نال شازیہ کے سر سے لگائی اور بولا۔
’’میں بھی سنوں گا اگر تم نے غلط پاس ورڈ بتایا اور کال آپریٹر نے اس سے انکار کیا تو میں کال کاٹ کر تمہارا بھیجا اڑا دوں گا۔‘‘
شازیہ کا رنگ سفید ہوگیا لیکن اس نے ہمت کرکے سر ہلایا۔ اول نے مائک اٹھا کر آپریٹر سے کہا۔ ’’میری بیٹی سے بات کرو، یہ پاس ورڈ جانتی ہے۔‘‘
شازیہ نے مائک لیا اور آہستہ سے بولی۔ ’’مجھے بھی ٹھیک سے یاد نہیں ہے لیکن شاید پاس ورڈ ہے روبر...‘‘
اول نے چونک کر اسے دیکھا اور پستول سختی سے اس کے سر سے لگا دیا۔ شازیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کانپتے لہجے میں کہا۔ ’’پلیز یہی پاس ورڈ ہے نا... پلیز... پلیز۔‘‘
دوسری طرف خاموشی تھی پھر کچھ دیر بعد کال آپریٹر نے کہا۔ ’’جی یہی پاس ورڈ ہے شکریہ۔ میں الارم ڈی ایکٹی ویٹ کررہا ہوں۔ کل کسی وقت ہمارا آدمی آکر سسٹم چیک کرے گا۔‘‘
کال ختم ہوئی تو شازیہ نے اطمینان کا سانس لیا اور واپس ماں باپ کے پاس آگئی۔ اس نے جھوٹ کہا تھا۔ اسے پاس ورڈ کا علم نہیں تھا مگر اسے امید تھی کہ وہ روبر یعنی ڈاکو کہے گی تو سیکیورٹی والے سمجھ جائیں گے۔ انہوں نے پاس ... ن لیا، یعنی وہ سمجھ گئے تھے۔ اول نے جمشید سے کہا۔ ’’میرا خیال ہے تم نے کافی سوچ لیا ہے اور اب تم تجوری کھولنے کے لیے تیار ہوگئے ہوگے۔‘‘
’’یہ اتنی شرافت سے نہیں مانے گا۔‘‘ دوم نے کہا۔ ’’جب تک اس کی بیوی اور بیٹی کو اس کے سامنے...‘‘
’’ایسا کچھ نہیں ہوگا۔‘‘ سوم نے اس کی بات کاٹی۔ ’’تم انہیں قتل کرسکتے ہو لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔‘‘
’’تب تجوری کھلوالو۔‘‘ دوم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ’’اس شخص کو اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی پروا ہوتی تو یہ پہلے ہی تجوری کھول چکا ہوتا۔‘‘
’’یہ کھولے گا۔‘‘ اول نے خطرناک لہجے میں کہا۔ ’’ٹھیک ہے، ہم اس کی بیوی اور بیٹی سے کوئی غلط سلوک نہیں کریں گے لیکن اگر اس نے تجوری نہیں کھولی تو ہم انہیں قتل کر دیں گے۔ تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں مسٹر جمشید... اگر تم نے دس منٹ میں تجوری نہیں کھولی تو پہلے میں تمہاری بیوی کو قتل کروں گا اور اس کے پانچ منٹ بعد تمہاری بیٹی کو... پھر ہم تمہارے بیٹے کے گھر آنے کا انتظار کریں گے اور اس وقت بھی تمہیں پانچ منٹ کی مہلت دی جائے گی۔ آخر میں تم نشانہ بنو گے۔ کیا تم میری بات سے متفق ہو؟‘‘
جمشید ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اول اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اچانک اس نے ہاتھ سیدھا کیا اور جمشید کی ٹانگ میں گولی اتار دی۔ اس کی دھاڑ کے ساتھ ریحانہ اور شازیہ کی چیخیں بھی گونجی تھیں۔ ریحانہ تقریباً ہوش میں آگئی تھی۔ جمشید اپنے ہاتھوں سے ران کو دبائے ہوئے تھا جہاں گولی لگی تھی اور خون پھوٹ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ران اور اس کے آس پاس کا شفاف فرش سرخ ہوگیا تھا۔ شازیہ روتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے خون روکنے کی کوشش کررہی تھی۔ ریحانہ بہ مشکل اٹھ کر اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے اپنے باقی دوپٹے کو گدی بنا کر جمشید کے زخم پر رکھ دیا تھا۔ گولی چلانے کے بعد اول خاموشی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے مزید کچھ نہیں کیا اور نہ ہی شازیہ اور ریحانہ کو کچھ کرنے سے روکا۔ ریحانہ روتے ہوئے اب جمشید کا رومال اس کے زخم پر باندھ رہی تھی۔ اس نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ ’’جمشید پلیز! یہ جو چاہتے ہیں انہیں دے دو... ورنہ یہ ہم سب کو مار دیں گے۔ تم اتنی ضد کیوں کررہے ہو؟‘‘
’’مسز جمشید کا مشورہ مناسب ہے۔‘‘ اول نے نیم سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ’’ان کا خدشہ بھی درست ہے۔ میری دی ہوئی مہلت میں اب صرف نو منٹ باقی رہ گئے ہیں۔‘‘
’’جمشید پلیز... پلیز انہیں دے دو۔‘‘
شازیہ نے التجائیہ لہجے میں اول سے کہا۔ ’’پلیز پاپا کے زخم کی پٹی کرنے دو۔‘‘
’’یہ مرے گا نہیں۔‘‘ اس نے بے رحمی سے کہا۔ ’’تم اس کی نہیں اپنی فکر کرو۔ تمہاری ماں اور موت کے درمیان اب آٹھ منٹ کا وقت باقی رہ گیا ہے۔‘‘
آٹھ بج چکے تھے اور جنید کسی وقت بھی گھر آنے والا تھا۔ ریحانہ نے جمشید کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ اپنی تکلیف پر کسی حد تک قابو پاچکا تھا مگر اس کے چہرے سے پسینا پھوٹ نکلا تھا۔ ریحانہ نے کہا۔ ’’جنید کے گھر آنے کا وقت ہوگیا ہے۔ اگر وہ آگیا تو وہ بھی اسی خطرے میں آجائے گا جس میں اس وقت ہم ہیں۔ اس لیے اس کے آنے سے پہلے کوئی فیصلہ کرو۔ معاملے کو آر کرو یا پار مگر اس طرح لٹکا کر مت رکھو۔‘‘ ریحانہ کا لہجہ کانپنے لگا۔ ’’یا تو ان کو تجوری کھول کر دے دو یا پھر صاف انکار کردو۔‘‘
جمشید خاموش رہا۔ ریحانہ اس کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جمشید نے آہستہ سے کہا۔ ’’یہ ہم میں سے کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔‘‘
’’تمہاری ضد برقرار رہی تو شاید ایسا ہی ہو۔‘‘ ریحانہ نے تلخی سے کہا۔ ’’کیا اس گولی سے بھی تمہیں سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ یہ لوگ کتنے سنجیدہ ہیں؟‘‘
’’سات منٹ۔‘‘ اول نے اعلان کیا۔
’’میں وہ ہیرے نہیں دے سکتا۔‘‘ جمشید نے سرگوشی میں کہا۔
’’ٹھیک ہے۔‘‘ ریحانہ نے کہا اور کھڑی ہوگئی۔ اس نے باری باری تینوں نقاب پوشوں کی طرف دیکھا۔ ’’میرا شوہر ان ہیروں کے لیے ہمیں قربان کرنے کو تیار ہے۔‘‘
’’اس صورت میں اس منٹ پورے ہونے کے بعد تم اس دنیا میں نہیں رہوگی۔‘‘ اول نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔
جمشید فرش پر لیٹ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ خون بہنے سے اسے نقاہت محسوس ہورہی تھی۔ اول رہ رہ کر گزرتے منٹس کا اعلان کررہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ’’ایک منٹ باقی رہ گیا ہے... خاتون! اگر تم کوئی وصیت کرنا چاہتی ہو یا اپنے شوہر اور بیٹی سے کوئی بات کرنا چاہتی ہو تو کرلو کیونکہ میں ایک منٹ پورا ہوتے ہی تمہیں گولی ماردوں گا۔‘‘
’’نہیں۔‘‘ شازیہ چلائی۔ ’’میری ماما کو مت مارو۔‘‘
وہ آکر ریحانہ سے لپٹ گئی۔ اول نے پستول ریحانہ کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ’’اپنی بیٹی کو پیچھے کرلو ورنہ ہوسکتا ہے اسے کوئی نقصان ہو۔‘‘
’’شازی... پیچھے جاؤ۔‘‘ ریحانہ نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اول نے پستول سیدھا کرلیا۔ اس نے سچ مچ ریحانہ کو شوٹ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ جمشید رضی اس قدر سخت جان اور ضدی نکلے گا۔ قتل ان کے پروگرام میں شامل نہیں تھا مگر وہ طے کرکے آئے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا، بیل کی آواز آئی۔ کوئی مین گیٹ پر موجود تھا۔ وہ تینوں تشویش زدہ ہوگئے۔ سوم نے کہا۔ ’’یہ کون آگیا؟‘‘
اول کنٹرول پینل کی طرف آیا۔ اس نے اسکرین پر دیکھا اور تشویش زدہ ہوگیا۔ ’’باہر ایک سیکیورٹی والا ہے۔‘‘
یہ سیکیورٹی والا کیونکہ اصلی تھا اس لیے وہ مین گیٹ پر لگے کیمرے کے سامنے یوں کھڑا تھا کہ اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ یقیناً شازیہ کی عقل مندی کی وجہ سے آیا تھا۔ اول نے انٹرکام کا بٹن دبا کر مائک اٹھا لیا۔ ’’کیا بات ہے؟‘‘
’’جناب! میں سیکیورٹی کی طرف سے آیا ہوں۔ سینٹر میں اس بنگلے کا الارم آن ہوا تھا لیکن رابطے پر سب ٹھیک پایا گیا اس لیے گھر کے افراد میں سے کوئی باہر آکر سائن دے دے۔‘‘
’’لیکن سینٹر سے کہا گیا تھا کہ کل کسی کو بھیجا جائے گا۔‘‘
’’مجھے پتا نہیں ہے۔ مجھ سے کہا گیا تو میں یہاں آگیا۔‘‘
’’بہتر ہے تم کل آنا۔‘‘
’’آپ مسٹر جمشید بات کررہے ہیں؟‘‘
’’ہاں، میں جمشید رضی ہوں۔‘‘
’’مسٹر جمشید! آپ کو معلوم ہوگا اگر مجھے سائن نہیں ملا تو مجبوراً ہمیں پولیس کو اطلاع دینی ہوگی۔ یہ سیکیورٹی پروٹوکول میں شامل ہے۔ پھر اس معاملے کو پولیس کلیئر کرے گی۔‘‘
اول نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ دوم اس کے پاس آیا۔ ’’اسے ہینڈل کرنا ہوگا ورنہ یہ پولیس کو اطلاع کر دے گا اور پولیس آگئی تو ہم سب مارے جائیں گے۔‘‘
اول نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ’’ہینڈل کون کرے گا؟‘‘
’’ظاہر ہے تم۔‘‘ دوم نے کہا۔ اول سوچ میں پڑ گیا۔ وہ شاید تجزیہ کررہا تھا کہ اگر اس نے گارڈ کو اندر آنے کی اجازت دی اور کوئی گڑبڑ ہوئی تو اسے کیا کرنا ہوگا۔ مگر اسے اندر بلانا ہی تھا۔ دوسری صورت میں پولیس آجاتی۔ فیصلہ کرکے اس نے انٹرکام کا بٹن دبایا اور کہا۔

سوم نے آکر تیزی سے کنٹرول سسٹم سے گیٹ لاک ختم کیا اور گیٹ کھل گیا۔ اول کے اشارے پر جشید، ریحانہ اور شازیہ کو تجوری والے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ دوم ان کے سر پر تھا۔ دروازے سے فرش پر پھیلا ہوا خون نظر نہیں آتا اس لیے اول کو اس کی فکر نہیں تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر چڑھا غلاف اتار دیا۔ وہ دروازے تک آیا اور اس نے پاس ورڈ لگا کر دروازہ ذرا سا کھولا۔ چند لمحے بعد سیکیورٹی والا اس کے سامنے تھا۔ وہ اسے دیکھ کر چونکا۔ "آپ مسٹر جشید ہیں؟"

"ہاں۔" اس نے اقرار کیا تو سیکیورٹی گارڈ کا ہاتھ تیزی سے اپنے شانے پر ٹنگی گن کی طرف گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گن اتارتا، ایک فائر ہوا اور گارڈ کے ماتھے میں سوراخ ہو گیا۔ وہ پلٹ کر پیچھے جا گرا اور اس کے ماتھے سے اڑنے والا خون اول کے چہرے تک آیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سوم پستول تانے کھڑا تھا اور اس کی نال سے دھواں نکل رہا تھا۔ اول نے چہرے سے خون صاف کیا اور چلایا۔ "کتے کے بچے... یہ کیا کیا؟"

"یہ جشید کو پہچانتا تھا۔" سوم نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ "اس نے گن اتارنے کی کوشش کی تھی۔ اگر میں دیر کرتا تو یہ تمہیں شوٹ کر دیتا۔"

اول غصے میں تھا۔ "میں اسے سنبھال لیتا، اسے قتل کرنا ضروری نہیں تھا۔"

"وہ مجھے پہچان لیتا کیونکہ میرا ساتھی تھا۔" اس بار سوم نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میرے ساتھ برسوں سے کام کر رہا تھا۔"

"اب اس کا کیا کرنا ہے؟" اول نے کچھ دیر بعد کہا، اس کا لہجہ مدھم ہو گیا۔

"اسے اندر لے آتے ہیں، کچن میں ڈال دیں گے۔ میں یہ خون صاف کرتا ہوں۔" سوم نے تجویز پیش کی اور اول نے اس سے اتفاق کیا۔ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ دونوں گارڈ کی لاش کھینچتے ہوئے اندر لائے۔ اس قتل نے صورت حال کو اچانک سنگین کر دیا تھا۔ اندر آنے سے پہلے انہوں نے غلاف پہن لیے تھے۔ لاش کچن کاؤنٹر کے پیچھے کر کے سوم نے سنک کے نیچے سے صفائی کا سامان نکالا اور دروازے کے سامنے فرش پر پھیلا ہوا خون صاف کرنے لگا۔ جشید، ریحانہ اور شازیہ کے چہرے زرد ہو گئے تھے۔ انہوں نے دیکھا نہیں تھا مگر گولی چلنے کی آواز سنی تھی اور پھر ان لوگوں کی آپس کی گفتگو سے اندازہ ہوا تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔ وہ ان

لے گئے تھے اور پھر سوم صفائی کرنے لگا تھا۔ دوم اس دوران میں دفتر کے دروازے کے پاس مستعد کھڑا تھا۔ جشید نے آہستہ سے کہا۔ "اسے کیسے معلوم کہ صفائی کا سامان کہاں رکھا ہوتا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے، یہ اس گھر کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں۔"

ریحانہ نے جوابی سرگوشی کی۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ یہ لڑکا سوسائٹی کی طرف سے سسٹم اپ گریڈ کرنے آیا تھا۔ اس نے کچھ دیر پہلے نقاب اتارا تھا اور مجھے فریج کی سطح پر اس کے نقوش دیکھنے کا موقع ملا اور یہ مجھے بالکل ویسا ہی لگ رہا ہے۔ مگر یہ بات ان کے سامنے مت کرنا ورنہ ہماری زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گے۔ یہ قاتل صفت لوگ ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے یہ لوگ سوسائٹی کی سیکیورٹی سے تعلق رکھتے ہیں، جب ہی انہیں سب معلوم ہے۔" جشید سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے پاؤں کی تکلیف بڑھ رہی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اس تکلیف کا عادی بھی ہو رہا تھا۔

"شاید... مگر پلیز ان کے سامنے اپنے اوپر قابو رکھنا۔"

سوم صفائی کر کے اندر آیا۔ اس نے لاؤنج میں پھیلا جشید کا خون بھی صاف کیا اور پھر سامان سنک کے نیچے رکھ کر اول سے دھیمی آواز میں کہا۔ "مجھے لگ رہا ہے سوسائٹی سیکیورٹی کو شک ہو گیا ہے ورنہ اس گارڈ کو اس طرح کیوں بھیجا... اسے صبح ہی آنا چاہیے تھا۔"

اول نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس صورت میں وہ ایک آدمی کو نہیں بھیجتے۔"

"ممکن ہے اسے چیک کرنے کے لیے بھیجا ہو اور اس کی رپورٹ پر کارروائی کی جاتی۔ اب وہ اس کی واپسی کا انتظار کریں گے اور اگر یہ واپس نہیں گیا تو اگلی بار وہ پوری تیاری سے آئیں گے۔ ہمیں اس سے پہلے یہاں سے نکل جانا ہوگا۔"

"لیکن ہیرے لے کر۔" اول نے بات مکمل کی۔

دوم جو ایک کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا، اس نے اچانک کہا۔ "باہر ایک کار اندر آئی ہے۔"

☆☆☆

جنید، عرفان اور آرش کی کاریں بنگلے کے ساتھ آگے پیچھے رکی تھیں۔ وہ گیٹ تک نہیں آئے تھے۔ گیٹ کے عین سامنے سیکیورٹی والوں کی ایک بائیک کھڑی تھی۔ تینوں نیچے اتر آئے۔ جنید نے تشویش سے کہا۔ "کوئی چکر ہے سیکیورٹی والے بھی آئے ہیں۔"

"اگر سیکیورٹی والے آگئے ہیں تو انہوں نے معاملہ ہینڈل کر لیا ہوگا۔" آرش بولا۔ "ہمیں اندر چلنا چاہیے۔"

"لیکن سیکیورٹی والے اندر نہ ہوئے تو..." عرفان نے کہا تو آرش بھی فکر مند ہو گیا۔

جنید نے کہا۔ "میں گاڑی اندر لے جاؤں گا اور جیسے ہی گیٹ بند ہونے لگے، تم بھی اندر آ جانا اور پھر چھپ کر بنگلے تک آنا۔ اگر اندر کوئی گڑبڑ ہوئی تو تم سیکیورٹی کو اطلاع دے سکتے ہو۔"

وہ دونوں متفق نہیں تھے لیکن انکار بھی نہیں کر سکتے تھے، اس لیے مجبوراً سر ہلایا تو جنید اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ریحانہ نے تڑپ کر کہا۔ "وہ جنید ہے۔ پلیز اسے کچھ مت کہنا۔"

"اپنا منہ بند رکھو۔" اول پلٹ کر غرایا۔ دوم اور سوم نے دروازے کے پاس پوزیشن سنبھال لی تھی۔ انہوں نے اندر سے دروازہ کھول دیا تھا۔ جیسے ہی جنید اندر داخل ہوا، دو عدد گنیں اس کے سر سے آلگیں۔ اول نے انہیں بتا دیا تھا کہ انہیں لڑکے کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ اس لیے قابو کرتے ہی انہوں نے اسے فرش پر گرا کر اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط ٹیپ سے باندھ دیے پھر اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر اس کا موبائل اور تمام دوسری چیزیں نکال لیں۔ اس دوران میں جنید شور کرتا رہا اور گھر والوں کو آوازیں دیتا رہا۔ ریحانہ اسے پکار رہی تھی اور کچھ دیر بعد وہ اسے کھینچ کر وہاں لے آئے۔ جنید پریشان تھا۔ اندر آنے سے پہلے اس نے ایک گلاس وال کو ٹوٹے دیکھ لیا تھا۔ مگر یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ گھر میں اس کا اس طرح استقبال ہوگا۔ اس نے باپ اور ماں کی حالت دیکھی تو اسے غصہ آنے لگا۔ اس نے پوچھا۔ "یہ لوگ کون ہیں اور آپ کے ساتھ یہ انہوں نے کیا ہے؟"

"یہ ڈاکو ہیں۔" جشید نے آہستہ سے کہا۔ "خود پر قابو رکھو۔"

"لیکن پاپا انہوں نے یہ کیا کیا ہے؟" جنید نے اس کے زخم کا معائنہ کیا۔ "یہ کیا چاہتے ہیں؟"

"یہ جو چاہتے ہیں تمہارے پاپا نہیں مان رہے ہیں۔" ریحانہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ "چاہے ڈاکو ہماری جان کیوں نہ لے لیں۔ یہ جشید کی ٹانگ میں گولی مار چکے ہیں اور تفتیش کے لیے آنے والے سیکیورٹی گارڈ کی جان بھی لے چکے ہیں۔ اس کی لاش ہمارے کچن میں موجود ہے۔"

جنید کی پریشانی مزید بڑھ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے آرش کو باہر چھوڑ کر اچھا کیا۔ مگر اب اسے خیال آ رہا تھا کہ وہ اندر کیسے آتا اور اسے کیسے معلوم ہوتا کہ اندر ڈاکو گھس آئے ہیں۔ وہ جنید کی کار کے پیچھے اندر آیا تھا اور اس وقت کہیں لان میں موجود تھا۔ "میرے خدا! اور آپ لوگوں نے کچھ نہیں کیا؟"

"ہم بے بس ہیں، انہوں نے پوری پلاننگ سے کام کیا ہے۔"

"ماما پاپا کا خیال ہے کہ یہ..." شازیہ بولتے بولتے رک گئی کیونکہ ریحانہ نے اسے گھورا تھا۔ سوم اس وقت ان سے کچھ دور کھڑا تھا اور اول دوم سے دھیمی آواز میں کچھ بات کر رہا تھا۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ان کے بارے میں بات کر رہے ہوں اور دونوں میں کوئی اختلاف ہو۔ پھر اول ان کی طرف آیا اور جشید کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میرے ساتھی کا اصرار ہے کہ تم جیسے ضدی اور ہٹ دھرم آدمی کو کم سے کم ایک جھٹکا دینا چاہیے اور تمہاری بیوی کو شوٹ کر دینا چاہیے کیونکہ تم نے ہماری دی ہوئی مہلت سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ وقت گزر گیا تھا مگر میرا خیال ہے تمہیں ایک موقع اور دینا چاہیے۔ اب بھی تم اگر تجوری کھول دو تو تمہاری بیوی بچ سکتی ہے۔ دوسری صورت میں میں تین تک گن کر اسے مار ڈالوں گا۔ میں کتنا سنجیدہ ہوں، اس کا اندازہ تمہیں اس گولی سے ہو گیا ہوگا جو اس وقت تمہاری ران میں پیوست ہے۔"

اول کے اشارے پر سوم آگے آیا۔ اس نے ریحانہ کو لے جا کر ایک طرف کھڑا کر دیا جبکہ دوم شازیہ اور جنید کو ایک کونے میں گھسیٹ کر لے گیا۔ ریحانہ کے سر پر اول نے پستول رکھ دیا تھا۔ پھر دوم آگے آیا اور اس نے جشید کو اس کے زخم کی پروا کیے بغیر بے رحمی سے کھڑا کر دیا۔ جشید کی چیخ نکل گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہی خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ دوم غرایا۔ "تجوری کھول دو... اگر اپنی بیوی کا بھیجا اپنے گھر کے فرش پر بکھرا دیکھنا نہیں چاہتے۔"

"ایک..." اول نے بلند آواز سے کہا۔ شازیہ رونے لگی اور جنید پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی ماں اور کبھی باپ کو دیکھ رہا تھا۔

"دو..." اول بولا۔

شازیہ اور جنید باپ سے التجائیں کرنے لگے۔ شازیہ روتے ہوئے بولی۔ "پاپا پلیز... یہ ماما کو مار دیں گے۔"

جنید چلایا۔ "پاپا! اگر ماما کو کچھ ہوا تو میں ان لوگوں کو نہیں چھوڑوں گا چاہے اس کے لیے مجھے دنیا کے آخری سرے تک ان کا پیچھا کرنا پڑے۔ آپ تجوری کھول دیں۔"

''پاپا! یہ ہم سب کو ماردیں گے۔''

جمشید مشکل سے کھڑا تھا اور اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اول نے جیسے ہی بلند آواز سے تین کہا، وہ چلایا۔ ''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے... جو بات کل ساری دنیا کے سامنے آنی ہے، وہ آج ہی آجائے۔ میں... میں دیوالیہ ہو گیا ہوں۔ سنا تم لوگوں نے... میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں مقروض ہو گیا۔ میرا یہ گھر اور بزنس سب چھننے والا ہے۔ میرے پاس ہیرے نہیں ہیں... میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

ریحانہ اور بچے بے یقینی سے جمشید کو دیکھ رہے تھے جو اب سر تھامے کھڑا تھا۔ وہ بہت دل شکستہ اور مایوس دکھائی دے رہا تھا۔ اول نے بے یقینی سے کہا۔ ''بکواس کرتے ہو تم... تجوری نہ کھولنے کا ایک بہانہ اور تلاش کیا ہے۔''

''میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔'' جمشید آہستہ سے بولا۔

''تب تجوری کھول کر دکھا دو۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں... جھوٹ نہیں کہہ رہا۔'' جمشید نے کہا۔ وہ تجوری کی طرف مڑا اور ڈیجیٹل پیڈ پر تجوری کا نمبر ملایا تو وہ کھل گئی مگر جب تجوری کھلی اور سب بے تابی سے آگے آئے تو ان کے منہ بھی تجوری جتنے کھل گئے کیونکہ تجوری اندر سے بالکل خالی تھی اور اس کی چمکیلی سطح بالکل آخر تک ایک جیسی تھی۔ اس میں ہیرے کیا، معمولی سا گرد کا ذرہ بھی نہیں تھا۔ اول نے اندر ہاتھ ڈالا اور پھر چلایا۔

''لعنت ہو۔''

''میں نے کہا تھا نا...''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' وہ حلق کے بل دھاڑا۔ ''ڈکاٹی میں اعجاز نے خود ہیرے تمہارے حوالے کیے تھے۔''

''ہاں لیکن جیسے ہی اسے میرے مالی حالات کا علم ہوا، اس نے ہیرے واپس منگوا لیے تھے۔ یہ سودا میرے لیے اہم تھا لیکن میرے ہاتھ سے نکل گیا۔'' جمشید دوبارہ دیوار سے ٹک کر فرش پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اول اس کی طرف جھکا۔

''مجھے یقین ہے تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم نے ہیرے اور اپنی دولت اسی بنگلے میں کہیں اور چھپائی ہے اور دھوکا دینے کے لیے تجوری کو خالی چھوڑ دیا ہے۔''

''میں تجوری جیسی محفوظ جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور کچھ چھپانے کا رسک کیوں لوں گا؟'' جمشید بولا۔ ''یہ سچ ہے... میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

اول بے تابی سے ٹہلنے لگا۔ وہ بار بار خالی تجوری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ جس تجوری کو کھلوانے کے لیے اس نے اتنے جتن کیے تھے، وہ اندر سے خالی نکلے گی۔ دوم کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''تب تم تجوری کیوں نہیں کھول رہے تھے؟''

''اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک میں ابھی اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان نہیں کرنا چاہتا تھا، دوسرے مجھے خطرہ تھا کہ تم لوگ یقین نہیں کرو گے۔''

''ہمیں بالکل یقین نہیں آیا ہے۔'' اول غرایا۔ ''تم نے ہیرے اور دولت کہیں اور چھپائی ہے اور تم اتنی آسانی سے اس کے بارے میں نہیں بتاؤ گے اس لیے ہمیں وہی کرنا پڑے گا جو ہم نے تجوری کھلوانے کے لیے کیا ہے۔ ہم یہاں دولت لینے آئے ہیں اور دولت لے کر ہی جائیں گے۔''

جمشید نے کہا۔ ''دیکھو، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تم تجوری کھلوانا چاہتے تھے، وہ میں نے کھول دی۔ اب تم میرے بیوی بچوں پر تشدد نہیں کر سکتے۔''

اول کی گفتگو پر ریحانہ دہشت زدہ نظر آنے لگی۔ پہلے بھی اسے ہی نشانہ بنایا گیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پھر اسے استعمال کرے گا۔ جیسے ہی اول نے اس کا رخ کیا، وہ چلانے لگی۔ ''میرے پاس مت آنا...''

''پلیز... میری ماما کو کچھ مت کہو۔'' شازیہ روتے ہوئے بولی۔

جمشید اور جنید بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ التجا کرنے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ جنید اپنے دوستوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ انہوں نے اب تک کچھ نہیں کیا تھا۔ اول نے ریحانہ کو بازو سے پکڑا اور باہر لے آیا۔ اس کا انداز جارحانہ تھا مگر باہر آتے ہی اس کا رویہ نرم پڑ گیا۔ اس کا اندازہ ریحانہ کو اس کی ڈھیلی گرفت سے ہوا۔ وہ اسے کچن کے پاس لایا اور آہستہ سے کہا۔ ''تمہارا شوہر بہت ضدی آدمی ہے لیکن تمہیں یقیناً دولت کے مقابلے میں اپنے بچوں اور شوہر سے زیادہ پیار ہوگا۔ اگر تم جانتی ہو کہ بنگلے میں اور کس جگہ ہیرے اور رقم چھپائی جا سکتی ہے تو بتا دو ورنہ اس بار تمہارے بچوں کی باری آئے گی۔ ہم انہیں ختم کر دیں گے اور تمہیں ساری عمر رونے کے لیے زندہ چھوڑ جائیں گے۔''

''نہیں... خدا کے لیے نہیں۔'' ریحانہ رو دی۔ ''میرے بچے بے قصور ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن ہمیں دولت چاہیے۔'' اول بولا۔ ''ہم پہلے ہی ایک جان لے چکے ہیں اب ہمیں کسی اور سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ ہم مزید لوگوں کی جان لیتے

ہیں۔ مجھے بتاؤ جمشید نے دولت کہاں چھپائی ہے۔ اس نے ہمیں دھوکا دینے کے لیے تجوری خالی چھوڑی ہے اور ہیرے اپنی دولت سمیت کہیں اور چھپادیے ہیں۔''

''میں نہیں جانتی... خدا کی قسم نہیں جانتی ورنہ اس لعنتی دولت کا پتا ضرور بتادیتی۔'' ریحانہ تیز لہجے میں بولی۔ ''مگر جمشید کو کیسے پتا چلا کہ تم لوگ اسے لوٹنے آؤ گے؟''

اول ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اس نے ریحانہ کو بالوں سے پکڑا اور کھینچتا ہوا دفتر میں لے آیا۔ ریحانہ کو دھکا دیا تو وہ جمشید کے پاس جا گری۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ جمشید نے اسے اپنے پاس کرلیا۔ شازیہ بھی اس کے پاس بیٹھی تھی جبکہ جنید کونے میں بے بس بندھا پڑا تھا۔ اول نے ان سب کا معائنہ کیا اور پھر جنید کی طرف بڑھا۔ اس کا انداز دیکھ کر ریحانہ چیخنے لگی۔ ''اسے کچھ مت کہو... جمشید! انہیں بتادو ہیرے کہاں ہیں؟''

''ہیرے کہیں نہیں ہیں۔'' جمشید نے اول پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ وہ جنید کے پاس پہنچا اور پستول اس کے سر سے لگا دیا۔ پھر اس نے ان کی طرف دیکھا۔

''میں دس تک گنوں گا اور اسے شوٹ کردوں گا۔''

ریحانہ اور شازیہ چیخنے لگیں۔ جمشید بھی کچھ کہہ رہا تھا اور ان کی باتیں ان سنی کرتے ہوئے اول بلند آواز سے گنتی گن رہا تھا۔ ''چار... پانچ... چھ... سات... آٹھ...''

شازیہ جواب تک رو رہی تھی، اچانک وہ اٹھی اور اول کے پاس آئی۔ ''تمہیں رقم چاہیے نا...؟''

وہ گنتے گنتے رک گیا۔ ''تم جانتی ہو ہیرے اور رقم کہاں ہیں؟''

''نہیں... لیکن...''

''لڑکی، تم مجھ سے اور اپنے بھائی کی زندگی سے مذاق کررہی ہو۔'' اول نے خوفناک لہجے میں کہتے ہوئے پستول دوبارہ جنید کے سر سے لگادیا۔ شازیہ چلّائی۔

''نہیں... میری بات سنو۔ میں نہیں جانتی کہ اس گھر میں کوئی دولت یا ہیرے ہیں یا نہیں لیکن میں ایک جگہ جانتی ہوں جہاں سے تمہیں بڑی رقم مل سکتی ہے۔''

اول رک گیا۔ اس نے شازیہ کی طرف دیکھا لیکن پستول جنید کے سر سے نہیں ہٹایا۔ ''کہاں سے؟''

''یہاں سے کچھ دور ایک جگہ ہے... میں نے خود دیکھا ہے وہ بہت بڑی رقم ہے۔'' شازیہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔ ''میں خدا کی قسم کھاتی ہوں، وہاں رقم ہے۔ ایک تجوری میں... مجھے اس کا نمبر بھی معلوم ہے۔''

''یہ ہمیں بے وقوف بنارہی ہے۔'' دوم تلخ لہجے میں بولا۔ ''یہ پورا گھر ہی چکر باز ہے۔ لڑکے کا بھیجا اڑادو۔ یہ خود بتائے گا کہ دولت کہاں چھپائی ہے۔''

مگر اول سوچ رہا تھا کہ اگر جمشید کے پاس سچ مچ ہیرے اور دولت ہوتی تو اتنی مزاحمت نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ دولت محفوظ رکھنے کے لیے تجوری تھی، اسے کہیں اور رکھنا مشکل کام تھا۔ شازیہ اس کی طرف پُرامید نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بالآخر اس نے پستول جنید کے سر سے ہٹا کر شازیہ کے رخسار پر رکھ دیا۔ ''لڑکی! سوچ لو اگر تم اپنے باپ کی طرح کوئی چکر چلارہی ہو تو یہ چکر تم لوگوں کو زیادہ دیر بچا نہیں سکے گا۔ وہ جگہ کہاں ہے؟''

''یہیں اسی سوسائٹی میں ایک جگہ ہے۔ یہاں سے دس منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔'' شازیہ بتارہی تھی۔ ''میں تمہیں وہاں لے جاسکتی ہوں۔''

''تم وہ رقم لاکردے سکتی ہو؟... رقم کتنی ہے؟''

''لاکھوں میں ہے۔ ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں والی بہت سی گڈیاں ہیں۔ شاید تین چار درجن گڈیاں ہیں۔''

اول نے سرہلایا۔ ''یہ بڑی رقم ہے۔''

''اگر تم میرے بھائی اور ماما پاپا کو چھوڑ دو تو میں تمہیں وہاں لے جاسکتی ہوں۔''

''بے بی۔'' اول نے نرمی سے کہا۔ ''تم اتنی چالاک نہیں ہو جتنا بننے کی کوشش کررہی ہو۔ تم میرے ساتھی کے ہمراہ جاؤ گی اور وہاں سے رقم لے کر آؤ گی۔ جب ہمیں رقم مل جائے گی تو ہم تم سب کو چھوڑ کر یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''شازی!'' جمشید چلّایا۔ ''تم ان کے ساتھ کہیں نہیں جاؤ گی۔''

''ہمارے ساتھ نہیں، میرے ایک ساتھی کے ہمراہ۔'' اول نے تصحیح کی۔ ''ہم میں سے دو یہیں رہیں گے۔''

اول نے شازیہ کے ہمراہ جانے کے لیے سوم کا انتخاب کیا تھا۔ ''تم لڑکی کے ساتھ جاؤ اور وہ رقم لے آؤ۔''

ریحانہ اور جمشید مسلسل شازیہ کو منع کررہے تھے لیکن وہ خاموش تھی۔ کچھ دیر میں سوم تیار ہوگیا۔ وہ شازیہ کے ساتھ اس کی کار میں آبیٹھا اور چہرے سے نقاب اتارتے ہوئے بولا۔ ''امید ہے تم میرا چہرہ یاد نہیں رکھو گی۔ مجھے بھول جانا ہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔''

سوم نے پستول ہاتھ میں رکھا تھا۔ شازیہ نے کار اسٹارٹ کی اور گیٹ تک آئی۔ بٹن دبا کر گیٹ کھولا۔ شازیہ نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ اس کے لیے اجنبی ہی تھا۔ عقب میں گیٹ بند ہونے سے پہلے وہ روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

آرش اور عرفان، جنید کے اندر جانے کے بعد دائیں طرف لان کی سمت چلے آئے تھے۔ یہ جگہ اندر بنگلے سے نظر نہیں آتی تھی، بہ شرط کہ کوئی دوسری منزل کی کسی کھڑکی یا ٹیرس سے نہ دیکھ رہا ہو۔ وہ درختوں کی آڑ لیتے ہوئے بنگلے کے دائیں پہلو میں آئے اور یہاں سے وہ بنگلے کی دیوار کے پاس آکر اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ کھڑکیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ جھک جاتے تھے۔ بنگلے کی بنیاد بھی لان سے چار فٹ اونچی تھی اس لیے گلاس وال سے بھی انہیں نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ عقب سے بھی اندر جانے کا ایک دروازہ ہے۔ مگر یہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کے باہر ڈیجیٹل پیڈ لگا تھا لیکن اس کا پاس ورڈ گھر والوں کو ہی پتا تھا۔ جنید نے کہا تھا کہ اگر اندر سب ٹھیک ہوا تو وہ انہیں کال کرے گا مگر دس منٹ سے اوپر گزر جانے کے باوجود اس کی کال نہیں آئی تھی۔ لان میں روشنی تھی اس لیے سب صاف نظر آرہا تھا۔ عرفان نے کہا۔

''جنید کا کچھ پتا نہیں ہے، میرا خیال ہے اندر کوئی گڑبڑ ہے۔''

آرش نے جنید کو کال کرنے کی کوشش کی تو اس کا موبائل بھی بند جارہا تھا۔ یہ فکر انگیز بات تھی۔ بنگلے میں موجود تمام افراد کے موبائل بند تھے اور اب جنید کا موبائل بھی بند جارہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، جنید کا موبائل بھی بند ہوگیا ہے۔''

''ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے، اگر اندر ڈاکو ہیں تو یہ پولیس کا کیس ہے۔''

آرش نے اس سے اتفاق کیا مگر جب وہ سامنے والے حصے میں آئے تو سرخ شیوی کار گیٹ سے باہر نکلتی دکھائی دی۔ وہ بھاگے لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے گیٹ بند ہوگیا۔ اب وہ باہر نہیں جاسکتے تھے۔

☆☆☆

دفتر کے فرش پر وہ تینوں فکرمند بیٹھے تھے۔ اول اور دوم ان کے سروں پر موجود تھے۔ پھر دوم نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ لاؤنج میں چلے آئے۔ دوم نے کہا۔ ''دیکھو، ہم یہاں ہیروں کے لیے آئے ہیں۔ ان کی مالیت پچاس کروڑ روپے ہے۔ کیا ہم صرف چند لاکھ روپے لے کر واپس چلے جائیں گے؟''

''جب تمہارے ذہن میں کوئی اچھی تجویز ہے تو وہ بتاؤ۔'' اول کا لہجہ سرد ہوگیا۔

''مجھے یقین ہے یہ جھوٹ بول رہا ہے اور ہم دوسرے طریقے سے پوچھیں گے تو یہ ہیرے بھی دے گا۔''

اول نے نفی میں سرہلایا۔ ''اگر ہیرے یہاں ہوتے تو وہ اب تک دے چکا ہوتا۔ کوئی عام شخص اس طرح کی آزمائشوں کا سامنا نہیں کرسکتا۔''

''یہ بہت ضدی شخص ہے۔'' دوم نے دور بیٹھے جمشید کی طرف دیکھا۔ ''جب ہم پلاننگ کررہے تھے تو یہی بات سامنے تھی کہ جمشید اتنی آسانی سے ہیرے ہمارے حوالے نہیں کرے گا۔ کیا اس شخص سے بعید نہیں ہے کہ اس نے ہیرے اور اپنی دولت کہیں اور چھپا رکھی ہو۔ ہمیں دھوکا دینے کے لیے تجوری خالی رکھی ہو۔ تم نے دیکھا، اس شخص نے خالی تجوری کس قدر مشکل سے اور خود پر کتنی مشکلیں سہہ کر کھولی ہے۔ کئی بار اس کی بیوی اور بچی کی جان پر بنی لیکن یہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔''

''اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟''

''یہی کہ اس نے ہیرے اور دولت کہیں اور چھپائی ہے۔''

''کہاں؟'' اول نے سوال کیا۔ ''اس بنگلے میں کوئی ایسی جگہ ہے؟ ہم یہاں کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ یہاں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''ممکن ہے اس نے عارضی طور پر کہیں رکھ دیے حفاظت کے خیال سے۔'' دوم نے کہا۔ ''میری دادی جان بھی چوروں سے بچانے کے لیے اپنے زیور چولہے کے نیچے دفن کرکے رکھتی تھیں۔''

''تمہاری دادی...'' اول کہتے کہتے رک گیا۔ ''احمقانہ باتیں مت کرو۔''

''نہیں سوچو... ایک دو دن کی بات ہے۔ وہ عقل مند آدمی ہے جانتا ہے کہ اگر ڈاکو بنگلے میں آنے میں کامیاب ہوگئے تو اسے تجوری کھولنا ہی پڑے گی اس لیے کسی ایسی جگہ چھپادیا جہاں ہمارا دھیان نہ جائے۔ ممکن ہے اس نے اپنے بیڈروم میں کسی جگہ چھپادیے ہوں۔''

اس بار اول سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے سرہلایا۔ ''ٹھیک ہے، دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شاید جمشید نے بھی چالاکی کی ہو۔ تم ان کی نگرانی کرو، میں اوپر جاتا ہوں۔''

اول کے اوپر جاتے ہی دوم تیزی سے دفتر میں آیا اور اس نے ٹیپ نکال کر پہلے ریحانہ کے ہاتھ پشت پر کرکے ٹیپ سے باندھے پھر اس کے اور پھر جنید کے منہ پر بھی ٹیپ لگادیا۔ اس

کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کچھ کرنے جا رہا ہے۔ وہ تینوں ہی خوف زدہ ہو گئے۔ جمشید نے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

جواب میں اس نے جمشید کے منہ پر بھی ٹیپ لگا دیا اور پھر اسے اوندھے منہ لٹاتے ہوئے کہا۔ "مسٹر جمشید! اب ذرا تم سے بات ہو جائے لیکن پہلے میں ہاتھوں سے بات کروں گا اور پھر زبان سے کروں گا۔" اس نے کہتے ہوئے جمشید کے ہاتھ بے دردی سے پشت پر کر کے ٹیپ سے باندھ دیے۔ جمشید کو سیدھا کرتے ہی اس نے قوت سے اس کے منہ پر مکا مارا۔ ریحانہ اور جنید کی ناک سے آوازیں نکلیں۔ جمشید کی بھوں پھٹ گئی تھی اور خون بہہ نکلا تھا۔ پھر اس نے اسے اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ جمشید کی ناک سے کربناک آواز نکلی۔ رومال پوش نے دو گھونسے اور مارے اور پھر جمشید کی زخمی ران پر جوتے کی ایڑی رکھ دی۔ وہ شدتِ کرب سے بل کھانے لگا مگر دوم کا جوتا نہیں ہٹا سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر بولا۔ "مسٹر جمشید! میرا سوال ہے کہ ہیرے کہاں ہیں؟"

جمشید کا چہرہ تکلیف کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا مگر ہیروں کی بات پر اس نے مچلنا بند کر دیا تھا۔ دوم کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر غراتے ہوئے بولا۔ "تم اس طرح نہیں بتاؤ گے۔"

وہ ریحانہ کی طرف بڑھا جو اسے آتے دیکھ کر دیوار کی جڑ کے ساتھ لگ گئی تھی۔ وہ سخت دہشت زدہ ہو رہی تھی۔

☆☆☆

شازیہ ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ وہ یہ کام کیسے کرائے گی؟ بے شک راجی کے بنگلے پر سیکیورٹی نہیں تھی مگر وہاں راجی اور دوسرے لوگ تو تھے۔ وہ اس ڈاکو کے ہمراہ وہاں جاتی تو سب اسے دیکھتے اور بعد میں ڈاکو پکڑے جاتے یا نہ پکڑے جاتے لیکن پولیس اسے ضرور گرفتار کر لیتی۔ ذرا آگے وہی موڑ آ رہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے اس کی کار کھمبے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ اچانک شازیہ کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے عادت کے مطابق بیٹھتے ہی سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی۔ جمشید کی طرف سے سب کو سخت ہدایت تھی کہ وہ کار میں بیٹھنے کے بعد سیٹ بیلٹ ضرور باندھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمارے ہاں حادثات میں نوّے فیصد اموات اسی لیے ہوتی ہیں کہ گاڑی میں بیٹھنے والے سیٹ بیلٹ نہیں باندھتے ہیں۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈاکو نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھی تھی۔ شازیہ نے غیر محسوس انداز میں کار کی رفتار تیز کی۔ موڑ قریب آ رہا تھا۔ اس نے اسٹیئرنگ پر گرفت مضبوط کی۔ سوم غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے شازیہ کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ تمہاری ماں ایک خوب صورت عورت ہے لیکن تم اس سے بھی بڑھ کر ہو۔"

"پلیز! ہاتھ ہٹاؤ میں ڈرائیونگ کر رہی ہوں۔" شازیہ نے کسمسا کر کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ مگر سوم نے ہاتھ نہیں ہٹایا۔ اس نے پھر سرگوشی میں کہا۔ "پلیز..."

سوم اس کے نرم و نازک لمس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے دھیان نہیں دیا کہ کار کی رفتار خاصی تیز ہو گئی تھی۔ اسپیڈومیٹر کا کانٹا ساٹھ سے اوپر جا چکا تھا۔ موڑ پاس آنے پر بھی شازیہ نے کار کو سیدھا ہی رکھا اور کچھ دیر میں کار کھمبے کے سامنے تھی۔ شازیہ نے تصادم کے لیے جسم سخت کیا تو سوم چونکا اور جب اس نے سامنے دیکھا تو دیر ہو چکی تھی۔ کار تقریباً ساٹھ میل فی گھنٹا کی رفتار سے بائیں طرف سے کھمبے سے ٹکرائی۔ سوم اپنی نشست سے اچھلا اور ونڈ اسکرین توڑتا ہوا سر کے بل تصادم سے جھک جانے والے کھمبے سے جا ٹکرایا۔ اسے مرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا کیونکہ تصادم سے اس کا سر پچک گیا تھا۔ سیٹ بیلٹ نے شازیہ کو بچا لیا تھا۔ اس نے بے اختیار چہرے پر ہاتھ رکھ لیا تھا اس لیے ونڈ شیلڈ کے بکھرنے والے ٹکڑوں سے اس کی آنکھیں اور چہرہ بچ گیا تھا۔ مگر تصادم کے دھچکے نے اس کے حواس کچھ دیر کے لیے گم کر دیے تھے۔

یہ ویران جگہ تھی۔ دونوں طرف جنگل تھا اس لیے کسی کو حادثے کا پتا نہیں چلا۔ چند منٹ بعد شازیہ کے حواس درست ہوئے تو وہ سیٹ بیلٹ کھول کر نیچے اتر آئی۔ اس نے نقاب پوش کی طرف دیکھا اور اس کی حالت دیکھ کر بے اختیار اسے متلی ہوئی۔ اس کے سر کی حالت اتنی ہی بری ہو رہی تھی۔ بونٹ پر اس کا خون اور بھیجا بکھر گیا تھا۔ شازیہ نے دوسری طرف منہ کرتے ہوئے بے ساختہ ابکائی لی اور اس کے پیٹ میں موجود تمام مواد باہر نکل آیا۔ جب اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو وہ اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھی اور ہاتھ سے اس کا جسم ٹٹولنے لگی۔ جگہ جگہ خون لگا تھا اور وہ شازیہ کے ہاتھوں میں بھی لگ رہا تھا۔ کراہیت کے باوجود وہ ٹٹولتی رہی، بالآخر اسے نقاب پوش کا پستول مل گیا۔ پھر اس نے کار میں گھس کر ڈیش بورڈ میں نصب گیٹ کا ریموٹ کنٹرول کھینچ کر نکال لیا۔ کار کا حشر ہو گیا تھا اور وہ بالکل بھی چلنے کے قابل نہیں تھی مگر شازیہ کو واپس اندر جانے کے لیے اس ریموٹ کی ضرورت تھی۔ پھر وہ واپس گھر کی طرف چل پڑی۔

☆☆☆

ریحانہ اور جمشید دونوں کی حالت بری تھی۔ دوم نے ان پر خاصا تشدد کیا تھا۔ وہ صرف تشدد نہیں کر رہا تھا بلکہ اس تشدد سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔ ماں باپ کی حالت دیکھ کر جنید کی حالت خراب ہو رہی تھی اور وہ مچل رہا تھا مگر بے بسی سے بندھا ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دوم نے اس بات کی پروا کیے بغیر کہ ریحانہ ایک نازک عورت ہے، اس کے چہرے پر کئی بار گھونسے مارے۔ اس کا چہرہ بھی جمشید کی طرح لہولہان ہو گیا تھا۔ ریحانہ پر ہر وار کے بعد وہ جمشید سے ہیروں کا پوچھتا تھا مگر وہ اسے صرف گالیاں دے رہا تھا۔ ایک گھونسا کھا کر ریحانہ فرش پر گری اور بے دم ہو گئی۔ دوم کسی درندے کی طرح غرا رہا تھا اور گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ ریحانہ کے بے ہوش ہونے کے بعد وہ دوبارہ جمشید کی طرف آیا۔

"میری بات سنو، ہم تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اگر ہیرے نہ ملے بے شک تم ان کے بدلے کچھ بھی دے دو مگر ہیرے نہیں دو گے تو موت تمہارا مقدر ہو گی۔ اب میں تمہارے سامنے تمہارے بیٹے کو قتل کروں گا۔ اگر تم اسے بچانا چاہتے ہو تو ہیرے دے دو۔"

جمشید پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دوم اٹھ کر جنید کی طرف بڑھا۔ وہ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر مچلنے لگا مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اسے بہت سختی سے باندھا گیا تھا۔ دوم نے ایک چھوٹا لیکن تیز دھار خنجر نکالا اور جنید کے بال پکڑ کر اس کا سر اوپر کیا۔ اس کا گلا نمایاں ہو گیا۔

☆☆☆

شازیہ لڑکھڑاتے ہوئے سڑک پر چل رہی تھی۔ تصادم نے اس کا جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا۔ اگر اسے اپنے ماں باپ اور بھائی کا خیال نہ ہوتا تو وہ وہیں سڑک پر لیٹ جاتی۔ مگر اس وقت ہمت کر کے خود کو گھسیٹ رہی تھی۔ وہ بنگلے سے کوئی ایک کلومیٹر دور نکل آئی تھی۔ چلنے کے ساتھ ساتھ جسم کا درد کم ہونے لگا تو اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ چند منٹ بعد وہ بنگلے کے سامنے تھی۔ اس نے ہانپتے ہوئے ریموٹ کا بٹن دبایا۔ دروازہ کھلنے لگا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا ورنہ اسے شک تھا کہ حادثے میں کہیں ریموٹ کو نقصان نہ ہوا ہو۔ وہ کام نہ کرتا تو شازیہ اندر نہیں جا سکتی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئی اور بائیں طرف لان میں مڑ گئی۔ وہ سامنے سے نہیں جا سکتی تھی اس لیے اس نے عقبی لان کا رخ کیا تھا۔ جیسے ہی وہ پیچھے پہنچی، ایک درخت کے پیچھے سے کوئی نکلا اور اس نے جلدی سے پستول اس کی طرف کیا۔

"گولی مت چلانا۔" آرش کی آواز آئی تو شازیہ رک گئی ورنہ وہ ٹریگر دبانے جا رہی تھی۔ اس نے آرش کی آواز پہچان لی تھی۔ پھر وہ اور عرفان سامنے آئے تو شازیہ نے سکون کا سانس لیا۔

"پلیز! ہماری مدد کرو۔ اندر ڈاکوؤں نے ماما پاپا اور جنید کو پکڑ رکھا ہے۔"

ڈاکوؤں کا سن کر وہ دونوں ہی گھبرا گئے تھے۔ آرش نے کہا۔ "ہم تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں... ڈاکو ہمیں بھی مار دیں گے۔"

"ہمیں باہر جا کر پولیس کو انفارم کرنا چاہیے۔" عرفان بولا۔

"تب تک ڈاکو ان کو مار چکے ہوں گے۔" شازیہ روہانسی ہو گئی۔ "پلیز... پلیز..."

مگر وہ دونوں ساکت کھڑے رہے پھر آرش نے کہنا چاہا۔ "سوری..."

"لعنت ہو تم پر..." شازیہ نفرت سے بولی۔ "تم خود کو جنید کا دوست کہتے ہو اور جب اس پر، اس کے گھر والوں پر مشکل آئی تو تم بہانے کر رہے ہو۔ تم جانا چاہتے ہو نا، یہ لو اس سے گیٹ کھول لینا۔"

شازیہ نے ریموٹ ان کی طرف پھینکا اور عقبی حصے کی طرف بڑھی۔ عرفان نے اسے پکارا مگر وہ ان سنی کر کے چلی گئی۔ وہ کچھ دیر شرمندہ سے کھڑے رہے پھر آرش نے ریموٹ اٹھایا اور وہ گیٹ کی طرف چل پڑے۔ شازیہ عقبی دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اسے کوئی نظر نہیں آیا...... اس کے کان کسی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ اس نے پستول سامنے کر لیا اور محتاط قدموں سے لاؤنج کی طرف بڑھی۔ لاؤنج کے پاس آتے ہی اسے ایک ڈاکو کے زور سے بولنے کی آواز آئی۔ شازیہ کو کچن میں گارڈ کی لاش کی جھلک دکھائی دی تھی مگر اس وقت اسے اپنے گھر والوں کی فکر تھی۔ اس نے دفتر میں جھانکا تو اسے تنومند نقاب پوش خنجر بلند کیے نظر آیا۔ جمشید پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ خنجر جنید کے گلے پر چلاتا، شازیہ نے عجلت میں فائر کیا اور گولی دوم کی پشت میں اتر گئی۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے مڑا اور اپنا پستول نکالنے کی کوشش کی تو شازیہ نے بے ساختہ دوسری گولی اس کے سینے میں اتار دی۔ دوم لڑکھڑا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے گرتے ہی شازیہ جمشید کی طرف جھپٹی اور اس کے منہ سے ٹیپ ہٹا دیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "میرے ہاتھ کھولو۔ تیسرا آدمی اوپر ہے، وہ کسی وقت بھی آ جائے گا... خنجر لاؤ۔"

شازیہ نے دوم کے ہاتھ سے چھوٹ جانے والا خنجر اٹھایا اور جمشید کے ہاتھوں سے بندھا ٹیپ کاٹ دیا۔ پھر اس نے جنید اور ریحانہ کے ہاتھوں کی بندشیں بھی کاٹ دیں۔

آزاد ہوتے ہی جنید ماں کی طرف جھپٹا۔ اس نے اسے ہلا جلا کر دیکھا اور پھر شازیہ سے پوچھا۔ ”تم اندر کیسے آگئیں؟“

”پیچھے سے....“

جمشید چونک گیا۔ ”وہ کہاں ہے جس کے ساتھ تم گئی تھیں؟“

”میں نے کار پول سے ٹکرا دی تھی اور حادثے میں وہ مر گیا۔“ شازیہ نے بتایا۔ ”کار بھی تباہ ہو گئی۔“

”تم ٹھیک ہو نا؟“ جمشید نے حادثے کا سن کر بے تابی سے پوچھا۔

”جی پاپا۔“ شازیہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ”میں نے سیٹ بیلٹ باندھ رکھی تھی۔“

”تم بروقت آگئیں ورنہ اس نے....“ جنید نے جملہ ادھورا چھوڑ کر نقاب پوش کی طرف دیکھا جو ساکت تھا۔ پتا نہیں چل رہا تھا کہ زندہ ہے یا مر گیا تھا۔ جمشید نے اس کا پستول لیا اور ایک پاؤں کے سہارے لنگڑاتا ہوا دفتر کے دروازے تک آیا۔ اس نے باہر جھانکا مگر اسے اول کہیں نظر نہیں آرہا تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ اس نے فائرز کی آواز سن لی ہوگی اور اب ہوشیار ہو گیا ہوگا۔ جمشید نے جنید سے کہا۔ ”اس کے لباس میں دیکھو، کوئی موبائل ہے؟“

مگر دوم کے لباس میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ فون وائر وہ پہلے ہی کاٹ چکے تھے۔ باقی سب کے موبائل اول کے پاس تھے۔ وہ سیکیورٹی سینٹر یا پولیس سے رابطہ نہیں کر سکتے تھے۔ جنید نے چونک کر کہا۔ ”باہر آرش اور عرفان بھی ہیں، وہ تمہیں نہیں ملے؟“

”ملے تھے۔“ شازیہ نے منہ بنایا۔ ”لیکن ڈاکوؤں کا سن کر ان کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ ایسے بھاگے کہ بس....“

جمشید کو اول کی فکر ہو رہی تھی، اس نے کہا۔ ”ان ڈاکوؤں کا سرغنہ بھی بنگلے میں کہیں موجود ہے۔ وہ اس تاک میں ہوگا کہ ہم میں سے کوئی باہر جائے تو وہ اسے نشانہ یا یرغمال بنا سکے۔“

جنید مسلسل ریحانہ کا چہرہ تھپتھپا رہا تھا اور اس کی کوششوں سے وہ ہوش میں آنے لگی۔ شازیہ اس کے پاس آبیٹھی تھی۔ کچھ دیر ہلنے جلنے کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں پھر اس نے نقاب پوش کو دیکھا اور جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

”اسے کیا ہوا؟“

”اسے میں نے شوٹ کیا ہے۔“ شازیہ نے فخر سے کہا۔ ”یہ جنید کو مارنے جا رہا تھا۔“

ریحانہ نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے شازیہ کو گلے سے لگا لیا۔ وہ انہیں بتا رہی تھی کہ وہ کس طرح چھوٹ کر یہاں تک آئی تھی۔ بلاشبہ یہ کارنامہ اس کی عمر سے بڑھ کر تھا۔ اس نے بہت ہمت اور ذہانت سے کام لیا تھا اور عین وقت پر آکر جنید کی جان بھی بچائی تھی۔ ماں باپ اسے فخر سے دیکھ رہے تھے۔ ریحانہ اپنے زخموں سے قطع نظر ٹھیک ٹھاک تھی مگر وہ جمشید کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے شازیہ سے پوچھا۔

”تیسرا آدمی کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم.... میں پیچھے کی طرف سے اندر آئی ہوں اور وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔“

”شاید وہ بھاگ گیا ہو۔“ ریحانہ بولی۔

”نہیں۔“ جمشید نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ اندر ہی اور ہمارے سامنے آنے کا انکار کر رہا ہے۔ وہ ہمیں مارے بغیر نہیں جائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ ہم یہاں بے بس ہیں اور کسی سے رابطہ نہیں کر سکتے۔ وہ اب بھی ہیروں کی تاک میں ہے۔“

”تم مجھ سے بات مت کرو۔“ ریحانہ سخت لہجے میں بولی۔ ”اب میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے.... تمہیں بیوی بچوں سے زیادہ اپنی دولت اور ہیرے عزیز ہیں۔“

بچوں کے سامنے ریحانہ کے اس طرح کہنے پر جمشید کا چہرہ سرخ ہوا۔ اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”ایسا نہیں ہے، ان کا شروع سے یہ منصوبہ تھا کہ ہیرے اور رقم حاصل کر کے یہ ہم سب کو قتل کر دیں گے۔“

”پاپا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ جنید نے باپ کی تائید کی۔ ”اس نے خود اعتراف کیا تھا کہ یہ ہیرے حاصل کرنے کے بعد ہمیں مار دیتے۔“ اس نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر ریحانہ کے تاثرات نرم پڑے مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔

”اب ہم کیا کریں؟“ شازیہ نے پوچھا۔

”ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا۔“ جمشید نے ان سب کو دیکھا۔ ”کچھ دیر میں سیکیورٹی اور پولیس آجائے گی۔ وہ اسے دیکھ لے گی۔ اس سے پہلے ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے ورنہ وہ ہمیں مار سکتا ہے۔“

”وہ ہمیں مارنا چاہتا ہے؟“ ریحانہ خوف زدہ ہو گئی۔

”ہاں مگر اس کا اصل مقصد ہیرے حاصل کرنا ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ ہم کہیں رابطہ کر کے مدد حاصل نہیں کر سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ یہیں ہوگا اور منتظر ہوگا کہ کسی طرح ہم میں سے کوئی سامنے آئے تو وہ ہم پر قابو پا سکے۔“

ریحانہ نے جمشید کی طرف دیکھا۔ ”وہ کب تک یہاں رکا رہے گا؟“

”جب تک ہم پر قابو نہیں پا لیتا۔ گھر سے باہر وہ جا نہیں سکتا کیونکہ اسے عقبی دروازے کا پاس ورڈ نہیں معلوم ہے اور یہاں سے جانے کے لیے اسے ہمارے سامنے سے گزر کر ہی جانا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“ جمشید نے تجزیہ پیش کیا۔

”مگر پاپا! ہم بھی تو باہر نہیں جا سکتے۔“ جنید نے فکرمندی سے کہا۔ ”یہاں رہتے ہوئے پولیس یا سیکیورٹی کو کیسے بلا سکتے ہیں؟“

”مجھے یقین ہے کہ جلد یا بدیر سیکیورٹی والے آنے والے ہوں گے کیونکہ مارے جانے والے گارڈ نے ان سے رابطہ نہیں کیا ہوگا۔ مگر ایک طریقہ ہے کہ وہ جلد آجائیں۔“

”وہ کیا پاپا؟“ شازیہ نے پوچھا۔

”یہ....“ جمشید نے کہا اور لاؤنج کی ایک گلاس وال پر پستول سے فائر کیا۔ دھماکے سے شیشہ بکھر گیا۔

☆☆☆

دو گھنٹے بعد پولیس تینوں ڈاکوؤں اور سوم کے ہاتھ سے مارے جانے والے سیکیورٹی گارڈ کی لاش لے گئی تھی۔ خود سوم بھی مارا گیا تھا۔ دوم زندہ تھا۔ اسے اسپتال روانہ کیا گیا اور اول پکڑا گیا تھا۔ اس کی شناخت بھی فوراً ہو گئی تھی۔ اس کا نام شمشاد تھا اور وہ پہلے سوسائٹی کی سیکیورٹی میں کام کرتا رہا تھا پھر اسے بعض حرکتوں کی بنا پر نوکری سے نکال دیا گیا تو وہ ڈاکو بن گیا۔ دوم کو جمشید نے خود شناخت کر لیا تھا۔ راشد علی چند سال پہلے تک اس کی جیولر شاپ پر بہ طور گارڈ کام کرتا تھا۔ ایک گاہک سے بدتمیزی پر جمشید نے اسے نوکری سے جواب دے دیا تھا۔ شاید وہ اسی کا بغض دل میں دبائے بیٹھا تھا اور آج اسے موقع ملا تو اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہی تھی۔ سوم رستم خان سوسائٹی کی سیکیورٹی میں بہ طور الیکٹرک ٹیکنیشین کام کرتا تھا۔ اسی نے جمشید کے بنگلے کے بارے میں تمام معلومات شمشاد کو فراہم کی تھیں۔ ہیروں کے بارے میں شمشاد کو پتا چلا تھا۔ اس کا ایک رشتے دار ہیروں کے مالک اعجاز کے پاس کام کرتا تھا۔ شمشاد نے ہی یہ منصوبہ بنایا تھا مگر اس کا منصوبہ ناکام رہا۔

پولیس کے ساتھ آنے والے ڈاکٹر نے ان سب کو دیکھا تھا۔ جمشید کو لگنے والی گولی گوشت میں پھنس گئی تھی۔ اسے نکالنے کے لیے آپریشن ضروری تھا اس لیے اسے بھی اسپتال بھیج دیا گیا۔ دو دن بعد اسے اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ مگر ڈاکٹر نے اسے ایک ہفتہ بیڈ ریسٹ تجویز کیا تھا۔ وہ وہیل چیئر پر گھر آیا۔ اسپتال سے جنید اسے گھر لایا تھا۔ جمشید گھر میں داخل ہوا تو وہاں سب پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ شیشے کی دیوار لگا دی گئی تھی۔ گھر میں اور جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی، وہ بھی ٹھیک کر دی گئی تھی۔ ریحانہ اور شازیہ دروازے پر موجود تھیں۔ شازیہ آکر اس سے لپٹ گئی اور اس کے کان میں کہا۔ ”پاپا آئی لو یو۔“

وہ مسکرایا پھر اس نے ریحانہ کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ پاس آکر آہستہ سے بولی۔ ”آئی ایم سوری۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ جمشید نے کہا۔ اسی لمحے اس کے موبائل فون کی بیل بجی۔ جمشید نے کال ریسیو کی۔ ”رحمان صاحب.... جی میں گھر آگیا ہوں۔ مگر حاضر نہیں ہو سکتا۔ آپ کو زحمت کرنا ہوگی۔ جی پتھر میرے پاس ہیں۔ آپ آج شام چھ بجے تک تشریف لے آئیں۔ میں اعجاز صاحب کو بلوا لیتا ہوں، ڈیل فائنل کر لیں گے۔“

جمشید موبائل پر بات کر رہا تھا تو ریحانہ سمیت وہ سب اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی اس نے موبائل بند کیا، ریحانہ بولی۔ ”جمشید! تم نے کہا تھا کہ تم دیوالیا ہو گئے ہو۔“

”میں نے جھوٹ کہا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اللہ کا شکر ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”لیکن تجوری میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے خود دیکھا تھا۔“ ریحانہ خوش ہو گئی ورنہ اب تک اسے یہ فکر بھی تھی کہ اگر جمشید کا بزنس سچ مچ ختم ہو گیا تھا تو ان کا کیا ہوگا۔ اگرچہ فاقوں کا خطرہ نہیں تھا مگر انہیں اپنا طرزِ زندگی چھوڑنا پڑتا اور یہ سوچ کر بھی ریحانہ کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اب جمشید نے اسے خوش خبری سنائی تھی کہ ایسا نہیں ہے، اس نے صرف ڈاکوؤں کو دھوکا دیا تھا۔ مگر تجوری کا کیا راز تھا؟ وہ کیسے خالی ہو گئی؟ اور ابھی جمشید ان کے سامنے موبائل پر بتا رہا تھا کہ ہیرے اس کے پاس ہیں۔ ریحانہ نے پوچھا۔ ”تم نے ہیرے کہیں اور چھپائے تھے؟“

”نہیں، ہیرے تجوری میں ہی ہیں۔“ جمشید نے سادگی سے جواب دیا۔ ریحانہ نے سر پر ہاتھ مارا۔

”میرے خدا جمشید! تم ڈاکوؤں کے سامنے بھی اسی طرح مجھے پاگل بنا رہے تھے۔ قسم سے بعض اوقات تو میرا دل چاہتا تھا کہ کسی ڈاکو سے گن لے کر تمہیں شوٹ کر دوں۔“

جمشید مسکرایا۔ ”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو پہلے منٹ میں ان ڈاکوؤں کے سامنے ہتھیار ڈال چکا ہوتا۔ اس کے بعد پتا ہے کیا ہوتا؟“

”وہ ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑتے۔“ جنید نے یقین سے کہا۔ ”پولیس نے اسپتال میں راشد کا بیان لیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ تجوری سے ہیرے اور رقم لوٹنے کے بعد

ہمیں قتل کر دیتے تاکہ کوئی عینی گواہ باقی نہ رہے۔"

شازیہ نے جھرجھری لی۔ "پاپا! ان کے ارادے بہت خوفناک تھے۔ جو میرے ساتھ گیا تھا، وہ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وجہ سے بھی میں کار کو پول سے ٹکرانے کی ہمت کر سکی۔ ورنہ شاید میں ایسا نہ کر پاتی۔"

جنید نے سر ہلایا۔ "اچھا ہوا اپنے انجام کو پہنچا۔"

وہ اندر لاؤنج میں آ گئے۔ ریحانہ بے چین ہو رہی تھی۔ اس نے پھر جمشید سے کہا۔ "تم نے بتایا نہیں اگر ہیرے تجوری میں تھے تو نظر کیوں نہیں آئے؟"

"ذرا صبر سے کام لو۔ ابھی تو گھر آیا ہوں، کچھ چائے پانی کو پوچھو، تمہیں ہیروں کی پڑ گئی۔"

"ویسے بھی وہ ہیرے پاپا کے پاس کسی کی امانت ہیں۔" شازیہ نے لقمہ دیا۔ "پاپا اتنی آسانی سے انہیں کسی کو نہیں دکھائیں گے۔"

وہ سب مسکرانے لگے۔ "ٹھیک ہے، لنچ تیار ہے۔ پہلے لنچ کرتے ہیں پھر تم ہمیں دکھاؤ گے کہ ہیرے کیسے تجوری میں ہیں اور کسی کو نظر بھی نہیں آ رہے ہیں۔" ریحانہ کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ شازیہ اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ ریحانہ نے محسوس کیا کہ اس واقعے کے بعد شازیہ اور جنید دونوں کے انداز میں تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ گھر اور ماں باپ کو اہمیت دینے لگے تھے۔ شازیہ کچن اور گھر کے دوسرے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ جنید نے ذمے داری سے گھر میں ہونے والی تمام ٹوٹ پھوٹ ٹھیک کرائی تھی۔ سیکیورٹی سے پورے گھر کے سسٹم کو ریفریش کیا تھا۔ شازیہ کی کار ابھی پولیس کی تحویل میں تھی۔ وہاں سے ملنے کے بعد اس کی مرمت کرائی جاتی۔ جمشید کی طرف سے ڈکیتی کی ایف آئی آر لکھوائی جا چکی تھی اور انویسٹی گیشن آفیسر نے یقین دلایا تھا کہ بچنے والے دونوں ڈاکو کم سے کم دس سال کے لیے جیل جائیں گے۔

لنچ کے بعد جمشید انہیں اپنے دفتر میں لایا۔ یہ اس کی جگہ تھی اور وہ اسے لاک رکھتا تھا۔ یہاں کی صفائی بھی وہ خود کرتا تھا۔ اس لیے گھر والے بہت کم یہاں آتے تھے۔ یہ سب کو پتا تھا کہ تصویر کے پیچھے تجوری ہے۔ جمشید نے ریموٹ اٹھا کر اس کا رخ تصویر کی طرف کیا۔ اس نے بٹن دبایا تو تصویر بائیں طرف سرک گئی۔ سرخ بٹن دباتے سے تجوری کا ٹچ پیڈ آن ہو گیا۔ اس نے نمبر ملایا اور ہینڈل پکڑ کر تجوری کھول دی۔ وہ تینوں اس کے پیچھے کھڑے تھے کیونکہ جمشید وہیل چیئر پر تھا اس لیے انہیں دیکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ان کے منہ کھلے رہ گئے پھر ریحانہ نے کہا۔

"یہ کیا... سیف تو خالی ہے۔"

جمشید مسکرایا۔ "یہ دھوکا ہے، اب میں تمہیں اصل سیف دکھاتا ہوں۔"

اس نے تجوری کا دروازہ بند کیا اور پھر ریموٹ کا سفید بٹن دبایا تو تصویر سرک کر اپنی جگہ آ گئی۔ مگر جب اس نے دوبارہ بٹن دبایا تو تصویر دوبارہ سرکی لیکن اس بار وہ دائیں طرف گئی تھی۔ اس کے سرکنے سے دوبارہ تجوری نمودار ہوئی لیکن یہ دوسری تجوری تھی۔ بٹن دبانے پر ڈیجیٹل پیڈ آن ہوا اور نمبر ملانے پر تجوری کھل گئی۔ اس کے اندر ہیروں والا سیاہ باکس، رقم اور دوسری قیمتی اشیا رکھی تھیں۔ "یہ ہے اصل سیف... دوسرا ڈمی ہے مگر دیکھنے میں بالکل اصل لگتا ہے۔ اسی وجہ سے ڈاکو بھی دھوکا کھا گئے۔ ان کا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ تصویر کے پیچھے کوئی دوسرا سیف بھی ہو سکتا ہے۔"

"ڈاکوؤں کا کیا... کبھی میرا ذہن اس طرف نہیں گیا۔" ریحانہ نے اعتراف کیا۔ "لیکن ایک ہی ریموٹ سے دونوں سیف کیسے کھلتے ہیں؟"

"تم شاید یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ تصویر کیسے سرکتی ہے۔" جمشید نے کہا اور پھر عملی طور پر کر کے دکھایا۔ "یہ دیکھو، اگر میں سفید بٹن کو ہلکا سا دباؤں گا تو تصویر دائیں جانب سرکے گی لیکن اگر میں اس بٹن کو مستقل دبائے رکھوں گا تو تصویر بائیں جانب سرکے گی، باقی فنکشن یکساں ہیں۔"

"شکر ہے وہ ناکام رہے ورنہ ہم سچ مچ دیوالیہ ہو جاتے۔" ریحانہ نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔ وہ سب باہر آ گئے۔ اچانک شازیہ نے پوچھا۔

"پاپا! جب ڈاکو جنید کو مارنے والا تھا تب آپ نے اسے روکا نہیں۔"

جمشید گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "میں اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ کسی انسان کی زندگی یا موت دوسرے کے اختیار میں نہیں ہے اور میرے سپرد جو امانت تھی، میں اس میں خیانت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے میں اپنی اور اپنے بچوں سمیت ہر قربانی دینے کو تیار تھا۔"

ریحانہ کے تاثرات بدلے لیکن جنید نے کہا۔ "پاپا! مجھے آپ سے ذرا بھی شکوہ نہیں ہے بلکہ مجھے آپ کی استقامت پر فخر ہے۔ میں آپ کی طرح بننا چاہتا ہوں۔" جنید باپ کے شانے سے لگ گیا۔

"میں بھی پاپا۔" شازیہ دوسری طرف سے آ کر لپٹ گئی تو ریحانہ بھی مسکرانے لگی۔